محبّت، یقین، اعتماد

سمیرا شریف طور

محبت یقین اعتماد



سمیرا شریف طور

القریش پبلی کیشنز
سرکلر روڈ چوک اُردو بازار لاہور
فون: 042-37652546 ، 042-37668958
www.alquraish.com E.mail:info@alquraish.com



فہرست

پیش لفظ

محبت، یقین، اعتماد......

محبت، جسے سمیرا شریف طور کا قلم جس ہیئت میں ڈھالنا چاہتا ہے ڈھال سکتا ہے۔ چاہے وہ شدت پسندی کی انتہا پہ ہو یا بے بسی کی انتہا پہ۔ "یقین" جس پر محبت کا پورا ڈھانچہ کھڑا ہوتا ہے۔ محبت کا وجود یقین کی ٹھوس زمین پر تعمیر ہوتا ہے، تشکیل پاتا ہے۔ اپنے حُسن، شدت اور انتہا کو ظاہر کرتا ہے۔ محبت جو کبھی وافر کی مانند ہوتی ہے تو کبھی کانچ کی مانند، خوشبو جو بکھر جاتی ہے، جو نہال کرتی ہے اور کانچ جس کی نوک جہاں بھی لگتی ہے بس زخم چھوڑ جاتی ہے۔ محبت اور یقین کو زیبائش اعتماد کی جگمگاہٹ سے ملتی ہے۔

جب بے یقینی کا "دیمک" محبت کو چاٹتا ہے تو اعتماد کے وجود کو خود بخود ڈھا دیتا ہے۔ اگر محبت ثادق کی مانند ٹھنڈک ہے تو یقین اور اعتماد مضبوطی، قرار، پائیداری اور پختگی کا نام ہیں۔

محبت جو کچے دھاگے کی طرح کمزور بھی کرتی ہے اور "تھام" بھی بخشتی ہے۔ محبت، یقین کے توسل سے اعتماد تک پہنچتی ہے اور اگر اعتماد کو ٹھیس پہنچے تو محبت کا وجود پاش پاش ہو جاتا ہے۔

محبت "ترصد" کی مالا کا ایک موتی ہے۔ جس کو یقین کی آس، اُمید کی سانس اور توقعات سے تزئین دی جاتی ہے۔ محبت جو کبھی تزاہر کی مانند ہے تو کبھی سیاہیٔ شام کی مانند۔ کبھی قربانی مانگتی ہے تو کبھی خود قربان ہو جاتی ہے۔

سمیرا شریف طور کی اس تیسری کتاب "محبت یقین اعتماد" میں گرما دینے والی محبت کی پرتیں کھلیں گی۔ یہ سمیرا کے قلم کی سب سے بڑی خوبی ہے کہ جو بھی تحریر قاری کے ذوقِ مطالعہ کے لئے لکھی جائے اسے "اہل" بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ اگر منظر نگاری یا مکالموں کا استعار کیا جائے یعنی مول کیا جائے یا انہیں اسطر (میزان) پر رکھا جائے تو یہ کہنا مشکل ہوگا کہ کون سا پلڑا زیادہ بھاری ہے۔

خوب صورت پلاٹ سے لے کر کردار نگاری یا منظر نگاری تک لفظوں کے ازدھر کو صفحۂ قرطاس پر پھیلا دینا سمیرا کے قلم کا ایک انوکھا اور منفرد فن ہے۔

میں نے "جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا" جیسے مدتوں نہ بھولنے والے ناول میں جو محبت کی اونچائی، بلندی اور ازہار یعنی شگوفے اور کلیاں بکھرتی دیکھیں، عموماً سمیرا کے قلم کا یہی اسلوب اور طریقہ رہا ہے۔

"عبدالباری" کے کردار میں سمیرا نے انسانی ذہن کی گتھیاں کھولیں جو پنہاں اور خفیہ، مثبت اور منفی خوبیاں یا خامیاں موجود تھیں، ان کو بڑے سلیقے اور سجاؤ کے ساتھ سامنے لائی۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ یہ ناول محبت کی اونچائی کے ساتھ ساتھ "عبدالباری" جیسے کردار کی بدولت "مہد" ہوا۔ اور سمیرا کے لئے یہ ناول رفعت کی جانب ایک بہترین "سبیل" بنا۔

نایاب جیلانی



محبت یقین اعتماد

"ساری دنیا کے گھروں میں ایشین، اٹالین یورپین ڈشز بنتی ہیں۔ ساری دنیا شوق و رغبت سے کھاتی ہے۔ لے دے کے ایک ہمارا انوکھا نرالا بلکہ خالص روایتی گھر ہے، جس میں دیسی کھانوں کے سوا کچھ اور پکتا ہی نہیں۔" روٹیوں پر طبع آزمائی کرتے، منہ بسورتے وہ خاصی اونچی آواز میں کہہ رہی تھی۔ "یقین کریں ونیزے آپی! کبھی کبھی دل چاہتا ہے احتجاج کروں۔ باقاعدہ بھوک ہڑتال شروع کردوں، لیکن ہائے میری دادی اماں...... بڑی سخت ڈکٹیٹر ہیں۔ خالص تھرڈ روح ان کے اندر رہتی ہے، مجال ہے کبھی مرغ کو چکن چاؤمن بنانے کی سوچ بھی ذہن میں در آنے کی گستاخی کرے۔"

وہ بدستور اپنے اردگرد سے بے خبر کہہ رہی تھی کہ کچن میں داخل ہوتیں دادی اماں کے ناتواں کانوں نے اس کے نادر خیالات سن لیے تھے۔ وہ جو آہستہ آہستہ چلتی اپنے گھٹنوں کے درد کو کوس رہی تھیں۔ وجیہ کے نادر فرمودات سے بہرہ ور ہونے کے بعد تیز تیز قدم اٹھاتی اس کے عقب میں جا کھڑی ہوئیں۔

بڑی نفاست سے گھونٹ گھونٹ چسکی اپنے حلق میں انڈیلتی ونیزے انہیں جلال کی بجلیاں اپنے چہرے پر طاری کئے دیکھ کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"وجیہ" خاصی نحیف آواز میں اسے متوجہ کرنے کو پکارا اگر مجال ہے جو اس نے سنا ہو۔ وہ کن انکھیوں سے دادی اماں کو دیکھنے لگی، پھر ایک نظر وجیہ پر ڈالی جو بدستور روٹیاں بناتے آج دال گوشت پکنے پر برے برے منہ بنا رہی تھی۔ بلکہ چند سیکنڈ پہلے ادا ہونے والے فرمودات بھی اسی حوالے سے تھے۔ وہ مزید دادی اماں کی آمد سے بے خبر اپنی راگنی چھیڑے کچھ کہہ رہی تھی۔ ونیزے نے پھر ڈرتے ڈرتے دادی اماں کے تیور ملاحظہ کئے۔ ان کے چہرے پر وجیہ کی بات پر غصہ صاف ظاہر ہو رہا تھا۔

"کم ونیزے آپی! مجھے تو بڑی حیرت ہوتی ہے۔ آپ تو چائنیز کھانوں کی عادی ہیں پھر اب کیسے یہ سڑیل روایتی دیسی کھانے کھالیتی ہیں۔ کیا آپ کو ان کم مرچ مصالحوں والے کھانے کھا کر ابکائی نہیں آتی۔"

ونیزے کا جی چاہا اپنا سر پیٹ لے۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ ایک سیکنڈ ضائع کیے بغیر دادی اماں اس کی چٹیا پکڑ لیں گی اور ہوا بھی ایسے ہی تھا۔ جیسے ہی اس نے وجیہ کے پاؤں پر پاؤں مار کر اسے دادی جان کی موجودگی سے باخبر کرنا چاہا مگر رزلٹ الٹا ہوا تھا۔ وہ جیسے ہی بلبلا کر پلٹی ونیزے کے اپنے ہی ہاتھ میں پکڑا گلاس اس کا ہاتھ لگنے سے چھوٹ کر زمین بوس ہو کر شہید ہو گیا۔ بے چارے مرحوم کے ٹکڑے سارو گرد بکھرے ہوئے تھے۔

"ارے...... خدا کی پناہ...... کیسی پاگل لڑکی ہو تم۔ ہر وقت ناشکری پر تلی رہتی ہو۔ ذرا ادھر تو آؤ میں تمہیں بتاتی ہوں کیسے ابکائی آتی ہے۔" اتنا نفیس خوبصورت شیشے کا گلاس ٹوٹنے پر دادی اماں مزید چراغ پا ہو گئیں۔ فوراً آگے بڑھ کر وجیہ کا بازو دبوچا وہ جو ان کی آمد سے قطعی بے خبر تھی، اپنی جگہ سے یوں اچھل گویا بچھو نے ڈنک مارا ہو۔ وہ ایک دو قدم پیچھے بھی ہٹی تھی مگر اب دادی اماں

سے بچنا ناممکن تھا۔

"خدا کی مار تجھے۔ لے کے اتنا خوبصورت گلاس توڑ دیا ہے اوپر سے ناشکری کی حد کرتی ہے۔ موئے انٹی اناتی کو روتی ہے۔" وجیہ کے بازو کو زور زور سے جھنجوڑتے انہوں نے انیشین انالیمن کو "انٹی اناتی" میں تبدیل کر دیا۔ ونیزے کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ ابھری مگر اس نے کمال ہوشیاری سے ضبط کر لی۔

"اوہوں دادی اماں! کونسا کچھ میں نے غلط کہہ دیا ہے۔ جس دور میں ہم جی رہے ہیں، روز نئی نئی ڈشز دریافت ہو رہی ہیں۔ لوگ انتہائی شوق سے کھاتے ہیں اور ہمارے گھر میں دیسی کھانوں کے علاوہ کچھ اور پکتا ہی نہیں ہے۔ کبھی دال پالک، کبھی مرغ چاول، کبھی دال کدو، کبھی خالی دال۔ میں تو تنگ آ چکی ہوں اس روٹین سے۔" وجیہ ایک لمحے کو ڈری تھی غصے سے اپنا بازو چھڑوا کر زور زور سے مرغ دال والی ہنڈیا میں چمچہ چلایا اور پھر روٹی بیلنے لگی۔ دادی اماں نے اس کے یوں دوبدو جواب دینے پر زور سے اسے دوہتڑ مارا۔

"خبردار لڑکی! تم نے تنگی والی بات کی تو۔ جان نکال لوں گی تمہاری۔ ارے ناشکری! خدا کا شکر ادا کر۔ تینوں وقت کی اچھی بھلی کھا کر سوتی ہے۔ بھوکی نہیں مر رہی تو۔ کپڑا، لتا، کھانا، پینا سب وقت پر مل رہا ہے تجھے۔ کس چیز کی کمی ہے۔ کبھی ان لوگوں کی طرف نظر اٹھا کر کیوں نہیں دیکھا جو ایک نوالے کی خاطر دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ جب تک میں ہوں اس گھر میں ایسے ہی کھانے پکیں گے۔ چسکا لگ گیا ہے تجھے مرچ مصالحوں سے بھرے کھانے کھانے کا۔ اگر میں دیسی کھانوں پر زور دیتی ہوں تو تم لوگوں کی صحت کی وجہ سے ورنہ یہ جو الم غلم شیاطانی کھانے کھا کھا کر تم لوگوں کے دماغوں میں کچھ ہوتا ہے نہ ہی آنکھوں میں کچھ سمجھ میں آئی میری بات۔ موئے انگریز یہ کھانے نکال کر چل دیئے اور ہمارے دماغوں میں کولتار ڈال گئے ہیں۔" اپنے خاصے بے لچک تحکمانہ انداز میں کہتے انہوں نے گھورتے ایک لمبی تقریر کر ڈالی تھی۔ وجیہ نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے فوراً سر جھکا لیا۔

ونیزے کے ہونٹوں پر اس سعادت مندی کے بھرپور مظاہرے پر ایک خوبصورت مسکان ابھر آئی تھی۔ اس دفعہ ونیزے نے مسکراہٹ روکنے کی ناکام کوشش نہیں کی تھی۔ کھل کر مسکرائی۔ وجیہ کی تمام روٹیاں پک چکی تھیں۔ توا اتار کر ہاٹ پاٹ ڈھک کر اس نے برنر بھی آف کیا۔

"بس کریں دادی اماں! بچی ہے نا، سمجھ جائے گی آہستہ آہستہ ہی عقل آئے گی۔" دادی اماں کا غصہ ٹھنڈا کرنے کو اس نے بھی زبان کھولی تو اس کی بھولی بھالی معصوم صورت دیکھ کر وہ فوراً ہی دھیمی پڑ گئیں۔

"میں اس گھر کی یا اس کی دشمن نہیں ہوں۔ سب کے بھلے کی ہی کہتی ہوں۔ اب یہ تو نہ ہی بچی ہے اور نہ ہی کم عقل۔ جب میں اس کی عمر کی تھی تو اللہ رکھے اس کے بڑے ابو جہانگیر احمد کو، وہ میری گود میں تھا۔ دودھ پیتا تھا اور ایک یہ نحوست ماری ہے۔ بارہویں میں پڑھتی ہے، دیو جتنا قد ہے اور عقل نام کی نہیں ہے۔ لڑکوں کی طرح اچھلتی کودتی ہے۔ چھینا جھپٹی کرتی ہے، ہر بات پر اعتراض۔ لڑکیاں تو نظر کے اشارے سے ہی سمجھ جانے والی مخلوق ہیں۔ خدا جانے یہ مصیبت کس پر چلی گئی ہے۔ خدا کا عذاب ہی تو ہے۔" دادی اماں نے وجیہ کی اور بھی بہت سی خامیاں جو ایک عرصے سے کھٹک رہی تھیں گنوائیں۔ وہ اندر ہی اندر غصے سے تلملا اٹھی۔

"دادی اماں پلیز....." خاص طور پر ان کی آخری بات پر وجیہ احتجاجاً چیخی تھی۔ مگر غصے کی زیادتی سے فوراً چپ بھی ہو گئی۔ مبادا کچھ غلط نہ بول جائے۔ دادی اماں کے سامنے تو ابو چچا، امی چچی تک کی زبان بند ہو جاتی تھی وہ تو پھر نیا نیا بولنا سیکھی تھی۔ اتنی گستاخی کیسے کر جاتی۔

"یہ پولیس، ولیس کی تڑیاں مجھے مت لگایا کرو۔ سیدھی ہو جاؤ جب سے کالج جانا شروع کیا ہے زبان ہی دراز کر لی ہے۔ ہر وقت تڑ تڑ کرتی رہتی ہے۔ اگر اب کوئی اثر نہ ہوا تو ٹانگیں توڑ کر گھر میں ڈلوا دوں گی۔ جو گھر میں پکتا ہے، جو سب کھاتے ہیں،

وہی تم بھی کھاؤ گی۔ مہارانی نہیں ہو جو تیرے لیے علیحدہ مرغ مسلم بھون کر رکھے جائیں۔" دادی اماں نے تو رہی سہی کسر بھی نکال دی تھی۔ وہ سر جھکا کر رو دی مگر دھیمی آواز میں کہے بغیر نہ رہی۔

"اتنی کنجوسی بھی اچھی نہیں ہوتی۔ جب خدا نے ہمیں دیا ہے تو شکر ادا کرتے کھائیں بھی ناں۔ سنبھال سنبھال کر رکھیں گے، قبر میں لے جانا ہے نا۔"

"کیا کہا تو نے.....؟" اسے اچھی خاصی سنا کر دادی اماں جو باہر جانے کو قدم اٹھا رہی تھیں ان کے تیز کانوں تک وجیہ کی یہ بد سرائی پہنچ گئی تھی۔ فوراً پلٹیں، وجیہ کے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔

"کچھ نہیں دادی اماں! میں تو کہہ رہی تھی آپ بالکل بجا فرماتی ہیں بلکہ میں ہی ناشکری ہوں بلکہ بقول آپ کے نحوست ماری۔" بوکھلا کر وہ پھر چبا چبا کر کہتی ونیزے کو مسکرانے پر مجبور کر گئی۔

"اچھا جلدی سے کھانا لگاؤ، سب انتظار کر رہے ہیں۔" وجیہ چونکہ بیان بدل گئی تھی اس لئے دادی اماں نے اسے گھورنے پر اکتفا کرتے اس کی جان بخشی کی تھی۔ وہ پھر اپنے گھٹنوں کے درد کو کوستے باہر نکل گئیں تو وجیہ قریب رکھی کرسی پر یوں گری جیسے معرکہ سر کر کے آئی ہو۔

"توبہ ہے..... ایک تو یہ ہماری پیاری دادی اماں بھی ناں..... " بات ادھوری چھوڑ کر اس نے اپنے گالوں پر ہاتھ رکھ کر ان سے پھوٹتی حرارت محسوس کی جو صرف اور صرف دادی اماں کے چانٹوں کی وجہ سے پھوٹ رہی تھی۔

"تم نے بھی تو حد کر دی وجیہ! تو بہ اتنا بولتی ہو، کبھی تو چپ رہا کرو۔ اچھے بھلے تو ہوتے ہیں تم لوگوں کے کھانے۔ کیا کمی ہے، مجھے تو اتنا مزہ آتا ہے ایمان سے میں بہت لطف اندوز ہوتی ہوں۔ ایمانداری سے میں نے کبھی اپنی ساری زندگی میں اپنے چائنیز کک کی تیار کردہ ڈشز میں بھی نہیں محسوس کیا۔"

"آپ صرف اس لیے کہہ رہی ہیں کہ آپ نے کبھی ایسے کھانے کھائے ہی نہیں۔ ابھی تو آپ کو ڈیڑھ ماہ ہوا ہے یہاں رہتے ہوئے۔ مزید وقت گزاریں گی تو اس روٹین سے اکتا جائیں گی۔" وہ ایک منٹ رکی پھر بولی۔ "میں ان کھانوں کو ہرگز برا نہیں کہتی مجھے تو اس روٹین کی خوراک سے اکتاہٹ ہوتی ہے۔ کیا کمی ہے ہمارے پاس، ماشاءاللہ اللہ کا بڑا فضل و کرم ہے ہر چیز ہے پھر بھی اتنی کنجوسی اور الزام صحت کو۔ کبھی کبھی روٹین سے ہٹ کر کچھ اور بھی پکا لیا جائے تو منہ کا ذائقہ ہی چینج ہو جائے۔ یہاں چاہے کدو گوبھی، بھنڈی، پالک آلو، گوشت چاول کوفتے، کباب کچھ بھی پکے، سب میں دال کا ہی ذائقہ محسوس ہوتا ہے۔" وہ بڑے برے منہ بناتے ہوئے دل کی بھڑاس نکال رہی تھی۔ ونیزے کھل کر مسکرا دی۔

وجیہ اپنی جگہ درست تھی اور دادی جان اپنی جگہ پر۔ وہ پرانے خیالات کی حامل پرانی سوچ و روایت کی مالک پرانی عورت تھیں۔ وہ ہر بات میں دیسی ٹوٹکوں اور بزرگوں کی باتوں کو اہمیت دیتی تھیں۔ چاہے معاملہ کھانے کا ہو یا صحت کا یا پھر عام گھریلو مسئلہ ہو وہ ہر کام اپنی مرضی، اپنی سوچ کے مطابق ہی کرواتی تھیں۔ باقی لوگ تو ان کی رائے کو، کام کو اہمیت دیتے تھے۔ ان کے فیصلے کو مانتے تھے مگر وجیہ نئے دور کی پروردہ، نئی سوچ رکھنے والی نئی لڑکی تھی۔ اسے ہر کام میں، ہر بات میں جدت چاہیے ہوتی تھی۔ اسے دادی اماں کے ٹوٹکوں سے اکثر اختلاف رہتا تھا۔ اسی لئے وہ سارے گھر میں سب سے زیادہ دادی اماں کی جھڑکیوں، صلواتوں کا نشانہ بنتی تھی۔

"وجیہ! تم نے ابھی تک دسترخوان پر کھانا نہیں لگایا۔ وہاں سب انتظار کر رہے ہیں اور یہ نواب زادی یہاں استراحت فرما رہی ہیں۔ چلو اٹھو جا کر دسترخوان بچھاؤ میں کھانا لاتی ہوں۔" چچی جان جو دادی اماں سے اس کی تازہ ترین کارگزاری سن کر آئی تھیں اسے یونہی بیٹھے دیکھ کر غصے ہوئیں۔ ماں کا غصہ دیکھ کر وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ بڑبڑاتے ہوئے باہر چل دی۔

"ایک تو میں ہی ہر ایک کو فارغ نظر آتی ہوں۔ مجھے ہی ہر وقت ڈانٹتے رہتے ہیں۔"

"یہ دیکھو ذرا ونیزے! یہ حال ہے اس لڑکی کا ایک ذرا سا کام کیا کہہ دیا ہے۔ زبان ہی نہیں رک رہی۔ کیا ہوگا اس کا۔ اگلے گھر جا کر ماں کی ناک کٹوائے گی۔" اسے مخاطب کر کے انہوں نے اپنا دکھڑا رو دیا تو اس نے مسکراتے ہوئے انہیں تسلی دی۔

"کچھ نہیں ہوتا ٹھیک ہو جائے گی۔"

"مشکل ہی ہے۔" چچی جان کافی ناامید تھیں۔ وہ بھی خاموش رہی۔

پھر اس نے چچی کے لاکھ منع کرنے کے باوجود ان کے ساتھ مل کر کھانا لگوایا۔ ایک ایک کر کے سب دسترخوان پر جمع ہونے لگے تو وہ بھی ہاتھ دھو کر دادی اماں اور بڑی امی کے پہلو میں بیٹھ گئی۔

* * *

وہ صبح فجر کی نماز ادا کر کے باہر لان میں نکل آئی۔ بھیگی گھاس پر گرتی اوس، اسے یہ دلآویز منظر ہمیشہ کی طرح دنیا جہاں کے سب منظروں سے زیادہ دلنشین، حسین اور روح پرور لگا۔ روح اندر تک معطر ہوتی چلی گئی۔ جوتا اتار کر ایک طرف رکھا اور شبنمی مخملی سبز گھاس پر چہل قدمی کرنے لگی۔ آنکھیں بند کیے، گہرے گہرے سانس لیتی، خارج کرتی یونہی ادھر سے ادھر چکر لگاتے اس خوبصورت ماحول کا ایک حصہ ہی محسوس ہو رہی تھی۔

تقریباً ڈیڑھ ماہ پہلے جب وہ اپنے گھر میں تھی تو بوا باقاعدگی سے اسے صبح صبح اٹھا دیتی تھیں۔ وہ نماز ادا کر کے باہر لان میں نکل جاتی اور بوا قرآن پاک کی تلاوت میں مصروف ہو جاتی تھیں۔ ہر چیز سے بے نیاز ہو کر خوبصورت منظروں کو اپنے اندر اتار کے وہ دیر تک واک کرتی، کبھی پھولوں کو سونگھتی، چڑیوں، فاختاؤں سے اٹکھیلیاں کرتی، درختوں کے گرد جھومتی، شاخوں سے آزاد ہو جاتی تھی۔ یاد رہتا تو صرف اتنا کہ یہ صبح کا خوبصورت منظر، قدرتی حسن، بھیگی نظروں کی زراہٹ وچہک سب اس کے لیے ہے اور پھر لان کے وسط میں بنے خوبصورت حوض کی چھوٹی سی سنگ مرمر سے تراشی دیوار پر بیٹھ کر گھٹنوں تک ٹھنڈے پانی میں اپنے پاؤں ڈبوئے غافل ہو جاتی تھی۔ گرد و پیش کا کوئی ہوش نہیں رہتا تھا یہاں تک کہ اسے بوا آکر متوجہ کرتیں۔ پھر اتنی دیر تک لان میں رہنے پر ماما کی ہلکی پھلکی پیار بھری جھاڑ پڑتی تھی۔ اگلے دن پھر وہی روٹین ہوتی تھی۔ ماما کے انتقال کے بعد تو بہت کچھ بدل گیا تھا، گھر، رشتے، بزنس اور خود پاپا بھی۔ اگر نہیں بدلے تھے تو وہ امجد بھیا اور صبیحہ بھابی تھیں۔ ان کی محبتیں اب بھی ویسی ہی تھیں۔ جان لٹاتی ہوئی۔

اسے اپنے گھر کے لان سے بے پناہ محبت تھی۔ ان کا اپنا لان تھا بھی بہت خوبصورت اور وسیع۔ رنگ برنگ پھولوں سے لدا ہوا، شاید ہی کوئی پودا ہو جو اس میں نہ ہو، ورنہ جب پاپا اور ماما زندہ تھے وہ نجانے کہاں کہاں سے ڈور انڈور پلانٹس منگواتے تھے۔ اس کام کے لیے انہوں نے بطور خاص دو ملازم (مالی) رکھے ہوئے تھے۔ اس کی ماما کو گارڈننگ کا بہت شوق تھا اور پاپا نے کبھی ان کی کوئی خواہش رد ہی نہیں کی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ان کا لان اپنی کلاس کے تمام لوگوں کے گھروں کے لانز سے زیادہ خوبصورت اٹریکٹو اور صاف ستھرا تھا۔

آنکھیں بند کیے وہ اپنے گھر کے لان میں پہنچی ہوئی تھی۔ جہاں کبھی بھی کسی کو اس کی محویت میں دخل اندازی کرنے کی جرأت نہیں ہوئی تھی سوائے ماما اور بوا کے۔ اب تو ڈیڑھ ماہ سے یہ قیدیوں جیسی زندگی گزارتے ہوئے اسے گزشتہ تمام واقعات و مناظر خواب ہی لگ رہے تھے۔ پچھلی سب باتوں کو سوچتے ہوئے اسے سب بہت اچھا لگ رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ وقت یہیں تھم جائے اور وہ خوابوں کے اسی جزیرے میں گھومتی رہے۔ ماما پاپا کے متعلق سوچتی رہے۔

"آ...... آ...... ہم" وہ آنکھیں بند کیے ماضی کو یاد کرتے شاید اس گھر کے چھوٹے سے مگر خوبصورت لان کا کوئی دسواں

چکر لگا چکی تھی، جب اسے یہ عجیب سی آواز سنائی دی۔ شاید کوئی اس کے قریب کھانسا تھا۔ اندازہ تو یہی ہوا تھا۔ ونیزے نے ایکدم آنکھیں کھول دیں مگر اپنے بالکل سامنے قدرے بہت نزدیک کھڑے قطعی اجنبی شخص کو دیکھ کر پہلے بوکھلائی، ڈری اور پھر اس کے حلق سے بے اختیار چیخ ہی نکل گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید حماقت کا مظاہرہ کر کے چور چور کا شور مچاتی، اس اجنبی شخص نے فوراً آگے بڑھ کر اس کے منہ پر اپنا کھردرا مگر مضبوط ہاتھ رکھ دیا۔ دوسرے ہاتھ میں پکڑا ہوا سفری بیگ وہیں گھاس پر ڈھیر کیا اور مضبوطی سے ڈری سہمی ڈرپوک سی ونیزے کا نرم و نازک بازو بھی دبوچ لیا۔ اجنبی کی اس جرأت پر ونیزے کی خوف و ہراس سے آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ تو ابھی خاصی ڈرپوک لڑکی واقع ہوئی تھی۔ اس اچانک افتاد سے مزید گھبرا گئی۔ نروس سسٹم نے کام کرنے سے یکدم انکار کر دیا۔ ونیزے جیسی دھان پان سی، کانچ کی طرح نرم و نازک لڑکی کے لیے اتنے قوی مضبوط و توانا، ڈیل ڈول والے چور کا تصور ہی سوہان روح تھا۔

اپنے منہ سے اس کا فولادی ہاتھ ہٹانے کو اس نے دونوں ہاتھوں سے اس کا بازو تھام کر پیچھے ہٹانے کی کوشش کی مگر سب مزاحمتیں بے کار گئیں۔ تڑپنا بے سود تھا۔ مقابل نہ صرف خاصا چالاک تھا بلکہ نہایت فولادی اعصاب کا مالک تھا۔ وہ کچھ بھی کر لیتی سب بے کار تھا۔ وہ اس کی مزاحمت روکنے کو نظر انداز کیے بازو دبوچے بے دردی سے گھسیٹتے ایک سائیڈ پر لے گیا۔

"خبردار! شور مچانے یا کوئی حرکت کرنے کی کوشش کی تو جان سے مار دوں گا۔" جسم کی طرح لہجہ بھی بہت کرخت کسی احساس سے عاری تھا۔ آواز اتنی بھاری، گونج دار، تحکم بھری مضبوط اور بے لچک تھی کہ ونیزے کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ ٹانگوں نے اس کے وجود کا بوجھ سہارنے سے انکار کر دیا۔ ہاتھ پاؤں..... سن ہوتے ہوئے کہ آنکھوں کے سامنے اندھیرا اتا چھا محسوس ہوا۔ بزدل اور کم ہمت وہ شروع سے ہی تھی۔ بجلی کی کڑک چمک سے بے ہوش ہو جانے والی ونیزے اب بھی خود کو کمپوز کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ ایک دو بار آنکھیں جھپکتے بکھرے حواسوں کو قابو میں کرنے کی کوشش میں بے حال ہوتی اس اجنبی شخص کی بانہوں ہی میں تو جھول گئی تھی۔

"اوہ..... تو......" ڈال کی طرح، لچکدار کانچ کی طرح نازک چاندی سے بھی زیادہ روشن خود پر گرے اس معطر ہوش ربا وجود پر اس نے ایک نگاہ کی۔ لڑکی کے بے ہوش ہو جانے سے اس کی سوچ کا رخ یکدم بدلا تھا۔ نظریں اس کانچ سے وجود پر گویا جم ہی گئی تھیں۔ لڑکی بلا کی حسین تھی۔ اتنا مکمل حسن شاید اس نے پہلی دفعہ ہی دیکھا تھا یا پھر پہلے بھی دیکھا تھا۔ وہ اندازہ نہ لگا سکا۔ پورا وجود ہی سحر انگیز تھا۔

"یہ کون ہے؟ اس قدر استحقاق سے یہاں کیا کر رہی تھی۔" یہ الجھن اسے بے چین کرنے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اس کانچ کے پیکر کو پہلے بھی کہیں دیکھ چکا تھا۔ کہاں؟ پہچان کے رنگ واضح نہیں ہو رہے تھے۔ مزید ستم یہ تھا کہ وہ ہوش و خرد سے بیگانہ اس کے چنے سے لگی بازوؤں کی گرفت میں تھی۔ اتنی جلدی وہ حواس کھوئی تھی کہ وہ اس سے کوئی پوچھ گچھ یا کوئی رائے قائم ہی نہیں کر سکا تھا۔ اس کے لیے اصل پریشانی موجودہ صورتحال تھی۔ اگر اس وقت کوئی گھر کے اندر یا باہر سے ادھر نکل آتا تو وہ بری طرح پھنس جاتا۔ اپنی پوزیشن خاصی آکورڈ محسوس ہو رہی تھی۔ اپنی نیچر پر غصہ بھی آیا کہ بلا سوچے سمجھے اتنا خوفناک ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ بہت آہستگی سے اس لڑکی کو گھاس پر لٹا کر اس کا سر اپنی جھولی میں رکھا۔

"ہیلو گرل..... دیکھو ہوش کرو..... پلیز اٹھو......" دونوں ہاتھوں سے اس کے گلابی چھلکتے رخساروں کو تھپتھپاتے اس نے کہا مگر دوسری طرف وہ ویسی ہی بے حس و حرکت تھی۔ اس نے اس کی ناک کو زور سے بند کر دیا تاکہ سانس بند ہو اور وہ ہوش میں آئے مگر یہ طریقہ بھی کارگر ثابت نہ ہوا۔ اب اس کے حقیقت میں ہوش اڑے تھے۔ اجنبی لڑکی بے ہوش پڑی تھی وہ بھی اس کی اپنی کم عقلی کی وجہ سے۔

"کیا ضرورت تھی یار اتنے مشکوک ہونے کی۔" اس نے جھنجلا کر خود کو لتاڑا۔ کلائی تھام کر نبض چیک کی تو سکون ہوا۔ وہ نارمل تھی۔ اپنی تسلی کے لیے دل کی جگہ پر ہاتھ رکھ کر دھڑکن چیک کی۔ جہاں کچھ سکون ہوا اس اجنبی لڑکی کی اس بے ہوشی پر کوفت بھی ہونے لگی۔ آج اسے اپنا یہ سرپرائز بہت مہنگا پڑا تھا۔ ایک آخری کوشش کے بعد بھی وہ ہوش میں نہ آئی تو اس نے اس کا سر بھی گھاس پر رکھا دونوں ہاتھ جھاڑتا اندر کی طرف لپکا۔

"امی..... امی..... دادی جان..... بھئی سب کہاں ہیں..... وجیہ..... چچی جان۔" اندر داخل ہوتے ہی اس نے پکارنا شروع کر دیا تھا۔

"امی......" وہ پکارتا بغیر ادھر اُدھر دیکھے امی کے کمرے کی طرف بڑھا۔ امی اس کی آواز سن کر حیران ہوتیں کچن سے باہر نکل رہی تھیں اسے کمرے کی طرف جاتے دیکھ کر فوراً پکارا۔

"واحق....." وہ اس پکار پر ایکدم پلٹا تھا۔ امی اسی کی طرف آ رہی تھیں۔ دوسرے کمروں سے دادی جان، چچی بیگم، وجیہ، ابو، شہروز، مہران وغیرہ بھی نکل آئے تھے۔ ان سب کو دیکھ کر وہ بے طرح خوش ہوا تھا فوراً سب سے پہلے امی کے آگے جھکا۔

"السلام وعلیکم امی جان۔"

"وعلیکم السلام جیتے رہو۔ اس قدر اچانک......" سر پر ہاتھ پھیرتے انہوں نے اسے گلے سے لگایا۔

"واحق تو آج صبح صبح، تجھے تو آج کئی دن بعد آنا تھا۔" اس کی اچانک آمد پر دادی اماں بھی حیران ہوتے پوچھ رہی تھیں۔ اس کی توقع کے مطابق سب اس قدر اچانک آمد پر حیران تھے۔ وہ مسکراتے ہوئے ان کے ساتھ لگ گیا۔

"بس بہت یاد آ رہی تھی آپ سب کی..... جلدی جلدی سارا کام سمیٹتے فوراً یاد آ گیا۔" اپنے سرپرائز کی کامیابی پر مسرور بھی تھا۔

ان سے ہٹ کر اس نے باری باری سب سے سلام دعا کی اس دوران وہ یہ بھول بیٹھا تھا کہ باہر کوئی وجود اس کی حرکت کی وجہ سے بے ہوش پڑا ہوا ہے۔

"واحق بھیا میں آپ کو بہت یاد کر رہا تھا۔" چچی جان کے سپوت زارون نے کہا۔

"ارے واہ، میرا پارٹنر مجھے یاد کر رہا تھا۔ یار میں نے بھی تمہیں بہت یاد کیا تھا۔ خاص طور پر تمہاری اس چوچی سی ناک کو۔" اس نے شرارتی سے زارون کی لمبی ناک کو کھینچا تو سب ہنس پڑے تھے۔

"مجھ سے تو تم بات مت کرنا۔ پانچ مہینوں میں تو ایک بار بھی ملنے نہیں آئے۔ اب بھی مت آتے۔" شہروز نے بھی کہا۔ ان سب کے شکوے بجائے وہ ہنس دیا۔

"اور دادی اماں کیا آپ بھی مجھ سے ناراض ہیں۔" اس نے دادی اماں سے پوچھا تو انہوں نے کچھ نہ کہا۔

"ارے آپ تو واقعی ناراض ہیں۔" انہیں خاموش دیکھ کر وہ تھوڑا سا پریشان ہوا۔ پھر اچانک باہر بے ہوش ہونے والی لڑکی بھی یاد آئی تو سر پر ہاتھ مارتے اٹھ کھڑا ہوا۔

"ارے مارے گئے۔ پلیز دادی اماں سارے گلے شکوے بعد میں، پہلے میرے ساتھ باہر چلیں۔ وہاں باہر لان میں کوئی لڑکی بے ہوش پڑی ہوئی ہے۔ پلیز دیکھیں وہ کون ہے؟" اپنی کارستانی اور لڑکی کے بے ہوش ہونے کی وجہ حذف کیے اس نے خاصی عجلت دکھائی تو دادی امی، چچی وجیہ کے ساتھ باقی سب بھی چونک گئے۔

"کون لڑکی؟" دادی اماں کے لہجے میں شک بول رہا تھا۔ وہ زچ ہوا۔

"پتا نہیں دادی اماں، میں جب گیٹ سے اندر داخل ہوا تھا تو وہ لڑکی وہاں چکر لگا رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بے ہوش ہو گئی۔ پلیز آپ لوگ چل کر دیکھیں تو سہی۔"

"ہمارے..... میں مر جاؤں..... وہ تو اپنی ونیزے آپی ہیں..... " وجیہ کو بروقت یاد آیا۔ "وہ روز صبح صبح لان میں واک کرتی ہیں لیکن واحق بھائی انہیں ہوا کیا؟" اونچی آواز میں بڑبڑاتے اس نے باہر کی طرف دوڑ لگائی۔ اس کے پیچھے واحق، چھوٹی چچی، امی، دادی، شہروز اور زارون وغیرہ بھی تھے۔

ونیزے ابھی تک اسی حالت میں تھی جیسے وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ دادی اماں اسے اس حالت میں ہوش و خرد سے بیگانہ دیکھ کر تڑپ کر آگے بڑھیں۔

"ارے میری بچی کیا ہوا اسے؟" اس کا سر اپنی گود میں رکھتے انہوں نے بطور خاص واحق کو دیکھا۔ سب ہی پریشان تھے۔ خاص طور پر واحق کے چہرے پر پریشانی سے زیادہ الجھن تھی۔ یہ لڑکی ابھی بھی اس کے لیے سوالیہ نشان بنی ہوئی تھی۔ جس کے لیے سب ہی پریشان ہو گئے تھے۔

"ارے کوئی اسے اٹھائے تو..... اندر تو لے جائے..... میرے خدا..... یہ تو امانت ہے میرے پاس..... کیا جواب دوں گی میں اس کے بھائی بھاوج کو..... اے میرے خدا عزت رکھنا۔" اونچی آواز میں کہتے انہوں نے سب کو دیکھا تو وجیہ اور چچی نے اس کی کمر میں بازو ڈال کر سر اونچا کر کے اسے اٹھایا۔

"واحق بھائی پلیز..... ہماری مدد کریں۔ انہیں اندر لے چلیں۔" کراہتے اور چچی سے تنہا ونیزے کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ تین قدم آگے بڑھنے کے بعد ہی اس نے اسے پکارا جو اس ونیزے کے مسلسل بے ہوشی کا ذمہ دار تھا۔ وہ فوراً آگے بڑھا تھا۔ چچی کو ایک طرف ہٹا کر اس نے اسے سنبھالا۔

وجیہ اور وہ بے ہوش ونیزے کو اندر لے آئے تھے۔ کمرے میں لے جانے کے بجائے اسے دادی اماں کے مخصوص تخت پر لٹا دیا۔ امی نے تکیہ اس کے سر کے نیچے رکھا۔ دادی اماں چچی اس کے ہاتھ پاؤں سیدھے کرنے لگیں۔ وجیہ پانی کا گلاس لے آئی تھی۔

"بھائی! آپ پلیز کسی ڈاکٹر کو بلائیں۔" اس کے منہ پر پانی کا چھڑکاؤ کرتے ہوئے وجیہ نے شہروز سے روہانسے لہجے میں کہا تو وہ ٹیلی فون اسٹینڈ کی طرف بڑھ گیا۔ اس دوران باقی لوگ بھی ارد گرد جمع ہو گئے تھے جبکہ دادی اماں نے باقاعدہ رونا شروع کر دیا تھا۔ وہ اپنی جگہ مزید چور بن گیا۔ لڑکی کا تعارف حاصل کیے بغیر ہی وہ یہ اچھی طرح جان چکا تھا کہ یہ لڑکی گھر والوں کے لیے بہت اہمیت رکھتی ہے۔

"میں نے فون کر دیا ہے۔ ڈاکٹر بس آتا ہی ہے۔" شہروز نے واپس آ کر سب کے اترے روہانسے چہرے دیکھ کر تسلی دی۔

"بڑی بہو! اس کے ہاتھ سہلاؤ..... پاؤں ملو..... کچھ کرو۔ خدا کے لیے اسے ہوش تو آئے..... پرائی امانت ہے یہ تو۔" دادی اماں مسلسل بول رہی تھی۔ ان سب کو پریشان دیکھ کر وہ خود بھی آگے بڑھا۔ وجیہ کے ہاتھ سے گلاس لے کر اس نے پورا گلاس اس پر انڈیل دیا تھا۔ ایک دم سر پر پانی گرا تھا۔ وہ کسمسائی مگر پھر بھی ہوش میں نہیں آئی تھی۔

"خرم فریج سے ٹھنڈا یخ پانی لے کر آؤ..... جلدی کرو۔" اس نے قریب کھڑے بھائی کو کہا تو وہ فوراً دوڑا۔

"ارے کیا کرتے ہو تم..... اس موسم میں ٹھنڈا پانی ڈالو گے۔ مارو گے اسے۔"

خرم بوتل لے آیا تھا وہ ڈھکن کھول کر ڈالنے ہی لگا تھا جب دادی اماں نے ٹوکا۔

"کچھ نہیں ہو گا..... آپ پلیز چپ رہیں۔ دیکھیں یہ ابھی ہوش میں آتی ہیں۔" بہت چڑچڑے انداز میں اس نے

جواب دیا۔ دادی اماں چپ ہو گئیں۔ آج تو وہ اپنے دیسی ٹوٹکے تک بھول گئی تھیں۔ اس نے بوتل پوری کی پوری اس پر الٹا دی تھی۔ اتنا یخ ٹھنڈا پانی ایکدم گرنے سے اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ اس کے یوں ہڑبڑا کر آنکھیں کھولنے سے سب کے جسموں میں جان لوٹ آئی تھی۔

"کیا ہوا تھا میری بچی کو؟" دادی اماں نے بہت ہی حلاوت و مٹھاس بھری آواز میں پوچھا تھا۔ وہ جو سب کو خالی خالی نظروں سے دیکھ رہی تھی اس میٹھی نرم پھوار پر انہیں دیکھنے لگی تو تھوڑی دیر پہلے خود پر بیتنے والی سچویشن بھی یاد آ گئی۔ آنکھیں نمکین پانی سے جل تھل ہو گئیں۔

"دادی اماں..... وہ..... وہ وہاں چور..... وہ مجھے....." مزید اس سے کچھ کہا نہیں گیا تھا۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ دادی اماں نے اسے یوں بچوں کی طرح روتے دیکھ کر ساتھ چمٹا لیا۔ بچوں کی طرح پچکارنے لگیں۔ وجیہ گلوکوز ملا پانی لے آئی تھی۔ بڑی امی نے وینزے کے ہونٹوں سے لگایا۔

"لو یہ پانی پیو..... شاباش....." اس نے ایک ہی سانس میں پورا گلاس خالی کر دیا تھا۔ دل کی دھڑکن معمول پر آئی حواس بحال ہوئے تو اس نے دادی اماں کے سینے سے سر اٹھا کر سب پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ مگر اب کی بار اسے پھر ایک شدید جھٹکے سے دوچار ہونا پڑا تھا۔

سینے کے اندر موجود دل نے شور مچا دیا۔ "چور، چور" وہ ان سب میں موجود تھا جو اس کی اس حالت کا ذمے دار تھا۔ اس کی آنکھیں ایک دفعہ پھر پھٹی تھیں۔ دل [illegible] تھا۔

"خبردار شور مچانے یا کوئی حرکت کرنے کی کوشش کی تو جان سے مار دوں گا۔" کتنی سفاک آواز تھی احساس و رحم سے عاری جس نے اس کے حواس چھین لیے تھے۔ اب بھی وہ اس کے کان کے قریب پکار رہا تھا۔ اپنے ہونٹوں پر اس کی نمکین انگلیوں کی سختی پوری شدت سے محسوس ہوئی۔ وہ پوری جان سے چیخی۔

"نہیں....." اس کی نظریں جیسے واسق پر جم سی گئی تھیں پھر ایک دم حرکت میں آئی۔ دادی اماں کو جھنجوڑ ڈالا۔ "دادی اماں..... یہ..... یہ چور..... اس نے مجھے....." انگلی سے اس نے باقاعدہ واسق کی جانب اشارہ کیا تھا۔ سب نے یکبارگی حیرانگی و بے یقینی سے واسق اور پھر وینزے کو دیکھا۔

"لاحول ولاقوۃ....." وہ با آواز بلند بڑبڑایا۔ "دادی اماں! لگتا ہے ان کے حواس ابھی تک ٹھکانے نہیں آئے۔ بہتر ہے یہاں تماشہ مت لگوائیں۔ یہ جو کوئی بھی ہیں ان کو کمرے میں لے جائیں۔ ڈاکٹر آنے ہی والا ہوگا۔" ناگواری سے کہتے ہوئے وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

دادی جان نے فوراً اسے بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔ وجیہ اور امی ایکدم ہنس پڑی تھیں۔ چچی جان بھی تخت پر بیٹھیں تو باقی سب بھی مطمئن ہو گئے۔

"پاگل ہو تم تو..... بھئی وہ کوئی چور وور نہیں۔ میرا بیٹا ہے سب سے بڑا، پانچ ماہ سے پشاور گیا ہوا تھا اپنی بہن کے پاس۔ اسے سرپرائز دینے کی عادت ہے۔ بغیر بتائے ہی صبح صبح چلا آیا۔ تم نے چونکہ اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اسی لیے غلط فہمی ہو گئی ہوگی۔ ویسے وہ شکل کا اتنا پیارا ہے چور تو نہیں لگتا۔" اس کے سر پر نرم ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں دباتے انہوں نے بتایا اور آخر میں کچھ شریر سے انداز میں چھیڑا تو اسے کچھ حیرت ہوئی۔

"مگر اس نے تو مجھے....." وینزے نے انہیں اس کا رویہ بتانا چاہا۔ پھر لب بھینچ لیے۔

"بڑا سنجیدہ ہے۔ کبھی کبھار دل چاہا دوسروں کو حیران کرنے کی بات آئی تو یوں چپ چپاتے بغیر بتائے گھر آتا ہے۔ خاص

طور پر جب وہ گھر سے باہر ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ یا مہینوں رہ کر آئے تو یونہی سرپرائز دیتا ہے۔ مشکوک لوگوں کے ساتھ رہتے رہتے اب خود بھی ایسی مشکوک حرکتیں کرنے لگا ہے کہ کوئی اجنبی پہلی ہی نظر میں دیکھے تو فوراً غلط سمجھ بیٹھے۔" چچی جان نے بھی بتایا۔ وہ چپ رہی۔ اسے دیکھ کر ابھی خاصی الجھی گئی تھی۔ وہ اسے نظر سے ہی نہیں واقعی مشکوک لگ رہا تھا۔

"وجیہ! بہن کو کمرے میں لے جاؤ۔ سب کو کام دھندے پر نکلنا ہے۔ ہم ذرا کچن دیکھ لیں۔" بڑی امی نے وجیہ کو کہا تو دادی اماں نے پیار سے اسے خود سے جدا کر کے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور وجیہ کے حوالے کیا۔ وہ چپ چاپ اس کے ساتھ اس کے کمرے میں آ گئی۔ دماغ تو ابھی بھی سنسنا رہا تھا۔ وہ ذہنی غیر حاضر تھی۔ بستر پر لیٹتے ہی آنکھیں بند کر لیں۔

تھوڑی دیر میں ڈاکٹر بھی آ گیا تھا۔ چیک اپ کے بعد اسے "ٹوٹلی پرفیکٹ" کہہ کر ایک دو ہدایتیں دیتے چلا گیا۔ باقی سارا وقت وہ آنکھیں بند کیے لیٹی رہی۔

* * *

واسق کئی گھنٹوں کے سفر کے بعد صبح صبح گھر پہنچا تھا۔ کھانے پینے کے بعد وہ غافل ہو کر ایسا بے خبر سویا کہ سارا دن سوتا ہی رہا تھا۔ شام کے بعد رات کے کھانے سے پہلے امی کے بار بار پکارنے پر وہ بمشکل بستر سے اٹھا تھا۔ بغیر حلیہ سنوارے کپڑے بدلے منہ ہاتھ دھوئے وہ باہر نکل آیا۔

"کیا ہے امی.....؟ کیوں آوازیں دے رہی ہیں؟ سونے تو دیتیں۔ اتنے دنوں بعد سویا تھا وہ بھی نیند خراب کر دی۔" آنکھیں ملتے وہ دادی اماں کے تخت پر ہی دراز ہو گیا۔ کچن سے باہر نکلتی وینزے نے انتہائی ناپسندیدگی سے اسے دیکھا۔ اس کے حلیے پر نظر پڑی تو شدید ناگواری کی لہر نے اس کے وجود پر بسیرا کیا۔ وہ واپس کچن میں چلی گئی۔

واسق جہانگیر احمد اسے پہلی نظر میں ہی انتہائی مشکوک لگا تھا۔ اس کے رویے نے بھی اس پر بہت برا اثر ڈالا تھا۔ پہلی نظر سے لے کر وہ بعد میں کافی دیر تک یہی سوچتی رہی کہ اس نے اسے کہیں دیکھا ہے۔ پہلی بار کب اور کہاں ملی تھی۔ ملنے کی وجہ کیا تھی، وہ یہی سوچتی اور کڑھتی رہی۔

اسے اچھی طرح یاد تھا کہ وہ ان لوگوں سے پہلی دفعہ ڈیڑھ ماہ پہلے ملی تھی۔ جب بھابی اور بھیا اسے یہاں چھوڑنے آئے تھے۔ بعد میں یہاں رہنے کے دوران بھی اس واسق نامی کسی شخص کے وجود کا علم تک نہیں تھا۔ بہت زیادہ کڑھنے، سوچنے اور تفکر کے بعد اسے سب یاد آتا گیا کہ وہ اسے پہلی دفعہ کب کہاں اور کیوں ملی تھی؟

پچھلے سال جب وہ بی کام کے دوسرے سال میں تھی تو ان کے سیکشن میں اسلام آباد سے ایک روشانا می لڑکی مائیگریٹ ہو کر آئی تھی۔ بہت ہی ملنسار اور باتونی لڑکی تھی۔ دنوں میں ہی وہ اساتذہ اور لڑکیوں کی منظور نظر بن گئی۔ شروع میں وینزے کی اس سے واجبی سی سلام دعا تھی، بعد میں اچھی خاصی علیک سلیک بھی ہو گئی۔ دو تین ماہ بعد اسے اس لڑکی سے تعلق ختم کرنا پڑا تھا۔ وجہ اس لڑکی کی بہت ہی مشکوک حرکات تھیں اور لڑکیوں اور اساتذہ نے غور کیا ہو یا نہ ہو اس نے بہت جلد جان لیا تھا کہ وہ کوئی سیدھی سادی لڑکی نہیں ہے۔ اس کو روزانہ ایک لڑکا اپنی بائیک پر کالج چھوڑنے بھی آتا تھا اور لے جانے بھی۔ ایک دن روشانے ہی اس کا اس لڑکے سے سرسری تعارف کروایا تھا یہ کہہ کر کہ وہ اس کا فیانسی ہے اور وہ لڑکا کوئی اور نہیں واسق جہانگیر احمد تھا۔ آج جب اسے پہلی نظر دیکھا تو بالکل نہیں پہچان پائی تھی مگر جب سارا دن سوچتے رہنے کے بعد یاد آیا تو اسے واسق جہانگیر سے کافی ناگواری محسوس ہوئی۔ وجہ وہ روشانے تھی۔ وہ اچھی لڑکی نہیں تھی اس کی مشکوک حرکات کی بدولت اس نے بہت ہی جلد اس سے دوستی ختم کر لی تھی اور تقریباً دو ماہ بعد ہی ایک دن اس نے صبح کے اخبار میں خبر پڑھی کہ ایک لڑکی جو معصوم اور بھولی بھالی لڑکیوں کو ورغلا کر اغوا کر لیتی تھی۔ اپنے پورے گروپ

مصیبت گرفتار ہو گئی۔ پیچھے، روشانے کی تصویر تھی۔ اخبار میں اس کے متعلق اور بھی بہت کچھ لکھا ہوا تھا مگر اس نے پڑھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ اپنے ذہن سے روشانے کا خیال تک جھٹک ڈالا تھا کہ اب دوبارہ وہ واحق جہانگیر کی صورت میں اس کی سوچوں میں در آئی تھی۔

وہ تو شروع سے ہی سیدھی سادی تھی۔ بقول سب کے معصوم احمق، پاگل اور بیوقوف وینزے کو ان سب القابات سے چڑ نہیں تھی۔ بس وہ بچپن سے ہی ایسی تھی۔ بزدل اور کم ہمت سی۔ آج جو کچھ بھی ہوا تھا وہ شاید بزدلی کی وجہ سے ہی ہوا تھا۔ ابھی وہ کچھ اور بھی سوچ رہی تھی کہ بڑی امی کی پکار نے اسے حواسوں میں لا پٹخا۔ وہ واحق سے مخاطب تھیں۔

"یہاں لیٹ گئے ہو تم۔ یہ وقت ہے سونے کا۔ اٹھو یہاں سے کم از کم اپنا حلیہ ہی درست کر کے کمرے سے نکلتے۔ اب بچے تو نہیں ہو کہ تمہیں بات بے بات سمجھانا پڑے۔" امی جب کچن سے نکلیں تو نظر سیدھی تخت پر آڑھے ترچھے لیٹے واحق پر جا پڑی۔ ٹراؤزر اور بنیان میں اس کا سڈول جسم بہت نمایاں ہو رہا تھا۔ بنیان میں سے سینے کے ساتھ ساتھ ورزشی بازو اور کندھے صاف عیاں تھے۔ ان کے ہونٹوں سے بے اختیار "ماشاء اللہ" نکلا۔ ان کا واحق لاکھوں میں ایک تھا۔ ہیرا صفت شکل و صورت کا مالک۔ حسن، جوانی، نیک کرداری، نیک سیرتی، خوش اخلاقی و خوش گفتاری جیسی سنہری صفات بدرجہ اتم اس میں موجود تھیں۔

امی کا سر فخر سے بلند ہوا تو "الحمدللہ" کہتے ہوئے انہوں نے بے اختیار نظریں پھیر لیں، اس ڈر سے کہ کہیں ان کے لاڈلے کو ان کی اپنی ہی نظر نہ لگ جائے۔

"واحق! اٹھا نہیں...... کیا کہہ رہی ہوں میں؟" اسی طرح غافل پڑے واحق کو انہوں نے پھر ٹوکا۔ واحق کے وجود میں بجلی سی حرکت ہوئی۔ آنکھیں کھول کر دو انگلیوں سے ملتے ہوئے دیکھا تو کچن سے آواز آئی تھی۔ امی کچن سے باہر دیوار کے ساتھ رکھی کرسی پر بیٹھے پلیٹ میں موجود ریزہ صاف کر رہی تھیں۔ سو واحق نے دوبارہ سے آنکھیں بند کر لیں۔

"واحق...... جانی ہوں میں تمہاری دادی اماں کو ورنہ...... اٹھ جاؤ......" کچن میں چچی بیگم کے ساتھ بیٹھی وینزے نے اٹھ کر بڑی امی کی آواز پہ پردہ اور دروازے سے سر باہر نکال کر باہر جھانکا۔ سیدھی نظر واحق پر جا پڑی۔

عین اسی لمحے ماں کی پکار پر اس نے بھی آنکھیں کھولی تھیں۔ نظروں کا سیدھا رخ وینزے کی ہی طرف تھا۔ چونکہ تخت اور کچن کا درمیانی فاصلہ باقی کمروں کی نسبت بہت کم تھا اسی لیے یہ منظر بہت واضح تھا۔ سرخ ڈوروں والی موٹی موٹی خمار آلود نیند سے بھری آنکھیں جب وینزے کی جانب اٹھیں تو چہرے پہ ان دیکھی سی مزید چمک چھلکیں۔ پھر وہ کہنی کے بل تھوڑا سا اٹھ کر تکیے کے سہارے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔ اس سارے عمل کے درمیان بھی اس نے اپنی نظریں بدستور وینزے پر گاڑھے رکھیں۔ وینزے پہلے تو اس کے یوں بے دھڑک بغیر پلکیں جھپکائے انہماک سے یک ٹک دیکھنے پر کچھ جھنجلائی پھر جیسے اس کے جیسے پر کوفت کا شکار ہوئی واپس کچن میں گم ہو گئی۔ واحق کے متعلق دل میں موجود ناپسندیدگی و ناگواری میں مزید اضافہ ہوا۔

"واحق بیٹا! شاباش اٹھو، کمرے میں جا کر کپڑے چینج کرو۔ یوں مت لیٹو۔"

وینزے کے سر اندر کر لینے کے بعد واحق نے بھی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں گھنے بالوں میں پھنسا کر اس نے اپنے بالوں کو مٹھیوں میں قید کیا اور پھر ایک جھٹکا دیا۔ امی کی آواز تو جیسے سنائی ہی نہیں دے رہی تھی۔ ذہن کہیں اور الجھا ہوا تھا۔

"کیا بات ہے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟ اتنے سست کیوں ہو رہے ہو؟" واحق پر اپنی کسی بھی پکار کا اثر نہ دیکھ کر امی اس کے پاس تخت پر آ بیٹھیں۔ دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھاما تو اس نے دھیرے سے مسکراتے آنکھیں وا کر دیں۔

"بالکل ٹھیک ہوں۔ بہت دنوں بعد آپ کی آواز سن رہا ہوں۔ ایمان سے بہت اچھی لگ رہی ہے آپ کی یہ آواز، بار بار

میرا نام پکارتی ہوئی۔" واحق نے اپنا سر ان کی گود میں رکھ دیا تھا۔ امی بے اختیار مسکرا دیں۔ جھک کر اس کی پیشانی پر محبت بھری کارروائی کی۔ لاڈ سے سارے بال بکھرا دیے۔

"جیتے رہو۔" آنکھوں میں ہزاروں ستاروں کی چمک لیے دعا دی۔ محبت سے چور بھرپور لہجہ تھا۔ وینزے جو کچن سے نکل کر اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔ راستے میں ماں بیٹے کو یوں لاڈ کرتے کرواتے دیکھ کر رک گئی۔

"میں روز آپ کو یاد کرتا تھا۔ بہت یاد آتی تھی سب گھر والوں کی۔"

وینزے کو یوں لگا جیسے وہ کوئی چھوٹا سا بچہ ہو اور اپنی ماں سے دوری پر ملنے والی بے قراری اسے ستا رہا ہو۔

"جبھی تو اتنے ماہ گھر سے باہر رہ لیا۔" نہ چاہتے ہوئے بھی شکوہ ان کے لبوں سے ادا ہو گیا۔ واحق نے مسکراتے ہوئے آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا پھر ہاتھ تھام کر ہونٹوں سے لگا لیا۔

"اللہ کی قسم! میں اس محبت بھری آغوش کو ترس گیا تھا۔" کتنا سچا لہجہ تھا امی نہال ہو گئیں۔ وینزے کے لیے یہ محبت بھرے جملے، اپنائیت بھرے شکوے، اور مان و الفت سے لبریز مظاہرے سب نئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں آن واحد میں اتنی حسرت آسمائی کہ وہ بغیر پلکیں جھپکائے دونوں کو دیکھے گئی۔

"سچ سچ بتائیں آپ نے بھی مجھے یاد کیا تھا۔ مجھ سے زیادہ؟" بہت شریر انداز تھا۔ خاصا چھیڑنے والا، وہ ہنس دیں۔

وینزے بس دیکھتی رہی۔

"ماں کی محبت کو تولا نہیں جاتا۔ اگر کہیں دنیا میں کوئی ایسا میزان ہے جو ماں کی محبتوں، اس کی شدتوں اور بے قراریوں اور بے چینیوں کو تولتا ہے تو تم پھر بھی میری محبت، بے قراری اور شدت کو کبھی قبول نہ کر سکو گے۔ میری ایک رات ہی تمہاری سب شدتوں پر حاوی ہے۔ جو ان چند ماہ میں میرے دل میں تمہارے لیے شدتیں بے چینیاں بے قراریاں موجود رہی تھیں۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر تمہاری سلامتی و کامیابی کے لیے دعا کرتی رہی تھی۔" آخر میں ان کی شدتوں کی گواہ محبت سے لبریز آواز آنسوؤں سے رندھ گئی تھی۔

"مجھے آپ کی بے قراری کا اندازہ ہے۔ میں جانتا ہوں آپ کتنی دعائیں مانگتی ہیں۔ یہ آپ کی دعاؤں کا ہی تو ثمر ہے کہ کامیابی و کامرانی کے ساتھ واپس لوٹ آیا ہوں۔ بحفاظت۔ اگر مجھے فرض کی ادائیگی کا احساس نہ ہو تو ساری عمر یونہی آپ کے قدموں تلے محبت بھری اس آغوش میں سر رکھے گزار دوں۔" بہت سنجیدگی و مضبوطی سے کہتے اس نے یونہی نظر اٹھائی تو ماں کے دائیں طرف کچھ قدموں کے فاصلے پر کھڑی وینزے پر پڑ گئی۔ وہ بہت ہی دونوں کو نہایت انہماک سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے دیکھ لینے پر بھی اس نے پہلے کی طرح ناگواری سے نہ ہی رخ موڑا تھا اور نہ ہی پلکیں جھپکی تھیں۔

"امی! مجھے تو یہ لڑکی ہوش و حواس سے بیگانہ، کچھ پاگل پاگل سی لگتی ہے۔ بائی دا وے یہ ہیں کون......؟" بہت سرگوشیانہ انداز تھا۔ امی نے فوراً وینزے کو دیکھا۔ وہ یونہی ایستادہ تھی۔ وہ مسکرا دیں۔ وہ اچھی طرح جانتی تھیں۔

وینزے کی حسرتیں! اس کی محبتیں! حساس طبیعت، اور مجبوریاں۔

وقت اسے ان کے گھر پر لے آیا تھا اور ان سب نے اسی کھلے دل سے قبول کیا تھا۔ بے پناہ محبت دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ کانچ سی لڑکی نگینے کی طرح شفاف، نازک اور حساس تھی۔ اسی لیے سب مل کر اسے سنبھال رہے تھے، ایک قیمتی زیور کی طرح، اس ڈر سے کہ کوئی چھین کر نہ لے جائے۔

امی نے واحق کے سر کے نیچے دھرا اپنا ہاتھ نکال کر وا کر دیا۔ وہ بھی چونک گئی۔ پہلے تو جھجکی، پھر آہستہ آہستہ چلتی ان کے کھلے بازوؤں میں آسمائی۔ تخت پر یوں بیٹھی کہ اب اس کی گھنے سیاہ ریشمی بالوں والی چٹیا واحق کے سینے سے لپٹنے لگی تھی۔ وہ اس کے بہت قریب تھی۔ شاید دل کی دھڑکنوں کو چھیڑ رہی تھی۔ وہ مبہوت سا اس کانچ کے پیکر کو دیکھے گیا۔ کسی پرفیوم کی خوشبو تھی، اس کے وجود

سے اتھل وتھل ازحد حسین تھی یا پھر اچانک بیدار ہونے والے احساس کی ڈور سے لپٹا خوبصورت معطر ہوا کا تیز ایک جھونکا تھا جو واصق کے اندر اترتا، اس کا تن من بھگوتا چلا گیا۔ اپنے سر کو بے خیالی میں جنبش دیتے ایک گہری سانس لیتے وہ اٹھ بیٹھا۔

"یہ ونیزے ہے۔ تمہاری دادی اماں کی بھانجی کی نند۔" امی نے بہت محبت بھری نظروں سے اسے دیکھتے بتایا۔ "پہلی دفعہ ہمارے گھر آئی ہے ڈیڑھ ماہ سے یہیں رہ رہی ہے اور کچھ عرصہ مزید یہاں رہے گی۔ تمہیں جانتی نہیں تھی نا اس لیے صبح تمہیں مشکوک سمجھتے ہوئے بے ہوش ہوگئی تھی۔ بہت کمزور دل کی مالک ہے یہ میری بیٹی۔ بالکل بھولی بھالی، سیدھی سادی۔" کتنے خلوص سے وہ اسے بتا رہی تھیں۔

واصق اس "سیدھی سادی" بیٹی کا رخ روشن دیکھنا چاہتا تھا جو ابھی ابھی اس کے دل کے تاروں کو چھیڑ گئی تھی۔ بے خیالی میں، بے دھیانی میں وہ کبھی نہ تسخیر ہونے والا مضبوط ڈیل ڈول کا مالک تسخیر ہو گیا تھا۔ اسے صرف ہوا کے ایک جھونکے نے فتح کرلیا تھا اور وہ جھونکا ونیزے ہی تھی۔ مگر افسوس وہ امی کے سینے میں اسی طرح منہ دیئے ہوئے تھی کہ امی کا دوپٹہ اس کا چہرہ ڈھانپے دے رہا تھا۔

واصق نے ایک گہرا سانس کھینچتے ہوئے، اپنی مٹھی میں بند اس کی چٹیا چھوڑی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"میرا خیال ہے اب مجھے اپنے کمرے کی طرف چلنا چاہیے۔ لگتا ہے اب میرے حصے کا پیار امی اب انہیں دیا کریں گی۔" سینے پر بازو لپیٹے اس نے صرف امی کا چہرہ دیکھنے کے لیے امی کو متوجہ کیا تھا۔ ردعمل اس کی توقع کے عین مطابق تھا۔ نہ صرف امی نے خفگی سے اسے دیکھا بلکہ ونیزے بھی ان کے سینے سے سر اٹھا کر قدرے حیرانگی سے اسے دیکھنے لگی۔

"بری بات بیٹا! یوں نہیں کہتے۔ ہر انسان اپنے حصے کی ہی محبتیں وصول کرتا ہے۔ یہ میری بیٹی ہے، پیاری سی، اور ماں کے لیے اپنے سب بچے ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔"

"آئندہ ایسی بات مت کہنا...... ورنہ......" بہت سنجیدہ انداز میں کہتے انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہ مسکراتے ان کی طرف بڑھا۔ امی کے کندھوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر ونیزے کی آنکھوں میں دیکھتے کہنے لگا۔

"امی جان! مذاق کر رہا تھا۔ اگر یہ آپ کی بیٹی ہیں تو اس ناتے ہماری بھی کچھ لگتی ہیں۔ جب ہماری ماں کا دل محبتیں بانٹنے میں اتنا وسیع ہے تو ہم تو دل و جان سے ان کے ہوئے۔ کیوں سچ کہہ رہا ہوں میں؟"

بظاہر مذاق کے رنگ میں کہتے وہ امی کو مطمئن کر رہا تھا جبکہ نظریں معنی خیز انداز میں اس کی طرف بے باکی سے دیکھ رہی تھیں۔ ونیزے کے اندر خطرے کی گھنٹی بجا گئی تھیں۔ وہ ان نظروں کی تاب نہ لا سکی تھی ایکدم نروس ہوتے ہوئے پلکیں جھکا گئی تھی۔ واصق اس کی اس ادا پر بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑا تھا۔ وہ مزید سر جھکا گئی۔

"امی آپ کی بیٹی تو اچھی خاصی ڈرپوک ہیں۔ چڑیا جتنا دل ہے ان کا۔ صبح خوامخواہ مجھے چور سمجھ کر بے ہوش ہوتے ہوتے میرے...... "وہ بات، ادھوری چھوڑ کر پھر ہنس پڑا تھا۔ ونیزے نے تڑپ کر سر اٹھا کر اسے تنبیہی انداز میں دیکھا تو وہ محظوظ ہوتا مسکرا رہا تھا۔

واصق کے ہونٹوں پر رقصاں دلآویز معنی خیز مسکراہٹ کا مفہوم وہ بخوبی سمجھ سکتی تھی۔ ہاتھ پسینے سے تر ہو گئے۔ سینے کی دیواروں میں مقید دل اتنی زور سے دھڑکا کہ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ "واصق مت تنگ کرو میری بیٹی کو"۔ اس کے یوں گھبرا اٹھنے پر امی نے واصق کو ٹوکا۔

"بخدا امی حضور! میں تنگ تو نہیں کر رہا۔ اتنی بھولی بھالی، سیدھی سادی، معصوم، صورت والے لوگوں کو کون کافر ہے تنگ کرے گا۔ جو بھی ایسا کرے گا گناہ گار ٹھہرے گا۔" وہ اسے چھیڑنے سے اب بھی باز نہیں آیا تھا۔

"واصق......" امی نے دم بدم سرخ ہوتے ونیزے کے چہرے کو دیکھتے اسے پھر ٹوکا تو وہ ہنستا ہوا اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

"برا مت ماننا ونیزے! وہ جو کچھ بھی کہتا ہے صرف مذاقاً کہتا ہے۔ دل کا بہت اچھا اور نرم ہے۔ بہت محبت کرنے والا ہے میرا بیٹا۔ دیکھنا بہت جلد تم دونوں آپس میں گھل مل جاؤ گے۔"

"اللہ نہ کرے۔" امی بہت اپنائیت سے اپنے بیٹے کی خوبیاں گنوا رہی تھیں اس نے دل کر سوچا۔ "میں کیوں اس مشکوک کردار والے بندے سے گھلنے ملنے لگی۔ بہت اچھی طرح میں اسے سمجھ گئی ہوں۔ نظر باز اور فلرٹ انسان۔" کسی کے متعلق رائے قائم کرنے میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ اب بھی دل ہی دل میں کہہ رہی تھی مگر بظاہر مسکراتی رہی۔

❋ ❋ ❋

ماما پاپا پرانے ہی سے تعلق رکھتے تھے۔ ونیزے اور امجد صرف دو ہی بہن بھائی تھے۔ چھ سال قبل ماما کی ڈیتھ ہوگئی تو خود کو بہت اکیلا محسوس کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ ان کی صحت بھی گرنے لگی۔ اس کے باوجود انہیں اپنے بچوں کی فکر تھی۔ امجد بھائی جب ایم بی اے کے بعد وطن واپس ہوئے تو پاپا نے ان کی شادی اپنے دوست کی بیٹی صبیحہ سے کردی۔ صبیحہ بھابی بہت ہی اچھی بیوی اور بہو تھیں۔ امجد بھائی اور پاپا جواد حسن ملکر بزنس چلا رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ان کا بزنس دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرتا جا رہا تھا کہ اچانک نہ صرف ان کے گھر بلکہ بزنس کو بھی کسی کی نظر لگ گئی۔ محبوب رحمانی جو کہ بزنس کی دنیا کی اہم شخصیت تھا، نہایت مکار چالباز اور عیار شخص واقع ہوا تھا۔ اس کی اچانک جواد حسن سے دوستی ہوگئی اور پھر وہ ان کے بزنس میں پارٹنر بننے کے لیے اصرار کرنے لگا۔ پاپا کو مزید ترقی کے سہانے خواب دکھا کر آخر کار اس نے پاپا کو شراکت داری پر آمادہ کر ہی لیا۔

پاپا جو بہت سلجھے ہوئے نفیس طبیعت کے مالک، بردبار انسان تھے، وہ محبوب رحمانی کی چالبازیوں کو سمجھ نہ سکے۔ پہلے اسے بزنس میں شامل کیا بعد میں گھریلو سطح پر تعلقات استوار ہونے لگے۔ محبوب رحمانی نے دو شادیاں کر رکھی تھیں ایک بیوی کا انتقال ہو چکا تھا اور دوسری کو اس نے خود طلاق دے دی تھی۔ کل چار بچے تھے۔ سب سے بڑا اجنار ونیزے سے صرف ایک سال ہی چھوٹا تھا۔ نجانے اس مکار شخص نے پاپا پر کونسا ایسا سحر پڑھ کر پھونکا تھا کہ پاپا کو اس کے علاوہ دنیا میں کوئی اور دکھائی ہی نہیں دیتا تھا۔ امجد بھائی اکثر انہیں سمجھانے کی کوشش کرتے تو وہ ہر بار انہیں "ناتجربہ کار" کہہ کر ٹال جاتے تھے۔

اصل طوفان تو تب آیا تھا جب اس نے ونیزے کو دیکھا اور دل ہار گیا۔ ونیزے جو اس کے بیٹے سے صرف ایک سال ہی بڑی تھی۔ نہایت معصوم، سیدھی سادی لڑکی اسے کہاں سے کہاں تک پہنچا سکتی تھی، اس نے پاپا سے ونیزے کے لیے بات کی۔ شروع میں تو پاپا نے صاف انکار کر دیا پھر اس کی چالاکیوں اور سمجھانے سے کشمکش و پیچ میں پڑ گئے۔ سوچنے کے لیے کچھ وقت مانگا۔ اس دوران تک محبوب رحمانی ان کی اس قدر برین واشنگ کر چکا تھا کہ پاپا اس مکار شخص کی عیار باتوں میں پھنس کر اسے ہاں کر بیٹھے۔

ونیزے کی تو حالت ہی بری تھی یہ جان کر کہ یہ پاپا کا اپنا ذاتی فیصلہ ہے۔ امجد بھائی نے بہت سمجھایا، ہر طرح سے پاپا کو قائل کرنے کی کوشش کی۔ دونوں کے مینٹل لیول اور عمروں کے ڈفرینس کو واضح کیا مگر سب بے سود تھا۔ پاپا کی آنکھوں پر محبوب رحمانی کے نام کی جو پٹی چڑھی ہوئی تھی اس کی موجودگی میں انہیں اپنی معصوم و بھولی بھالی بیٹی اور فرمانبردار سا بیٹا بھی نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ اگر انہیں کسی کی پرواتھی تو وہ محبوب رحمانی تھا۔ بزنس کو ڈبل کرنے کی فکر تھی۔ اس کے پاپا اتنے مادہ پرست انسان نہیں تھے مگر محبوب رحمانی کی محبت نے انہیں ایسا بنا دیا تھا۔

پاپا نے ونیزے کی شادی کی بی کام کر لینے تک مہلت مانگی تو محبوب رحمانی نے بخوشی دے دی اور اس دوران تک وہ نہ

صرف بزنس پر بلکہ وتیزے کے حوالے سے بھی پاپا کے گرد بھی خاصا جال کس چکا تھا، یوں کہ فرار کسی بھی طور پر ممکن نہ تھی۔ وتیزے کے بی کام کے بعد جیسے پاپا نے شادی کی بات کی۔ امجد بھائی ٹال گئے اور چند ماہ کی مہلت مانگی۔ امجد بھائی ان چند ماہ میں وتیزے کے بچاؤ کے لیے کوئی نہ کوئی مضبوط پناہ گاہ تلاش کر لینا چاہتے تھے، مگر محبوب رحمانی پاپا کے ذریعے ان پر دباؤ ڈالنے لگا اور یوں امجد بھائی کو وتیزے کے بچاؤ کی تمام راہیں تاریکی کی گہری بیب میں لپٹی دکھائی دیں۔ جب حالات ان کے کنٹرول سے باہر ہو گئے، محبوب رحمانی کا دباؤ مزید بڑھا تو انہوں نے رشتے سے صاف انکار کر دیا۔ جہاں پاپا امجد بھائی سے ناراض ہوئے وہیں محبوب رحمانی نے کمال ہوشیاری و چالاکی سے ان کے بزنس کے ۵۰ فیصد شیئرز اپنے نام منتقل کروا لئے۔ یہ سب کچھ اس قدر صفائی اور ہوشیاری سے ہوا کہ پاپا جیسے ذہین شخص اس کھلی دھوکہ دہی پر صرف ہاتھ ملتے رہ گئے۔

محبوب رحمانی نے شیئرز نام کروانے سے پہلے پاپا سے کچھ سادہ کاغذات پر دستخط کروا لئے تھے اور پھر ان کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کیا تھا۔ آدھا بزنس محبوب رحمانی کے قبضے میں چلا گیا تھا پاپا نے جب محبوب رحمانی سے وتیزے کی شادی سے انکار کر دیا تو اس نے پاپا کا دستخط شدہ ایک اسٹام پیپر پاپا کے سامنے دھر رکھا۔

جس کے مطابق جواد حسن وتیزے کی شادی اس سے کرنے پر راضی تھے، بلکہ اگر خدانخواستہ انہیں کچھ ہو جاتا تو ان کے بعد وتیزے سے کبھی بھی شادی کرنے کا [illegible] وتیزے کی شادی کے سلسلے میں محمد جواد حسن کو کوئی بھی اعتراض کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہوگا۔ پاپا کے لئے محبوب رحمانی کا یہ نیا روپ بہت ناقابل برداشت اور غیر متوقع تھا۔ ان کی اپنی کم عقلی اور غلطیوں کی وجہ سے نہ صرف آدھا بزنس ان کے ہاتھ سے نکل گیا تھا بلکہ اب بیٹی کا مستقبل بھی خطرے میں تھا۔ انہوں نے قانونی چارہ جوئی کر کے محبوب رحمانی پر غبن اور دھوکہ دہی کا الزام لگا کر مقدمہ دائر کر دیا۔

یہ وتیزے اور امجد بھائی پر خدا کی طرف سے شدید ایک آزمائش ہی تھی جو پہلی پیشی کے بعد ہی پاپا ہارٹ اٹیک ہونے کی وجہ سے انتقال کر گئے تھے۔ ان کی اس قدر اچانک موت پر دونوں تقریباً ایک ماہ تک سنبھل ہی نہیں سکے تھے اور محبوب رحمانی نے اس ایک سانحہ کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے حالات اپنے حق میں اس طرح موافق کئے کہ امجد بھائی دیکھتے ہی رہ گئے۔ بزنس کے بعد اب اس کا اگلا ٹارگٹ وتیزے تھی۔ محبوب رحمانی نے بھیا کو ایک ماہ کے اندر اندر وتیزے کی شادی کر دینے کی پرزور دھمکی دی اور ساتھ میں یہ بھی کہہ دیا کہ اگر امجد بھیا نہ مانے تو وہ کسی اور طریقے سے وتیزے کو حاصل کر لے گا۔

جہانگیر انکل صبیحہ بھابی کے کزن تھے۔ یہ لوگ اسی شہر میں رہتے تھے۔ صبیحہ بھابی اکثر اپنی خالہ کے ہاں جاتی رہتی تھیں البتہ وہ خود ان لوگوں سے کبھی بھی نہیں ملی تھی۔ صبیحہ بھابی کو یہاں انہیں جب حالات کا علم ہوا تو انہوں نے ہی بھیا کو آفر کی کہ وہ کچھ عرصہ وتیزے کو ان کے ہاں چھپا دیں۔ اس دوران امجد بھیا وہ خود کوئی اچھا سا رشتہ دیکھ کر وتیزے کی شادی کر دیں گے اور محبوب رحمانی اور باقی سب لوگوں کو یہی بتایا جائے کہ وتیزے اس شادی پر راضی نہیں تھی اسی لئے چپ چاپ کہیں چلی گئی ہے اور کہاں گئی ہے انہیں بالکل بھی علم نہیں۔ جب وتیزے کی شادی ہو جائے گی تو حالات کافی سازگار ہو جائیں گے بعد میں محبوب رحمانی کچھ بھی نہیں کر سکے گا۔

بھیا اور بھابی کو ان کی تجویز اچھی لگی تھی اگلے ہی دن وہ وتیزے کو ان کے ہاں چھوڑ گئے تھے۔ اب اسے ڈیڑھ ماہ ہو گیا تھا، تب وہ ان لوگوں کے گھر رہ رہی تھی اور اسے تب تک یہیں رہنا تھا جب تک اس کے لئے کسی معقول لڑکے کا بندوبست نہیں ہو جاتا۔

بڑی امی کی تو یہی خواہش تھی کہ وہ وتیزے کو اپنے واصق کے لئے مانگ لیں۔ اس خواہش کا اظہار انہوں نے اپنی ساس دادو جانی سے بھی کر دیا تھا مگر زبان سے کچھ کہتے وہ لوگ ڈرتے تھے۔ پہلی بات تو واصق کی تھی۔ امی کا خیال تھا کہ وہ شاید نہ مانے اور دوسری وجہ امجد جواد حسن کا اسٹیٹس تھا۔ وہ، محمد جواد حسن کے اسٹیٹس سے بہت کم تھے۔ پھر وتیزے خود بھی کوئی معمولی لڑکی نہ تھی۔ چاند

کا ٹکڑا تھی۔ شہزادیوں کی طرح پلی بڑھی تھی۔ عیش و عشرت میں اس نے زندگی گزاری تھی۔ اب بھی اس کے نام کروڑوں کی جائیداد تھی۔ وہ وتیزے اور امجد جواد حسن کے لیول کے تو نہیں تھے مگر خلوص، وجاہت اور محبتیں بانٹنے میں ان سے کم نہیں تھے۔ اسی لئے ان سب لوگوں کے دل کی خواہش فی الحال دل ہی میں تھی۔ صبیحہ امجد بھائی اکثر رات کو وتیزے سے ملنے آتے رہتے تھے۔ جبکہ وتیزے اس ڈیڑھ ماہ کے عرصے میں ایک دفعہ بھی ان سے ملنے ان کے گھر نہیں گئی تھی۔

یہاں آ کر وتیزے نے بالکل وہی انداز اختیار کر لئے تھے جو اس گھر کے مکینوں کے تھے۔ نہ کسی بات پر ناک بھوں چڑھائی، نہ کوئی تنقید نہ تبصرہ۔ بہت سے کوئی کام کرنا نہیں آتا تھا۔ بچپن سے لے کر اب تک وہ نوکروں کی فوج کے درمیان جوان ہوئی تھی۔ پانی پینے تک کے لئے بھی نوکر کو آواز دینا پڑتی تھی مگر یہاں آ کر وہ بصد اصرار سب کے منع کرنے کے باوجود ضد کر کے کسی نہ کسی کام میں ہاتھ الجھا لیتی تھی۔ خاص طور پر جب چچی یا بڑی امی میں سے کوئی کچن کا کام کر رہا ہوتا تھا تو کبھی سلاد بنا دیتی تھی کبھی دال چاول صاف کر دیتی تھی۔ سب خوشحال کھاتے پیتے گھرانے میں جب عام فیملیوں کی طرح پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی وہ بخوشی رہ رہی تھی صرف اس لئے کہ یہاں اسے ہر کسی سے بھرپور محبت اور غیر معمولی عزت ملی تھی۔

ماما پاپا ان دونوں بہن بھائیوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ کبھی کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دی تھی۔ کبھی آنکھ میں آنسو نہیں آنے دیا تھا۔ منہ سے نکلے ہر چیز حاضر ہوتی تھی مگر ان کی وہ محبت تقید اور نگہداشت [illegible] کے تابع ہوتی تھی۔ تکلف میں لپٹی ہوئی۔ اس کے اندر شروع سے ہی یہ تشنگی رہی تھی کہ وہ [illegible] پیار کرتے دیکھنے کی خواہش رکھتی تھی۔ ماما پاپا کی محبت دادی اماں، بڑی امی اور چچی جان کی محبت جیسی نہیں ہوتی تھی۔ [illegible] کسی چیز کی [illegible] تو بس کہہ کر وصول کر لینا۔ اسے اب تک رہا تھا وہ احساس نہیں تھا، احساس کیا ہوتا ہے؟ وہ اس گھر میں قدم رکھتے ہی محسوس ہوا تھا۔ خالص محبت، اپنائیت اور خلوص و توجہ کسے کہتے ہیں اس چھت تلے ڈیڑھ ماہ گزار کر وہ جان گئی تھی۔

بڑے ابو جہانگیر احمد کی ایک بیٹی اور تین بیٹے تھے۔ واصق سب سے بڑا بیٹا تھا۔ اس کے بعد جویریہ تھی، جس کی شادی پشاور اپنے ماموں زاد کے ساتھ ہو چکی تھی۔ جویریہ کے بعد مہران اور خرم تھے۔ چھوٹے چچا جان کے پانچ بچے تھے۔ بڑے شہروز احمد تھے اس کے بعد بالترتیب وجیہہ اور سمعیہ تھیں۔ سمعیہ کے بعد دو بھائی، ہارون اور [illegible] تھے۔

واصق کیا کرتا ہے، اس سارے عرصے میں اسے قطعی علم نہ تھا۔ بلکہ وہ ڈیڑھ ماہ سے یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ بڑی امی کے واصق نامی کوئی صاحبزادے بھی ہیں۔ البتہ شہروز احمد کسی ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کرتا تھا۔ بڑے ابو اور چچا جان دونوں بھائی مل کر مشترکہ کاروبار کرتے تھے۔ ریشمی کپڑا تیار کرنے کے پانچ چھ کارخانے تھے۔ اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی۔ بہت خوشحال و خوش اطوار ملنسار گھرانہ تھا۔ ابھی تو سوائے جویریہ کے، کسی کی بھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ یہاں رہتے ہوئے اس نے محسوس کیا تھا کہ مہران کا جھکاؤ وجیہہ کی طرف ہے۔ شاید بڑوں میں بھی کوئی بات طے تھے۔ البتہ شہروز اپنی کسی خالہ زاد میں انٹرسٹڈ تھا یہ بھی اسے جویریہ سے ہی علم ہوا تھا۔ جبکہ باقی سب ابھی پڑھ رہے تھے۔ ماسوائے واصق کے وہ باقی سب سے، اچھی خاصی گھل مل چکی تھی۔ سب اسے بہن کا درجہ دیتے تھے۔ محبت اپنائیت سے پیش آتے تھے۔ وہ اسی پر شاکر تھی۔

* * *

کافی دن ہو گئے تھے اور بھیا بھابی اس سے ملنے نہیں آئے تھے۔ اس کا اپنا گھر سے باہر نکلنا کسی خطرے سے کم نہیں تھا۔ کہیں آ جا بھی نہیں سکتی تھی۔ بھیا بھابی سے ہی ساری امیدیں وابستہ تھیں۔ مگر اب اس سارے ہفتے میں وہ بھی نہیں آئے تھے۔ وہ جو ان کی آمد کی شدت سے منتظر تھی اس درجہ تاخیر سے اندر ہی اندر پریشان ہو گئی۔ کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ ان لوگوں نے اسے

اتنی محبت سے اپنے گھر میں جگہ دے رکھی تھی پھر کیا کم تھا کہ وہ مزید انہیں پریشان کرنے بیٹھ جاتی۔ وہ خود ہی اندر ہی اندر کڑھتی رہی۔

سب اپنے اپنے معمول پر جا چکے تھے۔ گھر میں صرف پانچوں خواتین تھیں۔ دادی اماں بشیراں (کام والی ماسی) سے کام کروا کرا اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئی تھیں۔ چھوٹی چچی کی کسی بہن کا اپینڈکس کا آپریشن ہوا تھا۔ وہ اور بڑی امی ان کی عیادت کو جانے کی تیاریوں میں لگی ہوئی تھیں۔ وجیہ کا پرسوں ٹیسٹ تھا تو آج اس نے کالج سے چھٹی کی تھی۔ اور وہ فارغ ادھر سے ادھر چکر لگاتے بور ہو رہی تھی۔ اپنے گھر میں بہت زیادہ سوشل نہیں تھی مگر اتنی بھی قدامت پرست نہیں تھی کہ اپنے گھر کی چار دیواری میں مقید ہو کر زندگی گزار دیتی۔

چھوٹی چچی اور امی کے چلے جانے کے بعد وہ وجیہ کے پاس کمرے میں آ کر لیٹ گئی۔

"کیا بات ہے آپی ... کچھ پریشان ہیں؟" اسے مسلسل ایک ہی نقطے کو گھورتے دیکھ کر وجیہ نے کتاب بند کر دی اور اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

"مجھے بھلا کیا پریشانی ہونا ہے۔ میں تو خود ایک پریشانی ہوں" انتہائی دل گرفتگی و یاسیت سے کہتے اس نے کروٹ بدلی تو وجیہ نے فوراً اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"گھر والے یاد آ رہے ہیں؟" بہت محبت سے پوچھا تو اس نے خفیف سا سر ہلا دیا۔

"تو فون کر لیں۔" اس نے معقول مشورہ دیا۔

"ابھی سے اب فون کرنے [illegible] کی تک [illegible]"

"چلیں کوئی بات نہیں۔ ایک دو دن میں وہ دونوں [illegible] جائیں گے۔" اس نے ونیزے کو تسلی دی۔

"بابا جان کب [illegible] ... نہ دیں گے" دل کی صدا لبوں پر آئی تو ساتھ ہی آنکھوں سے آنسو بھی مچل گئے۔

"اللہ نہ کرے۔ انشاء اللہ وہ ایک دو دن میں چکر لگائیں گے۔ کہیں بزی ہوں گے ورنہ ضرور آتے۔ آپ پلیز ریلیکس ہو جائیں۔" محبت سے اس کے ملکی بالوں میں انگلیاں پھیرتے اس نے ہمت دلائی تو وہ سر ہلاتی خاموش ہو گئی۔ دل اندر ہی اندر بھرا جا رہا تھا۔

"آرام کریں بلکہ سو جائیں۔ میں چھت پر جا کر ٹیسٹ یاد کر لیتی ہوں۔"

ونیزے کا خیال کرتے محبت سے کہتے وہ اپنی کتابیں سمیٹ کر لائٹ آف کر کے دروازہ بھیڑ کر چلی گئی تو اس نے ایک گہری سانس لی۔ وہ تنہائی میں دل کھول کر رونا چاہتی تھی۔ اب یہاں کوئی نہیں تھا۔ اس نے اچھی طرح کمبل میں قلعہ بند ہو کر رونا شروع کر دیا تھا۔

"وجیہ ... وجیہ ... ارے کہاں ہو؟" ابھی اسے یہ پروگرام شروع کیے چند سیکنڈ بھی نہیں گزرے تھے جب کمرے کے قریب واثق کی آواز گونجی۔ وہ شاید دروازہ کھول کر اندر آ گیا تھا۔ وہ کمبل کے اندر ٹھٹک گئی۔ اپنی سانسیں تک روک لیں۔

"لو یہاں محترمہ استراحت فرما رہی ہیں اور میں سارے گھر میں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔" اسے چت بستر پر لیٹے سر تک کمبل تانے سوتے دیکھ کر وہ با آواز بلند بڑبڑایا۔ ونیزے کو اپنے وجود میں سنسناہٹ سی ہوتی محسوس ہوئی۔

"وجیہ ایک منٹ میں اٹھو۔ میرا ایک کام کر دو۔" وہ اب بستر کے قریب آ گیا تھا۔ ونیزے نے جیسے ہی اتنے قریب سے اس کی آواز سنی تو سختی سے مٹھیوں میں کمبل جکڑ لیا۔

"وجیہ! بہری ہو گئی ہو کیا ... خدا کی پناہ ... جب بھی یہ لڑکی سوتی ہے، کسی بات کا ہوش نہیں رہتا۔ چاہے کوئی اس کے

سر پر کھڑا آوازیں لگاتا جان سے ہی گزر جائے۔" سخت جھنجلائی ہوئی آواز تھی۔ وہ بے حس و حرکت پڑی رہی۔

"وجیہ! اب کے واثق نے آگے بڑھ کر بستر پر گرتے ہوئے اس کے پاس جگہ پکڑی تو ونیزے کو اپنے حواس کی طرح اپنا دل بھی مردہ ہوتا محسوس ہوا۔

"وجیہا ..... اٹھو" واثق نے دونوں ہاتھوں سے کمبل پکڑ کر سختی سے کھینچا تھا۔ اگلا ہی لمحہ اس کے لئے حیرت کا تھا۔ کمبل میں سے وجیہ کے بجائے ونیزے کو برآمد ہوتے دیکھ کر وہ بدک کر کمبل چھوڑتا بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"آپ" وہ حیران تھا۔

ونیزے واثق سے اس حرکت کی توقع نہیں کر رہی تھی۔ ایک دم اٹھ کر اس نے ایک طرف دھرے اپنے دوپٹے کو گھسیٹا۔ نہایت ناگواری سے اسے دیکھ اور دوپٹہ کندھوں پر لپیٹا۔

"ایم سوری۔" وہ قدرے شرمندہ دو قدم مزید پیچھے ہٹا۔ ونیزے نے انتہائی بے بسی سے اپنے آنسوؤں سے بھیگے چہرے کو بے دردی سے خشک کیا۔

"رئیلی سوری۔ میں سمجھا وجیہ ہے۔" ونیزے کے سوجے ہوئے چہرے کو دیکھتے اس نے پھر ایک [illegible] ہی اندر ٹھٹکا۔ ونیزے کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ [illegible] فرما رہی ہے۔ وہ اپنی حرکت کو بھولے اس کی آنسو بھری آنکھوں [illegible] بے دردی سے دوپٹے سے ناک رگڑتے وہ سرخ [illegible] کی طرح [illegible] وہ کب سے رو رہی تھی۔ حیرت کے ساتھ ساتھ فکر مندی نے بھی گھیر [illegible]۔

"کیا بات ہے۔ آپ کیوں رو رہی ہیں؟" اتنا تو اسے یقین تھا کہ یہ آنسو [illegible] جب آنکھوں سے نہیں بہے تھے۔ وجہ اور تھی۔ وہ قطعی لاعلم تھا۔

ونیزے نے اس کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ دوپٹہ کندھوں پر سیٹ کرتے وہ بستر سے نیچے اتر گئی۔

"پلیز ونیزے [illegible] کیا ہوا [illegible] آئی مین ہیلپ [illegible]" اس کے آنسوؤں کے ساتھ ساتھ اپنا دل بھی پانی پانی ہوتا محسوس ہوا۔ وہ بہت خلوص دل سے فکر مندی سے کہہ رہا تھا۔ ونیزے نے مطلق دھیان نہ دیا۔ اسے صاف اگنور کیے وہ دروازے کی طرف لپکی مگر واثق کے ایکدم راستے میں آ جانے سے رک گئی۔ انتہائی ناگواری اور ناپسندیدگی سے اسے دیکھا جو اسے دو دن سے انتہائی ناقابل برداشت اور غیر مہذب لگ رہا تھا۔

"ونیزے ... [illegible] ..." فکر مندی بدستور واثق کی آواز میں موجود تھی۔

"میرا راستہ چھوڑیں۔" وہ دیوار کی طرح سامنے ایستادہ تھا۔ اس کی بات کے جواب میں وہ ایکدم غرائی۔ اب واثق کی نظروں میں الجھن بھی سمٹ آئی۔

"کیا کسی نے کچھ کہا ہے؟" ایک طرف ہٹنے کے بجائے وہ پوچھ رہا تھا۔ ونیزے کا دل چاہا کہ وہ یا تو سامنے کھڑے شخص کو شوٹ کر دے یا پھر اپنا سر دیوار پر دے مارے۔ سوہانِ روح بنتا جا رہا تھا یہ شخص۔

"پلیز، میں نے کہا نا کہ میرا راستہ چھوڑیں۔" وہ سختی سے کہہ گئی۔ واثق فوراً راستے سے ہٹا تھا۔ وہ ایک منٹ ضائع کیے بغیر دروازے کی طرف لپکی۔

"ایک منٹ ونیزے ..... اتنا تو بتا دیں ... رو کیوں رہی تھیں۔" اس سے پہلے کہ وہ کمرے سے باہر نکلتی اس نے پھر تیزی سے آگے بڑھ کر اس کا بازو تھاما۔

وینزے تو پوری جان سے کانپ گئی۔ اب تک کسی کے اندر اتنی جرأت نہیں ہوئی تھی کہ اسے انگلی سے بھی چھولے اور یہ شخص جب سے آیا تھا اسے مسلسل ناگواریوں اور برداشت کے سمندر میں دھکیلتا جا رہا تھا۔ آنکھیں پھاڑے واصق کو دیکھتے اس نے اپنا بازو اس کی گرفت سے ایک دم کھینچا۔

"شٹ اپ... حد میں رہو تم..." غصے سے برا حال ہو گیا تھا۔ خونخوار نظروں سے اسے گھورا۔

"مگر وینزے..." واصق نے کچھ کہنا چاہا تو اس نے انگلی اٹھا کر اسے روک دیا۔ پھر چبا چبا کر کہا۔

"میں بہت مختلف لڑکی ہوں۔ آئندہ میرا راستہ روکنے کی کوشش مت کرنا۔ میں کوئی گری پڑی لڑکی نہیں ہوں، نہ ہی کوئی روشانے ہوں۔ میں وینزے جواد حسن ہوں سن لیا تم نے۔ اور یہ اپنے دماغ میں بھی فیڈ کر لو۔" وہ اپنا سارا غصہ، ساری کوفت، سب انتہا ناپسندیدگی و ناگواری چند لفظوں میں اس پر انڈیل کر دروازے کی دہلیز پار کر گئی تھی۔ پیچھے تو صرف اس کے جملوں کی بازگشت رہ جاتی تھی۔

جو کچھ بھی ہوا تھا وہ لاشعوری یا نادانستگی میں ہی سرزد ہوا تھا۔ اس میں واصق کی اپنی کسی شعوری کوشش یا خواہش کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ پہلی ملاقات میں بھی وہ اسے مشکوک سمجھ کر یہ حرکت کر بیٹھا تھا۔ پھر سے وہ بے ہوش ہو گئی تو اپنی غلطی پر پشیمان بھی ہوا تھا۔ آج تو اس نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی تھی۔ ہوا وینزے کے آنسوؤں نے ڈسٹرب کر دیا تھا۔ اسی لیے بہت شائستگی سے سب احتیاطیں فراموش کیے اس سے رونے کی وجہ پوچھنا چاہتا تھا مگر وہ یوں کہہ جائے گی اندازہ نہ تھا۔ پتا نہیں وہ کیا کہہ گئی تھی کس روشانے کی بات کر گئی تھی اس کے ذہن میں کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ تو یہ اس کے دماغ میں کیا فیڈ کروانا چاہتی تھی۔ وہ اس کے جملوں پر جھنجلاتا کمرے سے باہر نکل آیا۔ صحن میں آیا تو وہ اسی طرح کرسی پر بیٹھی اپنے دونوں بازوؤں پر سر رکھے رو رہی تھی۔ وہ پھر ٹھٹک گیا اندر جھنجلاتا چاہا مگر پھر کچھ سوچ کر باہر جاتے جاتے واپس پلٹ گیا۔ اپنے کمرے میں آ کر اس نے انتہائی بیزاری و کوفت سے بستر پر پڑی شرٹ اٹھا کر گولہ بنا کر دیوار پر دے ماری۔ خود بھی منہ کے بل بستر پر گرا۔ اب کہیں بھی جانے کا موڈ نہیں رہا تھا۔ بری طرح ڈسٹرب ہو چکا تھا۔ بند پلکوں پر وینزے کے نام کی تختی لگ گئی تھی۔ بری طرح خود کو لعنت ملامت کر کے اس نے آنکھیں بھی میچ لیں۔ ہائے ری قسمت، آنکھوں کی اسکرین پر بھی پلکوں کی باڑ تھی، گویا وہ چاندنی سا عکس جھلملاتا ٹمٹماتا چلا آیا۔

نازک طرح دمکتی ناک، سرخ رخسار اور سوجی ہوئی آنکھیں، مسلسل رونے سے بہتے موتی، واصق کو بہت واضح مکمل تصویر لگا۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول لیں۔

"یا خدا کیا کروں... ضرور یہ بے حواس اور پاگل سی لڑکی مجھے بھی بے حواس اور پاگل کر دے گی۔" انتہائی بے بسی سے مکا بستر پر مارتے، ہونٹوں کو بے دردی سے کاٹتے، سخت جھنجلا کر اس نے تکیہ سر کے نیچے سے کھینچ کر بغیر کہیں دیکھے سامنے دے مارا۔

"ہائے... ہائے... اوئی میرے اللہ..." نسوانی چیخ پر وہ ہڑبڑا کر اٹھا تھا۔ سامنے ہی دادی اماں اپنا سر پکڑے ہول رہی تھیں۔ وہ فوراً بستر سے اٹھ کر ان کی طرف لپکا۔

"کیا ہوا دادی اماں؟" فوراً ان کو کندھوں سے تھاما مبادا گر نہ جائیں۔

"کیا مار دیا ہے تو نے لڑکے... ہائے میرا سر..." واصق کو دیکھتے انہوں نے پھر بنا سر تھاما تو اس نے شرمندہ ہوتے ہوئے جلدی سے انہیں بستر پر بٹھا دیا۔ اس نے تو بس یونہی کوفت زدہ ہوتے ہوئے تکیہ نکال کر دے مارا تھا اسے کیا علم تھا کہ وہ سیدھی اندر داخل ہوتی دادی اماں کے سر کا نشانہ لے گا۔ آج اس سے غلطیوں پر غلطیاں ہو رہی تھیں۔ آج اسے اپنا یہ دن انتہائی منحوس لگا۔

"ایم سوری اماں! بس یونہی ہو گیا۔" دونوں ہاتھوں سے ان کے سر کو دباتے اس نے کہا تو دادی اماں نے اسے اپنا چشمہ

درست کرتے دیکھا۔

"تم وجیہ... وجیہ چلا رہے تھے۔ میں تو وہی معلوم کرنے آئی تھی کہ کیا کوئی کام تھا تمہیں اس سے مگر دروازے کے اندر قدم رکھتے ہی یہ ہوائی راکٹ سر پر آ لگا۔"

وہ شرمندہ ہوا۔ وہ اتنا غیر مہذب نہیں تھا نجانے پچھلے چند ماہ سے اس سے ایسی کیا غلطیاں سرزد ہوئی تھیں کہ گھر آتے ہی وہ غلطیوں پر غلطیاں کرتا جا رہا تھا۔

"وہ بس دادی اماں مجھے دوستوں کے ساتھ لنچ پر جانا تھا۔ ڈھنگ کے کوئی کپڑے نہیں مل رہے تھے۔ سوچا وجیہ سے کہہ دوں وہ کوئی اچھا سا سوٹ استری کر دے مگر وہ ہے کہاں... وہ تو آج کالج نہیں گئی، اور کمرے میں بھی نہیں..."

"چھت پر بیٹھی کوئی سبق یاد کر رہی ہے۔ تم وینزے یا مجھ سے کہہ دیتے۔"

"نہیں... اب اس کی ضرورت نہیں۔ میں کہیں نہیں جا رہا۔" اس نے صاف انکار کر دیا تو دادی اماں دیکھے گئیں۔

"دادی اماں یہ وینزے ہمارے گھر کیوں رو رہی ہے۔ کوئی مسئلہ ہے اس کے ساتھ؟" اچانک خیال آیا تو ان سے پوچھ لیا۔ وہ ابھی تک اس کی اپنے باپ کے ساتھ آمد کی وجہ سے بے خبر تھا۔

"کیا بتاؤں واصق اللہ نے جیسی موہنی صورت دی ہے مقدر اتنے ہی..." وہ افسوس سے ہاتھ ملتے خاموش ہو گئیں۔ وہ بے قراری سے دیکھے گیا۔

پھر دادی اماں نے ساری بات کہہ سنائی وہ تاسف و بے بسی سے سر ہلاتا رہا۔ اسے وینزے سے دلی ہمدردی بھی ہوئی۔

"ہمیں تو بڑی فکر ہے اس بچی کی طرف سے۔ جواد کی ایک ہی بچی ہے کتنے چاؤ سے پالا ہے۔ ہمیں تو ایک ہی فکر ہے۔ اللہ بچی کے مقدروں کو سنوار دے، اسے سکھ دے۔ عمر کی بھی کتنی سی ہے ماں باپ کا دکھ دیکھ لیا۔ دھر وہ منحوس مارا لالچی شخص آسیب بن کر پیچھے لگا ہوا ہے۔ گھر سے بے گھر ہو گئی ہے۔ اسے دیکھتی ہوں تو دل خون کے آنسو روتا ہے۔ اللہ ہدایت دے اس شخص کو بھی کہ وہ بچی کا پیچھا چھوڑ دے۔ اتنی فرشتہ صفت لڑکی ہے۔ زندگی میں کوئی پہلی دفعہ اتنی بھولی بھالی معصوم صورت لڑکی دیکھی ہے۔ آنکھوں میں ٹھنڈک پڑ جاتی ہے۔" وہ ان کی آواز سے ... رنگ سکتا تھا خاموشی سے سنتا رہا۔

"واصق اب تو تم ہی کچھ کرو اس بچی کے لیے۔ یونہی تو وہ شخص پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ اس کے بھائی نے مقدمہ تو کر رکھا ہے اس شخص پر مگر کچھ بن نہیں رہا۔ اب تمہارے جاننے والے خاصے امیر، خوشحال سلجھے ہوئے شریف لوگ ہیں کوئی بات تو چلاؤ۔" وہ نا سمجھی میں انہیں دیکھنے لگا۔ "بہت بڑی ذمہ داری ہے جو اس کے بھائی بھاوج نے ہم پر ڈال رکھی ہے۔ شادی ہو جائے گی، اپنے گھر بار والی ہو، سر پر شوہر کے نام کی چادر ہو گی تو مجال ہے وہ شخص اس کا نام بھی لے لے۔" دادی اماں کہہ رہی تھیں۔ وہ سر جھکائے سنتا رہا جبکہ ذہن کہیں اور تھا۔

"واصق!" دادی اماں نے اسے پُرسوچ انداز میں سوچتے دیکھا تو کہا۔ "سن رہے ہو نا تم؟" انہوں نے پوچھا تو وہ مسکرا دیا۔

"آپ فکر مت کریں۔ انشاءاللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے تسلی دی۔

"خدا کرے۔ بڑی پریشان ہے صبیحہ تو۔ بہت تنگ کر رہا ہے وہ ان دونوں کو۔ کاروبار پر تو سوا سانپ بن کر بیٹھا ہی ہے بچی کو بھی کھانے کا سوچ رہا ہے۔ روز دھمکیاں دینے پہنچ جاتا ہے، دو تین بندے پیچھے لگا رکھے ہیں۔ صبیحہ اور اسد تو ڈر کے مارے ادھر بھی نہیں آ رہے۔ ادھر سے یہ بچی فون کر کے خیر خیریت بھی معلوم نہیں کر سکتی۔ تیرے ابو نے ایک دو دفعہ چکر تو دکھائے تھے مگر وہ دونوں

کو پسند نہیں آئے۔ ہماری خواہش ہے کہ...... "وہ واثق کو دیکھتے فوراً چپ ہو گئیں۔ واثق یونہی مسکرا دیا۔

"کچھ نہیں ہوگا۔ آپ دل چھوٹا مت کریں۔ میں کچھ کرتا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ بہت جلد اپنے گھر جائے گی۔" اس نے تسلی دی تو دادی اماں اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"خدا تمہاری زبان مبارک کرے۔ بڑی حساس ہے یہ بچی، ہر وقت کڑھتی رہتی ہے۔ خدا وہ دن جلدی لائے جب وہ ساتھ خیریت کے اپنے گھر جائے۔" وہ کہتے کہتے کمرے سے نکل گئی تھیں۔ کچھ سوچتے ہوئے وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

* * *

"میں واثق جہانگیر ہوں۔ جہانگیر کا بیٹا۔ آپ پلیز اندر خبر کر دیں۔" وہ اس شاندار آفس میں کھڑا نک سک سے تیار، خوبصورت انداز و اطوار کی مالک سیکرٹری سے مخاطب تھا۔ واثق کے انداز میں کوئی ایسی خاص بات ضرور تھی کہ اس نے فوراً سر تا پا واثق کا جائزہ لیا۔

اس نے بہت سے مرد دیکھے تھے۔ مگر یہ جدا سا تھا۔ لاتعلق سا... جتنی مگر ایزی گو۔

"یس... سر ہلاتے ہوئے اس نے اندر... اطلاع دی۔"

"آپ پلیز اندر چلے جائیں۔" اندر کی طرف سے اجازت ملتے ہی وہ اٹھ کر دروازے کی طرف اشارہ کر گئی۔

"شکریہ۔" اسی لاتعلق انداز میں کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ جیسے ہی اندر داخل ہوا سیکرٹری کرسی پر بیٹھتے ہی بڑبڑائی۔

"بہت خوش انداز ہے مگر ہے خاصا مغرور لگے"

"السلام علیکم!" اس قدر شاندار آفس میں داخل ہو کر سامنے کرسی پر براجمان امجد جواد حسن کو اس نے سلام کیا تو وہ ایک دم اٹھ کر اپنی کرسی چھوڑ کر اس کی طرف بڑھا۔

"وعلیکم السلام۔ اچھا تو آپ ہیں واثق۔ جہانگیر انکل کے صاحبزادے۔" بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملاتے امجد نے کہا۔ پھر اسے کمرے کی دوسری طرف رکھے صوفوں پر لے آ بیٹھا۔

"آپ تو شاید پشاور گئے ہوئے تھے۔ کسی اہم مشن پر۔" امجد بھائی نے پوچھا تو واثق اندر ہی اندر خاصا جھنجلایا۔

"آپ کو کس نے بتایا؟" تھوڑا سا تکلف میں بیٹھتے اس نے غور نہیں دیکھا۔

"آپ کے والد محترم نے۔" ابو کے متعلق جان کر اسے مزید غصہ آیا۔ "ایک تو میرے گھر والے کسی بات کو راز نہیں رکھ سکتے۔"

وہ دل ہی دل میں بڑبڑایا مگر بظاہر مسکرا دیا۔

"بس جیسے ہی کام ختم ہوا میں واپس آ گیا۔"

"پھر کیسا رہا آپ کا مشن۔" انہوں نے مزید دریافت کیا۔

"بہت اچھا۔ میری توقع سے بہت بڑھ کر۔" اسے اب سب بتانا مجبوری تھا۔ ورنہ اتنی پرسنل گفتگو وہ کسی سے بھی نہیں کرتا تھا۔ ایک تو یہ کہ یہ شخص وینزے کا بھائی تھا۔ دوسرے وہ خود چل کر اس کے پاس آیا تھا۔

"کیا لیں گے آپ؟ چائے یا کولڈ ڈرنک۔" سائیڈ ٹیبل پر رکھے انٹرکام کا ریسیور اٹھاتے انہوں نے پوچھا تو اس نے چائے کا کہہ دیا۔

"میں تین روز پہلے ہی اپنے گھر لوٹا تھا وہاں آپ کی بہن کو دیکھا۔ ساری صورتحال جان کر از حد دکھ ہوا۔ آج کسی کام سے ادھر گزر ہوا تو سوچا لگے ہاتھ آپ سے بھی مل لوں۔" اس نے اپنی آمد کے متعلق بتایا وہ مسکرا دیے۔

"وینزے کیسی ہے خوش تو ہے وہ وہاں؟"

"ٹھیک ہیں۔ جہاں تک خوش رہنے کی بات ہے تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ البتہ اتنا کہہ سکتا ہوں وہ کافی اداس ہیں، شاید آپ کی منتظر بھی۔" اس نے صدی اصل بات کہہ دی۔ ابھی وہ جواب میں کچھ کہنا چاہتے تھے جب ملازم اندر داخل ہوا۔ انہوں نے ہونٹ بھینچ لیے۔ ملازم برتن رکھ کر چلا گیا تو انہوں نے چائے کا کپ تھام کر واثق کو پکڑایا۔

"شکریہ"

"یاد تو مجھے بھی اس کی بہت آتی ہے۔ فی الحال ابھی ہم نہیں آ سکتے۔ وہ اگر وہاں خوش نہیں تو ناخوش بھی نہیں ہے۔ اتنا تو مجھے آپ لوگوں پر یقین ہے۔ یہاں کے حالات سنورنے کے بجائے روز بروز بگڑتے ہی جا رہے ہیں۔ محبوب رحمانی روز کوئی نیا شوشہ لے چلا آتا ہے۔ پھر یہ بھی ڈر ہے کہ وہ کہیں ادھر پیچھا کرواتے ہوئے آپ لوگوں تک نہ پہنچ جائے۔ وینزے کے ساتھ ساتھ مجھے آپ لوگوں کی بھی فکر ہے۔ ہماری وجہ سے آپ لوگوں کو کافی زحمت اٹھانا پڑ رہی ہے۔"

"ارے نہیں۔ زحمت کیسی۔ رشتے دار ہونے کے ناطے یہ تو ہمارا فرض ہے۔ اچھا کیا آپ نے ہم پر بھروسہ کیا۔ بے فکر رہیں۔ وینزے وہاں محفوظ ہاتھوں میں ہیں۔ میں ہر طرح سے تعاون کرنے کی کوشش کروں گا۔ اسے آنچ تک نہیں آئے گی۔ بلیو می۔" اس نے پر عزم لہجے میں یقین دلایا۔ امجد نے بغور واثق کا جائزہ لیا۔ یکدم ہی انہیں یہ مسئلہ کافی حد تک حل ہوتا محسوس ہوا۔ واثق جہانگیر کی پرسنالٹی نظر انداز کر دینے والی نہ تھی۔ بہت قدر کی نہیں... میں مگر وہ بہت زیادہ بارعب، سنجیدہ، پروقار اور ذہین لگ رہا تھا۔ انہیں وینزے کے لیے کسی ایسے ہی مضبوط، پرعزم اور ذہین شریک سفر کی ضرورت تھی۔ جو حالات سے لڑنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔ حالات سے آگاہی رکھتا ہو۔ نہ صرف وینزے کے لیے ایک مضبوط قلعہ ثابت ہو بلکہ انہیں بھی محبوب رحمانی کی چالبازیوں کے چنگل سے نکالنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔ اس نے ان لمحوں میں ایک فیصلہ کیا تھا۔ اتنے عرصے کی پریشانی یکدم مفقود ہو گئی تھی۔

"آپ وینزے کو تسلی دیجئے گا ہم ان شاء اللہ دو ایک روز میں آپ کے ہاں چکر ضرور لگائیں گے۔"

"ضرور۔" اس نے بھی خوش دلی سے ہامی بھری۔

وہ مزید کچھ دیر رکا تھا۔ مزید وہ محبوب رحمانی کے متعلق دریافت کرتا رہا پھر وہ محبوب رحمانی کے متعلق ضروری کاغذات لے کر ان سے اجازت لیتا باہر نکل آیا۔

گھر لوٹا تو سیدھا اپنے کمرے میں گھس گیا۔ ابھی لیٹا ہی تھا کہ امی بھی پیچھے چلی آئیں۔

"کہاں تھے تم؟" اسے اٹھ کر بیٹھتے دیکھ کر انہوں نے پوچھا۔

"بس یونہی ادھر ادھر گھومتا رہا تھا۔" کوٹ اتار کر ٹائی کی گرہ کھول کر اس نے شرٹ کے بٹن بھی کھولنا شروع کر دیے تھے۔

"کھانا لاؤں تمہارے لیے۔" کف بٹن کھولتے اسے دیکھا تو انہوں نے پوچھا۔

"ضرور مگر ابھی نہیں۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد۔" مسکراتے ہوئے کہا تو امی قریب ہی بیٹھ گئیں۔ محبت سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں جبکہ وہ جھک کر اپنے پیروں کو جوتوں اور جرابوں سے آزاد کروانے لگا تھا۔

"تمہاری چھٹیاں کب ختم ہو رہی ہیں؟" اگلا سوال ہوا۔

"پتا نہیں۔" جوتے بیڈ کے نیچے کھسکاتے وہ سیدھا ہوا۔

"کیوں؟"

"میرے افسران کا حکم ہے کہ عید تک میں فُل فارغ ہوں۔ آرام سے خوب موج مستی کروں۔ شاید عید کے فوراً بعد مجھے کسی اور مشن پر بھیجنا چاہتے ہیں۔ لیکن کہاں یہ نہیں بتایا۔ بس یہ دو ماہ کا دورانیہ مجھے آرام کے لئے ہی دیا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے تم دو ماہ تک گھر پر ہی رہو گے۔" اس کا انداز سوچ تھا۔ اس نے سر ہلا دیا۔ "شکر ہے میری بھی مراد بر آئی۔ ورنہ جب سے تم نے یہ جاب شروع کی ہے مہینوں بعد تمہاری صورت دیکھنے کو ملتی ہے۔" پھر مسکراتے ہوئے ان کا انداز معنی خیز ہوا۔ "اب میں اپنی خواہش بھی پوری کروں گی۔ تمہاری اپنی کوئی پسند ہے تو بتا دو۔ ورنہ خود ہی کوئی اچھی سی لڑکی دیکھ کر تمہاری شادی کرنا چاہتی ہوں۔" امی نے کہا وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگا۔ وہ واقعی سنجیدہ تھیں۔ وہ ہنس دیا۔

"نہیں جی..... ابھی نہیں۔ ابھی تو مجھے بہت کام کرنا ہے۔" صرف بہانہ تھا۔

"ساری عمر تمہیں یہی کام ہی کرنے ہیں۔ بس اب میں کچھ نہیں سنوں گی۔ ہمارے لئے یہ دو ماہ ہی بہت ہیں۔ پہلے کو تمہارے فارغ ہونے کی منتظر تھی۔ ... کوئی بہانہ نہیں ملے گا۔ بس تمہیں رعایت ہے کہ اگر کوئی لڑکی دیکھ رکھی ہے تو ہمیں بتا دو ورنہ ہم خود دیکھ کر دیں گے۔"

"پسند..." وہ سوچ انداز میں بولا۔ جھماکے سے ذہن کی سطح پر کانچ سے وجود والا آنسوؤں سے تر چہرہ آ سمایا۔ بے خود اس کے ہونٹوں پر ایک دلفریب سی خوبصورت مسکراہٹ ابھری تھی۔ الوہی جذبوں سے مزین۔

امی جو بے خود دیکھ رہی تھیں بیٹے کے چہرے پر دم بدم گہری ہوتی مسکراہٹ کو پڑھنے کی کوشش کرنے لگیں۔

"کون ہے وہ؟" نجانے انہوں نے اس کے تصور تک رسائی حاصل کر لی تھی یا نہیں، پوچھا ضرور تھا۔ وہ ایکدم چونکا پھر نفی میں سر ہلاتا اٹھ کھڑا ہوا۔ مقصد امی سے بچنا تھا۔

"ابھی تک تو کوئی نہیں۔" کوٹ اٹھا کر الماری میں رکھتے واصق نے کہا۔ "اور پلیز امی!! ابھی اس ٹاپک کو رہنے دیں۔ ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اگر مجھے کوئی پسند آ گئی تو پہلی فرصت میں آپ کو ہی بتاؤں گا۔" اس کا مقصد فی الحال امی کو ٹالنا تھا۔ وہ بھی سمجھ رہی تھیں۔ اس کے گریز میں چھپا مفہوم ان کی سمجھ میں آ رہا تھا مگر تصور واضح نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"ٹھیک ہے۔ مگر یہ بھی سن لو میں زیادہ دیر تک انتظار نہیں کروں گی۔ کوئی پسند ہے تو بتا دو دوسری صورت میں لڑکی دیکھ لی ہوں۔ پھر مت کہنا کسی نے مجھ سے پوچھا نہیں۔" انہوں نے دوٹوک انداز میں کہتے فیصلہ سنایا تو وہ چونک کر امی کو دیکھنے لگا۔

"کون ہے وہ لڑکی؟" بے اختیار پوچھا چہرے پر چھائی پریشانی واضح تھی۔ امی ایکدم مسکرائیں۔

"تم نے مجھے بتایا ہے جو میں بتا دوں۔ اچھی طرح پہلے سوچ لو۔ بعد میں بتا دینا۔"

خوشگوار لہجے میں کہتی اس کے بالوں کو چھیڑتے وہ باہر نکل گئی تھیں۔

* * *

وہ ٹی وی آف کر کے زینہ طے کرتے اوپر ٹیرس پر آ گیا۔ آج بہت دنوں بعد اس کا دل یہاں ٹہلنے کو چاہ رہا تھا۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ سب اپنے اپنے کمروں میں سونے کے لئے جا چکے تھے۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ پہلے ٹی وی لگا کر بیٹھا تھا دل نہ مانا تو یہاں آ گیا تھا۔ شعبان کا مہینہ چل رہا تھا۔ آج شاید شعبان کی ساتویں یا آٹھویں تاریخ تھی۔ آسمان پر چاند آدھا تھا اس کے باوجود ارد گرد کافی روشنی بکھری ہوئی تھی۔ ٹھنڈی میٹھی معطر پھوار برس رہی تھی۔ آج کل جو آگ اس کے اندر لگی ہوئی تھی وہ بھی کم ٹھنڈی میٹھی پھوار بن کر اس کے پورے وجود کو بھی معطر کر دیتی تھی اور کبھی پورے وجود میں بھڑک کر اس کو بھی بھسم کرنے لگتی تھی۔

وہ جو خود کو ہمیشہ سے ہی ناقابلِ تسخیر سمجھتا آیا تھا۔ اس قدر اچانک غیر متوقع طور پر اس بے حواس پاگل سی لڑکی کے ہاتھوں تسخیر ہو چکا تھا۔ سب سے زیادہ حیرت بھی اس بات پر ہو رہی تھی کہ وہ جو چھوٹی چھوٹی خلافِ فطرت بات پر بچ جاتا تھا ہنگامہ کھڑا کر دیتا تھا اب ان چند دنوں میں اس قدر بدل گیا تھا کہ اپنے اندر ہونے والی یہ واردات بھی اچھی لگ رہی تھی۔ مگر وہ لڑکی وینزے، وہ ابھی تک سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ واصق کو دیکھتے ہی اس کے چہرے پر ناپسندیدگی کی واضح لہر چھا جاتی تھی کہ اسے خواہ مخواہ وہم ہونے لگتا تھا کہ جیسے وہ واقعی کوئی غلط کریکٹر کا حامل شخص ہے۔ واصق کو اس کی نظروں کی کاٹ سے اب الجھن ہونے لگی تھی۔ دوسری طرف امی نے اسے الجھا دیا تھا۔ جو بار بار اسے اس کی پسند کے متعلق پوچھتے اسے زچ کئے دے رہی تھیں۔ کتنی دفعہ لبوں پر وینزے کا نام آ کر رہ گیا تھا اسے اب خود پر بھی غصہ آنے لگا تھا۔ دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے آنکھیں بند کئے وہ یونہی کھڑا رہا اسے سوچتا رہا کہ اچانک ماحول میں کچھ ارتعاش سا پیدا ہوا تھا۔ اس نے یونہی آنکھیں کھول کر دیکھا تو بے یقین ہوا گرین سوٹ میں ملبوس وہ بلاشبہ وینزے ہی تھی۔ آہستہ آہستہ زینہ طے کرتے اوپر آ رہی تھی۔ اس کا سر اچھا خاصا جھکا ہوا تھا۔ وہ صرف اپنے پیروں پر نظریں جمائے چل رہی تھی یا پھر زمین پر کچھ تلاش کر رہی تھی۔ وہ بغیر ادھر اُدھر دیکھے، کسی طرف دھیان دیئے ناک کی سیدھ پر چلتی بالکونی کے دوسرے سرے پر رکھی کرسیوں میں سے ایک پر جا بیٹھی۔ چونکہ وہ اچھے خاصے اندھیرے میں کھڑا تھا۔ اس لئے وینزے نے سر اٹھا کر ادھر اُدھر دیکھنے کے باوجود اسے نہیں دیکھا تھا۔ ایک سرسری نظر ڈال کر وہ دوبارہ اپنی جھولی میں رکھے ہاتھوں کو ایک دوسرے میں پھنسائے باہر دیکھتی رہی۔

واصق کا دل چاہا اس سے جا کر پوچھے کہ وہ رات کے اس پہر یہاں کیوں آئی ہے۔ کیا اسے بھی اس کی طرح کسی کی یاد تنگ کر رہی ہے مگر وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہ ہل سکا۔ یک ٹک بغیر آنکھیں جھپکائے کئی بار دھیرے اسے دیکھتا رہا۔ بغیر اس بات کا خیال کئے کہ یہ ایک بہت ہی غیر اخلاقی حرکت ہے۔

ابھی وہ اسے دیکھ ہی رہا تھا جب اچانک ہی وینزے نے ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا۔ دونوں گھٹنوں پر سر رکھ کر وہ شاید پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ واصق کے دل کو کچھ ہوا۔ وہ بے ختیار اپنی جگہ سے ہلا تھا۔ یہ سوچے بغیر اس کی طرف بڑھا کہ اس نے اسے اس وقت اپنے سامنے دیکھا تو کیا ری ایکشن ہوگا۔

"وینزے....." وہ بے آواز چلتا اس کے سر پر جا پہنچا تھا۔ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے پکارا۔ بے اختیار اس کی بلند ہوتی سسکیاں بند ہو گئیں۔ ایکدم سر اٹھا کر اپنے سامنے کھڑے واصق کو دیکھے گئی۔

"کیا ہوا وینزے... کیوں پریشان ہیں؟" بہت اپنائیت سے پوچھ رہا تھا۔ شاید ہی زندگی میں کبھی اس کے لہجے میں اتنی اپنائیت اور محبت گھلی ہو جتنی آج۔ وہ یہ محبت و خلوص چاہت صرف اور صرف وینزے کے لئے محسوس کر رہا تھا۔

"آ..... آپ" ایکدم وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

اسے اپنا گھر یاد آ رہا تھا۔ بھیا بھابی اور بچوں کی یاد ستا رہی تھی۔ دل بہت دکھا ہوا تھا مگر وہ چچی کے سامنے آنسو بہا کر انہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی اس لئے ان کے سونے کے بعد خاموشی سے ادھر آ گئی تھی دل کھول کر رونے کے لئے۔ اپنی قسمت کو، اپنے مقصدوں کو مگر آج پھر یہ شخص اس کے آنسوؤں کے درمیان رکاوٹ بن کے آ کھڑا ہوا تھا۔

"جی ٹھیک ہوں میں۔" ہمیشہ کی طرح اب بھی اس کے لہجے میں کڑواہٹ گھل گئی تھی۔ اب بھی خاصی ناگواری سے ایک چبھتی نظر ڈال اس نے پیچھے، واپس جانے کے لئے قدم اٹھایا تو وہ پھر سامنے آ گیا۔

"تو پھر رو کیوں رہی تھیں؟" واصق جہانگیر کو وینزے کی کاٹ دار نگاہ اپنے اندر تک اترتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ اس کے باوجود وہ اسے روک بیٹھا تھا۔

"دماغ خراب تھا میرا۔ میں نے آپ کو پہلے بھی وارن کیا تھا کہ آپ اپنی حد میں رہیں۔ میں نے کہا بھی تھا کہ میں چیخ پڑی ہوں۔ آئندہ میرا راستہ روکنے کی کوشش مت کیجئے گا۔" اپنے چہرے کو ہاتھ کی پشت سے صاف کرتے غصہ بھری آواز میں کہا۔ "یہ ٹھیک ہے میں اپنی مجبوری کی وجہ سے آپ کے در پر پڑی ہوئی ہوں مگر کوئی گری پڑی نہیں ہوں نہ ہی ان لڑکیوں جیسی ہوں جن سے آپ کا واسطہ ہوتا ہوگا۔ پھر بھی آپ یہاں آ گئے۔ کم از کم اپنے والدین کا ہی تو خیال کر لیتے۔"

وہ اس کے یوں راستہ روکنے پر پھٹ ہی تو پڑی تھی۔ بہت ہی بری طرح گھورتے اس نے واصق کو سب سنا دیا تھا۔ کے تو مانو چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔ کتنا غلط سوچ اور سمجھ رہی تھی وہ اسے۔ کتنی غلط رائے رکھتی تھی وہ اس کے بارے میں۔ اس کے الفاظ سن کر واصق کو انتہائی افسوس ہوا۔ وینیزے پر نہیں اپنی پسند پر۔

دل کی اس انوکھی حسارت پر جسے ساری دنیا میں اس لڑکی کے سوا کوئی اور ملی ہی نہیں تھی۔ انتہائی دکھ و ملامت بھری نظر سے اسے دیکھ کر بولا۔ جب بولا تو اس کو اپنی آواز انتہائی سپاٹ لگی۔

"بہت غلط ہے۔ مردم شناسی کی صلاحیت تو موجود ہی نہیں آپ میں۔ کیا سمجھ رہی تھیں آپ مجھے، اور کیا ہیں آپ صرف ایک جسم۔" واصق کی نظروں میں واضح تمسخر تر آیا تھا۔ سرتاپا وینیزے کا جائزہ لیا۔ وہ تو ان الفاظ سے سٹپٹا ہی گئی۔ "اس جسم کی بھی میری طلب نہیں، وہاں تو بلکہ آپ کو آپ کی شکست میں حسن کی کمی تو نہیں۔ پتہ نہیں کیوں آپ نے اتنی غلط بات میرے حوالے سے کہہ دی۔ آپ خود تو چاہتی کب تھیں میں نے کبھی نظر سے آپ کو دیکھا ہے۔ میں بہت اونچا سمجھتا تھا آپ کو۔ بہت جدا، بہت منفرد، مگر افسوس۔ آپ کی سوچ بھی ان سب لڑکیوں جیسی ہے۔ سطحی، بہت ہی عام سی نکلی ہیں آپ تو۔ عام سوچ رکھنے والی عام ذہنیت کی حامل، عام سی لڑکی۔ کس بات پر غرور ہے آپ کو، وینیزے جواد حسن، مجھے اپنے والدین کا بہت خیال ہے۔ اینڈ یو کین گو فرام ہیئر۔" اس نے درشتی سے کہتے اس نے سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا تھا۔ وہ جیسے کسی سحر سے آزاد ہوئی۔ کتنا کچھ سنا دیا تھا واصق نے اسے۔ تمام الفاظ اس کے اندر اترتے گئے تھے۔ ایک کرب کی لہر اٹھی، وہ کوری تو پہلے بھی تھی اب آنکھوں میں بے یقینی بھی تھی۔ وہ قدم بڑھانے لگی تو اپنے عقب میں آئی واصق کی آواز پر رک گئی مگر مڑی نہیں تھی۔

"آئندہ جب بھی کوئی قدم اٹھائیں تو اپنے گرد و پیش کا بھی جائزہ لے لیا کریں۔ یہاں آکر بیٹھنے سے پہلے آپ کو اچھی طرح دیکھ اور سمجھ لینا چاہئے تھا کہ یہاں کوئی پہلے سے موجود تو نہیں۔ یہ ہمارا گھر ہے۔" کتنا توہین آمیز لہجہ تھا۔ وینیزے کا جی چاہا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ بے اختیار پلٹ کر اسے دیکھا وہ رخ موڑے کھڑا تھا۔ اسے صرف اس کی لمبی چوڑی پشت دکھائی دی۔ وہ چھلکتی آنکھوں سمیت تیزی سے تقریباً بھاگتے ہوئے نیچے سیڑھیاں اترتی چلی گئی۔

"کاش میں اس وقت یہاں نہ آتا یا وہ نہ آتی یا پھر اتنی باتیں ہی نہ ہوتیں۔ یوں اپنی سوچ، اپنی پسند سے دل اچاٹ نہ ہوتا۔" اسی کرسی پر گرتے جس پر چند منٹ پیشتر وہ بیٹھی تھی۔ اس نے اپنے بالوں کو اپنی مٹھیوں میں جکڑتے انتہائی دل گرفتگی سے سوچا۔

اگلا سارا دن وہ اپنے کمرے میں بند رہی۔ واصق کی باتیں یاد آتیں تو مزید اذیت سے دوچار ہو جاتی۔ یہ نہیں تھا کہ اس کا دل واصق کی جانب سے صاف ہو گیا تھا بلکہ وہ اور زیادہ دل گرفتہ ہو گئی تھی۔ پہلے تو وہ اسے صرف فلرٹ، نظر باز اور دھوکے باز لگتا تھا اب وہ اسے ڈرامے باز بھی لگنے لگا تھا۔

"کتنی اچھی ایکٹنگ اور ڈائیلاگ بازی کی تھی۔ صرف اور صرف مجھے متوجہ کرنے کو۔" وہ اب بھی تنفر سے ہی سوچ رہی تھی۔ خاص طور پر اس کی رات والی باتیں، "جسم، عام سی سوچ والی عام ذہنیت کی حامل عام سی لڑکی کہنا اسے پوری رات اذیت کی آگ میں جھلسا تا رہا تھا۔ اس نے کب کسی سے اتنا کچھ سنا تھا۔ کوئی موقع ہی نہیں ملا بطور خاص کسی سے بات کرنے اور اس کے بارے میں رائے قائم کرنے کا۔ وہ شروع سے ہی خاصی ڈرپوک اور کم صم واقع ہوئی تھی اسی لئے اس کی دنیا گھر، اسکول و کالج، بھیا بھابی، بچوں

بھی کبھار کی جانے والی آؤٹنگ تک ہی محدود تھی۔ اس کا حلقہ احباب بہت محدود تھا۔ دوست تو گنتی کی تھیں۔ چند ایک لڑکوں سے دوستی کرنے کا نہ تو اسے شوق تھا نہ ہی اشتیاق بلکہ وہ اس صنف سے ہی دور بھاگتی تھی۔ جب سے محبوب رحمانی نے آ کر زندگی اجیرن کر دی تھی۔ اس صنف سے اعتبار ہی اٹھ گیا تھا اور اب واصق جہانگیر نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی تھی۔ اگر وہ اس کے متعلق اچھی طرح نہ جانتی ہوتی تو شاید اس کی سوچ پازیٹو ہوتی مگر اب مثبت انداز میں سوچنے کی تو گنجائش ہی نہ تھی۔ یہی بات اسے بے چین کیے ہوئے تھی۔

"مگر شاید وہ یہ نہیں جانتا میں عام سی ذہنیت رکھنے والی عام سی لڑکی ضرور ہوں مگر ہر ایک پر مر مٹنے والی نہیں ہوں۔ مانا کہ اس کی پرسنالٹی بہت اٹریکٹو ہے۔ مقابل کو مسحور کر دینے والی ہے مگر میں واقعی مختلف ہوں۔ مجھے اپنے متعلق کوئی خوش فہمی نہیں۔ وقت اور حالات نے بہت کچھ سکھا دیا ہے۔ باپ کے غلط فیصلوں کی بدولت دوسروں کے در پر زندگی ضرور گزار رہی ہوں مگر بے غیرت نہیں ہوں۔ واصق جہانگیر احمد میں تو تمہیں پہلی نظر میں ہی پہچان گئی تھی۔ بعد کی باتیں تو بے معنی ہیں۔ میں راہ میں پڑا ہوا روڑا نہیں ہوں، جسے تم اٹھا لو، کچھ دیر اپنے پاس رکھو اور پھر کہیں پھینک دو۔ با حیثیت و باوقار جیتا جاگتا وجود ہوں۔ محبوب رحمانی جو بھیڑیے کی طرح میرے پیچھے لگا ہوا اب ایک ایسی ہی نسوان تم بھی بن گئے ہو۔ کاش بھیا بھابی آ جائیں ورنہ میں یہاں سے چلی جاؤں۔" آنکھوں پر بازو لپیٹے وہ مسلسل یہی سوچ رہی تھی۔

بڑی امی کمرے میں داخل ہوئیں تو چھایا اندھیرا دیکھ کر انہوں نے لائٹ آن کی۔

"کیا بات ہے وینیزے بیٹی، طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟" بڑی امی نے بستر پر بیٹھ کر اس کی آنکھوں سے بازو ہٹا کر پوچھا۔ انہیں ایکدم اپنے سامنے دیکھ کر اس نے اپنی بھیگی پلکیں جھپکیں۔ مسلسل مسکرانے کی کوشش کی۔

"جی۔" اس نے کہا۔ بڑی بی امی سے کتنی محبت کرتی ہیں۔ گر انہیں اپنے بیٹے کی اصلیت کا علم ہو جائے تو شاید نظر ملا کر بات بھی نہ کر سکیں اس نے آزردگی سے سوچا۔

"تو پھر باہر کیوں نہیں نکلیں۔ دادی اماں بھی کئی بار پوچھ چکی ہیں۔" انہوں نے اس کے بستر پر بکھرے دراز سلکی آبشار ایسے بالوں کو سمیٹے، ایک اور محبت بھری کارروائی کی تو وہ بے دلی سے اٹھ بیٹھی۔

"بس دل ہی نہیں چاہا۔" وہ اب بھی اس کے کھلے دراز بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھیں۔ اس کا جواب سن کر بغور دیکھا۔

"کسی سے لڑائی ہوئی ہے، وجیہہ نے کچھ کہا ہے؟"

امی کی نظر وہ رنگ اترتی ہوئی تھی۔ اس نے بے اختیار ان کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

"نہیں بڑی امی۔ بس ویسے ہی گھر یاد آ رہا ہے۔ کتنے دن ہو گئے ہیں بھائی بھیا سے ملے ہوئے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" انہوں نے پرزور تائید کی۔ "چلو اٹھو باہر چل کر بیٹھو سب لان میں اکٹھے بیٹھے ہوئے ہیں، موسم بہت خوبصورت ہو گیا ہے بس تمہاری ہی کمی ہے۔" بازو سے پکڑ کر اسے اٹھاتے انہوں نے کہا تو وہ خاموشی سے دوپٹہ سنبھالتی سینڈل اڑس کر ان کے ساتھ لان میں آ گئی۔

باہر کا موسم واقعی میں بہت خوبصورت تھا۔ آسمان پر ہلکے ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے۔ سب خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ تقریباً سبھی تھے ماسوائے بڑے ابو اور چچا کے۔ اس کی نظر بلا ارادہ دادی اماں کے پہلو میں بیٹھے واصق جہانگیر پر جا پڑی۔ اس نے بھی ایک پل کو دیکھا تو پھر نظر پھیر گیا۔ وہ کسی بات پر مسکرا رہا تھا اسے دیکھتے ہی مسکراہٹ معدوم ہو گئی۔ پہلی دفعہ وینیزے کو اندازہ ہوا کہ ظاہری طرح اس شخص کی مسکراہٹ بھی بہت خوبصورت تھی۔

"آ گئی میری بچی۔" وہ جیسے ہی قریب پہنچی، دادی اماں نے محبت سے کہتے بازو بھی وا کر دیئے۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی

ان کی طرف بڑھ گئی۔ اس پر ان لوگوں کی محبتوں کا ایک بہت بڑا قرض تھا وہ نہ ہی تو خود غرض تھی اور نہ ہی احسان فراموش، البتہ مصلحت آمیز ضرور تھی۔ بس ان کی محبتوں کے جواب میں کبھی خاموش رہتی تھی اور کبھی مسکرا دیتی تھی۔ وہ صرف ایک شخص کی وجہ سے ان سب کو علانہیں کہہ سکی تھی۔

"لگتا ہے، وئیزے جی آج آپ کو اپنا کمرہ بہت ہی بھا گیا تھا۔ صبح سے اب آپ کی شکل دیکھنے کو ملی ہے۔" شہروز نے کہا تو وہ دھیرے سے مسکرا دی۔

"آپ کے لئے ایک خوشخبری ہے۔" مہران نے کہا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ "آج رات آپ کے بھیا بھابی آ رہے ہیں گے۔ خوش ہو جائیں۔"

"ریئلی ..." "اتنی اچھی خوشخبری سن کر وہ کھل اٹھی تھی۔ بے اختیار دادی اماں سے تصدیق چاہی تو انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ خوشی کے احساس سے نہال ہو گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتی واسق بول اٹھا۔

"دادی ماں مجھے ایک ضروری کام ہے، جلدی آ جاؤں گا۔" ان کے برابر سے اٹھتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا۔

"اس وقت۔" واسق نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ "شام ہونے والی ہے، باہر گئے لوگ گھر لوٹتے ہیں اور تم باہر جا رہے ہو۔ آؤ گے کب؟" دادی اماں نے مزید پوچھا۔

"جلدی ہی آ جاؤں گا۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے باہر جانے کی۔ بلیاں بندھی ہوئی ہیں تمہارے پاؤں میں تو۔ آج سارا دن باہر تو گزارا ہے۔ آدھا گھنٹہ نہیں ہوا تمہیں گھر آئے ہوئے اور جناب ہیں کہ پھر چل دیئے ہیں۔" امی نے اٹھتے دیکھا تو اچھی خاصی جھاڑ پلا دی۔ وہ کھاتے ان کے کندھوں پر جھک گیا۔

"چھوڑیں امی، ایک کام ہے، بس جلدی ہی آ جاؤں گا۔ جانے دیں ناں۔"

"کیا کام ہیں ذرا مجھے بھی تو بتاؤ۔" انہوں نے پوچھا تو وہ ایک نظر وئیزے پر ڈال کر چپ ہو گیا۔ کیسے بتاتا کہ وہ گھر سے فرار چاہتا ہے۔

"امی میرا خیال ہے بھائی نے باہر کوئی بیوی رکھی ہوئی ہے۔" یہ مہران تھا۔ اس نے اسے گھورا مگر اثر کسے تھا بلکہ اس بات پر سب ہی ہنس پڑے تھے۔

"ارے یہ مانے تو سہی۔ ایسی بیوی لاؤں گی، کبھی گھر سے باہر قدم بھی نہیں نکال پائے گا۔" امی نے فرط محبت و انبساط سے اس کا ماتھا چوم لیا۔ وہ یوں اچانک ذکر پر تھوڑا سا کنفیوز ہو گیا تھا جبکہ سامنے ہی تو وہ بیٹھی ہوئی تھی۔ سب ہی جانتے تھے وہ اپنی مصروفیات کی وجہ سے اس ذکر سے کتنا بھاگتا ہے اسی لئے سب اکثر اسے دبوچ رکھتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح تو وہ آمادہ ہو ہی جائے گا۔

"امی میرا خیال ہے واسق کبھی نہیں مانے گا اسی لیے کسی اور کے متعلق بھی سوچ لیں۔"

شہروز نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا تو وہ یونہی مسکرا دیا۔

"اوروں کی بھی باری آ جائے گی پہلے جس کی باری ہے اسے تو نبٹنے دو۔" دادی اماں نے اسے چپ کرا دیا تھا وہ بسورنے لگا۔

"ہائے ظالم سماج......" شہروز نے دھیمی آواز میں ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ واسق کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

"اتنی ٹھنڈی آہیں مت بھرو۔ تمہاری 'ان کو' ٹھنڈ لگ جانے کا احتمال ہے۔" واسق نے اس کے کان کے قریب جھک کر کہا تو وہ اسے گھورنے لگا۔

"ڈوب مرو تمہاری باری کے انتظار میں دادی ماں سب کو باندھے رکھیں گی۔"

"اچھی بات ہے بیٹا" ذرا اور انتظار کر لو۔ شاید دس سال بعد میرا دماغ چل جائے اور شادی کر ہی لوں۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا تو مہران اور شہروز دونوں گھورنے لگے۔

"بڑے زاہد بنتے ہو مگر سن لو بڑی امی اور دادی اماں نے لڑکی پسند کر لی ہے اب تمہاری ایک بھی نہیں سنیں گی۔ چند ایک دنوں میں تمہیں کوئی خوبصورت کھونٹا نصیب ہونے والا ہے۔" شہروز نے کن انکھیوں سے دادی اماں کے پہلو میں بیٹھی وئیزے کو دیکھتے ہوئے کہا تو وہ سنی ان سنی کرتا ہاتھ ہلاتا اپنی بائیک کی طرف بڑھ گیا۔

رات کے کھانے کے بعد بھیا اور بھابی آ گئے۔ بخیر و عافیت سے دونوں بہت خوش تھے۔ بھابی بھی کافی مطمئن دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ جو کتنے دنوں سے ان کی آمد کی منتظر تھی بے اختیار ان سے لپٹ گئی۔ وہ کافی دیر تک ان کے پاس سب کی موجودگی میں بیٹھی رہی۔ بھیا کے چھوٹے رمیض نے رونا شروع کیا تو وہ بڑی امی کے کہنے پر اسے اٹھا کر باہر لے گئی۔ وہ جیسے رمیض کے لیے فیڈر تیار کرنے باہر نکلی تو بھابی نے بھی بات شروع کی۔

"ہم نے وئیزے کے لیے ایک رشتہ پسند کیا ہے۔ بہت اچھا لڑکا ہے۔ یقیناً آپ کو بھی پسند آئے گا۔" امجد کی طرف مسکراتی نگاہوں سے دیکھتے انہوں نے ... دادی ماں کو بتایا۔ تو سب ہی متوجہ ہو گئے۔ بڑے ابو، چچا جان، شہروز، مہران وغیرہ جبکہ بڑی امی کچھ گھبرا کر دادی ماں کو دیکھنے لگیں۔ آج ہی تو انہوں نے واسق کے لئے وئیزے کو مانگنے کا تہیہ کیا تھا مگر اتنی غیر متوقع بات سن کر وہ پریشان ہو گئیں۔ دادی ماں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں انہیں تسلی دی۔

"صبیحہ! امجد ... جو لڑکا بھی پسند کیا ہے وہ یقیناً اچھا ہوگا مگر ... ہماری بھی اس کے لئے ایک رشتہ ہے سوچ سمجھ کر پھر جواب دینا۔"

"آپ کہئے خالہ جان کون ہے وہ؟" امجد بھیا پوری طرح متوجہ تھے۔ فوراً پوچھا۔

"ہماری تو شروع سے ہی خواہش تھی مگر زباں پر لانے سے ڈرتے تھے۔ دوسری بات یہ بھی کہ واسق یہاں نہیں تھا۔ تم نے تو اسے دیکھا بھی نہیں تھا اسی لئے چپ رہے۔ اب تو تم اس سے مل چکے ہو۔ جانتے بھی ہو۔ صبیحہ سامنے بیٹھی ہے، تم اس سے اس کی شرافت اور نیک سیرتی کے بارے میں پوچھ سکتے ہو۔ ہمارے بارے میں بھی سب جانتی ہے۔ ہم تمہاری طرح بہت پیسے والے نہیں مگر شرافت ہے، عزت ہے، محبت، خلوص کو ہی سب سے بڑی دولت سمجھتے ہیں۔ اسی خلوص کی بنیاد پر ہم واسق کے لئے وئیزے کو مانگ رہے ہیں۔ اگر تم لوگوں کو قبول ہو تو پھر بھی ہماری چاہت و محبت میں کمی نہیں ہوگی۔ آگے تم دونوں کی مرضی۔" دادی اماں نے بہت سلیقے اور سبھاؤ سے اپنا مدعا بیان کیا تھا۔ بھیا اور بھابی دونوں حیرت سے ایک دوسرے کے منہ تکنے لگے۔ پھر دونوں ہی ہنس دیئے۔

"جی خالہ جان! ہمیں واقعی کوئی اعتراض نہیں کیونکہ آج ہم وئیزے کے لئے واسق کی ہی بات کرنے آئے تھے۔" بھیا نے بھی بتایا تو وہاں موجود سب افراد حیرانگی کے ساتھ خوش بھی ہو گئے۔

"تو پھر بیٹا! یہ رشتہ پکا سمجھیں ناں۔" دادی ماں نے بے پناہ خوشی سے پوچھا۔ امجد بھیا نے سر ہلا دیا۔

"ارے جہانگیر کسی کو بھیجو کہ مٹھائی منگواؤ۔ میں ابھی دونوں کا منہ میٹھا کروانا چاہتی ہوں۔" دادی اماں نے فوراً کہا۔

"میں لاتا ہوں۔" مہران فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

واسق شام سے پہلے کا گیا ہوا تھا اور ابھی تک گھر نہیں لوٹا تھا۔

ونیزے رمیض کو چپ کرا کر واپس لوٹی تو محفل کا رنگ ہی اور تھا۔ سب ایک دوسرے کے گلے مل رہے تھے۔ مبارک سلامت کے مظاہرے ہو رہے تھے۔ وہ ناسمجھی کے عالم میں حیران کھڑی رہی۔ دادی اماں کی نظر پڑی تو اس کا ہاتھ تھام کر پاس بٹھا لیا۔

"خدا جوڑی سلامت رکھے۔" اس کی پیشانی چومتے انہوں نے دعا دی۔ وہ ہونق بنی کبھی انہیں اور کبھی باقی لوگوں کو دیکھے گئی۔

"جاؤ بہو، انگوٹھی لے آؤ۔ ابھی رسم کریں گے۔" آناً فاناً انہوں نے بڑی امی کو حکم دیا۔ وہ فوراً اپنے کمرے کی طرف چل گئیں۔ واپسی میں ان کے ہاتھ میں ایک بیش قیمت ہیرے کی انگوٹھی تھی۔ جسے لا کر انہوں نے دادی اماں کو تھما دیا وہ اس افراتفری کو نہیں سمجھ رہی تھی۔

"ہم نے تو ہفتہ ہو گیا تھا ہوا لی تھی۔ شکر ہے آج پہنانے کا موقع تو ملا۔" وہ بھابی کو بتا رہی تھیں۔ دادی اماں نے بسم اللہ پڑھ کر انگوٹھی پہنا دی تو تب بھی خالی خالی نظروں سے دیکھے گئی۔ نہ چہرے پر شرم کی لالی تھی نہ ہی آنکھوں میں حیا کا رنگ اترا بلکہ تو سراپا حیرت بنی ہوئی تھی۔

"اور یہ واثق صاحب کہاں ہیں، نظر ہی نہیں آ رہے؟" بہن کی طرف سے مطمئن ہو کر اچھ بھیا نے شہروز سے پوچھا۔ اس کو سامنے تھے پوچھ سکتے تھے۔ واثق کے نام پر اس کے سوئے حواس بھی یکدم جاگ اٹھے۔ اندر کرب کی لہر جاگی۔

"تو کیا یہ سب واثق کے لئے ہو رہا ہے، نہیں۔" بجائے شہروز نے بھیا کو کیا جواب دیا تھا وہ تو اپنے اندر اٹھنے والے بھرپور طوفان سے نبرد آزما تھی۔ جی چاہا ابھی چیخ چیخ کر "نہیں نہیں" کہہ کر سب سے لڑ پڑے۔ مگر اس کے ہونٹوں کے قفل جوں کے توں برقرار رہے۔ بہت چاہنے کے باوجود وہاں سے اٹھ نہ سکی۔ پھر ان کو مٹھائی دی تو بھابی نے اٹھ کر سب کا منہ میٹھا کرایا۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں وہ واثق بھیا ہی ہیں جن سے آپ کی منگنی ہوئی ہے۔" وہ یہ سوچے بیٹھی تھی کہ شاید اس کا خیال غلط ہو۔ اسی لئے سب کے چلے جانے کے بعد وجیہہ کے ساتھ اس کے کمرے میں آئی تو اسے روک کر پوچھ لیا۔ جواباً اس نے اس کے خیال کی تصدیق کر دی تھی۔ وہ بے یقینی سے دیکھتی رہی۔

"یہ نہیں ہونا چاہئے تھا۔ یہ سب غلط ہوا ہے۔" وجیہہ کو بے یقینی سے دیکھتے اس کا دل رو رہا تھا۔ آنکھیں ضبط کے مراحل طے کر رہی تھیں۔ وجیہہ انکشاف کے پہاڑ توڑ کر چلی گئی تو وہ بستر پر گرتے تنہا اس انکشاف کے بوجھ تلے دبی روتی رہی۔

"بھیا کیوں کیا آپ نے ایسا۔ ماں باپ کا سایہ سر سے کیا اٹھا کہ تنی بھاری ہو گئی تھی بہن آپ پر۔ کم از کم پوچھ تو لیا ہوتا۔"

"بھوٹ مکھوٹ کر روتے وہ بھیا کی بے حسی پر شکوہ کناں تھی۔"

"اچھا نہیں کیا آپ نے میری کم سخنی، خاموش طبعی اور مصلحت آمیزی کا ناجائز فائدہ اٹھایا ہے۔ کبھی معاف نہیں کروں گی آپ کو۔" وہ ان کے تصور سے لڑ رہی تھی۔

"باپ نے جو کیا ابھی تو اس کا زخم بھی مندمل نہیں ہوا تھا اور آپ نے بھی وار کر دیا۔" کمبل میں منہ دیئے وہ اور شدت سے روئی۔ ماں کی کمی کا احساس اور شدت سے جاگا۔

"میں اس شخص کی شکل بھی دیکھنے کی روادار نہیں، کجا کہ ساری زندگی اسے برداشت کروں۔ اگر اس کی اصلیت کا علم نہ ہوتا تو شاید بخوشی آپ کی رضا کی خاطر یہ زہر نگل لیتی مگر اب یہ ممکن نہیں۔ آپ کو اپنا فیصلہ بدلنا ہوگا۔" وہ اب بھی بھیا سے مخاطب تھی۔ پھر اسی طرح نیر بہاتے رات دھیرے دھیرے سرکنے لگی۔ وجیہہ کمرے میں آ کر سو بھی چکی مگر ساری رات اس کی آنکھوں میں جھڑی لگی رہی تھی۔ ایک پل کو بھی نیند نہ آئی۔

* * *

"واثق یار اب اٹھ بھی جاؤ اور کتنا سوؤ گے۔ اگلے دن کے گیارہ بج رہے ہیں۔" ابھی اس کی نیند پوری بھی نہیں ہوئی تھی جب شہروز نے اس کے کمرے میں آ کر اس کے اوپر سے کمبل کھینچ لیا۔ جواباً وہ اس حرکت پر تلملاتا غصے سے اس کی طرف پلٹا تھا مگر وہ اس کی پہنچ سے دور تھا۔ دونوں ہاتھوں میں کمبل پکڑے بازو اوپر اٹھائے دانت نکال رہا تھا۔

"کیا مصیبت ہے یار ابھی نیند بھی پوری نہیں ہوئی اور تم نے اٹھا دیا۔" سخت جھنجلاتے آنکھیں ملتے اسے دیکھا تو وہ اس کے پاس آ بیٹھا۔

"کہاں تھے تم سارے رات؟ دو بجے تک تو ہم تمہارا انتظار کرتے رہے اور پھر تھک ہار کر سو گئے۔ بڑی امی بتا رہی تھیں کہ تم صبح تین بجے گھر لوٹے ہو۔ یہ رات ساری باہر گزار کر آخری پہر گھر لوٹنا شریفوں کا تو کام نہیں۔" شروع میں تو وہ سنجیدہ تھا آخر میں پھر آؤٹ ہو گیا۔ واثق نے صرف گھورا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں سے کمبل چھین کر دوبارہ سر تک پیٹا اور لیٹ گیا۔

"اتنے بیزار کیوں ہو۔ کہیں بڑی امی نے تمہیں کچھ بتا تو نہیں دیا۔ ویسے یار رات کو میں نے انہیں کافی پکا کیا تھا کہ میرے علاوہ تمہیں کوئی کچھ نہ بتائے۔" وہ دوبارہ اس کے منہ سے کمبل ہٹاتے کہہ رہا تھا۔ اس دفعہ واثق نے فوراً کمبل نہیں چھینا تھا۔ بس سوالیہ دیکھا تھا۔ واثق کے چہرے پر الجھن دیکھ کر شہروز سمجھ گیا کہ ابھی تک اسے کچھ پتہ نہیں ہوا۔

"راز کی بات ہے یار، رات دادی ماں نے تمہاری منگنی پکی کر دی ہے۔"

"کیا..؟" واثق کو بے پناہ حیرت ہوئی۔ فوراً سیدھا ہوا۔ "کیا ہوش میں کہہ رہے ہو؟" بے ساختہ وہ جھنجلایا۔

"کیوں اس میں ہوش کھونے والی کیا بات ہے۔ تمہیں اب شادی کر ہی لینی چاہئے۔ میرے بعد تمہارا نمبر ہے۔ ہاں مگر میں نے تمہیں پہلے ہی بتا دیا ہے کہ اس موقع پر صرف تمہاری خوشی سے زیادہ کسی کی خوشی نہیں۔"

"کیوں اس میں ہونے کی کیا ہے۔ سو فیصد سچی خبر ہے۔ بدولت اس موقع پر ہم شمس پیش پیش تھے۔" شہروز نے کہا تو وہ اسے دیکھے گیا۔

"مگر میں نے تو منع کیا تھا کہ ابھی میں شادی نہیں کرنا چاہتا۔" وہ جھنجلا رہا تھا کہ شہروز سے تصدیق چاہ رہا جب یقین ہو گیا کہ خبر واقعی سچی ہے تو وہ فوراً آؤٹ ہوا۔

"بڑی امی نے بتایا تھا مگر یار ابھی تو بس بات طے کی ہے ہوئی ہے۔ رکھوں میں ایک ہے وہ لڑکی۔ اگر تمہاری جگہ میں ہوتا تو خوشی سے بھنگڑے ڈالتا۔"

"وہ جو بھی ہے مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ اگر تم لوگوں کو تنا ہی شادی کا شوق ہے تو تم ہی کرا لو اس سے۔ مجھے تو بخشو ہی۔" غصے سے کہتے اس نے کمبل دور پھینکا تھا۔ بھناتا ہوا باتھ روم میں گھس گیا۔

شہروز سہولت سے اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ آدھ گھنٹے بعد وہ باتھ روم سے برآمد ہوا تو تب بھی غصے میں تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے نظر انداز کر کے باہر نکلتا اس نے فوراً آگے بڑھ کر اس کا بازو تھاما۔

"اتنے غصے میں کیوں ہو یار، سب ہی کی شادیاں ہوتی ہیں۔ تمہارے ساتھ دنیا سے کچھ انوکھا تو الامن ملہ تو نہیں ہونے جا رہا جو یوں تپ پا ہو رہے ہو۔"

"یار میرا سر دکھ چھوڑ دو، بس کہہ دیا نہ مجھے کہیں بھی شادی نہیں کرنی، کسی سے بھی نہیں۔"

"چاہے وہ لڑکی ونیزے جو وہ حسن علی کیوں نہ ہو۔"

شہروز نے سنجیدگی سے پوچھا، وہ تو یوں بدکا گویا کرنٹ لگ گیا ہو۔ بے پناہ حیرت ہی حیرت تھی۔

"کیا کہہ رہے ہو تم؟" دکھ کے ساتھ ساتھ حیرت سے آواز پھٹی ہوئی تھی۔

"ٹھیک ہے یہ۔ وہ لڑکی نیک ہے، یہ راتی زبردست لڑکی ہے جس کا بھی مقدر بنے گی کائنات رشک کر اٹھے گی۔ ایک تم ہو کہ ناشکری کر رہے ہو۔"

واصق بس ساکت آنکھوں سمیت اسے دیکھتا رہا۔ "دنیزے جواد حسن۔" اس کے ہونٹوں نے بے آواز حرکت کی "میں بہت مختلف لڑکی ہوں۔ آئندہ میرا راستہ روکنے کی کوشش مت کرنا۔ میں کوئی گری پڑی نہیں ہوں۔" دنیزے جواد حسن اس کے کان کے قریب کہہ رہی تھی۔ وہ صرف شہروز کو دیکھتا رہا۔

"کیا ہوگیا ہے تمہیں۔ ایمان سے بتاؤ اگر درمیان میں روپیہ نہ ہوتی تو میں جی جان سے راضی ہو جاتا۔" وہ صرف اسے چھیڑ رہا تھا۔

"تو پھر تم دادی اماں سے بات کرلو۔ میں اس لڑکی سے شادی نہیں کروں گا۔ وہ بہت مختلف لڑکی ہے مجھے بہت خاص لڑکی چاہئے عام نہیں۔" بہت ہی سپاٹ لہجے میں انکار کرتے وہ باہر نکل گیا۔ شہروز کے تو کچھ پلے نہیں پڑ رہا تھا۔

"پاگل ہے یہ تو۔" وہ بھی اس کے پیچھے دوڑا۔ واصق امی کو ڈھونڈنے کچن میں گیا وہ وہاں نہیں تھیں۔ تیزی سے راستے میں گزرتی دنیزے کو بھی نظرانداز کیے وہ امی کے کمرے کی طرف لپکا۔ تو شہروز نے درمیان میں راستہ روکا۔

"پلیز شہروز! اس وقت کچھ بھی سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ بہتر ہے تم خاموش ہو جاؤ اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔" اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے ٹوک دیا۔ اسے یونہی چھوڑ کر امی کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

وہ اپنے کمرے کی بکھری چیزیں سمیٹ رہی تھیں۔ اسے اپنے کمرے میں دیکھ کر مسکرائیں پھر اس کے عقب میں شہروز کو دیکھ کر تو فوراً اندازہ ہو گیا کہ وہ اپنی بات طے ہو جانے سے خفا ہو گیا ہے۔

"امی یہ میں کیا سن رہا ہوں۔" وہ جیسے طوفان بن کر ان کے سامنے آیا تھا۔ وہ مسکرا دیں۔ اندازہ تھا کہ کسی ایسے ہی رویے کا مظاہرہ ہوگا۔

"سچ سن رہے ہو۔" انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس نے پیچھے ہٹ کر ہاتھ جھٹک دیا۔

"واٹ رَبش؟ آپ کو ساری دنیا میں کوئی اور لڑکی نہیں ملی تھی۔ کیا کال پڑ گیا تھا دنیا میں لڑکیوں کا جو یہ لڑکی میرے سر تھوپ دی ہے۔" واصق کا انداز خاصا توہین آمیز تھا۔ امی تو خاصی حیران ہوئیں۔ شہروز فوراً اندر آیا۔

"آہستہ بولو اور مت بھولو کہ اس گھر میں وہ لڑکی بھی رہتی ہے۔" شہروز نے احساس دلایا تو وہ مزید بھڑک اٹھا۔

"آئی ڈونٹ کیئر۔ امی آپ نے میرے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ لوگ تو لڑکیوں سے بھی پوچھ لیتے ہیں اور آپ نے مجھ سے پوچھنا یا بتانا بھی گوارا نہیں کیا۔ حق ہے مجھ پر لعنت ہے ایسی زندگی پر۔" وہ غصے میں چراغ پا ہو رہا تھا۔

"میں نے تم سے پوچھا تھا۔ تم نے خود ہی کہا تھا کہ مجھے کوئی لڑکی پسند نہیں جو کچھ بھی ہوگا میری امی کی مرضی سے ہوگا۔ بس تم پچھلے برس شادی نہیں کرنا چاہتے تھے۔"

"ہاں تو اس ساری بات میں یہ لڑکی کہاں سے نکل آئی۔ ٹھیک ہے میں فوراً شادی پر بھی آمادہ ہوں مگر اس لڑکی سے نہیں۔" کچھ دھیما پڑتے اس نے کہا تو وہ حیران ہوئیں۔

"کیا اس لڑکی، وہ لڑکی لگا رکھا ہے۔ دنیزے نام ہے اس کا۔ کیا کمی ہے اس میں؟" دنیزے کے متعلق واصق کا اتنا شدید ری ایکشن دیکھ کر وہ حیران تھیں۔ اب بھی پوچھتے ہوئے ان کی آواز دکھ سے پھٹی ہوئی تھی۔

"امی اس میں کچھ کمی نہیں وہ بہت ڈیفرنٹ لڑکی ہے۔ میں خود کو اس کے قابل نہیں سمجھتا۔" امی کی دکھ سے پھٹی آنکھیں دیکھ کر وہ کچھ دھیما پڑ گیا جبکہ ذہن میں دنیزے کی کہی گئی تمام باتیں گھوم رہی تھیں۔ وہ کیسے بھول جاتا جو اس نے کہا تھا۔

"یہ ٹھیک ہے میں اپنی کسی مجبوری کی وجہ سے آپ کے در پر پڑی ہوئی ہوں مگر کوئی گری پڑی نہیں ہوں۔ نہ ہی ان لڑکیوں جیسی ہوں، جن سے آپ کا واسطہ ہوتا ہوگا۔" ابھی تو وہ اپنے دل کو سمجھا رہا تھا کہ گھر والوں نے یہ نیا انکشاف کر دیا تھا۔

"امی وہ ہمارے گھر صرف اس مقصد کے لئے تو نہیں ٹھہری تھی کہ ہم اس کو اپنے ہی گھر رکھ لیں۔ امی اس رشتے کو اس کی مجبوری مت بنائیں۔ ہم ویسے بھی تو اس کو تحفظ فراہم کر سکتے ہیں۔ کیا یہ سب کرنا بہت ضروری ہے۔ آپ خود سوچیں کتنی ناشائستہ بات ہے۔"

"تم اپنی یہ فلاسفی اپنے پاس رکھو۔ یہاں رہنا اس کی کوئی مجبوری نہیں۔ اس کا بھائی ہے تم سے بہتر تحفظ فراہم کر سکتا ہے۔ بات ساری حقیقی رشتے کی ہے۔ جو تم نہیں سمجھ رہے اور مجھے شائستہ ناشائستہ کے قاعدے مت پڑھاؤ۔ میں نے اسے بیٹی کہا ہے اور ماں اپنی بیٹی کو کن ہاتھوں میں محفوظ دیکھ سکتی ہے تم نہیں سمجھ سکتے۔ اگر تمہیں یہ قبول ہے کہ تم میری بیٹی سے شادی کرو گے تو مجھ سے کوئی تعلق رکھنا ورنہ کوئی ضرورت نہیں مجھے ماں کہنے کی۔ جو جی چاہے کرو، اور جہاں جانا چاہتے ہو چلے جاؤ۔ میں سمجھوں گی میرا کوئی بیٹا ہی نہیں ہے۔" وہ ایک جذباتی بلیک میلنگ

"امی۔ [illegible] سادگی سے انہوں نے کہہ دی تھی۔ اپنے سب سے لاڈلے اور چہیتے بیٹے کو۔ وہ بے یقینی سے دیکھتا رہا۔

"امی پلیز آپ مجھے سمجھنے کی کوشش کریں۔" وہ بے چارگی سے بس اتنا کہہ سکا۔

"بس میں نے جو سنا تھا وہ کہہ دیا۔" امی کو ابھی تک واصق کا دنیزے کے متعلق توہین آمیز لہجہ نہیں بھول رہا تھا۔ تبھی ضد میں ہو گئی اسے کچھ بھی کہنے سے ٹوک دیا۔

"ٹھیک ہے جو جی چاہتا ہے کریں۔ بعد میں مجھ سے کچھ مت کہیے گا اور بس اس لڑکی سے بھی پوچھ لیں یہ ہو کہ وہ بھی مجبوری میں پھنسی ہو۔" ہارے ہوئے جواری کی طرح شکست خوردہ لہجہ تھا۔

وہ خاموشی سے دروازے سے ہی اوٹ اپنے کمرے سے نکل چلی آئی۔

بڑی امی، واصق اور شہروز کے درمیان ہونے والی تمام گفتگو اس نے حرف بہ حرف سن لی تھی۔ پہلے اسے یقین تھا کہ یہ رشتہ طے کرنے کا شوشہ ضرور واصق نے چھوڑا ہو گا۔ اب حقیقت جان کر وہ دنیزہ دوہری دہشت ہوگئی۔ واصق اسے اس بری طرح ناپسند کرتا تھا اسے توقع نہیں تھی۔

"کیا کروں؟" دونوں ہاتھوں میں سر دیئے وہ اپنی کنپٹیاں سہلاتے وہ بری طرح الجھ گئی۔

"اتنی بے عزتی اور بے توقیری... خدا کبھی بھی کسی کو کسی کے در کا محتاج نہ کرے۔" وہ دکھ سے سوچتی رہی۔

بڑی امی کی محبت، سب جانی کی مجبوری اور واصق جہانگیر کی ناپسندیدگی نے اسے خاصا الجھا دیا تھا۔ بے یقینی و بد اعتمادی کے دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا۔ وہ کس کس بات پر یقین کرتی۔ وہ جو اس کے کانوں نے ابھی سنی تھیں یا وہ جو ایک سال پہلے روشانے نے کہی تھی کہ یہ شخص اس کا یار ہی ہے۔ چلو وہ روشانے کی بات کو بھی جھٹلا دیتی مگر اس نے اپنی آنکھوں سے خود نہ دیکھا ہوتا۔ وہ روز واصق کا روشانے کو پک اینڈ ڈراپ کرنا کیا تھا۔ اسے اپنا دماغ پھٹتا ہوا محسوس ہوا۔

"یا اللہ کیا کروں؟" اس نے بہت الجھتے ہوئے خود کو بستر پر گرا دیا۔

* * *

رشتہ طے ہونے کے اگلے دن سب نے مل کر مشورے سے شادی کی تاریخ فکس کر دی تھی۔ رمضان سے دو دن پہلے شادی تھی۔ درمیان میں صرف بیس دن ہی بچے تھے۔ وہ اس افراتفری اور عجلت میں طے ہونے والی ڈیٹ پر بھونچکا ہی تو رہ گئی۔ وہ جو بھیا بھابی سے ملنے اور بات کرنے کی سوچے بیٹھی تھی اس نئی افتاد پر ہراساں ہوگئی۔ شادی سے انکار کی حسرت تو دل میں رہ گئی بلکہ آنے

والے دنوں کی فکر ستانے لگی۔

جویریہ اپنی نندوں اور ساس کے ساتھ کوئٹہ آ گئی تھی اور رشتہ دار بھی اکٹھے ہونا شروع ہو گئے تھے۔ خوب زور و شور سے تیاریاں ہونے لگیں۔ گھر کی سب خواتین، گھر اور بازاروں کے چکروں میں بے حال ہوئی جا رہی تھیں۔ دوسری طرف بھیا اور بھابی کا بھی یہی حال تھا۔ جب بھی آتے کھڑے کھڑے ہی حال چال دریافت کر کے چلے جاتے اور وہ ان سے تنہا سہولت سے بات کرنے کا سوچتی ہی رہ جاتی تھی۔

واسق سے اس کا سامنا بہت کم ہوتا تھا۔ جب بھی سامنا ہوتا وہ یوں نظر انداز کر کے گزر جاتا تھا جیسے سرے سے اس کا وجود ہی نہ ہو۔ وہ اس رویے سے ذرا الجھ جاتی تھی۔

سب خواتین بازار گئی ہوئی تھیں۔ گھر میں کچھ مہمان لڑکیاں دادی اماں اور وہ خود تھی۔ جب سے تاریخ طے ہوئی تھی دادی اماں نے باقاعدہ کمرے میں بند کیے ہوئے تھیں۔ اب بھی اکتا کر باہر نکل آئی۔ دادی اماں تخت پر براجمان تھیں وہ ان کے پاس جانے کی بجائے بڑی ای کے کمرے میں گئی۔ آہستگی سے دروازہ بھیڑ کر نمبر ملایا۔ ہیٹ ملا کر وہ بیڈ پر ٹک گئی۔

رابطہ ہوتے ہی دوسری طرف بھابی تھیں۔

"السلام علیکم بھابی کیسی ہیں آپ؟"

"وعلیکم السلام، میں ٹھیک ہوں، کہو کیسے فون کیا۔" بھابی کے انداز سے لگ رہا تھا کہ جیسے بہت عجلت میں ہوں۔

"وہ بھابی میں کتنے دنوں سے آپ سے بہت ضروری بات کرنا چاہ رہی تھی۔"

"ہاں کہو۔"

"وہ... وہ بھابی! میں واسق سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔" کچھ جھجکتے ہوئے اس نے کہہ دیا۔

"دماغ تو درست ہے مہار، ہوش میں تو ہو، کیسی باتیں کر رہی ہو تم۔"

"بھابی پلیز بھیا کو سمجھائیں نا۔ مجھے نہیں شادی کرنی اس سے۔" وہ ایک دم رو پڑی تھی۔

"ونیزے! بہت نان سینس ہو تم۔ خبردار! آئندہ تم نے یوں الٹا سیدھا بولا تو بہت برا کروں گی۔ ہم تمہاری خاطر دن رات پریشان ہو رہے ہیں اور تمہاری رٹ ہے کہ تمہیں شادی نہیں کرنی۔ کیا محبوب رحمانی کے ساتھ زندگی گزارو گی؟" انہوں نے تو آڑے ہاتھوں لے لیا۔

"پلیز بھابی، میں زبردستی اور مجبوری کا سودا نہیں بننا چاہتی۔"

"کس نے کہہ دیا تمہیں ایسا۔ مجبوری کیوں بھئی۔ اتنی محبت سے تو وہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ ہمیں تو عزت کے لالے پڑے ہوئے تھے، یہاں تو عزت کے ساتھ ساتھ جان بھی محفوظ ہے اور کیا چاہیے تمہیں۔"

"بس مجھے واسق پسند نہیں ہیں۔" اس نے اپنے آنسو صاف کرتے عذر بتایا جو سچ بھی تھا۔

"ہیں... " بھابی دوسری طرف حیران ہوئیں۔ "تمہارا واقعی دماغ چل گیا ہے۔ ایسے ہمسفر کی تو لڑکیاں خواب دیکھتی ہیں۔ بس اب اپنی زبان بند رکھنا۔ خبردار کسی سے بھی کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ ابھی وہ ناپسند ہے شادی ہو گی تو خود بخود ہی پسند کرنے لگو گی۔ جتنے بھی دن باقی ہیں خود کو تیار کرو۔ خود بھی خوش رہو اوروں کو بھی رہنے دو۔ میں فون بند کر رہی ہوں۔ کل آؤں گی پھر بات کروں گی۔" بھابی نے فون بند کر دیا تھا۔ وہ ریسیور کو گھورتی رہ گئی۔ ابھی وہ فون رکھ کر پلٹی ہی تھی جب کمرے کا دروازہ کھلا اور کوئی اندر داخل ہوا۔ واسق کو اپنے سامنے دیکھ کر حیران ہوئی۔

"آپ اس رشتے پر راضی نہیں تھیں تو پھر چھپایا کیوں؟" آتے ہی اس نے پتھر پھوڑے۔ وہ واسق کے سرخ چہرے کو دیکھے گئی۔

"میں نے کچھ نہیں چھپایا۔ مجھ سے کسی نے پوچھا ہی نہیں تھا۔" اس نے بھی صاف بات کہہ دی۔

"اب کیا چاہتی ہیں آپ؟" وہ سپاٹ چہرہ لیے پوچھ رہا تھا۔

"وقت اور حالات کے تقاضے کبھی بھی میری سوچوں اور خواہشوں کے محتاج نہیں رہے۔ اگر بھیا اور بھابی کی زبان کا پاس نہ ہوتا تو انکار کرنے میں ایک دن بھی نہ لگاتی۔" اس نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔ واسق نے ہونٹ بھینچ لیے۔

"ٹھیک ہے میں امی سے انکار کر دوں گا۔ زبردستی اور مجبوری کے سودے کا میں بھی قائل نہیں ہوں اور آپ کو بھی امی سے بات کر لینی چاہیے۔"

"کیا بات کروں؟" اس نے تلخی سے پوچھا۔ تو واسق نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا۔

"یہی کہ آپ رشتے پر خوش نہیں اور میں آپ کو پسند نہیں۔" چبا چبا کر اس نے کہا۔

"بات صرف پسند کی نہیں اعتماد اور یقین کی بھی ہے۔" ناگواری سے کہتے وہ دروازے کی طرف بڑھی جہاں وہ دیوار بنا کھڑا تھا۔ "میں نے جو سنا تھا وہ میں بھابی سے کہہ چکی ہوں اور جو انہوں نے جواب دینا تھا وہ دے دیا۔ اب نہ مزید کچھ کہنے سننے کی خواہش ہے اور نہ ہی ضرورت۔" صاف اکھڑے لہجے میں کہتے وہ اس کے قریب سے نکل گئی تھی۔

واسق یونہی کھڑا رہا۔ مطمئن تو وہ پہلے بھی نہیں تھا۔ اب یہ جان کر کہ وہ تو سرے سے راضی ہی نہیں۔ دل پر آرے چلنے لگے تھے۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنے خود سر جذبوں کو سمجھایا تھا۔ اب جس طرح اس کی بھابی سے فون پر ہونے والی تمام باتیں سن کر پھر اڑیل ٹٹو کی طرح باغی ہونے لگا تھا۔ اس نے تو یونہی گھر آتے ہی فون کرنے کے لیے ریسیور کان سے لگایا تھا تو ای کے کمرے میں رکھے فون پر ہونے والی اس کی اور بھابی کی تمام باتیں اس کی سماعتوں میں پڑ گئی تھیں۔ یہ سب باتیں اسے پھر اک نئی اذیت سے دوچار کرنے لگی تھیں۔ امی کو تو کبھی بھی انکار کو نہیں مانیں گی، وہ دو رسیائی جو صورت تھی وہ بھی سمجھوتے کی راہ ہموار کرنے والی تھی۔

* * *

وقت رکنے سے کبھی رکتا ہے۔ اس کی تو سرشت میں رکنا ہی نہیں ہے۔ بات طے ہونے اور شادی ہونے تک کا دورانیہ بہت ہی تیز رفتاری سے گزر گیا تھا۔ واسق نے اپنی پوری کوشش کر لی تھی کہ کسی نہ کسی طرح امی کو یہ بات ہی ختم کر دینے پر راضی کر لے۔ اس کی تمام کوششیں بے کار گئیں۔ امی کی دھمکی جوں کی توں برقرار تھی۔ آخر کار تھک ہار کر اس نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا۔ دوسری طرف کم و بیش ونیزے کی بھی یہی حالت تھی۔ واسق ساری شادی کے دوران بہت ہی چپ چاپ اور سنجیدہ رہا تھا۔ ہر رسم میں یوں شریک رہا گویا سر پر پڑا ہوا بوجھ اتار رہا ہو۔ ادھر ونیزے نے بھی بالکل خاموشی و ناپسندیدگی و ناگواری کو اندر دبائے اس بندھن کو قبول کر لیا تھا اور پھر وہ ہوٹل سے رخصت ہو کر واسق کے ہمراہ قدم اٹھاتی دوبارہ اس گھر میں ایک نئی اور پر استحقاق حیثیت سے داخل ہوئی۔

حجلۂ عروسی میں بیٹھے اس نے سرسری ایک نظر اس کمرے پر ڈالی وہ اس کمرے میں پہلے بھی جا چکی تھی تب گمان اندازہ نہ تھا کہ کبھی دلہن بنی اس نئی حیثیت سے بھی اس کمرے میں بیٹھی ہو گی۔ بھابی اور بھیا نے اسے بہت سمجھایا تھا۔ محبوب رحمانی کے ڈراوے دیے تھے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی آئندہ زندگی کے متعلق بہت ساری باتیں سوچ ڈالیں۔ اب بھی آنے والے وقت اور حالات کا خیال کر کے اس نے خود کو ریلیکس کرنا چاہا مگر اندر جو بھی کھلبلی مچی ہوئی تھی وہ کسی بھی طور پر کم نہیں ہوئی تھی۔ اس نے خود واسق سے جو کچھ بھی کہا تھا جواباً اس نے جن الفاظ میں اس کی عزت افزائی کی تھی وہ اب بھی نہیں بھولی تھی۔ اس کے الفاظ جب بھی یاد آتے وہ تنفر سے

انا سیدھا سوچنے لگتی۔ بڑی مشکل سے اس نے خود کو حالات کے حوالے کر کے اس رات کے لئے تیار کیا تھا۔ اب بغیر کسی اشتیاق و بے تابی سے واثق کی منتظر تھی۔ وینزے نے خاموشی سے بیڈ کے کراؤن سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ اس حالت میں بیٹھے ہوئے ابھی اسے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا جب دروازے پر کھٹکا ہوا۔ وہ فوراً سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

واثق جس آہستگی سے کمرے میں داخل ہوا تھا اسی آہستگی سے اس نے اپنے پیچھے دروازہ بھی لاک کیا۔ آہستہ روی سے چلتے وہ بستر کے قریب آ کھڑا ہوا۔ چند لمحے سوچنے کے بعد وہ وینزے سے کچھ فاصلے پر بیڈ کے کنارے پر ٹک گیا۔ جب بولا تو آواز بہت ہموار تھی۔

"مجھے افسوس ہے وینزے کہ آپ کو انتہائی ناپسندیدگی و ناگواری کے باوجود مجھ سے شادی کے لئے آمادہ ہونا پڑا۔ میں آپ کی مجبوری سمجھتا ہوں اور یہ بھی اندازہ لگا سکتا ہوں کہ آپ بخوشی اس بندھن پر آمادہ نہیں ہوئیں۔ اس مجبوری کے پیچھے وجوہات کیا تھیں میں اس سے بھی بخوبی آگاہ ہوں۔ آپ میرے بارے میں اچھے جذبات نہیں رکھتیں۔ مجھے پسند کیا، آپ تو اعتبار اور یقین تک نہیں کرتیں، جبکہ یہ رشتہ سب سے پہلے اعتماد اور یقین اور محبت کی ڈیمانڈ کرتا ہے۔ ایم سوری، تینوں چیزیں ہم دونوں کے درمیان نہیں پائی جاتیں۔ آپ کی ناپسندیدگی جاننے کے بعد میں نے امی سے دوبارہ انکار کیا تھا مگر انہوں نے میرے انکار کی جو سزا مجھے سنائی تھی وہ میرے لئے ناقابل قبول تھی۔ نتیجتاً آپ یہاں ہیں۔ بہرحال کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا میری سرشت نہیں اور یقیناً آپ بھی پسند نہیں کریں گی کہ میں آپ کی خواہش کے برعکس اپنا کوئی حق استعمال کروں، جبکہ میں پہلے بھی واضح کر چکا تھا کہ خالی خولی جسم کبھی بھی میری ڈیمانڈ نہیں رہا۔ آپ تھک گئی ہوں گی، پلیز چینج کر کے آرام سے سو جائیں اور میری طرف سے فکرمند نہ ہوں۔ میں اپنے قول و فعل کا بہت پکا ہوں۔"

وہ جو کچھ دیر پہلے تک سہمی ہوئی سی بیٹھی تھی اتنی غیر متوقع گفتگو سن کر حیران سی اسے دیکھے جا رہی تھی۔ واثق نے ایک نظر اٹھا کر اسے دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ واثق کے خاموش ہو جانے پر بھی وہ بغیر پلکیں جھپکائے اسے دیکھے جا رہی تھی۔ اس کے وجود میں کوئی حرکت نہ ہوئی تو واثق نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

کئی لمحے نظر پلٹنا بھول گئی۔ دیوانہ دل ایکدم بے قابو ہوا۔ ساری تقریب میں وہ اپنی نظر بچاتا رہا تھا۔ اپنے دل کو سمجھاتا رہا کہ کہیں بھول کر بھی نگاہ اس دشمن جاں کی طرف نہ اٹھ جائے۔ مگر اب اٹھی تو ساری احتیاطیں بے کار گئیں۔ دل و ذہن کو سب سمجھانا تھا، رائیگاں ٹھہرا۔ واثق کو اس کے نیوٹ سائن کی طرح جگمگاتے چہرے پر بےخودی کی کیفیت میں نظریں جمائے اسے یوں محسوس ہوا جیسے آج قدرت نے اسے کائنات کے سارے حسن سے نواز دیا ہے۔ حسین تو وہ بے تحاشا پہلے بھی تھی مگر اب چودھویں کے چاند کی طرح جگمگاتے حسن کی چھب ہی نرالی تھی۔ بیوٹیشن کی کمال مہارت سے کی گئی تیاری نے اسے شعلہ جوالہ بنا دیا تھا اور اب وہ ناحق ناشکری کر رہا تھا۔

"کیا آج رات روئے زمین پر اس سے زیادہ حسین وجود کہیں اور ہوگا؟" اس کے دل نے اسے ورغلایا۔ اس نے نظر پھیر لی۔ بستر سے اٹھنا چاہا تو کچھ یاد آ گیا۔ پھر دوبارہ بیٹھ گیا۔ اس نے جیب سے مخملی ڈبیہ نکالی۔ شادی کے دوران وہ اس قدر اپ سیٹ رہا تھا کہ دلہن کے لئے کوئی گفٹ کے متعلق لاعلمی کا اظہار کر دیا تھا۔ وہ خاصا برہم ہوا اور پھر اسے لے کر پہلے اسے گفٹ خرید کر دیا تھا، بعد میں امی سے شکایت کر کے خوب سنوائی تھیں۔

"امی کی خواہش تھی کہ آپ کو یہ گفٹ دے دوں۔ لائیں میں پہنا دوں۔" مخملی ڈبیہ سے کنگن نکال کر اس نے یونہی دم سادھے بیٹھی کو اس کا ہاتھ تھاما۔ آہستگی سے کنگن پہنا کر اس کے ہاتھ کو دیکھا۔ گجروں کی بھینی بھینی خوشبو اور نرمی سے سجا اس کا ہاتھ پہلے ہی زیور سے بھرا ہوا تھا بلکہ وہ پوری کی پوری ہی خاصی زیور سے لدی ہوئی تھی۔ ان دو کنگنوں سے کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ خاموشی

سے اس کا ہاتھ چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ڈریسنگ کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے پہلے کوٹ اور پھر ٹائی بھی اتاری۔ الماری سے اپنا سلیپنگ سوٹ نکال کر باتھ روم میں گھس گیا۔ وہ جو بت بنی سب دیکھ رہی تھی۔ باتھ روم کا دروازہ بند ہوتے ہی اپنے ہاتھ کی جانب دیکھنے لگی۔ واثق کی تمام باتیں اس کے دل میں تر و تازہ ہو گئی تھیں۔ اس نے ناچاہتے ہوئے بھی خود کو سمجھانے بہت کچھ سوچ رکھا تھا اور اب اس طرح کی عزت افزائی پر دل چاہا دل کھول کر روئے۔ دل مطمئن ہونے کے بجائے اور کھولنے لگا تھا۔ وہ گھٹنوں پر سر رکھے بیٹھی رہی۔ یہاں تک کہ واثق لباس بدل کر واپس آ گیا تھا۔ وینزے کو جیسے کسی بھی بات کا ہوش نہیں رہا تھا۔ واثق نے کچھ حیرت سے اسے دیکھا وہ بغیر حرکت کئے بیٹھی ہوئی تھی۔ اچانک دل میں کسی خیال نے سر ابھارا تو فوراً بستر کی طرف آ گیا۔ اس کے قریب رک کر اس کو آواز دی۔

"وینزے۔" واثق کی پکار پر اس نے اپنا سر اٹھایا۔ خاموشی سے گردن اٹھا کر اسے دیکھا اور اسی خاموشی سے اٹھ کر اس کے قریب سے گزرتی ڈریسنگ کے سامنے کھڑی ہو کر ایک ایک زیور اتارنے لگی جو بھابی صبیحہ نے بڑے ارمانوں سے پہنایا تھا۔

واثق نے رخ موڑ کر وینزے پر ایک سرسری مطمئن نگاہ ڈالی پھر وقت دیکھا، رات کا ایک بج رہا تھا۔ الماری سے دوسرا کمبل نکال کر وہ بیٹھ گیا۔ بستر پر بیٹھتے ہی اس نے کمبل کھولا، لیٹتے ہی کچھ طرح اوڑھا۔

"سونے سے پہلے پلیز لائٹ آف کر دیجئے گا۔"

کمبل میں سر دینے سے پہلے اس نے خاص ہدایت کی۔ دوسری صبح معمول کے مطابق ہی بیدار ہوا تھا۔ آنکھیں کھلتے ہی اس کی نظر سیدھی جائے نماز پر بیٹھی ہاتھ اٹھائے دعا مانگتی وینزے پر پڑی۔ وہ بلا ارادہ ہی اسے تکتی نظر سے دیکھتا رہا۔ دعا ختم کر کے وہ قرآن مجید لے کر صوفے پر بیٹھ کر تلاوت کرنے لگی تھی بہت آہستہ آواز میں۔ اسے قرآن مجید پڑھتے دیکھ کر واثق جہانگیر کے اندر ایک عجیب سا احساس جاگا تھا۔ کلاک دیکھا، ابھی نماز کا وقت تھا۔ وہ فوراً ہی [illegible] باتھ روم میں گھس گیا۔ جلدی سے وضو کر کے باہر نکل [illegible] کا ارادہ، وہ نماز ادا کرنے لگا تھا۔

ابھی وینزے تلاوت قرآن سے فارغ ہو کر بیٹھی ہی تھی کہ کمرے میں وجیہہ، جویریہ اور ان کی پھوپھو زاد کزنیں اندر آ گئیں۔

"بہت جلد اٹھ گئے تھے دونوں۔" جویریہ نے اس کے پاس بیٹھتے اور گرد و نواح نظر ڈالتے پوچھا۔

"جلد آنکھ کھل گئی تھی۔"

"مشکل سے ہی کھلتی ہے۔ میں تو ساری رات جاگنے کی وجہ سے صبح گیارہ بجے اٹھی تھی۔ وہ بھی بعد میں جھولتی رہی۔"

جویریہ کے فخر کرنے پر وہ مسکرا دی۔

"دولہا میاں کہاں ہیں؟" اس کا اشارہ واثق کی طرف تھا۔

"پتا نہیں۔ میں نماز ادا کر رہی تھی۔ جب وہ باہر نکل گئے۔"

"اچھا... ہم تمہیں تیار کرنے آئے تھے۔ تھوڑی دیر میں تمہارے گھر سے ناشتہ آ جائے گا۔" وہ اس کے قریب سے اٹھ کر الماری کھول کر اس کے لئے کپڑوں کا انتخاب کرنے لگیں۔ تھوڑی دیر میں جویریہ، وجیہہ اور دوسری کزنوں نے مل کر اسے تیار کر دیا تھا۔ ہلکا پھلکا میک اپ کرنے کے بعد ایک ہلکا سا گولڈ کا سیٹ بھی پہنا دیا تھا۔

بازوؤں میں وجیہہ کانچ کی چوڑیاں ڈالنے لگی تو اس نے منع کر دیا۔

"میں یہ کنگن پہن لیتی ہوں۔" پہلی دفعہ اس نے خود سے کوئی رائے دی تھی۔

"لگتا ہے یہ واثق بھیا کی طرف سے گفٹ ملا ہے۔" اس کے کنگنوں پر ہاتھ پھیرتے جویریہ کی کزن نے کہا تو اس جھینپتے ہوئے سر جھکا دیا۔

تھوڑی دیر تک وہ سب کے ساتھ باہر بیٹھی رہی پھر ناشتہ کے لئے جویریہ اسے دوبارہ کمرے میں لے آئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد واسق بھی آ گیا تو اس نے ٹرالی اپنی طرف کھسکا کر چائے بنائی۔ کپ اس کی طرف لے جاتے ہوئے وہ ذرا رکی تھی کہ شاید وہ [illegible] نہیں۔

"پلیز یہ چائے لے لیں۔" واسق باہر سے اخبار لے کر آیا تھا۔ اب وہ ناشتے کے بجائے اخبار کو چاٹ رہا تھا جب آواز پر اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ چائے لئے منتظر تھی۔ اس نے جلدی سے کپ تھام لیا۔

"شکریہ۔"

وہ دوبارہ صوفے پر جا بیٹھی۔

"میں صرف چائے ہی پیوں گا کھانے کی طلب نہیں۔ پلیز آپ تکلف مت کریں۔" اسے سائیڈ پر چیزیں لگاتے دیکھ کر اس نے کہا تو ونیزے کے ہاتھ رک گئے۔ اسے دیکھا مگر وہ دوبارہ اخبار میں گم ہو چکا تھا۔ بے دلی سے اس نے تنہا ہی ناشتہ زہر مار کیا۔ شام کو ولیمہ ہوٹل میں ہی منعقد ہونا تھا۔ چونکہ اگلی صبح پہلا روزہ تھا اسی لئے سب نے ہی شام میں ہی ولیمے کی تقریب دینے پر اصرار کیا تھا۔ بھیا بھابی کی بھی یہی رائے تھی۔

ولیمے کی تقریب میں بھی وہ کسی شہزادی سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ لوگوں کی نظروں کے ساتھ ساتھ آئینے نے بھی گواہی دی تھی کہ وہ آج پہلے دن سے زیادہ حسین لگ رہی ہے مگر دل کے اندر کوئی لہر نہیں اٹھی تھی۔ اندر کا سمندر جو کافی ساکن تھا۔ تنگ آ کر اس نے خود کو حالات کی گرفت میں چھوڑ دیا۔

سارے دن کی تھکن سے برا حال تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ وہ کچھ بھی اتارے بغیر یونہی سو جائے جبکہ دوپہر میں بڑی امی اور جویریہ نے اسے نیند کی گولی دے کر سلا دیا تھا مگر وہ ولیمے سے کچھ دیر پہلے بیدار ہوئی تھی مگر اب نرم و گرم بستر دیکھ کر اس خواب آگیں ماحول میں اس کا دل اسے ایک گہری نیند لینے کو بار بار اکسا رہا تھا۔ پھر وہ خود کو زیادہ دیر تک نہ بہلا سکی۔ کپڑے، زیور اتارے بغیر ہی بستر پر گر گئی تھی۔ واسق کمرے میں سے باہر تھا جب تک وہ اندر آتا وہ تھوڑا سا آرام کر لیتی یہی سوچ کر اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

صبح پہلا روزہ تھا وہ بچپن سے سارے روزے رکھتی آئی تھی اس دفعہ بھی سب روزے رکھنے کا پکا ارادہ تھا اور ابھی تو اسے نماز تراویح بھی ادا کرنا تھیں۔ جیسے تک وہ یہی سوچتی رہی پھر جب نیند نے غلبہ پا لیا تو وہ اپنی آنکھیں بند ہونے سے نہ روک پائی۔

واسق کمرے میں آیا تو وہ بغیر زیور اتارے، لباس تبدیل کئے محو خواب تھی۔ پتا نہیں وہ کتنا تھکی ہوئی تھی جو اس طرح بے خبر سو گئی تھی۔ واسق کے نزدیک تب اس وجود کی بھرپور تھکن کا احساس جاگا تھا۔ دل چاہا لمحوں میں آگے بڑھ کر اس بے خبر وجود کی ساری تھکن خود میں سمیٹ لے۔ اتنا تو وہ کر سکتا تھا مگر وہ دل کو روک گیا۔

صبح جلدی اٹھنا تھا خیال آتے ہی اس نے لباس بدل کر بستر پر اپنی جگہ سنبھالی۔ لائٹ یونہی جلتی رہنے دی تھی۔ وہ ہمیشہ لائٹ آف کر کے سونے کی عادی تھی۔ چونکہ وہ خود بھی خاصا تھکا ہوا تھا نرم و گرم بستر پر دراز ہوتے ہی لمحوں میں غافل ہو گیا تھا۔

سوتے سوتے ونیزے کو سخت گھبراہٹ ہوئی تھی اس نے اچانک آنکھیں کھول دیں۔ بے اختیار بستر پر اٹھ بیٹھی۔ ہونٹوں پر زبان پھیرتے اس نے اپنے ارد گرد ایک نگاہ کی۔ جہاں اپنے جلنے کا احساس ہوا وہاں یہ بھی یقین ہو گیا کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہی تھی۔

"کیا خواب دیکھا ہے میں نے؟" اپنے ذہن پر زور دیتے وہ بستر سے اتر گئی۔ ایک ایک زیور اتارتے وہ خواب کے متعلق ہی سوچ رہی تھی۔

اسے یاد آیا کہ اس نے دیکھا تھا وہ اور واسق ایک ایسی جگہ پر کھڑے ہیں جو پہلے تو بالکل سنسان اور ویران تھی پھر تھوڑی

دیر بعد وہاں اکا دکا لوگ نظر آنے لگتے ہیں۔ چند لمحوں بعد وہ اس سنسان جگہ پر چہل قدمی کر رہی ہوتی ہے کہ اچانک کہیں سے کوئی پرندہ تیزی سے اڑتا اس کی طرف آنے لگتا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ اس پر حملہ کرتا وہ جلدی سے واسق کی طرف بڑھنے لگتا ہے کہ وہ واسق پر حملہ کرتا، ونیزے کی چیخیں نکل جاتی ہیں ساتھ ہی اس کی آنکھ بھی کھل جاتی ہے۔

"او میرے خدا، کتنا بھیانک خواب۔" خواب کی تمام جزئیات یاد کرتے ہی اس کی پیشانی پسینے سے تر ہو گئی۔ دل کی دھڑکن معمول سے زیادہ تیز تھی۔ خوف دہشت سے سارا جسم کانپ رہا تھا۔ وہ تیزی سے گلے سے اتارا زیور ڈریسنگ پر پھینکتے واسق کے قریب جا رکی۔ وہ کسی اچھی طرح لیٹے سو رہا تھا۔ ونیزے کا شدت سے جی چاہا کہ وہ اسے جھنجوڑ کر اٹھا دے اور پھر پوچھے کہ وہ ٹھیک تو ہے۔ وہ ایک دو منٹ کھڑی رہی پھر اپنی سوچ پر عمل کرنے کے بجائے دوبارہ ڈریسنگ کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ سارا زیور سنبھال کر اپنا نائٹ ڈریس نکال کر پہلے ولیمے والا لباس اتارا، پھر وضو کر کے جائے نماز بچھالی۔

* * *

رمضان المبارک کا بابرکت رحمتوں والا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ معمول تھا صبح سحری کے وقت اٹھ جاتی تھی۔ بڑی امی، چھوٹی چچی اور جویریہ سحری تیار کرتیں تو وہ چپ چاپ دیکھتی رہتی۔ ایک دو دفعہ اس نے ہاتھ بٹانا چاہا تو کاری جان نے اسے خاصی ڈانٹ پلا کر بٹھا دیا کہ ان کے گھر میں نئی دلہن دو ماہ تک کسی چیز اور کام کو ہاتھ نہیں لگاتی۔ ان کی باتوں کی وہ پہلے ہی گرویدہ تھی اب بھی نہال ہو گئی۔

افطاری کے وقت وہ اور واسق دیگر اہل خانہ میں نہ کہیں [illegible] ہوتے تھے۔ نئی نئی شادی ہوئی تھی روز کوئی نہ کوئی دعوت دینے چلا آتا تھا۔

آج چوتھا روزہ تھا وہ سب کو بڑی امی کی بہن کے ہاں افطار پر جانا تھا۔ امی کی خاص تاکید تھی کہ وہ افطاری سے دو تین گھنٹے پہلے ہی چلے جائیں۔ باقی سب بعد میں آ جائیں گے۔ چونکہ امی کا حکم تھا سو دونوں تین بجے ہی تیار ہو گئے۔ جویریہ کی پہروز فرمائش اور پھر ضد پر اس نے بلیک ساڑھی پہنی تھی۔ موسم کی مناسبت سے کندھوں پر گرم شال لپیٹ لی تھی۔ جویریہ نے ہی اسے تیار کیا تھا۔ سج سنور کر وہ اور بھی خوبصورت لگنے لگی تھی۔ واسق بھی بالکل تیار تھا وہ جویریہ کے ہمراہ نکلی تو بڑی امی اسے اس روپ میں دیکھ کر نہال ہو گئیں۔

"ماشاء اللہ اللہ نظر بد سے بچائے۔" انہوں نے والہانہ پیار کرتے اس کا ماتھا چوما تو دادی اماں نے بھی اسے گلے لگا لیا۔

"جیتی رہو، خدا سدا سہاگن رکھے۔" امی کی طرح پیار کرتے انہوں نے بھی دعا دی۔ وہ جھینپ سی گئی ایکدم بلش ہوئی تھی۔ واسق حواس کی کیفیت سے بے خبر یہ سب مظاہرے دیکھ رہا تھا۔ دیر ہو جانے کے احساس سے چڑ گیا۔

"اب چلیں بھی... اور کتنا وقت لگانا ہے۔" اپنی ناگواری چھپاتے اس نے کہا تو امی نے اسے گھورا۔

"تمہیں بڑی جلدی ہے دو منٹ انتظار کر لو۔" انہوں نے اسے جھڑکا تھا۔ امی کا صاف جواب سن کر وہ پاؤں پٹختے باہر نکل گیا۔ ونیزے اپنی جگہ سہم سی گئی نجانے وہ اب اسے کیا کہے۔

"لو... اسے کیا ہوا۔" دادی اماں کے لئے یہ سب نیا تھا وہ حیران ہوئیں، امی جو کہ واسق کے رویوں، انکار اور اب خاموش پالیسی اور چڑچڑے پن سے اچھی طرح باخبر تھیں، انہوں نے فوراً بات بدلی۔

"کچھ نہیں... بس یونہی چڑچڑا ہو رہا ہے۔ چلو جاؤ ونیزے وہ باہر گاڑی میں انتظار کر رہا ہو گا۔" اماں کو کہتے انہوں نے اسے بھی اشارہ کیا۔ وہ بے دلی سے اٹھ آئی۔ اسے واسق کے یہ رویے اندر ہی اندر بہت تکلیف دیتے تھے۔ اب بھی وہ کچھ غمگین سی ہو گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ باہر نکلتی جویریہ نے اسے پیچھے سے آواز دی۔

"دنیزے بھابی! آپ کی بھابی کا فون ہے آ کر سن لیں۔"

بھابی کا سنتے ہی وہ فوراً ٹیلی فون کی طرف لپکی جلدی سے ریسیور کان سے لگایا۔

"ہیلو بھابی! السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔ اچھی ہونا۔" انہوں نے پوچھا۔

"جی۔"

"واسق کہاں ہے؟ ذرا اس سے بات تو کراؤ۔"

"وہ تو باہر ہیں۔ ایک منٹ رکیں میں بلواتی ہوں۔" انہیں کہہ کر اس نے اپنے پاس کھڑی وجیہ کو اشارے سے واسق کو بلانے کا کہا۔

"بھابی بھیا کہاں ہیں؟ وہ ٹھیک ہیں؟" اس نے دوبارہ کان سے ریسیور لگایا۔

"ہاں... نہیں..." بھابی کی سسکی ابھری تو وہ چونک گئی۔

"بھابی! کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے نا؟" ان کے انداز سے غیر معمولی صورت حال کا اندازہ ہوا تو بے قراری سے پوچھا۔

"خیریت نہیں ہے دنیزے میں بہت پریشان ہوں۔ پلیز واسق سے بات کراؤ۔" بھابی ایک دم رونے لگی تھیں۔ وہ حیران رہ گئی۔ واسق بھی آ گیا تھا اس نے اٹھتے ہوئے فون اس کی طرف بڑھا دیا اور بے چینی سے اسے دیکھنے لگی۔

"السلام علیکم بھابی۔ دنیزے بتا رہی تھی..."

"وعلیکم السلام۔ پلیز واسق جلدی آ جاؤ، امجد کا محبوب رحمانی سے بری طرح کلیش ہو گیا ہے۔ وہ خاصے زخمی ہو گئے ہیں میں ہاسپٹل سے بات کر رہی ہوں۔ دنیزے کو لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس تم خود ہی آ جاؤ۔" ایک اچٹتی نظر پریشان دنیزے کے بے چین چہرے پر ڈالی اور پوچھا۔

"کون سے ہاسپٹل میں ہیں؟" دنیزے ہاسپٹل کا لفظ سن کر اور پریشان ہو گئی۔

"جی اچھا میں فوراً پہنچتا ہوں۔ آپ فکر مت کریں۔" بھابی نے جیسے ہی ہاسپٹل کا نام بتایا اس نے فون بند کر دیا۔ دنیزے کی طرف دیکھے بغیر وہ جانے لگا تو اس نے فوراً روکا۔

"بتیے کیا ہوا ہے؟ بھابی کیا کہہ رہی تھیں اور ہاسپٹل میں کون ہیں؟" وہ روہانسی اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ واسق نے ایک گہری سانس لی۔

"کوئی نہیں، بس ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ آپ گھر والوں کے ساتھ ڈنر پر چلی جایئے گا۔"

"جھوٹ مت بولیں۔ بتایئے کیا ہوا بھیا کو؟" اس کے یوں بہلانے پر وہ ایک دم رو پڑی۔

"کچھ نہیں ہوا۔ بس ہلکا سا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ میں اس وقت وہیں جا رہا ہوں۔" واسق نے اسے اصل صورت حال بتانے سے پھر بھی احتراز کیا تھا۔ وہ کتنے کمزور دل کی مالک تھی وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کے باوجود وہ ایکسیڈنٹ کا لفظ سن کر اس کے حواس باختہ ہو گئے۔ ہونٹوں پر ہاتھ رکھے اس نے دیوار کا سہارا لیا۔

"نہیں... " ہونٹوں سے بمشکل نکلا۔

"پلیز دنیزے! وہ ٹھیک ہیں پریشانی کی کوئی بات نہیں۔" اسے تسلی دیتے ہوئے اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"میں بھی جاؤں گی آپ کے ساتھ۔" بچوں کا سا ضدی انداز تھا۔ واسق نے وقت دیکھا اور پھر اس پر نظر ڈالی۔ اس حالت میں وہ اسے کہاں لے کر جاتا۔

"نہیں، آپ کسی اور کے ساتھ بعد میں آ جایئے گا۔ میں فون کر دوں گا۔" اسے عجلت میں کہتے وہ اندر کچن میں امی کو بتانے چلا گیا۔

واسق رات گئے لوٹا تو دنیزے نے رو رو کر بری حالت کر لی تھی۔

اسے دیکھتے ہی وہ دادی اماں کی گود سے نکل کر بے اختیار اس کی طرف بڑھی۔

"کیا ہوا بھیا کو؟ کیسے ہیں وہ؟ اور آپ نے فون کیوں نہیں کیا تھا۔" واسق کا بازو پکڑ کر جھنجوڑتے وہ بے اختیار رو رہی تھی۔ نہ ہی اسے اپنا ہوش تھا نہ ہی اردگرد موجود لوگوں کا۔

"ٹھیک ہیں وہ۔ صبح لے جاؤں گا آپ کو بھی۔" اس کا بازو تھام کر اسے دوبارہ دادی اماں کے تخت پر بٹھایا۔ پھر خود بھی ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

بڑے چھوٹے چچا، شہروز، مہران، امی، دادی جان، وجیہ وغیرہ سب ہی اصل صورت حال جاننے کے منتظر تھے۔ اس نے چیدہ چیدہ ساری بات کہہ سنائی ساتھ یہ تسلی بھی دی کہ امجد بھائی ٹھیک ہیں۔ تشویش والی کوئی بات نہیں۔ دنیزے تو محبوب رحمانی کا نام سن کر ہی کانپ گئی تھی اور شدت سے رونے لگی۔

"یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔" یہی سوچ اسے مزید اداس کر رہی تھی۔

صبح وہ واسق کے ساتھ ہی بھیا کو دیکھنے ہاسپٹل گئی تھی۔ وہ ہوش میں تھے۔ زخم بھی نارمل تھے۔ اسے دیکھ کر وہ مسکرائے بھی۔

"کیسی طبیعت ہے اب آپ کی؟" کوشش کے باوجود آنسوؤں کو چھلکنے سے روک نہیں پائی تھی۔

"ٹھیک ہوں بیٹا۔" اس کے سر پر پیار پر شفقت ہاتھ رکھتے انہوں نے تسلی دی۔

"یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے نا۔" ان کے ہاتھ کو ہونٹوں سے لگاتے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"ارے نہیں میری جان، ایسا کیوں سوچتی ہو۔ بس بزنس کی بات پر جھگڑا ہو گیا تھا۔ سنبھالو خود کو، واسق پلیز تم ہی اسے سمجھاؤ..." اسے چپ کراتے کراتے انہوں نے واسق کو بھی دیکھا تو وہ آگے بڑھ آیا۔ بھیا کے بستر پر بیٹھی دنیزے کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"دنیزے بھیا کو کیوں پریشان کر رہی ہو۔ پلیز سنبھالو خود کو۔" کندھے پر دباؤ ڈالتے نہایت تحکم بھرے لہجے میں کہا گیا تھا۔ دنیزے نے فوراً اپنے آنسو صاف کئے۔

وہ کافی دیر تک ان کے پاس ٹھہری تھی۔ اس دوران واسق بھی وہیں رہا تھا۔ پورے تین گھنٹے بعد اس نے اس کو چلنے کو کہا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔

"مجھے نہیں جانا، میں بھیا کے پاس رہوں گی۔" بھیا ابھی آدھ گھنٹہ پہلے ہی سوئے تھے۔ واسق کو اس کے یوں منہ اٹھا کر انکار کر دینے سے غصہ بہت آیا۔ بھابی کی موجودگی کا خیال کرتے پی گیا۔

"یہاں بھابی ہیں، گھر سے امی اور دادی جان بھی آ جائیں گی۔ آپ میرے ساتھ واپس چلیں۔" بھابی کو دیکھتے ہی اس نے تیزی سے اس کا ہاتھ پکڑا اور باہر لے آیا۔ باہر آتے ہی دنیزے نے سختی سے اپنا ہاتھ چھڑایا۔

"میں یہیں رہوں گی۔ مجھے نہیں کہیں جانا۔"

دماغ تو ٹھیک ہے آپ کا۔ جانتی ہیں کتنا خطرہ ہے آپ کو۔"

"تو کیا ہوا، مجھے ہی خطرہ ہے نا، آپ کو تو نہیں۔" بدتمیزی سے جواب دینا اور بحث کرنا اس کی عادت نہیں تھی مگر واثق کے رویے نے اسے بولنے پر مجبور کر دیا تھا۔ انتہائی بے خوفی سے واثق کی آنکھوں میں دیکھتی کہہ رہی تھی۔

"دماغ چل گیا ہے آپ کا۔ وہ شخص جو آپ کے بھائی کو زخمی کروا سکتا ہے آپ کو بھی کوئی تکلیف پہنچا سکتا ہے۔ اب تو اسے یہ سب علم ہے کہاں رہتی ہیں، کہاں جاتی ہیں، کب جاتی ہیں اور کس کے ساتھ جاتی ہیں۔"

"تو ہونے دیں۔ آپ کو اس سے کیا۔ اگر مروں گی تو میں ہی نا۔ آپ کا یہ دردِ سر نہیں ہے۔" انتہائی بدتمیزی سے اس نے کہا تھا۔ واثق تاسف بھری نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

"آپ میری بیوی ہیں آپ کی حفاظت کرنا میری ذمہ داری ہے۔"

"ہونہہ..... کس نے کہا ہے میں آپ کی بیوی ہوں یا مجھے آپ کی حفاظت کی ضرورت ہے۔" آج واقعی ونیزے کا دماغ چل گیا تھا جو اس قدر بدتمیزی کرتی جا رہی تھی۔

"شٹ اپ دیرے میں مزید کچھ نہیں سنوں گا۔ آرام سے گھر چلیں۔"

"ہونہہ... مجھے کہیں نہیں جانا۔ یہ گارڈ اور آپ مجھ سے نہیں جیا جاتا۔ تنگ آ گئی ہوں اس قیدیوں کی سی زندگی سے۔" اسی کے لہجے میں کہہ کر وہ واپس بھیا کے گھر کے اندر جانے لگی تو تب دیر سے اس کی لن ترانیاں برداشت کرتا واثق حقیقت میں آؤٹ ہو گیا۔ فوراً اس کا بازو دبوچا اور تیز تیز قدم اٹھاتا باہر گلی میں کھڑی اپنی گاڑی کی طرف لے آیا۔ اگلی سیٹ کا دروازہ کھول کر اسے اندر دھکیلا دروازہ لاک کر کے دوسری طرف سے خود بھی آ کر بیٹھ گیا۔ واثق نے یہ سب اتنی جلدی کیا تھا کہ وہ کوئی بھی مزاحمت نہیں کر سکی تھی۔ بے بسی سے باہر دیکھنے لگی۔ گھر آ کر کمرے میں داخل ہونے کے بعد واثق نے اس کا بازو چھوڑ دیا۔

"میں آج تو آپ کی بدتمیزی برداشت کر گیا ہوں، آئندہ نہیں کروں گا۔ آپ کو اپنی جان کی پروا نہیں مگر اور بہت لوگوں کو ہے۔ میں اس لب و لہجے کا عادی نہیں ہوں۔ عزت کرتا بھی ہوں، اور کرواتا بھی ہوں۔ مائنڈ اٹ....."

دوٹوک انداز میں اسے باور کرا کے وہ باہر نکل گیا تھا۔ بستر پر گرتے ہی اس کا جی چاہا کہ اپنے نصیبوں کو پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔

وہ صرف ایک دفعہ ہی بھیا کو دیکھنے گئی تھی۔ اس کے بعد اسے خطرہ ہے کہہ کر واثق نے اسے کہیں بھی لے جانے سے انکار کر دیا تھا۔ اور بدقسمتی یہ تھی کہ دوسرے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔ کسی اور کے ساتھ تو جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس روز کے بعد واثق کے تیور ہی بدل گئے تھے۔ جب بھی بات کرتا تھا خاصا جارحانہ سوز ہوتا تھا۔ شائستہ اطوار ناشائستگی میں بدل گئے۔ کچھ اس نئی ٹینشن کی وجہ سے روز بروز ونیزے کے اندر بھی برداشت کم ہوتی جا رہی تھی۔ ہر وقت خود بھی کڑھتی رہتی تھی اور کوئی نہ کوئی ایسی بات یا حرکت کر جاتی تھی کہ اچھا خاصا کول مائنڈ واثق بھی جھنجلا اٹھتا۔

بھیا ہاسپٹل سے گھر شفٹ ہو گئے تھے۔ اس کا بہت دل چاہ رہا تھا کہ وہ انہیں گھر جا کر دیکھ آئے۔ عرصہ ہو گیا تھا اسے اپنے گھر گئے ہوئے۔ مگر مجبوری یہ تھی کہ کوئی اسے وہاں لے کر نہیں جا رہا تھا۔

"جویریہ کو واپس اپنے سسرال پشاور جانا تھا۔ واثق بڑی امی اور چچی جان اسے ایئرپورٹ تک چھوڑنے گئے تھے۔ باقی سب اپنے اپنے کاموں پر نکل گئے تھے۔ گھر میں سوائے اس کے وجیہ اور دادی اماں تھیں۔ تھوڑی دیر بعد دادی اماں بھی سو گئیں تو اس کا ذہن بہت تیزی سے کام کرنے لگا۔

"وجیہ مجھے بھیا کے ہاں جانا ہے میرے ساتھ چلو گی۔"

"کیا.....؟" وہ حیران ہوئی یوں دیکھا جیسے واقعی ونیزے کا دماغ چل گیا ہو۔ "اس وقت تو گھر پر کوئی نہیں ہے۔ واثق بھیا تھوڑی دیر میں آ جائیں تو پھر چلی جائیے گا۔"

"تمہارے بھیا تو قیامت تک وہاں نہیں لے کر جائیں گے اور اب میں مزید اپنے گھر سے دور نہیں رہ سکتی۔ یہ سارا رسک میں نے اسی لئے لیا تھا ورنہ میرا دماغ خراب نہیں تھا کہ میں اس جیسے سر پھرے شخص سے شادی کرتی۔" وہ بہت برداشت کر رہی تھی۔ اب مزید چپ نہیں رہ سکتی تھی۔ سارا غصہ وجیہ کے سامنے نکلا وہ تو حیران ہو کر صرف اسے دیکھتی رہ گئی۔

بغیر کچھ سوچے سمجھے ونیزے نے کمرے میں آ کر پہلے اپنا بیگ لیا پھر تیزی سے ڈرائنگ روم میں آ کر وجیہ کو بتایا۔

"میں اپنے گھر جا رہی ہوں۔ دادی اماں وغیرہ کو بتا دینا۔" وہ ہر طرح کے ڈر خوف سے بے نیاز تھی۔ وجیہ تو پریشان ہو گئی۔

"تو کیسے؟"

"تو کیا تم ساتھ چلو گی؟" اس نے الٹا اسی سے سوال کر دیا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"گھر میں اس وقت کوئی نہیں۔ دادی اماں تنہا ہیں۔ آپ کچھ دیر رک جائیے سب آ جائیں گے تو پھر چلی جائیے گا۔" وجیہ کا ارادہ اسے سمجھانے کا تھا۔ وہ نفی میں سر ہلا کر باہر نکل آئی۔ وجیہ اس کے پیچھے گیٹ تک آئی تھی۔ ہر ممکن طریقے سے اسے روکنے کی کوشش کی مگر وہ راضی ہی نہیں ہو رہی تھی۔

"آپ اس وقت جائیں گی کس پر۔ گاڑی تو واثق بھیا لے گئے ہیں۔" اس نے اسے منانے کو آخری حربہ استعمال کیا۔

"اس کوئٹہ جیسے بڑے شہر میں ٹیکسیوں کا کال نہیں ہے۔ بڑی بی آئیں تو انہیں بتا دینا میں بھیا کے ہاں ہوں۔" دوٹوک انداز میں جواب دے کر وہ گیٹ عبور کر آئی۔

یہ شہر تو نہیں بلکہ یہ علاقہ اس کے لئے بالکل ہی انجان تھا اس کے باوجود اس نے رسک لے لیا تھا۔ بس اسٹینڈ پر کافی وقت کھڑے ہو کر انتظار کرنے کے باوجود کوئی ٹیکسی نہ ملی تو اس نے دور سے آتے چنگ چی رکشے کو ہاتھ دے دیا۔ اسے آج ہر حال میں اپنے گھر جانا تھا۔ ایسی ضد پہلی دفعہ اس کے اندر پیدا ہوئی تھی کہ وہ نتائج کی پروا کئے بغیر چلی آئی تھی۔ وہ سارا راستہ واثق کے رویے پر کڑھتی رہی۔ رکشے نے بھی خاصی دیر لگا دی تھی۔ خوامخواہ منتر پڑھانے کے چکر میں تھا۔

اللہ اللہ کر کے وہ جیسے ہی گھر میں داخل ہوئی بھابی بے چینی سے کاریڈور میں ٹہلتی مل گئی تھیں اسے دیکھتے ہی بھاگی بھاگی قریب آئیں۔

"السلام علیکم بھابی۔" انہیں دیکھ کر وہ بے پناہ خوش ہو گئی تھی۔ فوراً سلام کیا اور گلے سے لپٹ گئی مگر انہوں نے اسے خود سے جدا کر دیا۔

"کس کے ساتھ آئی ہو؟" بہت غصیلہ انداز تھا پوچھنے کا۔ وہ چونکی۔

"اکیلی۔"

"میرا جی چاہ رہا ہے کہ میں تمہیں کھینچ کر طمانچہ رسید کروں۔ جانتی ہو پورے دو گھنٹے پہلے تم گھر سے نکلی تھیں اور اب آ رہی ہو۔ اب تک تمہاری سسرال سے کوئی دس فون آ چکے ہیں۔ ایک دفعہ واثق خود بھی چکر لگا گیا ہے۔ سارا گھر پریشان ہو رہا ہے تمہارے لئے۔ کچھ تو خیال کر لیا ہوتا۔ کتنی انسلٹ ہوئی ہے تمہاری وجہ سے۔ ایسی کونسی مصیبت آ گئی تھی جو یوں تمہارا منہ اٹھائے چلے آنا بہت لازمی تھا۔" غصے سے انہوں نے اسے اچھی خاصی سنا ڈالیں۔ وہ جو پہلے ہی بھری بیٹھی تھی ایک دم رو پڑی۔

"سب ڈانٹ رہی ہیں مجھے۔ میں ہی بری ہوں۔ اب میں اپنے گھر بھی نہیں آسکتی۔"

"اپنے گھر آنے جانے ملنے ملانے کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں دنیزے، اس اس شوہر کوئی گھر پر نہیں، کسی سے اجازت نہیں، کچھ بتایا نہیں اور چلی آئیں تم، کچھ تو خیال کیا ہوتا تمہارے اس فعل پر انہوں نے کیا سوچا ہوگا۔"

"ایسا کون سا گناہ کر لیا ہے میں نے۔ صرف اپنے گھر ہی تو آئی ہوں۔ میں اب قیدیوں کی سی زندگی نہیں گزار سکتی۔ مجھی تھا نہیں کرنی مجھے شادی، ترس گئی ہوں اپنے گھر کو، لوگوں کے گھر رہتے ہوئے اب شرم آتی ہے۔"

"دنیزے ..... "بھابی نے دکھ سے دیکھا۔ "تم کسی غیر کے گھر میں تو نہیں ہو۔ اپنے سسرال میں ہو، شوہر کے گھر میں"

"ہوتا ہوگا... مجھے نہیں پتا۔" اس نے ایک دم سر جھٹکا۔ "میں اس لئے تو شادی پر راضی نہیں ہوئی تھی کہ اب بھی اپنے گھر میں آنا نصیب نہ ہو۔"

"دنیزے! میری جان، میری بہن تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں۔ وہ محبوب رحمانی کیسا زخمی شیر بنا ہوا ہے، دھمکیاں دیتا ہے کہ ہم نے تمہاری شادی کر کے اچھا نہیں کیا۔ اپنے بھائی کی ہی حالت دیکھو۔" انہوں نے مصالحانہ انداز میں سمجھایا۔ کچھ بات اس کی عقل میں آئی تھی تو چپ رہی۔

"بھیا کہاں ہیں؟"

"اپنے کمرے میں ہیں۔" وہ خاموشی سے اس کے پاس آ گئی۔ وہ سوئے ہوئے تھے انہیں بغیر ڈسٹرب کئے وہ کمرے سے باہر نکل آئی۔ لاؤنج میں آئی تو وہ فون پر کسی سے بات کر رہی تھیں۔ اسے بھی اشارے سے پاس بلایا۔

"تمہاری ساس ہیں۔" انہوں نے اس کی سوالیہ نظروں کا جواب دیتے اسے ریسیور تھمایا۔

"ہیلو۔"

"دنیزے! میری بیٹی ٹھیک ہو نا۔ بھلا یہ کیا حرکت تھی؟" انہوں نے اس کی آواز پہچان کر فوراً کہا۔

"میں ٹھیک ہوں آنٹی، کتنی دفعہ تو میں نے یہاں آنے کو کہا تھا مگر آپ بھی تو۔"

"ہم بھی تو تمہارے بھلے کے لئے منع کر رہے تھے۔ اب تم گھر سے مت نکلنا میں واثق کو بھیج رہی ہوں اس کے ساتھ فوراً گھر آؤ۔" انہوں نے فوراً حکم سنایا تو وہ سٹپٹا گئی۔

"مگر آنٹی..."

دوسری طرف سے انہوں نے بغیر کوئی بات سنے فون رکھ دیا تھا۔ اس نے بھی ریسیور پٹخا۔

"میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ جو بھی آئے منع کر دیجئے گا اسے۔" بھابی سے کہتے، پاؤں پٹختے وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔

"بری بات دنیزے! تم تو بہت اچھی لڑکی ہو، کبھی ضد نہیں کی۔ اب ایسی حرکتیں کیوں کر رہی ہو۔ ابھی تو صرف تمہاری شادی کو دس دن ہی ہوئے ہیں اور تم یوں منہ اٹھائے بغیر کسی سے اجازت لئے یہاں چلی آئیں۔" انہوں نے اس کے پاس بیٹھ کر اس کا ہاتھ تھام کر پیار سے کہا۔ وہ رو پڑی۔

"میں کیا کروں، مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ صرف میری وجہ سے بھیا زخمی ہو گئے۔ واثق کو بھی صرف میری وجہ سے شادی پر راضی ہونا پڑا تھا۔ مجھے لگ رہا ہے جیسے میں سب پر بوجھ ہوں۔"

"نہیں میری جان کیوں سوچتی ہو تم ایسے۔ تم تو ہم سب کی جان ہو۔ واثق نے کچھ کہا ہے۔" انہوں نے بہت ہی پیار سے اس کے اشک صاف کرتے ساتھ لگاتے پوچھا تو بے اختیار اس کا سر نفی میں ہل گیا۔ دل تو چاہ رہا تھا بھابی کو سب کہہ سنائے۔ اسے کسی ہمدرد، ہم راز کی اشد ضرورت تھی مگر وہ پھر بھی نفی کر گئی۔

"واثق بہت ہی اچھا اور سمجھا ہوا لڑکا ہے۔ ہم نے بہت ہی دیکھ بھال کر اسے تمہارے لئے منتخب کیا ہے۔ تم جس طرح کی سیدھی سادی اور بے وقوف ہو اس کے لئے واثق جیسے شوہر ہی سوٹ کرتا ہے۔ بہت چھان پھٹک کر ہم نے یہ شخص ڈھونڈا ہے۔ بہت ہی ذہین ہے۔ تمہیں پتا ہے وہ خود ہی محبوب رحمانی کو اس کے اوچھے ہتھکنڈوں سے باز رکھنے کی سر توڑ کوشش کر رہا ہے۔ اپنے خفیہ دماغ کو استعمال کرتے ہوئے وہ اس کے اگلے پچھلے سارے کالے کرتوت کھول رہا ہے۔ دیکھنا صرف چند دن کی بات ہے پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا ان شاء اللہ۔ پھر تم جب چاہے، جس وقت چاہے روز آنا مگر ابھی جب حالات نارمل نہیں ہیں خود پر تمہیں کنٹرول کرنا ہوگا۔ ہم تو صرف اس لئے منع کر رہے ہیں کہ تمہاری شادی اور اپنے تمام راز کھل جانے کے خوف نے اسے بہت نڈر کر دیا ہے کسی بھی وقت وہ کچھ بھی کر سکتا ہے اسی لئے احتیاط لازمی ہے۔" بھابی نے اسے بہت اپنائیت و رسانیت سے سمجھایا تو اس نے سر ہلا دیا۔

"یہ واثق کیوں بھاگ دوڑ کر رہے ہیں۔" ان کی یہ بات اس کے پلے نہیں پڑی تھی۔

"نری سیدھی ہو تم۔ پگلی وہ اس گھر کا داماد ہے۔ اب ہم سب کے دکھ سکھ سانجھے ہیں پھر وہ خفیہ تنظیم حس میں ہے تو کیا اس کے اس عہدے کا ہم فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔" بھابی نے بہت ہلکے پھلکے انداز میں کہا تو وہ نا سمجھی میں دیکھنے لگی۔

"تنظیمی حس میں۔" یہ خبر اس کے لئے بالکل نئی تھی۔ اس نے تو کبھی نظر اٹھا کر واثق کو خاص انداز سے دیکھا بھی نہیں تھا کجا کہ اس کے متعلق معلومات اکٹھی کرتی۔ جس طرح چانک بے حالت مجبوری وہ اس کی زندگی میں داخل ہوا تھا اسی طرح وہ ابھی تک اس بات سے بھی بے خبر تھی کہ وہ کیا کرتا ہے؟ کہاں جاتا ہے؟ کیوں جاتا ہے؟ اگر رات کو دیر سے لوٹتا ہے تو کیوں لوٹتا ہے؟

"ہاں بھئی تنظیمی حس میں۔ کیا تمہیں نہیں علم۔" اب بھابی سے حیرت کا اظہار ہو گیا تھا۔ "ارے تم تو واقعی بدھو ہو۔" اس کے نفی میں سر ہلانے سے بھابی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "وہ اس خطاب کی حقدار بھی تھی۔"

"وہ کوئی عام نہیں، اسپیشل انٹیلی جنس کا آفیسر ہے۔ انڈر گراؤنڈ لوگوں سے تعلق رکھتا ہے۔ اب تک تو وہ کتنے اہم کیسز سر انجام دے چکا ہے۔ پچھلے ہی ماہ وہ پشاور سائیڈ میں ایک بہت بڑے مافیا گروپ کو پکڑوا کر آیا ہے چونکہ اسے کسی نئے کیس کے لئے آرام دینے کے بہانے وہ کی چھٹی دی گئی تھی اسی لئے وہ آج کل محبوب رحمانی پر کام کر رہا ہے۔" بھابی نے کافی تفصیل سے بتایا تو اس کا جی چاہا اپنی عقل پر ماتم کرے۔ وہ اتنے عرصے سے بے خبر تھی اور کسی نے اسے کسی بات کی بھنک بھی تو نہیں پڑنے دی تھی۔

بعد میں بھابی اس سے واثق کے متعلق باتیں کرتی رہیں۔ واثق اسے لینے آیا تو بھابی نے اسے بھیا کی طرف سے مطمئن کرتے رخصت کیا۔

گاڑی میں بیٹھے ہوئے وہ خود کے بجائے باہر کے نظاروں میں غرق رہی۔

"جب میں نے آپ کو منع کر دیا تھا کہ فی الحال میں آپ کو یہاں نہیں لا سکتا تو یہ حماقت سر انجام دینے کی کیا ضرورت تھی؟" واثق بہت دیر تک اپنا غصہ کنٹرول کرتا رہا تھا۔ مگر اس کی یوں بے توجہی اور باہر کے نظاروں میں دلچسپی دیکھ کر کہے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ رخ موڑ کر اسے دیکھنے لگی۔

"میرا دل چاہ رہا تھا بھیا بھابی سے ملنے کو، اپنا گھر دیکھنے کو، آپ کون سا میری بات مان رہے تھے۔" بہت ہی معصوم اور سادے انداز میں اس نے جواب دیا تھا۔ واثق کا جی چاہا کس چیز سے گاڑی دے مارے، یعنی "اندھے کے آگے رونا، اپنے نین کھونا" والی مثال فٹ آ رہی تھی۔

وہ جویریہ کو چھوڑ کر امی اور چچی کے ہمراہ گھر لوٹا تو وجیہہ سے علم ہوا کہ وہ تنہا ہی اپنے گھر جانے کو نکل گئی ہے۔ وہ بے انتہا پریشان ہو گیا تھا۔ بے حد اسپیڈ سے گاڑی دوڑاتے وہ وہاں پہنچا تھا مگر وہ وہاں نہیں تھی۔ اسی پریشانی میں وہ واپس گھر لوٹا تھا شاید گھر واپس چلی گئی ہو۔ پچھلے تین گھنٹوں سے وہ کس قدر پریشان ہوا تھا یہ وہی جانتا تھا۔

بہت ہی ناشائستہ حرکت کی ہے۔ کم از کم اپنی حیثیت کے متعلق ہی سوچ لیا ہوتا۔

"میں اپنی حیثیت اچھی طرح جانتی ہوں۔" حیثیت کے لفظ نے ونیزے کے اندر مرچیں سی بھر دی تھیں۔ "آپ یہی تو کہنا چاہتی ہیں ناں، میں بہت ہی عام سی لڑکی ہوں، عام سی سوچ والی، عام سی ذہنیت کی حامل ایک سطحی لڑکی تو پھر کس حیثیت کی بات کر رہی ہیں آپ جبکہ میں تو پہلی نظر سے لے کر اب تک کچھ بھی نہیں جان پائی۔ یہ تک نہیں کہ آپ جاب کیا کرتے ہیں۔ اگر آج بتانا چاہیں تو بتا دیں۔" بہت ہی سنجیدگی سے کہتے اس نے دوبارہ چہرے کا رخ باہر کی طرف کر لیا۔ کہنا تو وہ اور بھی بہت کچھ چاہتی تھی باتیں تو بہت تھیں جو دل و دماغ کو الجھائے ہوئے تھیں خاص طور پر روشانے والی گرہ جس نے دل کے ساتھ ساتھ دماغ کے بھی دروازے بند کر دیئے تھے۔ وہ کہنا بھی چاہتی تھی، سب کچھ کلیئر کرنا چاہتی تھی مگر اس کی خودداری وانا نے اسے روک دیا تھا۔

* * *

عصر کی نماز کے بعد وہ سب لاؤنج میں آگئی۔ مجھے یاد ہوں کو برش سے سمجھاتے وہ ادھر سے اُدھر ٹہلتی رہی۔ پھر تھک کر کرسی پر بیٹھ کر یونہی وقت گزارنے لگی۔ دادی ماں عصر کی نماز کے بعد ہمیشہ دو وقت ساتھ ہی نماز پڑھ کر وظیفے کرتے اور قرآن پڑھتے گزار دیتی تھیں۔ جب سے رمضان شروع ہوا تھا ان کی عبادت میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ ان کی دیکھا دیکھی اکثر اس کی زبان پر بھی کوئی نہ کوئی ورد جاری رہتا تھا۔ ابھی وہ اٹھنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ کافی وقت گزر گیا تو مغرب سے کچھ پندرہ منٹ پہلے وہ نیچے اتر آئی۔ ارادہ کمرے میں جانے کا تھا مگر راستے میں پڑے فون کی بیل نے اسے روک لیا۔ کمرے میں جانے کے بجائے اس نے آگے بڑھ کر فون اٹینڈ کیا۔

"ہیلو۔" بے اختیار اس نے ریسیور کان سے لگایا۔

"یہ واثق جہانگیر احمد کا گھر ہے؟" دوسری طرف سے پوچھا گیا تھا۔ وہ قدرے چونک کر پوری جان سے متوجہ ہوئی۔

"جی ہاں۔" "آپ کو بتانا ہے کہ ان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ آخری خبر ہے کہ ان کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔" اطلاع دینے والا جو کوئی بھی تھا اس نے اس کے حواسوں پر گویا بم پھوڑ دیا تھا۔

"واٹ؟" وہ بے اختیار چیخ اٹھی۔ ریسیور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا۔ "نہیں۔" اسے اپنے ہونٹوں پر سختی سے ہاتھ جماتے ہوئے اس نے اپنی بلند ہوتی چیخوں کو روکنا چاہا، مگر آواز اس کے اعصاب کو منتشر کرتی جا رہی تھی۔

"کار ایکسیڈنٹ۔" اس نے نفی میں بری طرح سر ہلایا۔ "واثق کی ڈیتھ۔" وہ قالین پر گھٹنوں کے بل گری اور سر تھام کر بیٹھ گئی۔

"آنٹی..." ضبط کھوتے ہی وہ بے اختیار چیخیں مارنے لگی۔ اس کی دلدوز چیخیں سن کر سب کے سب بھاگے آئے تھے۔ افطاری سے صرف پندرہ منٹ پہلے کا وقت تھا سب ہی گھر پر تھے۔

"ونیزے..... کیا ہوا۔ میری جان؟" سب سے آگے امی تھیں اسے یوں گھٹنوں کے بل اوندھے منہ گرے دیکھ کر انہوں نے جھنجوڑ ڈالا۔ شاک کی سی کیفیت میں ونیزے نے اپنا سر اٹھایا۔ بے یقینی سے امی کو دیکھا۔

"آنٹی... وہ....." فون کی طرف اشارہ کرتے وہ بول نہیں پائی تھی۔ سب نے فون کی طرف دیکھا۔ ریسیور جھول رہا تھا۔ کسی کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

"آنٹی! فون ... واثق" اس کے نیلے سے ہونٹ پھڑپھڑائے اور پھر ساکت ہو گئے۔ وہ بے ہوش ہو کر امی کی بانہوں میں جھول گئی تھی۔

* * *

وہ صبح نو بجے گھر سے نکلا تھا۔ سب ضروری معلومات اکٹھے کرتے رپورٹس کرتے کرواتے مختلف لوگوں سے ملتے جلتے اس کو وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ عصر سے کچھ پہلے وہ ایس ایس پی قیوم ثقلین کے دفتر میں آ گیا۔ ساری معلومات اسے مہیا کرتے ملتے ملاتے اور ہدایات دیتے کچھ وقت وہاں لگ گیا تھا۔ قیوم ثقلین کے آفس سے باہر آ کر اس نے ایک سکون بھری سانس لی۔ گویا سر سے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا تھا۔ اب اس کا ارادہ گھر جانے کا تھا۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ موبائل پر امجد بھیا کی کال آ گئی۔ انہوں نے اسے اپنے آفس بلوایا تھا۔ اس نے وقت دیکھا ساڑھے تین بج رہے تھے۔ ابھی افطاری میں کافی وقت تھا وہ بغیر تاخیر کئے ادھر آ گیا۔

"امجد صاحب اندر ہیں۔" آفس میں ایک دم داخل ہونے کے بجائے اس نے سیکرٹری سے پوچھا تو اس نے سر ہلا دیا۔ وہ جھجکتے ہوئے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ امجد بھائی کے پاس محبوب رحمانی بیٹھا ہوا تھا۔ شاید کوئی بات ہو رہی تھی۔ وہ امجد بھیا کو سلام کرتا آہستگی سے کرسی کھسکا کر بیٹھ گیا۔ خاموشی سے امجد اور محبوب رحمانی کی باتیں سنتا رہا۔ دونوں ہی غصے میں تھے۔ دونوں ہی ایک دوسرے کو برے نتائج کی دھمکیاں دے رہے تھے۔

میرا خیال ہے محبوب رحمانی صاحب آپ کو جو کچھ بھی کہنا ہے آپ وہ کورٹ میں جا کر دیں۔ اب وہ پہلے والی صورتحال نہیں رہی کہ آپ کے اثر و رسوخ کے آگے ہم چپ ہو جائیں گے۔ جس دن آپ کو کورٹ سے اس طرح کا ایک اور نوٹس کال جائے گا تب آپ کے پاس آنے گا۔ یہ مہربانی اب آپ جانے دیں ہم جو کچھ بھی کہنا ہے اپنے وکیل کے ذریعے عدالت میں کہیے گا۔ پلیز۔" وہ کافی دیر سے سنتا رہا تھا۔ جب اس نے دیر سے کہا تو محبوب رحمانی مزید برداشت نہیں کر سکا تھا۔ ایکدم اسے ٹوک گیا۔ وہ اسے دیکھنے لگا۔

"تم کون ہوتے ہو ہمارے معاملے میں بولنے والے۔" وہ غصے سے پوچھنے لگا۔

مجھے واثق جہانگیر احمد کہتے ہیں۔ میرا خیال ہے آپ نے پہچان لیا ہے۔ ویسے میری بیوی ہیں ان کے متعلق کچھ بھی کہنے یا غلط سوچ بھی ذہن میں لانے کی کوشش کی تو بھی آپ کے لئے خطرناک ثابت ہو گی۔ آپ کے پاس میری بیوی کے متعلق انکل جو وصیت کی جو بھی وصیت ہے وہ کورٹ میں پیش کیجئے گا۔ اس کے غلط ہونے کو ہم ثابت کریں گے اور اب آپ دیکھ کیا رہے ہیں یہاں سے چلے جائیں۔ ویسے تو آپ کو یہاں آنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اگر آنے کی جرأت کر لی ہے تو حد میں رہیے ورنہ میری ایک کال کرنے کی دیر ہے اور آپ کے وارنٹ جاری ہو جائیں گے۔" بہت ہی ٹھوس ٹھہرے لہجے میں خاصی تحکم تھی۔ وہ محبوب رحمانی تو کچھ بول ہی نہ سکا ایک دم باہر جانے کو مڑا۔ دروازے کے قریب رک کر اس نے واثق کو گھورا۔

"دیکھ لوں گا میں تجھے بھی۔ میں بھی کوئی عام آدمی نہیں ہوں۔ فی الحال ایک پانسہ تمہارے نام سہی۔ فیصلہ میرے ہی حق میں ہو گا۔ دیکھ لینا۔ یہ ففٹی پرسنٹ شیئرز کسی بھی قیمت پر بھی تم لوگوں کے حق میں نہیں دوں گا۔ ایسا مزا چکھاؤں گا کہ ساری عمر یاد رکھو گے۔" دھمکی دیتے ہی وہ باہر نکل گیا تھا۔

واثق سر جھٹکتے امجد بھائی کو مطمئن کرنے لگا۔

"کچھ نہیں کرے گا یہ شخص۔ آپ پلیز ریلیکس ہو جائیں۔"

"ہوں۔" انہوں نے سر ہلایا۔

"میں آج سب قانونی کارروائی مکمل کر آیا ہوں۔ ایس ایس پی قیوم ثقلین سے بھی مل چکا ہوں۔ انشاء اللہ وہ کل صبح تک گرفتار ہو جائے گا۔ اینڈ ڈونٹ وری۔"

"تھینک یو سو مچ واصق۔ رئیلی آئی ایم ویری گریٹ فل ٹو یو۔" تب بہت تشکر بھری آواز میں انہوں نے کہا تو وہ ہنس دیا۔

"او کے۔ یہ میرا فرض تھا۔ یقیناً آپ بھی قبول کریں گے۔"

"بیٹھو۔" اس کے برجستہ جملے پر وہ مسکرا دیے پھر کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں امجد بھائی، میں صبح سے گھر سے نکلا ہوا ہوں۔ اب چلوں گا۔ کافی دیر ہو گئی ہے گھر والے انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"اچھا۔"

واصق ان سے اجازت لے کر آفس سے نکل آیا۔

آہستہ روی سے گاڑی چلاتے وہ آئندہ پیش آنے والی صورتحال کی پلاننگ کرنے لگا تھا۔ راستے میں پھولوں کی دکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس کی نظر بے اختیار وہ پھولوں کے ہار اور گجروں پر ٹھہر گئی۔ ذہن میں چاندنی سا بکھرا ونیزے کا خوبصورت سراپا در آیا۔ شادی کی رات اسے کنگن پہناتے ہوئے اس نے اس کی کلائیوں میں سجے گجرے تھے جو گھنی گھنی مہک دیتے ونیزے کے لیے ڈھیر سارے گجرے خریدے کو خود بخود دل چاہا۔ اس نے وہ یہ بالکل نہیں سوچنا چاہتا تھا کہ وہ اس سے کس حد تک بدگمان ہے۔ بس دل کہہ رہا تھا کہ اس کے لیے ڈھیر سارے پھول گجرے خریدے۔

وہ ایک گاڑی پارک کر کے دوسری طرف کی سڑک کے سرے پر واقع دکان کے اندر چلا گیا۔ اپنی پسند کے پھول، گجرے اور موتیوں کے ہار لے کر وہ باہر نکل آیا۔ اسے سڑک پار کر کے دوسری طرف کی سڑک کی سائیڈ پر پارک کی گئی کار کی طرف جانا تھا۔ سڑک پر کافی رش تھا۔ وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سڑک پار کرنے لگا۔ تمام احتیاط کے باوجود ایک گاڑی بہت اسپیڈ سے اس کی طرف بڑھتی آ رہی تھی۔ اس نے بھاگ کر خود کو گاڑی کی پہنچ سے دور ہونے کی کوشش کی تھی مگر اب دیر ہو چکی تھی۔ گاڑی اسے بری طرح اچھالتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ شاپنگ بیگ سے پھولوں کا گلدستہ، گجرے اور موتیوں کے ہار نکل کر اور گر کر سڑک پر بکھر گئے تھے۔

* * *

"ونیزے کیسی ہے اب؟" امجد بھائی فون سنتے ہی پہنچ گئے تھے۔ ساتھ میں مسیحہ بھابی بھی تھیں۔ دونوں ہی آدھ گھنٹہ پہلے موصول ہونے والے فون پر بھاگے چلے آئے تھے۔

"ڈاکٹر چیک کر کے گیا ہے۔ کہتا ہے کوئی شاک پہنچا ہے جس کی وجہ سے یہ بے ہوش ہو گئی ہیں۔ انجکشن لگا گیا ہے شاید گھنٹے کے اندر ہوش میں آ جائے۔" شہروز نے بتایا۔ بے ہوش بستر پر پڑی ونیزے کو دیکھتے سب ہی پریشان تھے۔

"واصق کو کئی دفعہ فون کیا ہے مگر اس کا سیل کوئی رسپانس ہی نہیں دے رہا۔ بیل جاری ہے اور وہ ریسیو ہی نہیں کرتا۔" چچی جان نے بھی بتایا سب کے چہرے کسی ان ہونی کے خوف سے اترے ہوئے تھے۔

"ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ فکر مت کریں۔" ونیزے کا ہاتھ تھام کر اسے ایک نظر دیکھ کر بھابی نے بھی تسلی دی۔

"تقریباً کوئی پچاس منٹ پہلے وہ میرے پاس تھا۔ پھر جلدی گھر جانے کا کہہ کر نکل آیا تھا۔ حیرت ہو رہی ہے وہ چلا کہاں گیا ہے۔ وہ بھی بغیر انفارم کیے۔" بھیا بھی متفکر تھے۔

ابھی وہ سب بیٹھے آنے والی گمنام کال پر ہی گفتگو کر رہے تھے کہ خرم بھاگا آیا۔

"امی! وہ واصق بھیا آ گئے ہیں۔" آتے ہی اس نے حواس باختگی سے بتایا گویا سب کو نئی زندگی مل گئی تھی۔ سب سب ہی تیزی سے باہر بھاگے تھے۔

واصق سامنے تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔ امی اور دی کی تو اسے دیکھتے ہی چیخیں نکل گئیں۔

"واصق۔" امی تڑپ کر آگے بڑھیں۔ ایکدم اس کا چہرہ ہاتھوں میں بھر لیا۔ "یہ... یہ کیا ہوا واصق؟" اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ گلے میں بھی رسی لٹک رہی تھی جس میں واصق کا بازو تھا۔ ہاتھ بھی زخمی تھا۔ شرٹ بری طرح خون سے رنگی اور پھٹی ہوئی تھی۔ چہرے، ماتھوں گردن پر جا بجا خون جما ہوا تھا۔

"بس ایک ہلکا سا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ شکر کریں، وہ تو میری نظر پڑ گئی تھی کار پہ۔ پاؤں فوراً آگے بڑھا لیا۔ ورنہ کار نے تو اچھا خاصا اچھال کر پھینکا تھا۔ شاید رحمدلی تھی جو دوسری طرف سڑک پہ کھڑی پھلوں کی ریڑھی پر جا گرا تھا اور بچت ہو گئی۔ ورنہ...."

بات ادھوری چھوڑ کر وہ ہنس پڑا تھا۔ دادی اماں نے بے اختیار اسے ساتھ چمٹا لیا۔ کتنے حوصلے کا وہ مظاہرہ کر رہا تھا۔

"میرا تو دل ہول رہا تھا۔ دو گھنٹے پہلے ایک فون آیا تھا۔ ونیزے نے ہی ریسیو کیا تھا۔ پتا نہیں کس کا تھا؟ کیا کہا تھا؟ ونیزے تو ابھی تک بے ہوش پڑی ہے۔" امی نے بتایا۔

"کیا... ٹھیک تو ہے وہ؟" بے اختیار پتا اور بھی سے اس نے پوچھا۔

"ہاں... تھوڑی دیر تک ہوش میں آ جائے گی۔" اس نے سکون بھرا سانس لیا۔

امی گیلے تولیے سے اس کے چہرے، گردن اور بازوؤں پر سے خون کے دھبے صاف کرنے لگی تھیں۔ اسے پھولوں کا یاد آ گیا۔ پہلی دفعہ خود سے اس کا دل کوئی چیز لانے کو چاہا تھا مگر... واصق کو بہت افسوس ہونے لگا مگر وہ فون کس نے کیا تھا۔ وہ الجھنے لگا۔ کچھ وقت اسی طرح سب کے درمیان بیٹھے گزر گیا۔

"مجھے اپنے کمرے میں جانا ہے یاد۔" اس طرح بیٹھے رہنے سے الٹی اپنی دکھتی ٹانگ میں درد کی مزید ٹیسیں اٹھتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ شہروز کو اشارہ کر کے کہا تو وہ اسے سہارا دیتے اس کے کمرے کے باہر چھوڑ گیا۔ ایکسیڈنٹ کی وجہ سے اس کی ٹانگ پر بھی چوٹ لگی تھی۔ اور بھی جانے کہاں کہاں اندرونی چوٹیں آئی تھیں۔ لڑکھڑاتی ٹانگ سمیت وہ بستر پر بیٹھ گیا۔ ونیزے کی پشت دروازے کی طرف تھی۔ پیروں کو جوتوں سے آزاد کر کے تھوڑا سا اوپر کی طرف کھسکتے اس نے تکیے سے ٹیک لگائی۔

کار تو اسے اچھال کر اس تیزی سے آگے بڑھ گئی تھی کہ وہ دوسری طرف ریڑھی پر گرتے اچھل کر سڑک پر گر گیا تھا۔ سر اور ٹانگ کی چوٹ تبھی لگی تھی۔ بازو بھی خاصا زخمی ہوا تھا۔ سڑک پر گرنے کے بعد چند لمحوں تک تو اسے اپنا بھی ہوش نہیں رہا تھا۔ پانچ دس منٹ بعد حواس بحال ہوئے تو لوگوں کے ہجوم کو چیرتا اپنی گاڑی لیے پہلے ہاسپٹل پہنچا تھا۔ وہاں زخموں کی ڈریسنگ کروانے میں کافی وقت لگ گیا تھا۔ بار بار گھر سے کال آ رہی تھی۔ مگر وہ جان بوجھ کر اٹینڈ نہیں کر رہا تھا۔ اصل میں وہ انہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن یہاں آ کر وہ ونیزے کی طرف سے خود پریشان ہو گیا تھا۔

"لو یہ دودھ پی لو اور یہ شرٹ بھی لاؤ اتارو۔" امی دودھ کا گلاس لیے اندر چلی آئیں۔ پھر اس کی پھٹی خون آلود شرٹ کے بٹن کھولنے لگیں۔ الماری سے ایک سادہ سوٹ نکال کر صوفے پر رکھا۔

"دیکھو یہ ونیزے ابھی تک حواس میں نہیں آئی۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ کسی شاک سے بے ہوش ہوئی ہے روزے کی حالت میں تھی، جب بے ہوش ہوئی تھی۔ دس منٹ بعد ہی روزہ افطار ہو گیا تھا۔ اور یہ اسی طرح پڑی ہوئی ہے۔" دوسری طرف آ کر اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے امی نے کہا۔

"تم دودھ پی کر کپڑے بدل لینا پھر میں کھانا بھی لاتی ہوں۔" پریشانی سے کہتے وہ باہر نکل گئیں اس نے بہت آہستگی سے ونیزے کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

"وینزے..." چند منٹوں بعد اس کی پلکوں میں ہلکی سی لرزش ہوئی تو اس نے بے اختیار پکارا۔

"وینزے! پلیز آنکھیں کھولو، دیکھیں یہ میں ہوں... واثق...." اس پر جھک کر اسے پکارتے اس نے اس کا بازو ہلایا۔ وہ پوری آنکھیں کھول کر اسے یک ٹک دیکھے گئی۔

"واثق..." اس کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی، پھر آنکھوں سے قطرہ قطرہ دل پگھلنے لگا۔ واثق اس پر جھکا ہوا تھا۔ اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ باقی کچھ اور اسے نظر نہیں آیا۔ یونہی لیٹے لیٹے اس نے ہاتھ اٹھا کر اس کے سر پر بندھی پٹی پر پھیرا۔

"کیا ہوا ہے؟ کیسا فون تھا؟" اسے روتی سے آنسو بہاتے ہونٹ کچلتے دیکھ کر اس نے دوبارہ پوچھا تو وہ با آواز پھوٹ پھوٹ کر مزید رونے لگی۔

"پلیز وینزے... کیا بات ہے؟" واثق نے اس کا بازو ہلایا تو وہ اٹھ بیٹھی۔

"یہ... یہ کیسے ہوا؟" اس کے سر کی طرف دیکھتے وینزے نے پوچھا تو آنکھیں بدستور بہہ رہی تھیں۔

"یہ... کچھ نہیں... معمولی سی چوٹ ہے۔" "جھوٹ بولتے ہیں آپ۔" اب اسے سب یاد آ گیا تھا۔ وہ گمنام کال اور اس پر دی جانے والی [illegible] خبر اور اب واثق کی موجودہ حالت۔ وہ سب شاک تھا تو اس نے سنا تھا یا یہ سب جھوٹ تھا جو وہ دیکھ رہی تھی۔ وہ [illegible] کے ساتھ تھے۔ ویسے کے بعد رات کو نیند میں دیکھا جانے والا خواب بھی یاد آ گیا [illegible] لیے چیخ کر کہا۔ "وہ فون پر کسی نے کہا تھا کہ آپ کا کار ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اور آپ کی ڈیتھ ہو گئی۔" ٹھہر ٹھہر کر بتاتے وہ [illegible] کے سینے پر سر ٹکاتے رو پڑی تھی۔ [illegible] کی خبر نہ تھی۔ [illegible] یوں لگ رہا تھا کہ جیسے کسی نے اس کے جسم سے جان کھینچ لینے کی کوشش کی ہو۔ بری طرح رو رہی تھی، واثق نے پہلے [illegible] کے گرد اپنا بازو پھیلا دیا۔

"میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ جس نے یہ خبر دی ہے وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ بلیو می... دیکھیں میں ٹھیک ہوں۔ بس ہلکا سا کار ایکسیڈنٹ ہوا تھا اور تو کچھ نہیں۔" گھر کے ملگجے سوٹ میں وہ بغیر دوپٹے کے تھی۔ بال کھلے ہوئے تھے۔ ساری پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ واثق نے آہستگی سے اس کے بالوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ آج تو وہ اپنی بھی کیفیت نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ شاید موت کو بہت قریب سے دیکھنے کا اثر تھا۔

"فون پر کس نے اطلاع دی تھی؟" یونہی روتے اس نے پوچھا تو اس نے ایک طویل سانس لی۔ "پتا نہیں۔ ہوگا کوئی میرا مہربان ہی۔ آپ پریشان مت ہوں۔ پتا کروا لوں گا میں۔"

امی ٹرے میں کھانا سجائے داخل ہوئیں تو اس نے بہت آہستگی سے وینزے کو خود سے جدا کیا۔

"امی آ گئی ہیں انہیں کچھ بتانے یا پریشان کرنے کی ضرورت نہیں، خاص طور پر کال کے بارے میں۔" آہستگی سے اس کے کان میں سرگوشی کے سے انداز میں اس نے باور کرایا۔

"شکر ہے وینزے کو ہوش آیا..." ٹرے بستر پر رکھ کر انہوں نے وینزے کے قریب جگہ پکڑی۔ "وہ فون کیا تھا؟ بے ہوش کیوں ہوئیں؟" بڑی فکرمندی سے اس کا ہاتھ سہلاتے انہوں نے پوچھا تو وہ واثق کو دیکھنے لگی جس نے اسے کچھ بھی بتانے سے منع کر دیا تھا۔

"ایکسیڈنٹ کے وقت میں وینزے سے ہی بات کر رہا تھا۔ میرا خیال ہے میرے بے اختیار بلند ہونے والی چیخ انہوں نے سن لی ہوگی۔ کیوں وینزے...." بات بناتے اس نے ٹرے اپنی طرف گھسیٹی وہ ناسمجھی میں سر ہلا گئی اور کیا کر سکتی تھی بھلا جبکہ ذہن سب کال کرنے والے کی طرف الجھا ہوا تھا۔

"وینزے! پلیز تم بھی کھانا کھانا شروع کرو۔ کچھ نہیں کھایا تم نے اسی لئے بے ہوش ہو گئی تھی۔" امی نے واثق کی سالن والی پلیٹ اس کے سامنے رکھی اور ساتھ میں دوسری چیزیں بھی۔ "باہر تمہارے بھیا بھابی آئے ہوئے ہیں۔ تمہاری بے ہوشی کا سن کر آئے تھے۔ کھانا کھا لو پھر تم دونوں ان سے مل لینا۔" اس کی پشت پر بکھرے سلکی بال سمیٹ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اس نے خاموشی سے سر ہلایا تو وہ باہر نکل گئیں۔

"پلیز کھانا کھائیں۔" واثق نے اس کی طرف روٹی بڑھاتے اسے متوجہ کیا تو وہ چپ کر کے عمل کرنے لگی۔ شادی کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ وہ پہلی دفعہ بطور خاص ایک ہی جگہ پر بیٹھی ایک پلیٹ میں کچھ کھا رہی تھی۔ واثق کے رویے پر اور اس کو [illegible] دیکھ کر اس کے اندر ایک گہری طمانیت کا احساس جاگا تھا۔

* * *

واثق کی تمام تر کوششیں رنگ لے آئی تھیں اس نے محبوب رحمانی کی کرپشن کے حوالے سے [illegible] کے متعلق کی جانے والی تمام معلومات پولیس کے حوالے کر دی تھیں۔ [illegible] خاص طور وینزے نے۔ جس کی جان صرف اسی وہم میں اٹکی رہتی تھی کہ [illegible] واثق [illegible] ایکسیڈنٹ کے بعد تو وہ ہر وقت اچھی خاصی ڈری رہنے لگی تھی۔ یہ نئی خوشخبری ملی تو بے حد پرسکون ہو گئی۔

رمضان ویسے تو چل رہا تھا دوسرا عشرہ ختم ہونے میں ابھی تین دن باقی تھے۔ اتنے بڑے گھر میں اتنے لوگوں کی موجودگی میں رمضان کے روزے رکھنا [illegible] سحری اور افطاری کے اوقات میں خوب ہلچل مچی ہوتی تھی۔

وہ نماز تراویح ادا کر کے [illegible] ماں کے تخت پر آ بیٹھی۔ روزانہ وہ نماز کے فوراً بعد سو جاتی تھی مگر آج نیند نہیں آ رہی تھی۔ واثق آج رات ابھی تک گھر نہیں آیا تھا۔ عشا کی اذان کے بعد نکل گیا تھا اور اب رات کے گیارہ بج رہے تھے اور اس کی واپسی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ باقی سب اپنے اپنے کمروں میں جا کر سو گئے تھے۔ ان سب کو صبح جلدی اٹھنا تھا۔ وہ کمرے میں جانے کے بجائے تخت پر ہی لیٹ گئی۔

ادھر ادھر کی باتوں کو سوچتے اس کے ذہن میں پھر روشانے کا خیال در آیا۔ ساتھ ہی واثق کا تصور بھی چمکا۔ ایکدم اس کا دل اچاٹ ہوا تھا۔ [illegible] جی چاہ رہا تھا کہ [illegible] "آئی ڈونٹ کیئر" کہہ کر کنونس نہیں کر سکتی تھی۔ اب تو معاملہ ہی اور تھا۔ پہلے تو اس کی واثق جہانگیر کو قابل توجہ ہی نہیں سمجھا تھا اسی لئے اس کا رویہ اتنا تکلیف نہیں دیتا تھا۔ مگر جب سے اس کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا اسے اپنے اندر کے موسموں کی بھی خبر ہو گئی تھی۔ ساتھ یہ احساس بھی کہ وہ اسے کبھی ناپسند نہیں رہا تھا۔ دل کو تو شروع سے ہی اچھا لگتا تھا بس اگر درمیان میں یہ روشانے نام کا کانٹا نہ ہوتا تو وہ مطمئن ہو کر ایک پرسکون ازدواجی زندگی کا لطف اٹھا رہی ہوتی۔ اب تو محبوب رحمانی بھی گرفتار ہو چکا تھا کسی قسم کی کوئی فکرمندی نہیں تھی۔ جب سے اسے واثق کی اپنے اور بھیا کے لئے کی جانے والی تمام کوششوں کا علم ہوا تھا تو دل میں موجود جو ہلکی سی ناگواری و ناپسندیدگی کی لہر بھی اتر چکی تھی۔ وہ شاید اس بدلتی کیفیت کا ذکر واثق کے سامنے بھی کر دیتی اگر درمیان میں روشانے کی گرہ نہ ہوتی۔ [illegible] یہ احساس [illegible] روشانے [illegible] لگا تھا۔ جب بھی کوئی ایسا خیال آتا آنکھیں بھر آتی تھیں۔ مزید ستم یہ تھا کہ واثق نے جب سے محبوب رحمانی گرفتار ہوا تھا اس پر توجہ دینا چھوڑ دی تھی۔ گفتگو بھی بس برائے نام ہی ہوتی تھی۔ وہ یونہی سوچتے سوچتے سو گئی۔

[illegible] بہت خاموشی سے ڈپلی کیٹ چابی سے داخلی دروازے کا لاک کھول کر وہ اندر داخل ہوا تھا۔ جب سے محبوب

رحمانی والا کیس اس نے اپنے ہاتھ میں لیا تھا یونہی رات گئے لوٹنا پڑتا تھا۔ چابی جیب میں ڈالتے وہ بے دھیانی میں اپنے کمرے کی طرف بڑھا مگر تخت پر وینزے کو سوتے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ یہ خلاف توقع بات تھی ورنہ روز ہی جب وہ گھر لوٹتا تھا تو وہ اپنے کمرے میں سو چکی ہوتی تھی۔ اندر بڑھنے کے بجائے وہ تخت کے قریب چلا آیا۔

اس کے کھلے سیاہ لمبے گیسو اور تخت پر بکھرے اس کے وجود کو بھی ڈھانپے ہوئے تھے۔ دوپٹے کا ایک پلو بازو سے لپٹا تھا تو دوسرا زمین پر گرا ہوا تھا اور وہ اتنی بے خبر سوئی ہوئی تھی کہ گرد و پیش کی کوئی خبر نہ تھی۔ رات کے اس پہر جب سب لوگ سو چکے تھے اس وقت گھر کے مردوں میں کوئی باہر نکل آتا اسے یوں اس طرح بے خبری کی نیند لیتے دیکھ لیتا تو کتنا عجیب لگتا۔ واسق جہانگیر کو اس خیال سے ہی کوفت ہوئی۔

اس نے تیزی سے ہاتھ آگے بڑھایا۔ ارادہ اسے جگانے کا تھا مگر جب نظر اس کی دراز پلکوں میں اٹکے آبی موتیوں پر پڑی تو ہاتھ خود بخود کندھے کے بجائے چہرے کی طرف بڑھا۔ بہت آہستگی سے اس کے قریب بیٹھا تھا۔ بہت نرمی سے پلکوں میں کے شفاف چمکتے آبدار موتی چن لیے۔ بے اختیار اسے بغور دیکھتا رہا۔ بے خبری کی نیند لیتے وہ کچھ ورشے لگ رہی تھی۔ حسین اتنی کہ نظر اس کے شفاف چہرے پر سے پھسلتی جا رہی تھی شاید وہ بہت دنوں بعد اسے یوں غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ کچھ سوچتے سوچتے سوئی تھی کہ لیے چہرے پر کچھ کرب سا ... بھی رقم تھی وہ ادا کو ... کر سکا

رات کے اس پہر موسم خنک ہو گیا تھا۔ نومبر کا مہینہ چل رہا تھا۔ سردی بہت زیادہ تو نہیں مگر اچھی خاصی تھی کہ اب بغیر لحاف اور ہیٹر کے سونا مشکل تھا جبکہ وینزے نے صرف ... کی نرم کپڑے اور شال کے تھی بلکہ اس نے جو سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا وہ اتنا باریک ریشمی تھا کہ اس سرد موسم کی مناسبت سے موزوں نہیں تھا۔

وہ بچہ نہیں تھا کہ اسے اس حالت میں دیکھ کر کچھ محسوس نہ کرتا۔ بیوی تھی تو اس کے دل میں دھڑکتی تھی رگ رگ میں اتری ہوئی تھی مگر بات ساری پسند، اعتماد و یقین کی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اس نے اپنے لیے جو بد اعتمادی، ناپسندیدگی و بے یقینی کی گہری چھاپ دیکھی تھی وہ اسے ہمیشہ اپنی ایک حد میں رہنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ اس بات سے قطع نظر کہ میاں بیوی کا جو ریلیشن شپ دونوں کے درمیان ہے وہ کیا ڈیمانڈ کرتا ہے۔ اس نے اس سے اول روز جو باتیں کہی تھیں ان پر ابھی بھی قائم تھا۔ جسم واقعی کبھی بھی اس کی ضرورت نہیں رہا تھا پھر تو یہ وینزے تھی اس کے دل کی پہلی خواہش، محبت، عزت و توقیر والے اسے اس کی رضا سے دلی آمادگی و خود سپردگی کے جذبے سے مخمور ہو کر حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اعتماد، یقین، محبت و اعتبار کے جذبوں کو بنیاد بنا کر اس کے ساتھ ساری زندگی بتانے کی خواہش رکھتا تھا یہی وجہ تھی کہ وہ امی کی دھمکی کے آگے فوراً ہار گیا تھا۔ اپنی محبت کا یقین سے سونپ کر اس کی محبت و اعتماد کا یقین خود کو بخشنا چاہتا تھا یوں کہ درمیان میں کوئی خلش باقی نہ رہے۔ کسی ناپسندیدگی و ناگواری کی چبھن دل کو تڑپا نہ پائے۔ اب وہ یہ سب کیسے برداشت کر لیتا۔ اس کی ناپسندیدگی و بے توجہی اس کے لیے ایک کڑا امتحان بنی ہوئی تھی۔ واسق نے ایک گہرا سانس لیا۔ نیچے گرا دوپٹے کا پلو اٹھا کر اس پر ڈال دیا۔

رات بتدریج ٹھنڈی ہوتی جا رہی تھی۔ ہاتھوں کو آپس میں ملتے اس نے اس کا کندھا ہلایا۔

"وینزے۔" ساتھ میں آواز بھی دی۔

وہ کسمسائی تھی، کروٹ بدلی تھی کہ اس کا سر تکیے سے ڈھلک کر اس کی گود میں آ گیا۔ ریشمی کالی گھٹا نے ایکدم اس کی گود میں بسیرا کیا تھا۔ خوشبو کے جھونکے واسق کو اپنے اندر اترتے محسوس ہوئے۔ نرم و نازک ڈال کے اس ساحر وجود کے ضرب کی آگ واسق کے وجود کو جھلسانے لگی تھی۔ دل کی انہونی خواہش انگڑائی لے کر بیدار ہوئی تھی۔

"وینزے....." بمشکل خود کو سنبھالتے اس نے اسے دوبارہ آواز دی۔ اس پکار پر اس نے آنکھیں کھولیں تو بے دھیانی

مما سے دیکھے گی۔ اس کے ذہن میں صورتحال واضح نہیں ہوئی تھی۔

"آپ یہاں کیوں لیٹی ہوئی ہیں ..... پلیز اندر کمرے میں چلیں۔" واسق کی آواز اسے غفلت کی دنیا سے باہر کھینچ لائی تھی۔ لمحے میں اپنی موجودہ حالت کا احساس ہوا۔ یکدم جھٹکے سے اپنا سر اس کی گود سے نکالا اور اٹھ بیٹھی۔ واسق کو اپنے اتنے قریب دیکھ کر دل کی دھڑکن یوں آؤٹ ہوئی کہ سنبھلنا بھول گئی۔ رخسار دہک اٹھے تھے۔ حیا کی لالی نے گہری لپیٹ میں لے لیا تھا۔ فوراً اپنے بکھرے گیسو دوپٹے میں چھپاتے اس نے واسق کی طرف سے رخ بھی بدلا تھا۔

"آ..... آپ ..... کب آئے؟" دل کی طرح زبان بھی لڑکھڑا رہی تھی۔

واسق جو اسے غور سے دیکھ رہا تھا اس کے لیے یہ سارا منظر بالکل نیا تھا۔ گھبرایا گھبرایا سا یہ وجود سرخ چہرہ، اور حیا کی ردا میں لپٹا یہ خوبصورت سراپا۔ یہ سب چہرہ وہ پہلے والی وینزے کے مدمقابل تو نہیں تھا۔

"بس ابھی۔" واسق نے ایک گہری سانس لی۔ "آپ اتنی دیر باہر مت رہا کیجیے۔" وہ نیچے جھک کر جوتا پہن رہی تھی۔ سفید گورے جیسے پاؤں کالی سینڈل میں خوب جچ رہے تھے۔ جھکنے سے اس کے لمبے گھنے ریشمی بال آگے آ گئے تھے۔ چہرہ چھپ گیا تھا۔ جیسے اچانک چاند کالے سیاہ بادلوں کی اوٹ میں ہو جائے۔ تند زلفوں کے ... وار بھی دل پر لگا۔ ایک ایک نقش جذب کرتا، ایک ایک ادا نوٹ کرتا واسق تو پہلے ہی دل ہارا ہوا تھا۔ اس کی اس ... کی بہت دھیان سے کی تھی۔ وہ ایک گہرا سانس خارج کرتے اٹھ کھڑا ہوا۔ وینزے نے بھی ... دونوں خاموشی سے آگے پیچھے کمرے میں داخل ہو گئے۔



* * *

دھیرے دھیرے رمضان کا عشرہ بھی گزر گیا۔ وہ تقریباً ہر دوسرے دن بھائی بھیا کے گھر چلی جاتی تھی۔ ادھر سے وہ دونوں اور تینوں بچے بھی آ جاتے تھے۔ محبوب رحمانی والا معاملہ اچھا خاصا حل ہو گیا تھا۔ کیس عدالت میں چل رہا تھا۔ بھیا اور واسق پوری طرح کیس اپنے حق میں ہو جانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے جس کے ۸۰ فیصد چانسز بھی تھے۔ واسق کے اکٹھے کیے گئے ثبوت و شواہد اس قدر ٹھوس قابل قبول اور جاندار تھے کہ وہ کسی بھی صورت نہیں بچ سکتا تھا۔

آخری عشرے کا چوبیسواں روزہ بھی گزر گیا۔ واسق کو کچھ بخار تھا۔ اس کے باوجود اس نے سارا دن روزے کی حالت میں گزارا۔ دو دن پہلے ہونے والی تیز بارش کا اثر تھا یا پھر آدھی آدھی رات تک باہر رہنے کی وجہ تھی جو اسے ہلکا سا ٹمپریچر ہو گیا تھا۔ نماز تراویح کے بعد وہ باہر رہنے کے بجائے وہ جلد ہی گھر لوٹ آیا تھا۔ لاؤنج میں سب ہی نماز کے بعد پھلوں اور خشک میوہ جات سے ہاتھ صاف کرتے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ یہی تو رات کا وقت ہوتا تھا۔ جب سے مرد حضرات اپنے کام دھندوں سے فراغت پاتے ہی ایک جگہ اکٹھے بیٹھتے تھے۔ ایک دوسرے کو سارے دن کی روداد سنائی جاتی تھی۔ کچھ اس کی سنتے کچھ اپنی کہتے، وہ ہر قسم کی ذہنی ٹینشن و پریشانی سے آزاد ہو جاتے تھے۔ اور شاید یہی اپنائیت اس گھر کی پرامن فضا کو قائم رکھنے کا اصل راز تھی۔ جب سے اس نے یہ جاب اسٹارٹ کی تھی ہر طرف سے غافل ہو گیا تھا۔ سب کے درمیان بیٹھنا چھوڑ دیا تھا۔

"ارے واسق، آؤ یار، شکر ہے آج تم جلدی گھر لوٹ آئے۔" اسے اندر داخل ہوتے دیکھ کر شہروز نے کہا تو وینزے بھی اسے دیکھنے لگی۔ وہ دادی اماں کے پاس آ بیٹھا۔ دادی اماں کے دوسری طرف امی تھیں اور امی کے ساتھ وہ دشمن جان بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ واسق نے ایک سرسری نگاہ ڈالی اور پھر سب کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"شادی کروا کر جگری یار کیسے آنکھیں پھیر لیتے ہیں واسق کو دیکھ کر پتا چل گیا ہے۔" شہروز نے اس پر بھرپور چوٹ کی تو وہ

ہنس دیا۔

"تم کیوں پیچھے ہو تم بھی کروا لو۔ تمہیں بھی دیکھ لیں گے کیسے آنکھیں پھیرتے ہو۔" اس نے بھی برجستگی سے کہا تو سب کے بے اختیار قہقہے نکل پڑے تھے۔ وہ بھی مسکرا دی۔

"میں تو راضی ہوں تم دادی اماں سے سفارش کر دو۔" شہروز نے کافی آہستگی سے کہا تھا کہ صرف وہی سن سکا۔

"دادی اماں! میرا خیال ہے اب اسے بھی کھونٹا نصیب کر دیں۔ خوامخواہ ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔" شہروز کی بات پر اس نے دادی اماں کو کہا تو وہ اسے گھورنے لگیں۔

"چپ کر کے سب بیٹھے رہو۔ بڑوں کے معاملات میں مت بولا کرو۔" انہوں نے یوں اس کے اور شہروز کے سب کے درمیان اس طرح کی باتیں کرنے پر ٹوکا۔ شہروز نے منہ بنایا۔

"اب تو اس کی ترقی ہو گئی ہے دادی اماں۔ بیوی والا ہے۔" شہروز نے خاصے چڑچڑے لہجے میں کہا تو سب پھر ہنس پڑے تھے۔ وہ بھی مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ان سب کو یونہی مسکراتے چھوڑ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

"جاؤ ونیزے، واصق کمرے میں گیا ہے۔ شاید سارا سارا دن ادھر ادھر بھاگتے دوڑتے تھک گیا ہے۔ تم دیکھو تو۔" بڑی امی نے واصق کا یوں اٹھ کر چلے جانا محسوس کیا تھا۔ وہ ان کی نظروں میں ہی تاڑ گیا کہ صاحبزادے کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔ اپنے قریب بیٹھی ونیزے کے کان میں آہستگی سے کہا تو وہ اٹھنے لگی۔ انہوں نے مزید ہدایت کی۔

"میں نے کیتلی میں چائے بنا کر رکھی ہے۔ گرم کر کے لے جانا اور ساتھ میں سر درد کی کوئی ٹیبلٹ بھی۔" وہ سر ہلا کر کچن میں چلی آئی۔ گرم چائے اور ٹیبلٹ لے کر جب وہ کمرے میں پہنچی تو وہ ہیٹر آن کیے گرم لحاف میں لیٹا ہوا تھا۔ لائٹس آف تھیں اور بیڈ سائیڈ کے دونوں لیمپ روشن تھے۔

اس نے جیسے ہی لائٹ جلائی واصق کی خاصی ناگوار سی آواز ابھری۔

"پلیز لائٹ آف رہنے دیں۔ آنکھوں میں چبھ رہی ہے۔"

اس نے ایک سیکنڈ بھی ضائع کیے بغیر حکم کی تعمیل کی تھی۔ چائے لیے اس کی سائیڈ پر آ گئی۔

"یہ چائے لے لیں۔" وہ کپ بڑھائے کھڑی تھی۔ "مگر میں نے تو آپ کو کہا ہی نہیں۔" نائٹ لیمپ کی مدھم سی روشنی میں ونیزے اس کے چہرے کی حیرت یا شاید ناپسندیدگی اچھی طرح محسوس کر سکتی تھی۔

"آنٹی نے بھیجی ہے۔" وہ جتائے بغیر نہ رہ سکی۔

"اوہ..... اچھا، لائیے۔" وہ اٹھ بیٹھا۔ اس کے ہاتھ سے کپ لے کر وہ پینے لگا تو اس نے ہتھیلی پر رکھی ٹیبلٹ بھی آگے کی۔ اب وہ واقعی چونکا تھا۔ ونیزے سے تو اس عنایت کی تو اسے امید نہیں تھی۔

"کیا یہ بھی امی نے بھیجی ہے؟" چبھتا ہوا سوالیہ انداز تھا وہ کلس کر رہ گئی۔

"جی۔" صرف اتنا ہی کہہ سکی۔ واصق نے ٹیبلٹ اٹھالی۔ وہ خاموشی سے بیڈ کی طرف آ کر بیٹھ گئی۔ اسے واصق کی اس حرکت اور بات نے دکھ پہنچایا تھا۔ وہ ہونٹوں کو کچلتی اپنے بالوں سے کیچر پن اتار کر انگلیاں پھیرتے لیٹ گئی۔

"میری امی اب آپ کی ساس بھی لگتی ہیں۔ انہیں آنٹی مت کہا کریں۔ وہ آپ کو اپنی بیٹی کہتی ہیں تو پھر آپ بھی انہیں ماں کا درجہ دینا چاہیے۔" کیا حکم بھرا اسٹائل تھا۔ ونیزے کی تو جان ہی جل گئی۔ واصق پر ایک نظر ڈال کر رہ گئی۔

پرسوں کی بارش کی وجہ سے سردی بڑھ گئی تھی مگر وہ ابھی تک کمبل ہی استعمال کر رہی تھی جبکہ کمرے میں صرف ایک ہی لحاف تھا جو دو دن سے واصق کے استعمال میں تھا۔ اس نے خاموشی سے کمبل اوڑھا۔ لحاف میں سر دینے سے پہلے اس نے اپنی سائیڈ کا لیمپ

بھی آف کر دیا۔ جس کی وجہ سے کمرے میں موجود نیلگوں روشنی اور مدھم پڑ گئی تھی۔

سحری کے وقت وہ واصق سے پہلے اٹھ گئی تھی۔ واصق سو رہا تھا جب اس نے منہ ہاتھ دھونے کے بعد باہر کی راہ لی۔ باہر اچھی خاصی چہل پہل ہو رہی تھی۔ تقریباً سبھی اٹھ چکے تھے لیکن دسترخوان پر ابھی تک کوئی نہیں آیا تھا۔ وہ بھی خاموشی سے اماں کے تخت پر بیٹھ گئی۔ وہ وظیفہ کر رہی تھیں وہ انہیں دیکھتی رہی۔

"واصق اٹھ گیا؟" ہال کمرے کی طرف برتن لے جاتے بڑی امی نے پوچھا تو اس نے یونہی گردن ہلا دی جس سے ہاں یا ناں کی تصدیق نہیں ہوئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد دسترخوان بھی سج گیا تھا۔ سب بیٹھ گئے تھے تو وہ بھی بیٹھ گئی۔ ابھی اس نے لقمہ ہی لیا تھا جب دادی اماں کی پکار سنی۔

"ونیزے بیٹی! واصق نہیں آیا۔ کیا اٹھا نہیں ابھی تک۔"

"پتا نہیں، میرا مطلب ہے جب میں باہر آئی تھی تو وہ سو رہے تھے۔"

"عجیب نیند ہے اس کی۔ سب وقتی، جاؤ شاباش سے اٹھا کر لاؤ سحری کا وقت کم پڑتا جا رہا ہے اور وہ سو رہا ہے۔" وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ کمرے میں داخل ہوئی تو وہ اسی طرح سو رہا تھا۔ وہ چلتی ہوئی اس کی طرف بڑھی۔ اسے اٹھانے کو ہاتھ بڑھایا پھر کھینچ لیا۔ فیصلہ نہ کر پائی کہ کیسے اٹھائے۔ کبھی خود سے مخاطب کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی ایک دو دفعہ نام لینے کی زحمت کرنا پڑی تھی تو "سنئے" کہہ کر کام چلایا تھا۔

"سنئے۔" اب بھی وہی کہتے اس کے قریب کھڑے ہو کر پکارا مگر بے سود۔ اب ہاتھ سے ہلانے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ اس نے اس کا کندھا ہلا دیا۔ اس کے باوجود [illegible]

"سنیے پلیز، اٹھ جائیں... روزہ رکھ لیں۔" اسے پھر ہلاتے اس نے کافی نحیف آواز میں پکارا۔ جس انداز میں وہ پکار رہی تھی شاید ہی وہ اٹھتا پھر بھی واصق نے ذرا کی ذرا آنکھیں کھول کر اسے دیکھا پھر بند کر لیں۔

"سنیے پلیز! باہر سب سحری کر رہے ہیں روزہ رکھ لیں۔ بہت کم وقت رہ گیا ہے۔" واصق کے آنکھیں کھول کر بند کر لینے سے وہ بھی خاصی جھنجلا گئی تھی۔ اب [illegible] آواز میں کہا۔ آواز میں جھنجلاہٹ بہت نمایاں تھی پہلے والی نرمی مفقود تھی۔

واصق پر کچھ اثر نہ دیکھ کر وہ ارادے سے پلٹ گئی کہ سوچتی ہے وہ خود ہی اپنے لاڈلے کو اٹھا لیں گی۔ ابھی وہ قدم بھی نہ اٹھا پائی تھی جب بے اختیار پلٹنا پڑا۔ اس کا ہاتھ واصق کے ہاتھ میں تھا۔ آنکھیں بدستور بند تھیں۔ وہ اس جسارت پر کچھ نہ سمجھ سکی۔ البتہ پریشان ضرور ہوئی۔ واصق کا ہاتھ بہت گرم تھا۔ انگلیاں جل رہی تھیں۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے کسی آگ کے دہکتے انگارے نے اس کے ہاتھ کو چھو لیا ہو۔ یکدم اس کے ذہن میں سرسراہٹ ہوئی۔ فوراً بیڈ کے کنارے ٹک گئی۔ لاشعوری طور پر اس پر جھکی۔

"واصق! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔" وہ جو ہاتھ لگانے پر جھنجلا رہی تھی۔ انتہائی پریشانی سے اس کا نام پکارتی اس کی پیشانی پر اپنا ہاتھ رکھے پوچھ رہی تھی۔ دوسرا ہاتھ اس کے سینے پر دھرا ہوا تھا۔ واصق نے پوری کی پوری آنکھیں کھول لیں۔ آنکھوں کی رنگت بہت سرخ ہو رہی تھی۔

"ہوں....." اپنی پوری آنکھیں ونیزے کے چہرے پر جمائے اس نے ہنکارا بھرا۔ وہ بے چین ہو اٹھی۔

"آپ کی طبیعت خراب ہے؟" اس کا بازو ہلاتے اس نے دوبارہ پوچھا۔

"نہیں... ٹھیک ہوں میں۔" اس کا ہاتھ ہٹاتے لحاف ایک طرف کر کے اس نے کہا تو وہ فکرمندی سے اسے دیکھے گئی۔

"مگر آپ کو تو تیز بخار ہے۔" اسے اٹھ کر بستر سے نیچے ٹانگیں لٹکاتے دیکھ کر اس نے کہا۔ کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے اپنے گھنے بالوں کو پیچھے کرتے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ دینیز بھی کھڑی ہوگئی۔

"آپ پلیز لیٹ جائیں۔ آرام کریں، آپ کو تو بہت تیز بخار ہے۔" اسے باتھ روم کی طرف بڑھتے دیکھ کر وہ کہے بغیر رہی۔ وہ سنی ان سنی کرتا اندر گھس گیا۔ وہ وہیں ٹہلنے لگی۔

واسق تولیے سے منہ ہاتھ صاف کرتا باہر نکلا تو اسے وہیں دیکھ کر رک گیا۔

"آپ روزہ مت رکھیں اس طرح تو طبیعت اور خراب ہو جائے گی۔" وہ بہت ڈرپوک اور چڑیا جتنے دل کی مالک تھی۔ وہ تو دشمن کو بھی بیمار نہیں دیکھ سکتی تھی یہ تو پھر اس کا اپنا شوہر تھا۔ کیسے برداشت کرتی۔

"آپ بھول رہی ہیں یہ فرض روزے ہیں، کسی صورت معاف نہیں۔" تاؤ میں صوفے پر بیٹھتے واسق نے کہا تو وہ چڑ گئی۔

"مگر بیماری کی حالت میں کچھ رعایت تو ہے نا۔" وہ خواہ مخواہ اس سے الجھ پڑی۔

"میں ٹھیک ہوں۔ آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی باہر کسی سے میری طبیعت کے متعلق ذکر کرنے کی۔" بہت ہی زیادہ کھردرے لفظوں میں کہتا وہ باہر نکل گیا تو۔ پیچھے وہ کھڑی دیکھتی رہ گئی۔

صبح سحری کے وقت واسق نے کوئی میڈیسن نہیں لی تھی۔ سارا دن روزے کی حالت میں ہوتے ہوئے طبیعت مزید خراب ہوگئی تھی۔ سارا دن کمرے میں بے سدھ لیٹا رہا۔ دینیز جو سارا دن اندر باہر آتی جاتی اسے دیکھ کر ہولتی رہی تھی۔ افطاری کے بعد برداشت نہ ہو تو امی سے خراب طبیعت کا ذکر کر دیا۔ وہ اس کے ساتھ ہی کمرے میں آگئی۔

"تم نے صبح ہی ذکر کیوں نہیں کیا تھا؟" واسق کے سرہانے بیٹھ کر اس کا سر اپنی گود میں رکھتے انہوں نے اس سے پوچھا۔ وہ اپنی جگہ چور سی بن گئی۔

"انہوں نے منع کر دیا تھا۔" واسق کی طرف دیکھتے بتایا۔

"حد ہوتی ہے واسق بے پروائی کی بھی۔" انہوں نے اب واسق کو جھڑکا۔

"امی ٹھیک ہوں میں۔ لڑکی تھوڑی ہوں میں جو آپ اس پریشان ہو رہی ہیں۔" اب بھی وہ سخت جھنجلا گیا تھا۔ انہوں نے ڈانٹا۔

"عجیب عادت ہے تمہاری، بے پروائی والی۔ کبھی اپنا خیال نہیں کیا تم نے۔ روزہ بھی افطار کیا تھا یا یونہی بے سدھ لیٹے ہو۔" افطار کو تو کافی وقت گزر گیا تھا۔ ان کے پوچھنے پر اس نے سر ہلا دیا۔

"کس سے؟" ان کی جرح جاری تھی۔

"آپ کی بہو نے دودھ لا دیا تھا۔" بہت جھنجلا کر اس نے کہا تھا۔ امی نے پروا نہ کی۔

"میں بلواتی ہوں کسی کو۔ اس کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس جاؤ۔"

وہ اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئیں تو وہ اس پر الٹ پڑا۔

"کیا ضرورت تھی امی کو پریشان کرنے کی۔"

"آپ کو اتنا ہائی ٹمپریچر ہے۔ مجھ سے نہیں دیکھی جا رہی تھی آپ کی یہ حالت۔"

واسق نے ہونٹ بھینچ لیے۔ امی شہروز کو بلا لائی تھیں۔ ان دونوں کو زبردستی ڈاکٹر کی طرف بھیجا۔

"میں بہت اچھی طرح دیکھ بھی رہی ہوں اور محسوس بھی کر رہی ہوں۔ تمہاری دادی اماں نے بھی مجھے کتنی دفعہ ٹوکا ہے کہ تم

دونوں کی جب سے شادی ہوئی ہے تب سے تم دونوں کو چپ سی لگ گئی ہے۔ شادی شدہ جوڑوں والی کوئی بات نہیں تم میں۔ چلو واسق تو اس شادی پر تیار ہی نہیں تھا اس کا رویہ تو سمجھ میں آتا ہے مگر تم کیوں ایسا کر رہی ہو۔ وہ سارا دن گھر سے باہر گزار دیتا ہے۔ رات گئے لوٹتا ہے تو تم جو سارا دن اچھی بھلی ہوتی ہو۔ کبھی مل بیٹھ کر بات کرتے تم دونوں کو دیکھا نہیں۔ دیکھو، اگر کوئی مسئلہ ہے، کوئی بات ہے تم دونوں میں تو بلا جھجک مجھے کہو۔ واسق نے اگر کچھ کہہ دیا ہے تو بھی کہو، اگر اس کا قصور ہوا تو ضرور ٹوکوں گی۔ ایسی زندگی گزارنے کی اجازت بالکل نہیں دوں گی۔ میں تو تم دونوں کو خوش دیکھنا چاہتی ہوں میری جان!" مسکراتے ہوئے ایک ساتھ۔"

رات کو سب ہی ہال کمرے میں نماز ادا کر رہی تھیں۔ نماز پڑھ کر ایک ایک کر کے سب اٹھ گئیں تو آخر میں وہ اور امی تنہا رہ گئی تھیں۔ تبھی دھیمے سے مسکرا کر انہوں نے یہ ذکر چھیڑ دیا تھا۔ ان کی اس محبت بھری پھوار پر دینیز کا دل چاہا اپنا دل کھول کر ان کے سامنے رکھ دے۔ سب کچھ کہہ دے۔ چھ سال بعد اس کو ان کے روپ میں ماں ملی تھی۔ بلکہ ماں سے بھی بڑھ کر محبت کرنے والی شفیق و مہربان ہستی تھیں۔ وہ کیسے ان سے کچھ چھپا سکتی تھی۔ جبکہ اب وہ خود اس مسئلے کا حل چاہتی تھی۔ واسق کی چونک خراب ہو جانے والی طبیعت پر وہ تنگ پریشان تھی اور یہ رنجش جس کا کوئی اختتام نہیں ہو رہا تھا وہ اب مزید نہیں برداشت کر سکتی تھی۔ اب امی نے یہ قصہ خود چھیڑا تو وہ انہیں سب بتاتی گئی۔ بچپن کی ساری باتیں واسق کے متعلق دل میں پیدا شدہ سارے گلے شکوے، سارے شکوک و شبہات، واسق کی کہی گئی تمام باتیں، سب کچھ ہی خاموشی سے سنتی رہیں۔

"یہ جو تمہارے دل میں خلش ہے کسی دوسری لڑکی کے متعلق اسے باہر نکال دو۔ واسق کی گواہی میں تمہیں دیتی ہوں۔ وہ اس قسم کا لڑکا نہیں ہے۔ جہاں تک اس لڑکی کی بات کا تعلق ہے تو میں واسق سے پوچھوں گی۔ شاید دوستوں میں مذاق میں کوئی الٹی سیدھی بات کہہ دی ہو۔ واللہ علم۔ میں اسے پوچھوں گی تم دل چھوٹا مت کرو۔" انہوں نے شفقت سے اس کا کندھا تھپکا۔

"دینیز یہ رمضان کا، بڑا بابرکت والا مہینہ ہے، رحمتوں و نوازشوں والا۔ اللہ تعالیٰ سے اپنی خوشیوں کی بقا، محبت کر دل کو تو ذات کا گھر بنا کے اپنی نیکیوں کو ضائع کرو۔ کل چھبیسواں روزہ ہے۔ عید آنے میں بھی صرف ماشاءاللہ چار دن باقی ہیں۔ اگر اسی طرح ایک دوسرے سے روٹھے ہوئے، کھنچے ہوئے، بے بنیاد غلط خدشات میں گھرے ہوئے یہ دن بھی گزار دیئے تو کیا فائدہ ہوا ایسی عبادات کا، خلوص، تقویٰ سے رکھے روزوں کا، عقیدت سے کی جانے والی تلاوت کا، جب تم دونوں میاں بیوی ہونے کے باوجود اس بندھن کو نبھانے سے پہلو بچا رہے ہو۔ صرف اور صرف اپنی اپنی ذات میں قلعہ بند ہو کر کتنا بڑا گناہ کر رہے ہو تم دونوں۔ اپنے دل کے اندر چھپی ہوئی رنجشوں، غلط فہمیوں کو سینچتے ہوئے شکوک و شبہات کو پروان چڑھا رہے ہو۔ مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے کہ تم نے اپنے دل کی بات پہلے ہی دن مجھ سے کیوں نہ کہی۔ اگر کہہ دیا ہوتا تو آج صورت حال کچھ مختلف ہوتی۔ بہرحال تمہیں اب پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ واسق کی طرف سے بھی دل صاف کر دو وہ اب تمہارا شوہر ہے۔ تمہاری پہلی ترجیح، اس کی ضمانت تمہیں میں دیتی ہوں۔" اس کے ہاتھ کو تھپکتے انہوں نے کہا تو وہ ان کی آغوش میں منہ چھپا کر رو دی۔

"ایم سوری امی! مجھے احساس ہے یہ جو کچھ بھی ہوا ہے، اس میں میرا بھی قصور ہے۔ مگر میں کیا کرتی، میں جن حالات سے گزر کر آئی ہوں اور جو درپیش تھے انہوں نے مجھے کم حوصلہ، کم فہم، اور خوفزدہ کر دیا تھا۔ ہر شخص مجھے محبوب رحمانی ہی لگتا تھا۔ ایسے میں واسق کو دیکھ کر نہیں بھی ہرٹ کر گئی۔ اس میں میری کسی شعوری کوشش کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ حالات ہی ایسے تھے پھر میرے دل میں رشتے کے متعلق بھی بے اعتباری تھی اور اس حد تک تھی کہ میں محبت و یقین اعتماد و اعتبار کے درمیان معلق ہو کر رہ گئی تھی۔ دل میں بے اعتباری ہی بے خبری تھی۔" اس نے اپنا دل کھول کر ان کے سامنے رکھ دیا۔ انہوں نے اس کا چہرہ اٹھا کر اشک صاف کیے۔

"اب نہیں رونا...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ جاؤ اپنے کمرے میں اور آرام کرو۔ واسق کا بھی خیال رکھنا۔ اب تک تو وہ ڈاکٹر کے پاس سے آ گیا ہوگا۔" وہ خاموشی سے اٹھ کر کمرے میں آ گئی۔ واسق صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔

آنسو بہانے سے اس کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں۔ "سوں، سوں" کرتی وہ بستر میں دبکی تو واثق نے بغور دیکھا... دھیان دیے بغیر کمبل سر تک تان گئی۔

* * *

عید کی تیاریاں کرتے، افراتفری میں سب کام نپٹاتے، آخری روزہ بھی آپہنچا۔ امی نے واثق سے بات کی تھی یا نہیں جانتی تھی نہ انہوں نے خود ذکر کیا تھا۔ واثق کا رویہ جوں کا توں برقرار تھا۔ وہ خود سے کوئی پیش رفت کرتا اسے بہت ملال... انتظار ہی کرتی رہی کہ واثق شاید اپنے اور اس کے لئے منتخب کی گئی سزا کو ختم کر دے مگر انتظار انتظار ہی رہا اور سارا رمضان گزر گیا۔

وہ سارا دن خود ہی جھنجلاتی رہی۔ اس نے تو نہ ہی عید کی تیاری کی تھی، نہ کپڑے، نہ جیولری کچھ بھی نہیں لیا تھا بلکہ حیرت کی بات یہ تھی کہ گھر کے کسی فرد کو بھی اس کا خیال نہیں آیا تھا۔ واثق سے تو اس نے یہ توقع کبھی کی ہی نہیں تھی۔ ستائیسویں روزے... بڑی بھیا بھابی اس کے لئے عیدی لے آئے تھے۔ آج بھی سارا دن خود سے لڑتے، الجھتے وہ یہی سوچتی رہی کہ ان کے لائے گئے جوڑوں میں سے کوئی ایک پہن لے گی۔ چونکہ آج آخری روزہ تھا اسی لئے افطاری پر بھی بھابی اور بچے بھی ان کے ہاں افطار کرنے... افطاری کے بعد وہ بھی گھنٹے بیٹھ کر وہ چلے گئے تو وہ پھر خود سے الجھنے لگی۔

چائے کی طلب ہو رہی تھی۔ وہ اٹھ کر کچن کی طرف آگئی۔ باہر مسجد میں سے تکبیر کی آوازیں آرہی تھیں۔ سڑک پر گاڑیوں کا کافی رش تھا۔ ہر طرف چاند رات کی خوشیاں منائی جا رہی تھیں اور ایک وہ خود تھی جو ویران دل لئے رونے کو بے تاب تھی۔ اس کا دل بھر بھر آنے لگا۔

"ونیزے... حیرت ہے کہاں کھوئی ہیں آپ ذرا بھی گرد و پیش کا خیال نہیں ہوتا۔ میں نے کتنی دفعہ آپ کو پکارا ہے مجال ہے جواب دیا ہو..." وہ اپنی ہی سوچوں میں غرق تھی جب واثق کی جھنجلائی ہوئی آواز سنی۔ اس نے فوراً پلٹ کر دیکھا تو اس نے اپنی خاصی جھاڑ پلا دی۔

"آ... آپ... وہ آپ کی موجودگی سے بے خبر تھی اپنی جگہ کنفیوز سی ہو گئی۔

"مجھے ایک کپ چائے چاہیے۔ پلیز... بہت ضروری..." اس نے اسے دیکھتے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"بنانا آتی ہے نا چائے آپ کو؟" وہ پوچھ رہا تھا جبکہ ونیزے کے اندر اسے واثق کا بار بار آپ، آپ کہنے پر جھنجلاہٹ ہونے لگی۔ خاموشی سے سر ہلا کر پیچھے ہٹ کر کچن میں چلی آئی۔

کیتلی چولہے پر چڑھا کر وہ دودھ نکالنے فریج کی طرف بڑھی، جب دودھ کا پیکٹ نکال کر پلٹی تو واثق بھی کچن میں کھڑا ہوا تھا۔ پہلے تو چونکی پھر سر جھٹکتے چائے بنانے لگی۔

"ایک بات تو بتائیں۔ آپ اپنے گرد و پیش سے اتنی بے خبر کیوں رہتی ہیں یہ اچھی بات تو نہیں۔" انتہائی بے تکلفی سے کہتے وہ کرسی گھسیٹ کر اس کے قریب بیٹھا تو وہ حیران ہو کر اسے دیکھنے پر مجبور ہو گئی۔

واثق کا چہرہ کیسا کھلا کھلا سا تھا۔ آنکھوں کی معنی خیز سی چمک کچھ اور افسانے سنا رہی تھی۔ اس نے پزل ہو کر رخ موڑ لیا وہ چولہے کی آگ کم اور زیادہ کرنے لگی۔

"کیا بات ہے، کوئی مسئلہ ہے جو اتنے غور سے سوچا جا رہا ہے۔" وہ جو اتنی پوری توجہ اور دھیان چائے پر رکھے ہوئے تھی۔ اس گل افشانی پر چڑ گئی۔

"آپ کو کون سا وہ مسئلہ حل کر دینا ہے۔" صاف بڑبڑاہٹ تھی۔ واثق محظوظ ہوا۔ ونیزے رخ موڑ کر کھڑی ہو گئی... واثق کی نظروں کی تپش اپنی پشت پر اچھی طرح محسوس کر رہی تھی۔ وہ اندر ہی اندر جھنجلانے لگی کہ یا تو وہ یہاں سے اٹھ کر چلا جائے یا پھر اس کی الجھن دور کر دے۔ یہ شاید جھنجلاہٹ ہی تھی یا پھر ہاتھ چھلکا تھا۔ کپ میں چائے انڈیلتے ہوئے کیتلی سے چائے اچھل کر اس کے دوسرے ہاتھ پر گرتے گرتے بچی۔ پھر بھی گھبراہٹ میں ہاتھ کیتلی سے چھو گیا تھا۔ بے پناہ تکلیف کا احساس جاگا۔ ہلکی سی سسکی ہونٹوں سے آزاد ہوئی۔ اس نے جلدی سے کیتلی رکھ کر اپنا بایاں ہاتھ تھاما۔ واثق جو سب دیکھ رہا تھا وہ بھی یکدم قریب آیا تھا۔ فوراً اس کا ہاتھ پکڑ...

"دھیان کہاں تھا آپ کا..... ابھی جل جاتا تو۔" روئی کے گالوں جیسے نرم و نازک شفاف ہاتھ کی تھوڑی سی انگلی جل گئی تھی۔

"بہت بے خبر رہتی ہیں آپ اگر چائے بنانا نہیں آتی تھی تو انکار کر دیا ہوتا۔"

وہ غصے سے بول رہا تھا۔ وہ کچھ بے یقینی سے دیکھنے لگی۔ وہ تو اس بے قراری سے ہاتھ پکڑنے پر ہی حیران تھی۔ ان الفاظ پر بھونچکا رہ گئی گھرا گئے ہی لمحے تے دنوں کی بے قراری اس کی الجھن چڑچڑاپن سب کے باہر آگئی۔

"چھوڑیں میرا ہاتھ۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہتے سختی سے کھینچا مگر گرفت بہت مضبوط تھی۔ اس نے کچھ غصے سے کچھ گھبرا کر دیکھا تو اس کی نظریں ملتے ہی جیسے جھک گئیں۔ کیا کچھ نہیں تھا ان آنکھوں میں۔ اسے اپنی روح فنا ہوتی محسوس ہوئی۔ دل کی دھڑکن تو حد سے بڑھ گئی تھی۔

"کیا ہے... چھوڑتے کیوں نہیں۔ چائے ڈالی ہے... ٹھنڈی ہو جائے گی۔" وہ اب روہانسی ہو گئی تھی۔ واثق نے کچھ نہیں کہا تھا۔ اسی طرح ہاتھ پکڑے، ہاتھ پکڑے، کمرے میں دوسرا ہاتھ بڑھا کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

"کیا کرتے ہیں... وہ چائے۔" وہ تو پہلے ہی گھبرا گئی تھی۔ اب تو اس کا حال بھی ہو گئی۔

"وہ بھی آ جائے گی تم چلو۔"

"او میرے اللہ" ونیزے کو تو اپنے... سے بے جوں بھی جاتے محسوس ہوئے۔ واثق کی نظریں، لہجہ، رویہ کیا طرز تخاطب بھی چینج تھا۔ "تم" دماغ اسی پر الجھ گیا اور واثق اسے لئے اپنے کمرے میں آگیا اور اسی طرح پکڑے بیڈ پر بٹھا دیا۔

"ایک منٹ، میں بھی آیا۔"

وہ فوراً باہر نکل گیا تھا۔ جب لوٹا تو ہاتھ میں چھوٹی ٹرے تھی۔ جس میں چائے کے دو کپ تھے ایک کپ اسے تھمایا تو اس نے لرزتے ہاتھوں سے تھام لیا۔ دوسرا کپ لے کر وہ بھی اس کے برابر ہی ٹک گیا۔ یوں کہ اپنا بایاں بازو اس کے کندھے پر رکھ دیا تھا۔ وہ اس قرب پر مزید سمٹ گئی۔

"یار روٹھی ہوئی محبوبہ، بیوی کو کیسے مناتے ہیں، مجھے اس کا کوئی تجربہ نہیں کیونکہ یہ میری زندگی کا پہلا واقعہ ہے۔" چائے کا سپ لیتے اس نے بات کی۔

"میں کوئی روٹھی ہوئی نہیں ہوں۔" بڑی آہستہ آواز میں وہ منمنائی۔ چائے کا کپ تو یوں بھی ہاتھ میں لرز رہا تھا۔ واثق نے ہاتھ نہ جلنے کے ڈر سے کپ تھام کر ٹرے میں رکھ دیا۔ اس کی منمناہٹ بھی سن لی تھی۔

"ہاں تو پھر میں کیا کہہ رہا تھا۔" واثق نے تھوڑا سا جھک کر اس کا چہرہ دیکھا جو سرخ ہو رہا تھا۔ ونیزے نے سر اس قدر جھکایا ہوا تھا کہ بس سجدہ کرنے کی کسر رہ گئی تھی۔ ایک بے اختیار مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر سرایت کرتی گئی پھر اس نے اپنے ہاتھ میں اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے جو انتہائی یخ ہو رہے تھے۔

"کوئی اور بات کرنے سے پہلے میں اپنی جاب کے متعلق اچھی طرح بتا دوں تا کہ تمہارے دل و دماغ میں موجود رہ جانے والی آخری خلش بھی مٹ جائے جو سارے قصے کی اصل وجہ تھی۔ مجھے ہرگز ہرگز علم نہیں تھا کہ تم میری جاب کے متعلق اتنی بے خبر ہو۔ میں انٹیلی جنس میں خاص گروپ میں کام کرتا ہوں۔ میرے کام میں احتیاط، رازداری بہت ضروری ہوتی ہے۔ ہر کام بہت

خاموشی سے خفیہ پلانوں پر کیا جاتا ہے۔" دینز ے ان باتوں پر حیران ہوئی۔ بھلا ان سب باتوں کا روشانے سے کیا تعلق ہے۔

"تم یقیناً حیران ہو رہی ہو کہ روشانے اور میری جاب کا کیا تعلق مگر جب تم میری ساری بات سنو گی تو خود بخود جان جاؤ گی۔ بس اتنا بتا دوں کہ میری جاب کے متعلق بہت کم لوگ باخبر ہیں صرف خاص دوست احباب، رشتہ دار اور گھر والے ہی جانتے ہیں۔ ورنہ عام لوگوں کو میں ہمیشہ یہی بتاتا ہوں کہ صرف پولیس میں ہوں۔ صرف اس لئے کہ ہم جو کام کرتے ہیں اس میں رازداری سب سے اہم شرط ہے۔" وہ نہ جانے کیا کیا کہہ رہا تھا اس کے تو کچھ بھی پلے نہیں پڑا تھا۔ الجھن زدہ انداز میں سر اٹھا کر دیکھے گئی۔ پہلے والی گھبراہٹ مفقود تھی۔ واثق نے چائے کا کپ اٹھا کر اسے دوبارہ تھمایا۔

"لو اب یہ پیو۔" وہ خاموشی سے تھام کر گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔

"پچھلے دنوں پورے پانچ ماہ میں جس پراجیکٹ پر کام کرتا رہا تھا وہ دہشت گردوں کی ایک تنظیم تھی جب اپنا کام شروع کیا تو تصور میں بھی نہیں تھا کہ میری زندگی میں بھی کوئی انہونی ہو جائے گی۔ پہلے ہی مرحلے پر تم سے سامنا ہونا کسی انہونی سے کم نہ تھا۔ میں تو صرف یہ سمجھا تھا کہ کوئی نیچوں لڑکی ہمارے گھر میں گھس گئی ہے اور نہ جانے اس کے کیا ارادے ہیں اسی لئے میں تمہارے پیش آیا تھا۔ نتیجہ برعکس نکلا اور تم بے ہوش ہو گئی۔ بعد میں تمہیں دیکھا تو الجھتا رہا کہ یہ چہرہ کہیں دیکھا بھالا ہے مگر کہاں؟ بہت سوچنے کے باوجود یاد نہ آیا۔ میں کیس سے قبل منائے گئے کیس کے متعلق بالکل بھول چکا تھا۔ پھر انہی لمحوں میں جب تم امی کے جانے پر تخت پر گر بیٹھی تھیں تو میں چاہنے کے باوجود اپنی نظریں اور سوچیں تمہارے وجود پر سے نہ ہٹا سکا اور لمحوں میں تمہارے سحر میں کھو گیا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ میں بہت مضبوط اعصاب کا مالک ہوں مگر تمہارے مقابل تو میرا دل مجھے ہی دھوکہ دے گیا اور میں کچھ بھی نہ کر سکا۔" اب کے واثق کے لہجے میں خاصی بے چارگی اور محبت کی پھوار تھی۔ وہ جو مسلسل سے دیکھ رہی تھی اس کے بے چارگی اور شرارت خیز انداز میں مسکرائے پرنور نظریں جھکا گئی۔ واثق تھوڑا سا شریر ہوا۔

"یار اس میں بھی میرا کوئی قصور نہیں تھا تمہاری یہ ناگن سی زلفیں میرے سینے پر لوٹ پوٹ ہو گئیں مجھے حقیقت میں ڈس ہی گئی تھیں۔" دینز ے کے بالوں سے ہیر کیچر اتار کر سارے بال بکھرا دیئے تھے۔ سارا وجود لمبے گھنے سیاہ بالوں میں چھپ گیا تھا۔ واثق سے اتنا غیر متوقع کیا تھا کہ وہ مزاحمت بھی نہ کر سکی۔

"پلیز" وہ معنی خیز الفاظ سے زیادہ نظروں کی بے باکی پر روہانسی ہو کر اس کے ہاتھوں کو دھکیلتے پیچھے ہٹی تو واثق کا منہ قہقہہ میں گونجا۔ اسے مزید معطر ہو گیا پھر اس کے ہاتھ سے خالی کپ لے کر دوسرے کپ کے ساتھ ٹرے میں رکھا۔ اسے کندھوں سے تھام کر خود سے قریب کر لیا۔

"تمہارے بارے میں دادی امی سے علم ہوا پھر مجید بھائی سے ملا اور ساری صورتحال کو خود اپنے طور پر ہینڈل کرنے کی جرأت کی۔ وہ فوراً رضا مند ہو گئے۔ اس دوران تمہاری ناپسندیدگی اور بے اعتباری مجھ پر بہت اچھی طرح واضح ہو چکی تھی مگر وجہ کیا تھی میں بے خبر تھا یہ مسئلہ صرف تم سے بات کرنے سے ہی حل ہو سکتا تھا مگر تم نے کوئی بات کرنے کا موقع ہی نہ دیا۔ اس رات جب تم نے مجھے بھی خاصی سنا ڈالی تھیں تو میں وہاں ٹیرس پر پہلے سے ہی موجود تھا۔ تمہیں دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔ جب تم رونے لگی تو مجھے خود پر اختیار نہ رہا اور سب باتیں بھلائے تمہاری طرف لپکا تھا جواباً تم نے جس طرح کی عزت افزائی کی تھی پلیز بے یقینی و بے اعتباری کا جو نام دیا تھا میرا دل چاہا کہ زمین پھٹے اور میں اس میں سما جاؤں۔ دینز ے سچ سچ بتاؤ کیا میں تمہیں شکل سے چور، فراڈ اور لوز کریکٹر کا شخص لگتا ہوں۔" اس کی بات پر وہ شرمندہ ہوتی سر جھکا گئی۔

"اس میں میرا کیا قصور تھا۔ آپ بھی تو میرے ساتھ ایسی مشکوک حرکتیں کر رہے تھے۔ پھر اچانک رات کو آپ کو اپنے سامنے دیکھ کر ڈر گئی تھی۔ جو منہ میں آتا گیا، میں کہتی گئی، جواباً آپ نے بھی رعایت نہیں کی تھی۔ بری طرح ذلیل کر دیا۔ عام سی ذہنیت والی گھٹیا سوچ کی حامل عام سی لڑکی کہہ کر۔" شکوہ اس کے لبوں سے بھی پھسل گیا تھا۔ واثق ایک دم ہنس پڑا تھا۔

ہم گر عام سی لڑکی ہوتیں تو امی کے بے پناہ اصرار اور دھمکیوں کے باوجود بھی شادی کے لئے ہامی نہ بھرتا۔ کچھ دل کی خواہش تھی اور کچھ امی کی محبت کہ میں خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ کر اس رشتے پر آمادہ ہو گیا۔"

"ڈاکٹر کے پاس سے گھر لوٹا تو وجیہ کے بتانے پر کہ تم اور امی ہال کمرے میں ہو۔ میں یونہی ادھر آ گیا اور پھر تمہاری امی کی ساری باتیں سن لیں۔ حیرت بھی ہوئی اور ساتھ یہ انکشاف بھی کہ روشانے بی بی کون ہیں اور میں نے تمہیں پہلی بار کہاں دیکھا۔ تم دونوں پر ظاہر کئے بغیر میں واپس کمرے میں آ گیا تھا۔ ارادہ تم سے فوراً بات کرنے کا تھا اسی لئے صوفے پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ بعد میں جب تم آ گئیں تو یہ سوچ کر بات کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا کہ کیا پتا یہ بے قراری، یہ الجھن، صرف اور صرف بیوی ہونے کے ناتے ہو۔ جبکہ شادی کی رات میں نے کہا تھا کہ اعتماد اور یقین کے ساتھ ساتھ مجھے محبت بھی چاہئے۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ روشانے کے متعلق میری ذات کی بے اعتباری و بے یقینی تمہارے دل میں موجود چھپی محبت ہے یا پھر صرف ایک بیوی کی رقیبانہ سوچ۔"

واثق کی اس بات پر اس کے دل نے پھر غیر معمولی دھڑکنا شروع کر دیا تھا۔ نظریں جھک کر رہ گئیں۔

"روشانے نامی لڑکی میری جاب کا ایک حصہ تھی، وہ اس طرح کہ وہ ہمارے ہی ڈیپارٹمنٹ میں کام کرتی ہے۔ اس کا اصل نام روبینہ ہے۔ ہم دونوں کو بطور خاص اس کام پر مامور کیا گیا تھا کہ مختلف کالجز اور سکولز میں سے ہونے والی بھولی بھالی خوبصورت لڑکیوں کے اغوا کرنے والے گروہ اور اس گھناؤنے مافیا کے اصل چہروں کو بے نقاب کریں۔ تم لوگوں کے کالج میں بھی ایک ایسی ٹیچر تھی۔ روشانے وہاں طالبہ کے طور پر گئی تھی۔ میں اسے روز چھوڑنے اور لینے جاتا تھا۔ اس طرح ہم نے بہت احتیاط اور راز داری سے یہ سارا کیس حل کیا تھا۔ روشانے نے مجھے بتایا تھا کہ تم اس ٹیچر کے ساتھ ہو۔ کیونکہ اس ٹیچر نے جن جن لڑکیوں کو ہدف بنایا تھا ان میں ایک تم بھی تھیں۔ ہمارا پلان کامیاب ہوا تھا۔ وہ ٹیچر گرفتار کر لی گئی تھی ساتھ میں اس کا پورا گروپ بھی پکڑا گیا تھا۔ چونکہ یہ تعلیمی اداروں کی بہتر ساکھ کا سوال تھا والدین یہ جاننے کے بعد کہ اب ان تعلیمی اداروں میں کیسے کیسے لوگ داخل ہونا شروع ہو گئے ہیں کسی کو بھی اپنے بچوں کو نہ بھیجتے اسی لئے ہمیں اسکولز اور کالجز کے نام خفیہ رکھنے پڑے روشانے اور اس گروپ کو مجرم کے طور پر اخبار میں پیش کرنا پڑا تھا۔ یہی وہ لڑکی تھی جس کی وجہ سے تم میرے متعلق انتہائی مشکوک رہی ہو۔ روشانے کی شادی ہو چکی ہے اب تو اس کے دو بیٹے بھی ہیں۔" وہ انکشاف پر انکشاف کرتا جا رہا تھا آخر میں، جو ہلکے پھلکے انداز میں کہا تھا وہ شرمندہ ہوتی فوراً کہہ گئی۔

"آئی ایم سوری۔"

"اٹس او کے یار، ہم جیسے لوگوں کو ہر کوئی مشکوک نظروں سے ہی دیکھتا ہے۔ تمہارا کوئی قصور نہیں ہے، اب خیال کرنا۔ جہاں محبت ہو وہاں شکوک و شبہات بھی ہوتے ہیں۔ کوشش کرنا بے یقینی و بے اعتباری ہمارے درمیان نہ آنے پائے۔" اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے اس نے کہا تو وہ فوراً سر ہلا گئی۔ اگلے ہی لمحے اپنی بے اختیاری پر جھینپ بھی گئی۔

"تمہیں اصل بات تو بتائی ہی نہیں۔ تمہارے وجہ سے مجھے امی کی اچھی خاصی جھاڑ سننے کو ملی ہے۔ تھوڑی دیر پہلے جب بھیا بھابی کے جانے کے بعد افسردہ ہو گئی تھیں تو مجھے فوراً تمہارے پیچھے دوڑایا اور یہ بھی سن لو میرے کار ایکسیڈنٹ اور گھر آنے والی گمنام کال کے پیچھے محبوب رحمانی کا ہاتھ تھا۔" واثق نے ہلکے پھلکے انداز میں بتایا۔ وہ دم بخود سی رہی۔

"اور ہاں یاد آیا، چاند رات مبارک تو میں نے کہا ہی نہیں۔" اس کا جھکا چہرہ اوپر اٹھاتے اس نے کہا تو وہ بے اختیار ہنس دی۔ اس کے دونوں ہاتھوں کو جھٹک کر کھڑی ہو گئی۔

"بہت جلد یاد آ گیا...... وہ بھی اگر امی نہ کہتیں۔" ساری گرہیں کھلیں تو یہ احساس بھی جاگا کہ وہ چار دن سے کس قدر الجھن میں تھی اور ابھی تھوڑی دیر پہلے کیوں جھنجلا رہی تھی۔ دل بار بار کیوں بھر آ رہا تھا۔

واثق نے اس خفگی بھرے وجود کو شانوں سے تھام کر اس کا رخ اپنی طرف کر لیا تھا۔

"بھولا ہی کب تھا۔ اگر آپ نہ کہتیں تو تب بھی مجھے تمہارے پاس ہی آنا تھا۔ آؤ تمہیں تمہاری عید کی شاپنگ دکھاؤں۔" واسع نے بیڈ کے دوسری طرف رکھی بے تحاشا چیزوں کی طرف بڑھا جن کی طرف ابھی تک اس کا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔

"جب تمہارے دل میں موجود جذبہ رقابت اور محبت کے درمیان میں سے میں نے محبت کو اخذ کر لیا تو سب سامان بھی لے لیا۔ ارادہ تمہیں صبح سرپرائز دینے کا تھا مگر تمہاری صورت ایسی جھنجلائی اور روہانسی ہو رہی تھی کہ مجھے تم پر ترس آ گیا۔" ایک ایک چیز اس کے سامنے رکھتے وہ کہہ رہا تھا۔ وہ سب کچھ دیکھنے لگی۔ چہرے پر بے پناہ جھلاہٹ و اشتیاق در آیا تھا۔ واسع مسکرا دیا۔

پرپل رنگ کا خوبصورت کامدانی، جوڑا، مہندی، چوڑیاں، جیولری پھولوں کی لڑیاں، گجرے، پازیبیں، پرفیوم اور بھی نجانے کیا کیا تھا وہ ششدر دیکھتی رہ گئی۔

"مجھے خاص زنانہ شاپنگ کرنے کا کوئی تجربہ نہیں۔ پہلی دفعہ کی ہے اگر کوئی چیز مس ہو گئی ہے تو آئی ایم سوری۔ اگلی عید پر ہم دونوں خود جائیں گے شاپنگ کرنے۔" آخر میں آنکھ دبا کر اس نے کہا تو وہ شرم سے سرخ ہوتی پوری جان سے کانپی۔ خوامخواہ چیزیں ادھر ادھر کرنے لگی۔ تبھی واسع نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے مقابل کھڑا کر لیا۔ جھکی پلکیں جھکی ہی رہ گئیں۔

"میری طرف دیکھو دینیزے۔" وہ سرگوشیانہ انداز میں کان میں بولا۔ اس نے اٹھتی گرتی پلکیں اٹھا کر ایک لحظہ کو مقابل کو دیکھا۔ نگاہوں میں وارفتہ پن در بے خودی تھی جو تاب نظارہ لا سکی۔ بے اختیار سر جھکایا تو اس کے سینے سے ٹکرایا۔ گھبرا کر پیچھے ہٹنا چاہا تو گرفت سخت ہو گئی۔ وہ صرف کسمسا ہی سکی۔

"پلیز..." وہ اس کے قرب کی تپش سے گھبرا کر سکائی۔

"اب... ہوں... آج پہلی دفعہ تو تم خود میرے قریب آئی ہو۔ مکمل خود سپردگی کے ساتھ۔ کیسے چھوڑ دوں۔ پہلی دفعہ کوئی اپنا حق استعمال کر رہا ہوں۔"

محبت کے بیٹھے میٹھے ادلتی تپش اور محور بہ تعب دینیزے کو آج اپنا آپ بچ نکلنا بہت ناممکن لگا۔ مقابل تو بن پیے ہی بہک رہا تھا۔

"آج رات روئے زمین پر میری بیوی سے زیادہ اور کوئی حسین نہیں ہوگا۔"

"بہت، بہت برے ہیں آپ۔" اس کی فولادی گرفت سے جب نکلنے میں ناکام رہی تو ہارے ہوئے لہجے میں بے اختیار کہہ کر اس کے سینے پر سر ٹکا گئی۔ جواباً واسع کا بے اختیار برجستہ قہقہہ دینیزے کے ساتھ ساتھ پوری فضا کو بھی گلنار کر گیا تھا۔

"جیسا بھی ہوں یار! اب خوش قسمتی سے تمہارا ہی ہوں۔" بلور کی طرح نازک، نگینے کی طرح خوبصورت اور چاندنی کی طرح چمکتے دمکتے دینیزے کے معطر وجود کو اپنے آپ میں سمیٹے اس نے خوش کلامی کی تھی۔

"نئی زندگی اور نئی زندگی کی خوبصورت شروعات مبارک ہوں میری جان!" پیار بھری سرگوشی بھی ہوئی تھی۔ اس کے دل کی طرح دینیزے کا دل بھی خوش آئند تصورات بھی کھویا تھا۔ وہ بے اختیار اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لائی کہ جس نے سب حالات سنوار دیے تھے۔ یوں کہ بس صرف!

محبت ہی محبت تھی!

یقین ہی یقین تھا!

اور اعتبار ہی اعتبار تھا!

پاگل سا میرا ڈھول ماہیا

اپنی پلکوں کے دریچوں میں چھپا لے مجھ کو
حسن تدبیر سے تقدیر بنا لے مجھ کو
مجھ کو محسوس کرے گا نہ کوئی تیرے سوا
عشق کی راج ہوں سانسوں میں بسا لے مجھ کو

وہ کمرے میں داخل ہوئی تو سیدھی نظر بستر پر آڑھے ترچھے لیٹے بیٹے پر جا پڑی جو کسی میں سر دیے دو دنیا مافیہا سے بے خبر نیند کی وادیوں میں غرق تھا۔ بایاں بازو نیچے لٹک رہا تھا جب کہ کمبل کا تو تھا ہی وہ کہیں نہیں، صرف ایک کونا اس کے بازو کے نیچے دبا ہوا تھا۔

"توبہ ہے یہ لڑکا اتنا بڑا ہو گیا ہے مگر ابھی تک اسے سونا نہیں آیا۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائیں۔ اپنے بیٹے سے نظر ہٹا کر اب انہوں نے ایک تفصیلی نگاہ چاروں طرف دوڑائی۔ کل دوپہر سے لے کر اب تک صرف چوبیس گھنٹوں سے بھی کم وقت میں کمرے کی حالت بری ہو چکی تھی۔ کتابیں ریک کے بجائے سینٹرل ٹیبل بستر اور قالین پر رونق افروز تھیں۔ گیلا استعمال شدہ تولیا صوفے پر گولا بنا تھا۔ ایک جوتا بستر کے قریب تھا اور دوسرا باتھ روم کے دروازے میں الٹا پڑا ہوا تھا۔ رات کو بدلا جانے والا لباس صوفے کے ہتھے پر دھرا ہوا تھا۔ ان کی طبیعت پر یہ پھیلاوا بہت گراں گزرا۔ بعض اوقات، کلوتا بیٹا ہونا بھی عادتیں بگاڑ دیتا ہے۔ وہ خود تو اچھی خاصی سلیقہ مند بھی سگھڑ اور نفیس طبیعت کی مالک تھیں۔ صفائی پسند بھی بے انتہا تھیں بلکہ ان کی دو بڑی بیٹیاں تو ان ہی کا پرتو تھیں۔ شوہر عالم صاحب بھی انہیں جیسے تھے مگر یہ داؤد عالم نہ جانے کس پر چلا گیا تھا۔ جہاں کی جو طبیعت میں نفاست ہو۔ بے انتہا پڑا تھا اس وقت بھی دن کے بارہ بجے وہ اپنے گدھے گھوڑے کی بلکہ لگتا تھا جیسے پورا اصطبل بیچ کر سویا ہوا ہو۔ کل ہی دس بجے کے قریب کوئٹہ سے لوٹا تھا۔ شام کو دونوں بہنیں بھی اپنے شوہروں اور بچوں سمیت اپنے بھائی کو ملنے آ گئی تھیں۔ رات گئے تک وہ لاؤنج میں محفل جمائے بیٹھے رہے تھے۔ دو بجے کے قریب سب سونے کو اٹھے تھے اور ابھی تک غافل پڑے ہوئے تھے۔ عالم صاحب کو تو آفس جانا تھا وہ صبح سویرے ہی چلے گئے تھے۔

جبیں اور حنا دونوں کے شوہر بھی اپنے کاروبار والے تھے۔ وہ بھی نو بجے کے قریب چلے گئے تھے جب کہ دونوں بہنیں بچوں سمیت دو دن کے لیے اپنے اپنے سسرال آئی ہوئی تھیں رات سے وہ یہاں تھیں۔

کچھ دیر پہلے ہی وہ دونوں اپنے بچوں سمیت رخصت ہوئی تھیں۔ اس وقت وہ گھر پر تنہا تھیں۔ کتنی دیر تک داؤد کے بیدار ہونے کا انتظار کرنے کے بعد انہوں نے خود اس کے کمرے کا چکر لگایا تھا مگر کمرے کی حالت دیکھ کر وہ حقیقتاً چکرا کر رہ گئی تھیں۔

"داؤد! اب اٹھ جاؤ...... بہت سولیا۔ جلدی کرو اٹھو شاباش......" کمرے میں بکھری کتابیں سمیٹنے کے بعد وہ اس کے سر پر کھڑی ہوئیں۔

"کیا ہے امی..... سونے دیں ناں...... اتنے دنوں بعد تو گھر کی نیند میسر آئی ہے۔" نیند کی بوجھل آواز میں کہتے اس نے کمبل سر تک لینا چاہا مگر تجمل بیگم نے ایک دم کمبل اس کے ہاتھ سے کھینچ لیا۔

"بہت بری بات ہے داؤد! تمہاری تو سب عادتیں ہی بگڑ چکی ہیں اور تمہاری بہنوں نے مجھے ذرا بھنک نہیں پڑنے دی۔ تم وہاں بھی یقیناً یہی سب کرتے رہے ہو گے......" انہوں نے سخت آواز میں کہا تو وہ نیند سے بوجھل آنکھیں کھول کر انہیں دیکھنے لگا۔ لبوں پر خود بخود دلفریب مسکراہٹ ابھر آئی۔ کہنیوں کے بل اٹھتے ہوئے بیڈ کی کراؤن سے پشت ٹکائی۔

"او پیاری امی جی! جانے دیں وہاں کا پوچھیں ہی نہیں۔ وہ تو حنا ہر ہفتے چکر لگا لیتی تھی تو سہولت ہو گئی تھی ورنہ... آپ کے بغیر وہ فلیٹ مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔ بس جی چاہتا تھا کہ اڑ کر آپ کے پاس پہنچ جاؤں۔ بڑی مشکل سے بھاگ دوڑ کر کے، افسران سے مل کر اپنا یہاں ٹرانسفر کروایا ہے۔" تجمل بیگم نے مسکرا کر اسے دیکھا پھر کمبل تہہ کرنے لگیں۔

"چلو وہاں سے تو جان چھوٹی۔ کب سے چارج لے رہے ہو یہاں کی برانچ کا؟" تیزی سے ہاتھ چلاتے کشن زمین اور بستر سے سمیٹتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

"ایک ہفتے کے بعد۔ یہ چھٹیاں بھی [illegible] کر کے لی ہیں۔ قسم سے امی وہ کوئٹہ کی برانچ کا آفیسر بڑا اخرانٹ ہے۔ اس کا بس چلے تو وہ اتوار تو ایک طرف عید بقرعید پر بھی چھٹی نہ دے۔" ہاتھوں کی انگلیوں سے اپنے گھنے مگر بکھرے بالوں کو سمیٹتے وہ بستر سے اترا۔

"کپڑے نکال دوں؟" اسے باتھ روم کا رخ کرتے دیکھ کر انہوں نے پوچھا تو وہ سر ہلا گیا۔ انہوں نے کپڑے نکال کر اسے تھمائے اور اس کے میلے کپڑے اٹھا کر ہاتھوں میں لئے۔

"ناشتے میں کیا لو گے؟" وہ بہت خوش خوراک تھا پھر کتنے مہینوں بعد یہاں دوبارہ سیٹل ہونے کے بعد شاید پہلی دفعہ وہ ناشتے کا پوچھ رہی تھیں۔ وہ مسکرا دیا۔

"پراٹھا اور وہ بھی آلو کا۔ قسم سے بہت دن ہو گئے ہیں آپ کے ہاتھوں کی کوئی چیز کھائے ہوئے۔ فریج میں رکھے باسی کھانے کھا کھا کر طبیعت بھی باسی ہو گئی ہے۔" وہ ہنس دیں۔

"ٹھیک ہے تم نہا لو، اتنی دیر میں تمہارے لئے پراٹھے بناتی ہوں۔" وہ کمرے سے نکل گئی تھیں جتنی دیر میں وہ نہا کر تیار ہو کر باہر آیا تھا۔ وہ گرما گرم خستہ کرارے پراٹھے لاؤنج میں لے آئی تھیں۔

"واہ! ماں ہو تو ایسی۔ جیسی امی جی! ایسی خوشبو بھلا حنا کے پکے باسی کھانوں میں کہاں تھی۔" خوشبو سونگھتے ہی اس کا معدہ ایک دم متحرک ہوا تھا۔ امی ہنس دیں۔ وہ قالین پر بیٹھا ہوا تھا۔ انہوں نے وہیں چھوٹی تپائی پر ٹرے رکھی۔

"جانتی ہوں میں کتنے مدیرے ہو تم..... خاص طور پر ماں کو بنانا تو تمہیں خوب آتا ہے۔" انہوں نے اس کے سر پر ہلکی چپت لگاتے پاس کی جگہ سنبھالی۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا تھا۔

"خدا کی قسم امی! میری کیا اوقات کہ میں آپ کو بناؤں۔ واہ واہ! تعریف تو اس ہستی کی ہے جس نے آپ کو بنایا ہے اتنے لذیذ کھانے بنانے والی والدہ محترمہ کو..... واہ۔" نوالہ توڑ کر منہ میں رکھتے وہ ہانک رہا تھا۔ وہ مسلسل مسکراتی رہیں۔ آج کتنے دنوں بعد اسے اپنے سامنے یوں ناشتہ کرتے دیکھ کر ان کا سیروں خون بڑھ گیا تھا۔ ابھی ایک مہینہ پہلے ہی تو وہ ول کر گیا تھا مگر وہ آمد بھی صرف دن کی تھی۔ اگلی صبح سویرے ہی بغیر ناشتہ کیے اس نے رخت سفر باندھ لیا تھا اور اب وہ مستقل یہاں سیٹل ہو گیا تھا۔ ان کی آدھی

فکر تو ختم ہو گئی تھی۔ جب سے وہ یہاں عالم صاحب کے ساتھ آئی تھیں ہر وقت سر پہ سوار رہتی تھی۔ روز فون کر کے اسے ہدایات دیتی تھیں۔ وہ تو شکر تھا کہ حنا وہاں قریب ہی رہتی تھی۔ روز وہاں کا چکر لگا لیتی تھی مگر جیسا خیال وہ خود رکھتی تھیں وہ حنا سے اپنی گھریلو ذمہ داریوں میں کہاں ممکن تھا۔ اب انہوں نے شکر ادا کیا تھا کہ اس کا ٹرانسفر یہاں ہو گیا تھا۔ ناشتے کے بعد انہوں نے اسے چائے بنا کر دی تھی۔ وہ ٹی وی آن کر کے بیٹھ گیا تو وہ کچن کا پھیلاوا سمیٹنے لگیں تب ہی فون کی بیل بجی۔

"داؤد! دیکھنا ذرا کس کا فون ہے؟" انہوں نے وہیں سے صدا لگائی تھی۔ داؤد آواز دھیمی کر کے فون کی طرف بڑھ آیا۔

"ہیلو۔" ریسیور کان سے لگاتے اس نے کہا۔

"السلام علیکم۔" بھاری نسوانی آواز تھی۔ اس نے ریسیور کو گھورا۔

"وعلیکم السلام۔ جی آپ کون اور کس سے بات کرنی ہے؟"

"مجھے تجمل سے بات کرنی ہے۔ پلیز انہیں بلوا دیں۔ میں نسرین بول رہی ہوں۔" دوسری طرف سے کافی مہذب انداز میں کہا گیا تھا۔

"جی اچھا ہولڈ کریں۔ میں انہیں بلاتا ہوں۔"

"امی! آپ کا فون ہے۔ کوئی نسرین صاحبہ ہیں آپ کو بلا رہی ہیں۔" اس نے وہیں ریسیور رکھ کر امی کو آواز دی تو وہ نسرین کا نام سن کر دوڑی باہر نکل آئی تھیں۔

"ارے نسرین! تم.... تم نے کیسے زحمت کر لی میرے گھر فون کرنے کی۔" اس نے دوبارہ صوفے پر بیٹھ کر اپنی نگاہیں ٹی وی اسکرین پر جما دیں۔ آواز مدھم ہی رکھی کہ امی فون کر رہی تھیں۔

"نہیں۔ میں تو آنا چاہ رہی تھی مگر عالم جب بھی فارغ نہیں ہوتے پھر گھر کی سیٹنگ میں ہی کہیں نکلنے کی فرصت کہاں ملی ہے۔ اب تو ماشاءاللہ داؤد بھی یہیں آ گیا ہے۔ میں کسی دن وقت نکال کر آؤں گی۔ تم سناؤ گھر میں سب تو خیریت ہے نا۔ ماریہ کا کیا حال ہے۔" بہت محبت سے وہ گفتگو فرما رہی تھیں۔ داؤد کا لاشعوری طور پر دھیان اسی جانب تھا۔

"ارے جانے دو۔ اس عمر میں سب لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں لاپرواہ۔ تم خوامخواہ ہی پریشان ہو رہی ہو۔ بچی ہے جب شادی ہو گی سنبھل جائے گی۔ اللہ نے عورت کی فطرت میں بڑی لچک رکھی ہے۔ وہ ہر طرح کے ماحول میں ڈھلنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ جب ذمہ داریاں کندھوں پر آ پڑتی ہیں تو سارا بچپنا سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگ جاتا ہے۔" وہ بہت چاہنے کے باوجود خود کو امی کی گفتگو سننے سے باز نہیں رکھ پایا تھا۔ اسے دوسری جانب کون شخصیت ہیں؟ کچھ کچھ اندازہ ہو رہا تھا اور کن محترمہ کا ذکر ہو رہا ہے وہ اصل نکتے تک پہنچ گیا تو ایک گہری سانس لی۔ "یااللہ خیر۔" اندر ہی اندر اس نے دعا کی۔

"رہنے دو۔ ابھی اس کو تعلیم سے تو فارغ ہو جانے دو پھر تمہیں جلدی کاہے کو ہے۔" اب کے امی نے کچھ جھنجھلا کر کہا تھا۔ داؤد نے بغور انہیں دیکھا۔ ایسی ہی جھنجھلاہٹ ان کے چہرے سے بھی ہویدا تھی۔

"وہ نہیں مانتی تو رہنے دو۔ دیکھو نسرین میں تم سے ذکر کر چکی ہوں۔ تم جانتی ہو میں کیا چاہتی ہوں۔ چلو فی الحال خاموش رہو۔ میں ایک دو دن میں چکر لگانے کی کوشش کرتی ہوں۔ ہاں..... ٹھیک ہے...... بالکل ٹھیک۔ جو میں نے کہا تھا ضرور سوچنا۔ ہاں ابھی داؤد کا انتظار تھا ماشاءاللہ وہ بھی کل سے یہاں مستقل آ گیا ہے۔ بات کروں گی۔ بس تم ان لوگوں کو انکار کر دو۔ بس میں نے کہہ دیا ناں۔ اچھا اللہ حافظ۔" وہ اس کے قریب صوفے پر آ بیٹھیں۔ اس نے ایک گہری سانس لی۔

"کون نسرین آنٹی..... کیسا ذکر؟" وہ بن رہا تھا۔ امی نے اسے گھورا۔

"داؤد! میں سنجیدہ ہوں۔ نسرین کے گھر ایک رشتہ آیا ہوا ہے۔ قطب الدین بھائی کے دوستوں میں سے کوئی ہے۔ وہ

ماریہ کی شادی کرنا چاہتی ہے اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں کیا چاہتی ہوں۔'' انہوں نے بلاتمہید فوراً بات کی تھی۔ وہ اندر ہی اندر کلس کر رہ گیا۔ بعض اوقات امی بھی حد کرتی تھیں۔ ''اور میں نے آپ سے جو کہا تھا آپ وہ بھی جانتی ہیں۔ میں کسی ایسی لڑکی کو اپنی زندگی میں شامل کروں... وہ بھی یاد کیجیے... نو امی جی پلیز آپ سے میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ آپ اس موضوع کو بند کر دیں۔'' اس نے اب کے کچھ برہمی سے انہیں ٹوک دیا۔

''تم نے اسے دیکھا نہیں اس بہانے کو تو رہنے ہی دو۔'' جواباً انہوں نے بھی کچھ برہمی سے کہا تو وہ زچ ہوا۔

''ہاں دیکھا تھا اس وقت جب بچہ تھا۔ آپ کے ساتھ نسرین آنٹی کے ہاں جایا کرتا تھا اور وہ موٹی تازی بھیڑ جب بھی کم نہ تھی۔ آفت کی پڑیا تھی۔ اس کی اوپری منزل میں انسان کا نہیں بلکہ شیطان دماغ فٹ تھا۔ پوری بلی جالو تھی وہ۔ عمر کے حساب سے گر میں اسے بلی جالو کہوں تو زیادہ بہتر ہے۔ اور آپ بھول گئیں پچھلی دفعہ اس نے اپنی سہیلیوں کے ساتھ مل کر میرا کیا حشر کیا تھا۔ حنا اور جبین سے کیسے وہ خار کھاتی تھی۔ مجھے تو معاف ہی رکھیں۔ میں باز آیا ایسی لڑکی سے۔'' اس نے باقاعدہ ہاتھ جوڑے تھے۔ امی حیران ہوئیں اسے تو سب یاد تھا جب کہ وہ تو سب بھول بھال گئی تھیں۔

''بچپن میں تو سب ہی ایسی ہوا کرتی ہیں۔ تم نے خوامخواہ اسے موٹی تازی بھیڑ بنا دیا ہے۔ وہ تھوڑی صحت مند تھی۔ اب تم دیکھو ذرا... کتنی سمارٹ اور خوب صورت ہو گئی ہے وہ، ماشاء اللہ۔ وہ کچھ شرارتی سی ہے مگر بدتمیز ہرگز نہیں۔ بچپن میں اگر وہ شرارتیں کرتی تھی تو تم بھی بدلہ لیا کرتے تھے۔ نسرین سے شکایت لگا کر اسے پٹوا کر۔'' انہوں نے تو گویا پوری سائیڈ لے ڈالی تھی اس کی۔ وہ زچ ہو کر بیٹھ گیا۔

''امی جی پلیز! خدا کے لیے اس موضوع کو یہیں چھوڑ دیں۔ وہ بچپن میں کیا تھی یا اب کیا ہو گئی ہے مجھے غرض نہیں ہے۔ شادی کروں گا تو میں اپنی پسند سے... کہنا پڑ رہا ہے۔'' وہ ریموٹ کنٹرول سے ٹی وی بند کر کے ریموٹ کنٹرول کو ٹیبل پر پٹخ کر لاؤنج سے نکل گیا۔ پیچھے وہ ہکا بکا رہ گئیں۔

''یا اللہ نسرین کو کیا منہ دکھاؤں گی میں۔ یہ لڑکا تو کسی بھی طرح پروں پر پانی ہی نہیں پڑنے دے رہا۔'' وہ نہایت فکرمندی سے سوچنے لگیں۔

* * *

وہ نہا کر نکلا تو کال بیل ہو رہی تھی۔ امی شاید کسی کام میں مصروف تھیں وہ عجلت سے باہر نکلا۔ امی کچن میں آٹا گوندھ رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر جلدی سے دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا تو وہ باہر نکل آیا۔ دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا تو وہ باہر نکل آیا۔ دروازہ کھولا تو وہاں دروازے پر موجود شخصیت کو دیکھ کر اس کا منہ ضرور کڑوا ہوا تھا۔

''السلام علیکم بیٹا! کیا حال ہے؟'' اندر کی جانب قدم بڑھاتے انہوں نے اس کے گیلے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔ عقب میں ان کے نوعمر سا لڑکا تھا جو دلچسپی سے دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ بائیک پر سوار تھا شاید ان کو چھوڑنے آیا تھا۔ داؤد کو متوجہ دیکھ کر فوراً بائیک سے اتر آیا تھا۔

''السلام علیکم! میں حمزہ ہوں اور آپ یقیناً داؤد بھائی ہیں۔'' اس سے ہاتھ ملاتے وہ پوچھ رہا تھا۔ داؤد نے صرف سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا۔ نسرین بیگم دونوں کو کھڑا دیکھ کر اندر کی جانب بڑھ گئیں۔

''آؤ اندر آؤ بلکہ بائیک بھی لے آؤ۔'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا تھا۔ حمزہ بائیک اندر لے آیا تو وہ دونوں بھی ٹی وی لاؤنج میں چلے آئے۔ امی بھی ادھر ہی آ گئی تھیں۔ بہت اپنائیت سے نسرین ملیں۔

''میں ادھر سے گزر رہی تھی۔ سوچا کتنے دن ہو گئے ملاقات کیے ہوئے ملتی چلی جاؤں..... اور سناؤ بیٹا آپ کا کیا حال ہے؟'' انہوں نے امی کو اپنے آنے کی وجہ بتاتے ہوئے اس بھی گھسیٹا۔ وہ پہلو بدل کر رہ گیا۔ امی کا احساس نہ ہوتا تو شاید سامنے بھی نہ آتا۔

''میں ٹھیک ہوں.... آپ سنائیے؟''

''بس بیٹا' اللہ کا شکر ہے۔'' انہوں نے محبت سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

خوب صورت توانا وجود کا مالک، سوبر سی شخصیت لیے شلوار سوٹ میں صوفے پر بیٹھا انہیں کافی بھلا لگا۔ آخری بار جب انہوں نے دیکھا تھا تو وہ بارہ سال کا کھلنڈرا سا دبلا پتلا لڑکا تھا پھر کبھی موقع ہی نہ ملا۔ وہ اور تجمل اکثر فون پر رابطہ رکھتی تھیں جب ان کے شوہر کا انتقال ہو تو وہ ملتان چلی گئی تھیں پھر اکثر جب بھی یہاں آنا ہوتا وہ اکثر ملنے آتی رہی تھیں۔ ساتھ میں عالم بھائی بھی ہوتے تھے، بچے تعلیمی مصروفیت کی وجہ سے بہت کم آتے تھے۔ یہاں ان کا ددھیال تھا لیکن ایک دو دن میں واپس چلے جاتے تھے۔ ایسے میں نسرین تجمل بیگم کو دعوت دینے کا سوچتی رہ جاتی تھیں مگر بچوں سمیت گھر پر بلانے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ اب برسوں بعد وہ دوبارہ یہاں سیٹل ہوئے تھے تو ان کو پہلی دعوت کا خیال آیا تھا مگر داؤد پھر بھی نہیں تھا۔ ان کی بیٹیاں آئی ہوئی تھیں۔ تجمل، عالم صاحب، جبین اور حنا اپنے بچوں سمیت دعوت پر آئی تھیں نہ اب آنا جانا لگا رہتا تھا۔ کبھی وہ آ جاتی تھیں کبھی تجمل ان کے ہاں چلی جاتی تھیں مگر آج پہلی بار اتنے برسوں بعد وہ داؤد سے مل رہی تھیں۔ وہ انہیں اچھا لگا تھا۔ وہ دونوں حمزہ باتوں میں مصروف ہو گئے تو وہ تجمل کے ساتھ لگ گئیں۔

''میں تو پریشان ہوں ماریہ کی حرکتوں کی وجہ سے... کل بھی ... سب لوگ گھر سے گئے ہوئے تھے۔ بس دو یا نازیہ اور ماریہ ہی گھر پر تھیں۔ ویسے میں نے ان دونوں کے ساتھ تم کو بھی دیکھی اللہ اپ سے پہلے جو تمہیں بتایا تھا کہ قطب صاحب کے دوست کے بیٹے کا رشتہ آیا تھا۔ وہ بھی اس نے اوٹ پٹانگ حرکتیں کر کے بھگا دیا۔ لوگ سلجھے ہوئے تھے۔ لڑکا بھی قابل اور صاحب روزگار تھا۔ میری بڑی خواہش تھی کہ رشتہ ہو جائے مگر جب وہ لوگ دیکھنے آئے تو انہوں نے جو بھی پوچھا۔ الٹا سیدھا ہانکتی گئی۔ وہ پوچھتے الف تھے اور ماریہ بتاتی ''بی'' تھی۔ خدا کی قسم بہت شرمندہ ہوئی میں۔ گھر بھر کی لاڈلی ہے اور اسی لاڈ پیار نے اسے بگاڑ دیا ہے۔ تم میری اپنی ہو۔ بہت قریب ہو میرے اسی لیے سب بتا رہی ہوں پھر تم نے جو خواہش کی ہے میں تو ابھی تک حیران ہوں۔ ماریہ تمہاری بہو بننے کے قابل نہیں ہے۔ وہ کسی اچھے گھر میں جائے یہ میری سب سے بڑی خواہش ہے مگر تمہارے گھر آئے ایسا تو میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا۔ داؤد تمہارا اکلوتا بیٹا ہے۔ یقیناً بہو بھی تم ایسی ہی چاہتی ہو جو سلجھی ہوئی سگھڑ اور سلیقہ شعار ہو اور اس گھر کو ایسی ہی لڑکی کی ضرورت ہے جب کہ ماریہ تو اس کے بالکل متضاد ہے۔ پڑھائی میں وہ بالکل صفر ہے اور گھر بار کی بھی الف ب سے بھی بالکل ناواقف۔ میں نہیں چاہتی کہ ہماری آپس کی دوستی و محبت ختم ہو۔ تم آنا چاہ رہی تھیں مگر میں نے سوچا پہلے ہی تم سے بات کروں۔ مجھے بہت افسوس ہے۔''

وہ بہت دھیمی آواز میں تجمل بیگم کا ہاتھ پکڑے کہہ رہی تھیں۔ داؤد ان دونوں سے کافی دور کونے میں موجود صوفے پر براجمان تھا بہت کوشش کے باوجود بھی ان کی گفتگو کا ایک لفظ بھی اس کے پلے نہ پڑا۔

''میرا خیال ہے۔ یہ اتنی بڑی وجہ نہیں ہے کہ تم انکار کرو اگر تم ابھی راضی نہیں تو میں انتظار کر لوں گی۔ ویسے بھی ماریہ کا ٹائم مسئلہ ہے۔ وہ ہو جائے تو پھر بات ہو گی مگر میں انکار نہیں سنوں گی۔ ابھی اس میں بچپنا ہے جب کندھوں پر ذمہ داری پڑے گی تو خود بخود سلجھتی جائے گی۔ حنا بھی شادی سے پہلے ایسی ہی تھی مگر اب ایسی بدل گئی ہے کبھی میں سوچتی ہوں کہ وہی حنا ہے جس نے شادی سے پہلے کبھی جھاڑو کو ہاتھ نہیں لگایا تھا اور کبھی کچن کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ اب ماسی کی طرح جب تک گھر کی صفائی ستھرائی نہ کرے

اسے چین نہیں آتا۔" انہوں نے فوراً کہا تو نسرین ہنس دیں۔

"ہاں مگر حنا اور ماریہ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اسے دنیا کی ہر چیز سے دلچسپی ہو سکتی ہے سوائے گھر کے کاموں اور پڑھائی کے۔ ڈنڈا سر پر ہو تو کتاب کو ہاتھ لگائے گی ورنہ ایک لفظ بھی نہیں پڑھتا۔ سو سو جتن کر کے اسے بی۔ اے تک لائی ہوں۔ بڑی خواہش تھی کہ اسے پڑھاؤں گی لکھاؤں گی، کسی مقام تک پہنچاؤں گی مگر وا ری قسمت۔ سچ کہا ہے کسی نے کہ ایک انڈہ وہ بھی گندا۔ مجھ پر تو یہ ضرب المثل فٹ آتی ہے۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا تو تجمل بھی ہنس دیں۔

تجمل نے ان کی کولڈ ڈرنکس اور فروٹس کے ساتھ تواضع کی تھی۔ وہ دونوں مزید ایک گھنٹہ بیٹھ کر چلے گئے تھے۔ انہیں رخصت کرتے ہوئے داؤد نے شکر ادا کیا تھا۔

"یہ خاتون... میرا مطلب ہے آپ کی یہ ہمشیرہ صاحبہ خیریت سے ہی آئی تھیں؟" ان کے جانے کے بعد ہی کمرے میں ... رہی تھیں وہ بھی ادھر ہی آ گیا۔

"ہوں..." انہوں نے ہنکارا بھرا۔ اس نے بغور دیکھا وہ کچھ سوچ رہی تھیں۔

"کیا سوچ رہی ہیں؟" فریج سے پانی کی بوتل نکال کر منہ سے لگاتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ تم بتاؤ تم نے اپنی شادی کے بارے میں کیا سوچا ہے؟" دانی تو بے پروا لگے انہوں نے اسے دیکھا تو اس کا منہ بن گیا۔

"پلیز امی جی! آپ عام ماؤں کی طرح مجھے اس سلسلے میں مجبور مت کریں۔ شادی میں اپنی پسند سے کروں گا۔ مجھے نہیں پسند آپ کی یہ بہن ورنہ ان کی بیٹی۔" اس نے صاف انکار کیا تھا۔ امی دیکھتی رہ گئیں۔ "اور ہاں آئندہ اس موضوع پر کوئی گفتگو ہو۔ میں آپ کی خاطر یہ جواب دے رہا ہوں۔ اگر آپ نے مجھے اسی طرح زچ کیا تو میں اپنا ٹرانسفر دوبارہ کوئٹہ کرا لیتا ہوں پھر کرواتی رہیے گا میری شادی۔ حد ہے جب سے آیا ہوں ایک ہی لفظ سن رہا ہوں۔ شادی... شادی شادی۔" وہ غصے سے کہتا ہوا کچن سے نکل گیا۔ پیچھے وہ ہکا بکا دیکھتی رہ گئیں۔ اس طرح تو وہ کبھی بھی پیش نہیں آیا تھا مگر آج... وہ سوچتی رہ گئیں۔

نسرین بیگم کو آج کل ماریہ کو ٹیک پروین اور پڑھاکو لڑکی بنانے کا جنون سوار ہو گیا تھا۔ ہر وقت اپنی نظریں اس پر گاڑے رکھتی تھیں۔ ماریہ جس کی گھر کے کاموں میں خاص طور پر کچن سے جان جاتی تھی۔ آج کل نسرین بیگم کے زیر عتاب آئی ہوئی تھی۔ اس کی غلطیاں سنگین ترین تھیں۔ رشتے سے انکار ایسا تھا کہ وہ چاہنے کے باوجود نظر انداز نہیں کر پا رہی تھیں۔ انہوں نے اس کی پڑھائی کا بھی شیڈول ترتیب دے دیا تھا اور ساتھ ہی سختی سے وارننگ بھی کر دی تھی کہ وہ نازیہ، زویا کے ساتھ دس سے لے کر ایک بجے تک لائبریری جایا کرے گی اور سنجیدگی کے ساتھ اپنی پڑھائی پر توجہ دے ورنہ وہ کسی بھی ایرے غیرے کے ساتھ اس کی شادی کر کے چلتا کر دیں گی اور کبھی پلٹ کر خبر بھی نہ لیں گی۔ ماریہ واقعی ڈر گئی تھی۔ کچھ نسرین بیگم کے تیور بھی ایسے تھے کہ اس دفعہ وہ رعایت دینے کو تیار نہیں تھیں اور اس نے بظاہر خاموشی سے مان بھی لیا تھا لیکن اندر ہی اندر وہ سخت جھنجلائی ہوئی تھی اور دوسری طرف انہوں نے حمزہ کی ڈیوٹی لگائی ہوئی تھی کہ وہ ان تینوں کے علم میں لائے بغیر روزانہ ان کے بعد لائبریری جایا کرے گا اور سارا دھیان رکھے گا کہ وہاں جا کر وہ پڑھتی ہیں یا پھر باتیں کرتی ہیں۔ خاص طور پر ماریہ بی بی۔ اس حکم شاہی پر وہ اندر ہی اندر تلملایا ضرور تھا مگر چچی کے سامنے انکار کرنے کی مجال نہیں تھی۔ اسی لیے آج جب وہ تینوں لائبریری روانہ ہوئیں تو وہ بھی گھر سے نکلا۔

لائبریری کا ماحول، وہاں کی سنجیدہ پڑھاکو فضا ماریہ کو ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ وہ اندر ہی اندر امی کی دی گئی اس سزا پر بل کھا رہی تھی مگر بڑی مشکل سے خود پر قابو پاتی۔ وہ کتابوں سے دو سو کوس دور بھاگنے والی لڑکی تھی مگر اب......

"یار یہ ماؤں کو اپنی نالائق بیٹیوں کو زبردستی پڑھاکو بنانے کا آخر خبط کیوں سوار ہوتا ہے؟" جیسے ہی اس کے ضبط نے

جواب دیا تھا اس نے تھمو کر بوریت سے کتاب ٹیبل پر پٹختے ہوئے انتہائی بیزاری سے منہ بنا کر کہا تو نازیہ اس کی صورت دیکھ کر گھورنے لگی۔ وہ نہایت سنجیدگی سے زبردستی کتابیں ہاتھ میں لیے پڑھنے کا موڈ بنا رہی تھی۔

"یار کتنی بور ہو تم دونوں۔ ان کتابوں کو دور کرو اور مجھے بتاؤ میں کیا کروں؟ میں تو اس طرح سے مر جاؤں گی۔" مسکین صورت بنا کر اس نے زویا کے ہاتھ سے کتاب لے کر ٹیبل پر زور سے پٹخ دی تھی جس سے لائبریری کی خاموش فضا میں واضح ارتعاش پیدا ہوا تھا اور گرد بیٹھے لوگ ڈسٹرب ہو کر ان کی ٹیبل کی طرف ایک تنبیہی نگاہ ڈالنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

"ڈوب مرو تم۔ کیسی ڈھیٹ ہو تم۔ یہاں بھی چین نہیں ہے۔ اب اگر تم بولی ناں تو میں تمہاری گردن دبا دوں گی۔ یہ لائبریری ہے کوئی پارک نہیں۔" زویا نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"اب تم میری دادی اماں بننے کی کوشش مت کرو۔ گھر میں ایک ہی دادی کافی ہے۔ حد ہوتی ہے یہ لائبریری نہ ہوتی گھر میں دادی جان کا کمرہ ہو گیا۔ یہ نہ کرو... وہ نہ کرو... چپ رہو... ہنسو... نہیں... نگاہیں نیچی رکھو... یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ گھر میں میری ماں ڈکٹیٹر کا رول ادا کرتی، ہر وقت میرے سر پر سوار رہتی ہیں۔ اپنی نظروں سے میرا پوسٹ مارٹم کرتی رہتی ہیں۔ اور یہاں تم دونوں باڈی گارڈ۔ یا اللہ میں کیا کروں؟ میری معصوم سیدھی سادی جان کہاں جائے؟"

ماریہ کا انداز روہانسی دینے والا تھا جب کہ ساری کی دوسری طرف پشت کیے کتاب میں سر دیے بیٹھا حمزہ جس کی ساری توجہ ادھر ہی تھی، ماریہ کی ساری باتیں سن کر اس کا جی چاہا کہ اس سر پھری لڑکی کا گلا دبا دے۔ اسے تو گھر میں چین تھا ورنہ ہی یہاں۔ وہ تو بری طرح پھنسا تھا جو چچی کے حکم پر مجبوراً یہاں ان تینوں سے چھپ کر ان کی نگرانی کر رہا تھا۔

"ماریہ پلیز اگر تم تھوڑا سا پڑھ لو گی تو بہت نوازش ہو گی ہم پر... بلکہ احسان عظیم۔ چچی جان نے یہ سب ہانکنے کے لیے تمہیں یہاں نہیں بھیجا تھا بلکہ پڑھنے کے لیے بھیجا تھا اور تم ہو کہ مسلسل بکواس کیے جا رہی ہو۔ خدا کے لیے ہماری جان بخشو کچھ پڑھ لو۔ آخری سمسٹر ہے اور تمہیں ذرہ بھی احساس نہیں۔" نازیہ نے غصے سے جب کہا تو وہ کلس کر رہ گئی۔

"رہنے دو ناں! جب اسے خود ہی احساس نہیں تو ہم کیا کریں؟ پیپر سر پر ہیں اور یہ کہ..." بات ادھوری چھوڑ کر اس نے سر جھٹکا تو وہ تلملا اٹھی۔

"اچھا حساب کرنے کا شکریہ اور مت ڈانٹ بی بی! میرے سر پر پیپر نہیں بلکہ بال ہیں۔ وہ بھی ڈیڑھ گز لمبے۔ خاندان بھر میں دور دور تک اتنے خوب صورت بال کسی اور کے نہیں صرف میرے ہیں۔ کبھی تو مثال کا درست استعمال کر لیا کرو۔" وہ بجائے شرمندہ ہونے کے مزید ہانک رہی تھی۔ نازیہ اور زویا کا جی چاہا کہ اپنا سر پیٹ لیں جب کہ حمزہ صرف دانت کچکچا کر رہ گیا۔

"واقعی یہ لڑکی لاعلاج ہے۔ چچی جان اس طرح اس پر اتنی محنت کرنے کے بجائے اپنا کچھ وقت اس کے لیے کوئی کان سے بہرہ، عقل سے اندھا اور آنکھوں کا کانا ڈھونڈ کر اسے چلتا کریں تو زیادہ بہتر ہے۔ سارے ہوش ٹھکانے آ جائیں گے محترمہ کے۔" وہ انتہائی دل گرفتگی سے سوچ رہا تھا۔

"تم گھر چلو میں چچی جان کو تمہاری ساری کارستانی بتاؤں گی۔ وہی صرف تمہیں ہینڈل کر سکتی ہیں۔" ماریہ کے جواب میں نازیہ کی تلملاہٹ صاف سنائی دی۔

"ہوں...... جو مرضی کرو میری بلا سے تم تو ہو ہی شکایتی چوہیا۔ بڑی منحوس شکل والی۔" وہ اسے مزید چڑا رہی تھی۔ نازیہ کا غصہ ایک دم چھلکا تھا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی بھاری بھرکم کتاب اس کے کندھے پر دے ماری جو اسے لگی بھی کچھ زور سے۔

"ہائے... ہائے... ہائے اللہ جی... اوئی میں مر گئی..... کیا مار دیا ظالم... کندھا توڑ دیا ہے میرا..... ہائے امی کی کتاب نہ ہوئی پتھر ہو گیا۔ اف اللہ تمہیں دیکھے۔ تمہاری پھولی غبارے کی صورت کو بھی کا سنڈیوں بھرا پھول بند جائے۔ تم اچھے

بری طرح کندھے کو سہلاتے ہوئے وہ اونچی آواز میں آہ و زاری کر رہی تھی۔ ساری لائبریری میں ایک دم شور مچ گیا تھا۔ کچھ لوگ تنقیدی اور کچھ دلچسپ نظروں سے دیکھنے لگے تھے۔ لائبریرین بھی متوجہ ہو گیا۔ اس کی دل خراش صلواتوں والی آہ سے گھبرا کر دونوں نے بے بسی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ دوسری طرف حمزہ بھی تلملائے بغیر نہ رہ سکا۔

"پلیز! یہ کیا شور مچایا ہوا ہے ساری لائبریری میں آپ نے...... یہ پڑھنے کی جگہ ہے۔ اگر یوں ہی شور شرابہ کرنا ہے تو یہ تخریب کاری باہر بھی ہو سکتی ہے۔ پلیز آپ آرام سے بیٹھیں ورنہ میں آپ کے لائبریری کارڈ کینسل کر دوں گا۔" لائبریرین نے بری طرح جھڑک دیا۔ تینوں کے منہ لٹک گئے۔

"اب تم نے اگر لب کھولے یا زبان ہلائی تو میں گھر جا کر تمہارا کچا چٹھا کھول دوں گی۔ قیمہ بنا کر چیل کووں کو کھلا دوں گی۔ آرام سے بیٹھی رہو بہت ہو گئی عزت..." زویا نے کہا تھا بلکہ بارود بوچ کر کرسی پر بٹھایا تھا اور وہ اس بے عزتی پر چپ ہو گئی تھی۔

وہ ادھر ادھر دیکھتی رہی۔ کتاب میں اس کا دل لگنے والا نہ تھا۔ زویا کتاب ایشو کروا کر اس میں سے کچھ پوائنٹ نوٹ کر رہی تھی جب کہ نازیہ انگلش کی میڈم کے ... کتاب سے کل کے اپنے سبق کا ترجمہ کر رہی تھی۔ وہ اکتا کر لوگوں کے چہرے پڑھنے لگی۔ اسے شروع سے ہی یہ کام نہایت دلچسپ لگتا تھا۔ کتابوں کی بجائے لوگوں کو پڑھنا۔ تب ہی اگلی رو میں دوسری ٹیبل پر بیٹھے خوش لباس و خوش شکل ایک نوجوان پر نظر پڑی تھی۔ وہ بڑے غور اور دلچسپی سے ادھر ہی متوجہ تھا۔ ماریہ کو اپنی طرف متوجہ پا کر اس نے اسمائل پاس کی تھی اور ہاتھ ہلا کر وہیں سے سلام جھاڑا۔ ماریہ ایک دم ٹھٹھک گئی۔ وہ سب ایک عرصے سے اس لائبریری میں آ رہی تھیں۔ اس لڑکے کو پہلے کبھی نہیں دیکھا جب کہ باقی سب جانے پہچانے چہرے تھے۔ شاید یہ کوئی نیا ممبر تھا۔ اس نے کچھ گھبرا کر ادھر دیکھا، نظر ڈالی شاید وہ کسی اور کے لیے ہاتھ ہلا رہا ہو مگر نہیں اس لائبریری میں صرف وہی تین لڑکیاں تھیں۔ باقی سب ہی کتابوں میں غرق تھے۔ صرف وہی فارغ تھی۔ اب کی بار اس نے کچھ گھور کر موصوف کو دیکھا۔ "اس کی مجال کیسے ہوئی ماریہ قطب الدین کو سلام جھاڑنے کی؟" وہ اب بھی مکمل توجہ سے ادھر ہی دیکھ رہا تھا بلکہ اب کی بار تو اس نے انتہا کر دی۔ باچھیں پھیلا کر وکٹری کا نشان بنا کر اسے وش کیا تو ماریہ کا خاندانی جٹ خون کھول اٹھا بلکہ جوش میں آیا۔

"کمینہ۔ ذلیل۔ لڑکی جان کر اشارے کرتا ہے۔ اشارے باز، بدتمیز۔ ہمت کیسے ہوئی؟ ارے مائی کا لال ہے تو باہر آ۔ تمہیں پوچھوں میں۔" وہ ایک دم طیش میں آ چکی تھی۔ تلملا کر غصے سے پھنکارتے سانس پھلا کر بڑبڑا رہی تھی۔ زویا اور نازیہ دونوں نے اس کی بڑبڑاہٹ واضح طور پر سنی اور چہرے پر چھائے غصے کو دیکھا۔

"ہیں..... خیریت..... اب تمہیں یہ بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا ہے؟ اب کس بچھو نے کاٹ لیا ہے..... اب کون ہے بے چارہ جسے ان مہذب گالیوں سے نواز رہا ہے؟ ذرا بتانا پسند فرمائیں گی؟" نازیہ نے حیران ہو کر پوچھا تو اس نے غصے سے اسے دیکھا وہ اب بھی زیر لب مسکرا رہا تھا۔ شاید وہ اس کا غصہ نوٹ کر چکا تھا۔ ایک دم کھلکھلا کر ہنسا تھا۔ ماریہ کو گویا آگ ہی لگ گئی۔

"یہ جو سامنے ٹیبل پر بیٹھا ہے۔ یہ لڑکا کب سے اشارے کر رہا ہے مجھے۔ دیکھو دیکھو ذرا اب کیسے مسکرا رہا ہے..... بچہ" کر اس نے اشارے سے کہا تو وہ لڑکا فوراً کتاب پر مسکراتے ہوئے جھک گیا تھا۔ ماریہ کا غصہ مزید بڑھنے لگا۔

"اللہ خیر کرے۔ کس نے ہمت کر لی بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کی..... اور ایسا کیا اشارہ کر دیا موصوف نے.....؟" نازیہ نے طنز آمیز لہجے میں پوچھا تو وہ اس کا طنز محسوس کر کے کلس کر رہ گئی۔

"کیسی کزن ہو تم میری۔ ذرا پروا نہیں میری۔ غیرت نام کو نہیں۔ ایک شخص تمہاری معصوم، باحیا، شریف، عزت دار بہن کو

کیوں دیکھ کر اشارے کر رہا ہے اور بجائے اس کے کہ محترمہ اس کا گریبان پکڑیں الٹا طنز کے تیروں سے میرا جگر چھلنی کر رہی ہو۔ بڑی بری بات ہے۔" وہ افسوس سے سر ہلا رہی تھی۔ زویا طنزاً ہنس دی۔

"اس خوش فہمی میں مر جائے کوئی۔ سنا تم نے نازیہ! معصوم..... باحیا..... شریف اور عزت دار۔ وہ بھی انگلش وائلڈرین مووی دیکھنے والی محترمہ ... کیا شان ہے اس حیاداری کی..... ایسی باحیا عزت کی....." نازیہ نے تو حد ہی کر دی تھی۔ اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ لاپروائی سے دوپٹہ اوڑھے ایک بازو کرسی کی پشت پر رکھے دوسرا ٹیبل پر پھیلائے نہایت لاپروا انداز میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے کالے بالوں کی لٹیں چہرے پر جھول رہی تھیں۔ دوپٹہ آدھے سر سے ڈھلک گیا تھا۔ ایسے میں محترمہ کا عزت دار باحیا ہونے کا دعویٰ نازیہ کے حلق سے نیچے نہیں اتر رہا تھا۔

"نازیہ تم حد سے بڑھ رہی ہو۔ دیکھنا گھر جا کر میں تائی امی سے تمہاری شکایت کروں گی۔ بالکل اپنے بھائی پر گئی ہو۔ جیسا مینڈک بھائی ویسی ہی مینڈک کی بہن۔" اس طنز پر وہ کہہ رہی تھی۔ دوسری طرف الماری کی اس جانب بیٹھا حمزہ اس لقب پر تلملا اٹھا۔

"آج ماریہ بی بی تمہاری خیر نہیں۔ گھر چلو ذرا ساری کسر نکالتا ہوں۔ میری الماری سے فلم نکال کر دیکھنے پر تو کبھی معاف نہیں کروں گا۔" ایک ایک لفظ کہتے اپنے غصے کو بمشکل دبا رہا تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ ضرور ماریہ کی دہائی پر غور کرتا لیکن اس وقت تو غصے سے برا حال تھا۔

"چلو اب واپس چلتے ہیں۔ بہت ہو گئی پڑھائی ... بھوک سے میرے پیٹ میں چوہوں کا میچ شروع ہو چکا ہے۔ تم دونوں کتابیں ایشو کروا لو۔ باقی کا کام گھر جا کر کر لینا۔" اب کے اس کا انداز ... تھا۔

"ہاں نازی اب چلتے ہیں۔ گھنٹے ہو گئے ہیں یہاں آئے ہوئے کہ اب تو مجھے بھی بھوک لگنے لگی ہے۔ آج اتنا ہی کافی ہے باقی بعد میں۔" زویا نے بھی قلم بند کیا تو نازیہ نے بھی کتابیں سمیٹیں۔

"تھینک گاڈ تم لوگوں کو مجھ پر ترس تو آیا۔" وہ بھی مسکرا کر کھڑی ہو گئی۔

"تم اب ذرا ٹھیک ہو جاؤ۔ کل بھی اگر تم نے یہی حرکتیں کی نا تو چچی جان کو تمہیں اپنے ساتھ لانے سے منع کر دوں گی پھر جو تمہاری شامت آئے گی وہ تم جانو اور چچی جان۔" نازیہ نے تنبیہ کی تھی۔ اس نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔

"ویسے ماریہ! بعض اوقات چچی جان بھی حد کر دیتی ہیں۔ اب یہ نہیں پڑھنا چاہتی تو رہنے دیں۔ ان کا بس چلے تو اس کے دماغ میں کتابیں گھول کر ڈال دیں چاہے عقل آئے نہ آئے۔" زویا نے بھی رائے دی۔ وہ اسے گھورنے لگی۔

"ساری عقل جیسے حضرت تمہارے دماغ میں ہی تو ہے۔ امی کو بھی پڑھائی فوبیا ہو گیا ہے۔ ان کا بس چلے تو صبح دوپہر شام تینوں وقت کھانے میں بھی مجھے کتابیں اور نوٹس ہی تناول فرمانے کو دیں۔ اپنا سارا علم مجھ پر ہی جھاڑنے کے درپے رہتی ہیں۔ بس نہیں چلتا ورنہ میرا پڑھنے کو دل کب کرتا ہے۔ اب تک تو گھسیٹ گھساٹ کر یہاں تک پہنچی ہوں۔ اس دفعہ میں نے سوچ لیا ہے کہ پکا فیل ہونا ہے اور تب تک ہونا ہے جب تک امی میرے ساتھ سمجھوتہ نہیں کر لیتیں۔" اس نے بھی اپنے نیک خیالات کا اظہار کیا تھا۔ وہ دونوں تو سر جھٹک کر رہ گئیں مگر حمزہ تاسف سے سر ہلا کر رہ گیا۔

"کاش چچی جان اپنے کانوں سے اپنی دختر نیک اختر کے خیالات ملاحظہ فرما سکیں۔" وہ تینوں وہاں سے نکل گئی تھیں۔ وہ خاموشی سے انہیں جاتا دیکھتا رہا۔ جب وہ وہاں موجود کرسی پر بیٹھیں تو وہ بھی ہاتھ جھاڑتا اٹھ کھڑا ہوا۔

"شکر ہے اس عذاب سے جان چھوٹی۔ کبھی کبھار تو یہ ماریہ بھی حد کر دیتی ہے۔" کتابیں لائبریرین کو تھما کر وہ لائبریری سے نکلا تو وہاں اپنی بائیک پر سوار ہوتے داؤد عالم کو دیکھ کر وہ ٹھٹکا۔

"ارے داؤد بھائی..... یہاں کیا کر رہے ہیں؟" وہ صرف ایک لمحے کو ہی سوچ سکا تھا اگلے ہی پل وہ ان کی طرف بڑھ گیا۔

"السلام علیکم داؤد بھائی! کیسے ہیں آپ؟ اور یہاں کیسے؟" کل ہی تو وہ نسرین چچی کے ساتھ ان کے ہاں ملا تھا اتنی جلدی وہ انہیں کیسے بھول جاتا۔ انہوں نے بھی حیران ہو کر دیکھا۔

"وعلیکم السلام۔ حیرت ہے تم اور یہاں....." مصافحہ کرتے وہ خوش دلی سے ہنس دیا۔

"بس کسی سزا کا نتیجہ ہے۔ آپ بتائیں آپ کیسے آئے یہاں؟"

"بس یوں ہی۔ یہ لائبریری گھر کے قریب ہے پھر جب تک چھٹیاں ختم نہیں ہوتیں سوچا ادھر ہی آ جایا کروں۔ بوریت بھی دور ہو جائے گی۔"

"ہوں۔ صحیح کہہ رہے ہیں آپ؟ کسی دن آیئے نا ہمارے ہاں۔ چچی جان تو کل سے آپ کا مسلسل ذکر کر رہی ہیں بلکہ تو باقاعدہ آپ کو گھر بلانے کا بھی پروگرام بنا رہی ہیں۔" اس نے یوں ہی کہہ دیا تھا۔ داؤد عالم کے مسکراتے لب ایک دم بھینچ گئے۔

"اچھا دیکھیں اس وقت میں چلتا ہوں۔ ایک دوست کے ہاں بھی جانا ہے۔"

"ضرور میں بھی چلوں گا۔ گھر جا کر چچی جان کو آپ سے ملاقات کا ضرور بتاؤں گا۔ وہ بہت خوش ہوں گی۔" وہ چپ رہے پھر وہ ان سے ہاتھ ملا کر خدا حافظ کہہ کر گھر سے نکل آیا تھا جب کہ داؤد عالم نے کافی ناگواری سے اسے ایک رکشے میں بیٹھے دیکھا تھا۔

"ایک تو ہماری والدہ محترمہ بھی نا" اس نے جھٹکا کر بائیک اسٹارٹ کی۔

گھر جا کر زویا اور ماریہ نے امی کی سب حرکتوں کی رپورٹ گھر والوں کے گوش گزار کی تھیں۔ امی ورکشاپ اٹینڈ کرنے گئی ہوئی تھیں جو چپ ہو گئی تھی۔ اس نے شکر ادا کیا مگر رات کو جب انہوں نے اپنے کمرے میں بلا کر ساری کسر نکالی تو وہ سر جھکائے سب سنتی رہی کہ بولنے میں مزید شامت کا احتمال تھا۔ جب وہ بول کر خوب ڈانٹ کر تھک گئیں تو وہ کرسی پر گر گئی۔

"تم آج مجھے ایک بات صاف بتا دو۔ سدھرنے کے تم قابل نہیں ہو۔ پڑھنے سے تمہاری جان جاتی ہے۔ اب صرف ایک حل ہے کہ تمہاری شادی کر دوں۔ تجمل مجھے بہت دفعہ کہہ چکی ہے مگر میں نے ہر دفعہ انکار کیا صرف اور صرف تمہاری حرکتوں کی وجہ سے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میں اتنی خود غرض بن جاؤں مگر اب مجھے کچھ سوچنا پڑے گا..... اور یہی مجھے ایک حل نظر آتا ہے۔ کہتی ہے تجمل سسرال جا کر بڑے بڑوں کی عقل ٹھکانے آ جاتی ہے۔ مگر تم....."

"امی..... امی! میں نے کیا کر دیا ہے۔ آپ کے کہنے پر لائبریری جا تو رہی ہوں پھر مزید کیا کروں.....؟" اتنی زور سے پڑی تھی کہ وہ ایک دم رو دی۔ نسرین بیگم کا جی چاہا کہ اپنا سر پیٹ لے۔

"بس بی بی! اب مجھ پر احسان مت کرنا۔ جتنے تمغے پڑھ پڑھ کے تم نے میرے سینے پر سجا دیے ہیں وہی کافی ہیں۔ کوئی ہوں تمہارے تایا اور ابا جی کو۔ اب تم میرے ہاتھوں سے نکلتی جا رہی ہو۔ تجمل کا لڑکا نہیں تو کہیں بھی..... کیسا بھی..... جو بھی ملے بس تمہیں چلتا کریں۔ میں نہیں کر سکتی تمہاری رکھوالی۔"

وہ جز بز ہو گئی۔ یہ تجمل آنٹی اسی لیے آئے دن آ کر ڈھیروں پیار کرتی ہیں اور اب امی۔ کیسے وہ انہیں سمجھائے شادی کا مطلب ہے کہ ساری زندگی کو جہنم بنانا۔

"امی پلیز! دیکھیں آئندہ جو بھی کہیں گی کروں گی۔ بس شادی کی بات نہ کریں۔" وہ باقاعدہ روہانسی ہو گئی آگے بڑھ کر امی کے کندھوں کو تھاما۔

"شادی یا پڑھائی..... جو آسان لگتا ہے سوچ لو۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ کم از کم تمہیں ماسٹرز تو کروا ہی لوں گی لیکن بی اے میں تمہارا یہ حال ہے۔ سارے ارادے ملیا میٹ کر دیے ہیں تم نے۔ بس بی اے مکمل کرو۔ بہرحال شادی تو کرنی ہی ہے۔" انہوں نے جیسے اسے باندھ دیا تھا۔ نہایت بے چارگی سے اس نے انہیں دیکھا۔ "تمہارے پاس سوچنے کو وقت ہے۔ اگر پڑھائی چھوڑ دی تو گھر سنبھالنا ہو گا یہ بھی ذہن میں رکھنا۔" وہ اسے فیصلہ سنا کر کمرے سے نکل گئیں تو وہ بے بسی سے خالی کمرے کو دیکھتی رہ گئی۔

* * *

ماریہ سے بڑی نور باجی جن کی شادی پھوپو کے بیٹے زوار بھائی کے ساتھ لاہور میں ہوئی تھی۔ زوار بھائی چونکہ کسی کمپنی میں کام کرتے تھے۔ ان کے کام کی نوعیت فیلڈ ورکنگ کی تھی۔ آج وہ اس شہر میں تو کل کسی اور شہر میں۔ ایسے میں نور باجی، پھوپو اور فیملی کے ساتھ لاہور رہتی تھی۔ نور باجی کی جب سے شادی ہوئی تھی۔ وہ ہر بار آ کر اپنی شادی کا رونا روتی رہتی تھیں۔ زویا اور ماریہ پر اس قدر اثر نہیں ہوا تھا جس قدر ان کی باتوں کا اثر ماریہ نے لیا تھا۔ اسی لیے وہ نور باجی کی دہائیاں سن کر اندر ہی اندر ہولتی رہتی۔ اس نے پکا ارادہ کر لیا تھا اتنی جلدی شادی نہیں کروانی۔ اگر کروانی ہے تو بھی شوہر کی خدمت کیا کرنی، سسرال کے جھنجٹ نہیں پالنے۔ کوئی کام نہیں کرنا۔ کچھ نور باجی کو بھی بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کی عادت تھی۔ بظاہر اپنے گھر میں خوش باش نظر آتی تھیں مگر اس کا اثر ماریہ پر کچھ زیادہ ہی تھا۔

ماریہ کے نزدیک پھوپو ہونے کے باوجود نور باجی کی ساس صرف ساس تھیں جو کہ نور باجی جیسی نازک مزاج لڑکی سے سارے گھر کے کام کرواتی تھیں اور ان کے شوہر زوار بھائی بھی ایسے ظالم تھے کہ اپنی پیاری سی خوبصورت نازک مزاج دلہن کو گھر والوں پر چھوڑ چھاڑ کر خود سیر سپاٹے کرتے رہتے تھے جنہیں اپنی بیوی کا ذرا بھی احساس نہیں۔ ماریہ کے نزدیک تو نور باجی دنیا کی مظلوم ترین لڑکی تھیں جن کے نازک کندھوں پر سارے گھر کی ذمہ داری تھی اور یہ ان پر بہت بڑا ظلم تھا۔ آج کل وہ امید سے تھیں بلکہ ان کے ہاں بچے کی ولادت تھی۔ رات کو فون کر کے اپنی ذمہ داریوں کا رونا رو کر انہوں نے دادی جان اور تائی جان سے پر زور التماس کی تھی کہ ماریہ یا کسی اور کو ان کے ہاں بھیج دیں۔ تائی امی کا خون فوراً جوش میں آیا تھا۔ وہ سارے گھر کی ذمہ داری نسرین بیگم اور عدینہ بھابی پر ڈال کر ماریہ کو ساتھ لیے فوراً روانہ ہو گئی تھیں۔ اب گھر میں وہ اور زویا تھیں۔ بڑی بھابی بھی اپنے میکے پرسوں سے جا چکی تھیں۔ بھابی تو پہلے ہی گئی ہوئی تھیں۔ ایسے میں گھر کا سارے کا سارا کام چچی کے ذمے تھا۔

صبح کا سارا چارج انہوں نے ہی سنبھالا ہوا تھا جب کہ رات کی ذمہ داری نسرین پر تھی اور باقی ذمہ داریاں تائی جان پر تھیں۔ ان کے جانے سے یہ کام اس پر اور زویا پر آ پڑے تھے۔ دادی جان تو حکم چلانے کے علاوہ پہلے بھی کچھ نہیں کرتی تھیں۔ اب بھی کچھ نہیں کرتی تھیں۔ ایسے میں ماریہ کی شامت آئی ہوئی تھی۔ اسے کچھ نہیں کرنا آتا تھا۔ اب پھنسی ہوئی تھی۔ جھاڑو لگاتی تو کوڑا پیچھے اور جھاڑو آگے ہوتی تھی۔ جھاڑ پونچھ کا بھی یہی حال تھا۔ زویا کو وہی کام دوبارہ کرنا پڑتا تھا لیکن وہ مجبور تھی۔ نسرین چچی کی سختی سے تاکید تھی کہ اسے عادت ڈالنی چاہیے چھوٹے موٹے کام کرنے کی۔ اب بھی اسے کچھ نہ سکھایا گیا تو وہ ساری زندگی کچھ نہیں کرے گی۔ ان کی کڑی نظریں ہر وقت ماریہ پر ہوتی تھیں۔ ان کا بس چلتا تو وہ سب کچھ گھول کر اسے پلا دیتیں۔

اس دن بھی کام سے فارغ ہو کر دونوں تیار ہو کر لائبریری چلی آئی تھیں۔ اب وہ لڑکا روزانہ تو نہیں البتہ ایک دو دن بعد ضرور آتا تھا۔ اسٹائل اس کا اب بھی وہی ہوتا تھا۔ حرکتیں بھی وہی تھیں۔ اشاروں سے ابھی تک آگے نہیں بڑھا تھا۔ ماریہ کو یقین تھا جس دن بھی اشاروں سے زبان تک آیا اسی دن اس کا ضبط چھلک جائے گا۔ دو دن سے وہ نہیں آیا تھا۔ آج ہی آ رہا تھا اور حیرت کی

بات تھی اس بار بغیر کوئی اشارہ کئے، سلام جھاڑتے یا سائل پاس کیے آرام سے بیٹھا رہا تھا۔ ماریہ کی نظر جب بھی اٹھی اسے اپنی طرف متوجہ مگر سوچتا ہی پایا۔ ماریہ اور زویا دونوں کو اس کا یہ انداز دیکھ کر شدید حیرت ہوئی۔

"مجھے تو یہ چور فراڈیا لگتا ہے۔" زویا نے رائے دی۔

"اور مجھے لگتا ہے آج کہیں سے پٹ کر آیا ہے۔ ایسے لڑکوں کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔ ویسے زوئی! موصوف کا ذرا حلیہ ملاحظہ کرو۔" اس کا رف سا حلیہ دیکھ کر ماریہ نے اسے کہا تو وہ سر ہلا گئی۔

"واقعی آج تو یہ معمول سے ہٹ کر آیا ہے ورنہ روز یہ سوٹڈ بوٹڈ ہوتا تھا۔ شاید یہ بھی اس کا اسٹائل ہو تمہیں متاثر کرنے کا ... ویسے ایمان سے ماریہ اس حلیے میں بھی کسی ہیرو سے کم نہیں۔" وہ آخر میں اسے شرارت سے دیکھنے لگی تو اس نے آنکھیں دکھائیں۔

"اب آنکھیں تو نہ دکھاؤ۔ بالکل چڑیل لگ رہی ہو۔ تم مانو یہ بندہ ہے بڑا ہینڈسم۔" اسے نظروں سے بغور جانچتے ہوئے وہ کہہ رہی تھی۔ ماریہ کا جی چاہا زویا کا سر پھوڑ دے۔

"جب بھی بات کرنا میرے خلاف ہی کرنا۔ ہو وہ ہینڈسم ہے تو میری بلا سے۔ مجھے تو زہر لگتا ہے یہ شخص۔" وہ دانت پیسنے لگی۔ زویا سے ہنسی روکنا محال ہو گیا۔

"اب تم زیادتی کر رہی ہو۔ بالکل ہیرو لگتا ہے ویسے بھی اس بے چارے کا قصور اتنا بڑا بھی نہیں۔ تمہیں صرف سلام جھاڑتا ہے، مسکرا دیتا ہے یا پھر دیکھ لیتا ہے۔ یہاں روزانہ آتے جاتے اٹھتے بیٹھتے دسیوں لوگ مسکرا کر سلام لے لیتے ہیں۔ وہ بے چارہ بھی لے لیتا ہے تو کیا جرم کر لیتا ہے۔ اس پر اتنا غصہ کرنے کی ضرورت کیا ہے ....." اسے مسلسل شرارت سوجھ رہی تھی۔ ماریہ کو شدت سے ماریہ کی بات آئی۔ ویسے بھی اس کی ایک ہنسی سی تھی۔ ماریہ کا سارا غصہ ختم کر دیتی تھی جب کہ یہ زویا اس کا جی چاہا کتاب اس کے منہ پر دے مارے۔

"اب تم مجھے یہ مت سکھاؤ کہ وہ کیا کر رہا ہے کیا نہیں..... بس میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ وہ غلط حرکت کر رہا ہے۔ یہاں آنے والے اور بھی بہت سے لوگ ہیں جو روز سلام لیتے ہیں یا مسکرا دیتے ہیں۔ ان کا انداز مہذبانہ ہوتا ہے۔ اس کی طرح شرارے نہیں کرتے۔ وہ بھی صرف ایک کو ہی، سب پر مشترکہ سلامتی بھیجتے ہیں۔" ماریہ نے جل کر کہا تھا۔

"مرد تم میں جا کر کہہ دیتی ہوں۔ بھائی صاحب ... یہ لڑکی آپ پر کچھ زیادہ ہی فدا ہو گئی ہے۔ اس پر بھی نظر کرم کیجیے۔ آپ کے سلام کی منتظر ہے۔ اس کو بھی سلام سے نوازا کریں۔"

"ہائے ایسی قسمت کہاں؟ اور پھر ہو سکتا ہے صرف ایک ہی اس کی نظر میں جچتی ہو اور وہ صرف ایک ہی کو سلامتی کے قابل سمجھتا ہو۔" وہ مسلسل اسے چھیڑ رہی تھی۔

"میں اب لائبریری نہیں آؤں گی۔ امی کو بھی سب بتا دوں گی..... سمجھیں تم.....؟" اس نے چیخ کر کہا تھا۔ ارد گرد موجود لوگ فوراً متوجہ ہوئے اور وہ بھی ہوا تھا پھر ماریہ کو دیکھ کر مسکرا دیا تھا۔ ماریہ جھلس اٹھی۔ ایک دم غصے نے آ لیا۔ زویا کا خیال کیے بغیر فوراً کتابیں اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔

"بری بات ہے۔ اتنی بڑی ہو کر بھی بالکل بچوں کی طرح جھگڑتی ہیں آپ تو..... میرا خیال ہے لائبریری میں ایسا تخریب کاری اچھی نہیں لگتی..... سنا آپ نے......"

زویا ہائے ہائے کر رہی تھی جب وہی لڑکا اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے پاس سے گزرتے کہہ رہا تھا۔ دونوں نے حیران ہو کر دیکھا۔ ماریہ گھورنے لگی۔ "اتنی اتنی جرأت۔"

"اے مسٹر!" اس سے پہلے کہ وہ آگے بڑھتا اس نے اسے پکارا تھا۔

"چلیے شکر ہے آپ کی چپ تو ٹوٹی۔" وہ بھی بلا کی چیز تھا۔ وہ پکار کر پچھتائی۔

"جی کہیے کیا خدمت کر سکتا ہوں آپ کی؟" ہونٹوں پر مچلتی مسکراہٹ بمشکل روکے کہہ رہا تھا۔

"ہونہہ تم میری خدمت کرو گے۔ اتنے دنوں سے سب برداشت کر رہی ہوں تو یہ میری شرافت ہے۔ ورنہ تمہیں پہلے دن ہی بتا دیتی کہ تم جیسے لوگوں کا انجام ہوتا ہے اور اس وقت تمہیں کیا تکلیف ہوئی ہم جھگڑیں یا مریں تمہیں اس سے کیا..... تم کون ہوتے ہمیں ٹوکنے والے ......؟" وہ اونچی آواز میں کہہ رہی تھی۔ ارد گرد کے لوگ بھی متوجہ تھے۔ زویا تو ایک دم پریشان ہو گئی۔

"میرا خیال ہے ہم باہر چل کر بات کر لیتے ہیں۔ یہ زیادہ بہتر ہے۔ میں باہر ہوں آ جائیے گا۔" وہ کہہ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا تھا۔ وہ ہکا بکا دیکھتی رہ گئی۔

"بدتمیز۔" وہ کڑھ رہی تھی پھر کتابیں شو کر کے لائبریرین کو تھام کر باہر نکل آئی تھیں۔ وہ ادھر ہی لائبریری کے باہر ٹہل رہا تھا۔ اس نے ایک زہریلی نگاہ اس پر ڈالی۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھتیں وہ خود ہی ان کی راہ میں آ گیا۔

"جی اب کہیے کیا فرما رہی تھیں آپ اندر.....؟" سینے پہ بازو لپیٹے وہ کھڑا تھا۔ ماریہ نے بے بسی سے زویا کو اور پھر اسے گھورا۔

"دیکھو مسٹر تم جو بھی ہو جو بھی چاہتے ہو ... زیادہ ہینڈسم بنے کی تمہیں ضرورت نہیں۔ میں اگر برداشت کر رہی ہوں تو یہ میری بڑائی ہے ورنہ روز روز جو تم حرکتیں کر رہے ہو، میری جگہ کوئی اور ہوتی تو کب تک تمہارے حواس ٹھکانے آ چکے ہوتے۔ میں سمجھ رہی تھی کہ شاید تم صرف بجوائے منت کے لیے یہ کر رہے ہو مگر.... کہیں تمہارے ..... تک نہیں لگنا چاہتی۔ سیدھی طرح سے اپنا رستہ ناپو سمجھے....." اس کے یوں ڈھٹائی سے اکڑ کر اس کے سامنے کھڑا ہونے پر برداشت نہیں کر پائی تھی۔ اسی لیے جوش میں آ گئی تھی۔ جواباً وہ مسکرایا تھا۔

"محترمہ میں ہینڈسم بننے کی کوشش نہیں کر رہا ..... میں واقعی ہوں اور اگر میں اپنا رستہ نہ ناپوں تو.....؟" مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر عیاں تھی۔ ماریہ کا جی چاہا کہ اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ نوچ لے۔

"ایسے لوگوں کے منہ لگنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ خواہ مخواہ تماشا بنانے والی بات ہے۔" زویا نے اس کا بازو پکڑا تو وہ گھور کر رہ گئی۔

"اسی وجہ سے تو میں اب تک خاموش تھی ورنہ یہ شخص حد سے بڑھتا چلا گیا۔" وہ کہے بغیر نہ رہی۔

"دیکھیں مس ماریہ اب کے آپ ناانصافی کر رہی ہیں۔ آپ کو صرف میں اسی تماشے سے بچانا چاہتا تھا جو خاموش تھا منہ کب کا کلام کر چکا ہوتا۔" وہ اب ایک دم سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

"تم..... تم..... میرا نام کیسے جانتے ہو؟" وہ ایک دم ٹھٹکی۔ "آخر کون ہو؟ اور ہمارے ہی پیچھے پڑ گئے ہو کیوں؟" وہ کہے بغیر نہ رہ سکی تھی۔

"ہاں یہ سوال کیا عقل مندوں والا۔" وہ ایک دفعہ پھر مسکرا دیا۔

"میرا نام ذوالعالم ہے۔ پہلے دن یوں ہی ادھر آیا تھا۔ آپ تینوں کو دیکھا۔ آپ کی حرکتیں مجھے اچھی لگیں۔ مجھے ایسی لڑکیاں اچھی لگتی ہیں جو ہر وقت دادی اماں کا رول ادا کرنے کے بجائے نیچرل ہوں اور ماریہ آپ بالکل ایک نیچرل لڑکی لگی تھیں مجھے۔ اسی لیے آپ کو دیکھ کر سلام کر لیا تھا اور پھر مجھے اس میں مزا آنے لگا۔ میرا مقصد صرف آپ لوگوں کے تاثرات نوٹ کرنا تھا اور جب آپ تینوں مل کر مجھ پر تبصرے کر رہی ہوتی تھیں، مجھے اچھا لگتا تھا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ مزید کچھ ہو مگر آپ لوگوں کی احتیاط دیکھ کر

میں نے مزید کوئی حرکت نہ کی ... مگر آج یوں ہی ماریہ بی بی کو دیکھ کر زبان پھسل گئی تھی اور آپ لوگوں نے بھی حد کر دی۔" وہ مسکرا رہا تھا۔ ماریہ اسے گھور بھی نہ سکی۔

"میں اتنی بے وقوف نہیں جو آپ کی باتوں میں آ جاؤں۔" ماریہ کی بات پر وہ کھلکھلا کر ہنسا تھا۔

"ارے واقعی۔ میں تو یہ بھول گیا تھا کہ میں ایک عقل مند خاتون سے مخاطب ہوں۔" ماریہ جز بز ہوئی۔ وہ بظاہر سنجیدگی سے کہہ رہا تھا لیکن لہجے کا اتار چڑھاؤ، آنکھوں کی شرارت اور ہونٹوں سے جھلکتی مسکراہٹ دونوں سے چھپی نہ تھی۔ وہ اب بھی کھل کر انہیں زچ کر رہا تھا۔

"شٹ اپ۔ بھاڑ میں جاؤ تم۔ آئندہ تم نے ایسی حرکت کی نا تو میں تمہارا سر پھوڑ دوں گی۔ سنبھال کر رکھو اپنا سلام اور داد دینا۔ سمجھے تم چلو رو۔" اسے کینہ توز نظروں سے گھورتی، رویا کا بازو تھام کر وہ تیز تیز قدم اٹھاتی اپنے راستے پر ہو لی جب کہ عالم ان دونوں کو رکشے میں بیٹھ کر نظروں سے اوجھل ہوتے دیکھتا رہا۔

"لڑکی واقعی بہت تیز ہے۔" مسکرا کر وہ بھی بائیک کی جانب ہو لیا۔

* * *

حنا کوئٹہ واپس چلی گئی تھی کیونکہ اصل میں ان کے یہاں سسرالی رشتے دار تھے۔ ویسے تو اس کی شادی کوئٹہ میں ہوئی تھی اور وہیں رہتی تھی۔ چھٹیاں گزارنے یہاں آئی ہوئی تھی اور اب چھٹیاں ختم ہونے والی تھیں تو وہ چلی گئی تھی جب کہ جبین یہیں بیاہی گئی تھی۔ وہ ہر دوسرے دن آ جاتی تھی اور جب بھی آتی۔ "شادی کب کرو گے؟" کی گردان کرتے داؤد کا دماغ کھاتی رہتی تھی۔ تنگ آ کر اس نے گھر سے باہر وقت گزارنا شروع کر دیا تھا۔ امی تو باقاعدہ ناراض تھیں کیونکہ اس نے نسرین آنٹی کی بیٹی کے لیے صاف انکار جو کر دیا تھا۔ وہ اپنی ناراضگی کے تاثر سے اسے بلیک میل کرنے کی کوشش میں تھیں مگر اس نے سوچ لیا تھا۔ وہ بلیک میل نہیں ہو گا۔

صبح وہ آفس چلا جاتا۔ درمیان میں کچھ وقت نکال کر وہ لائبریری کا چکر ضرور لگاتا تھا۔ اس نے جو ناول شروع کیا تھا اب واقعی دل لگی بن گیا تھا۔ آج کل وہ روز چکر لگا رہا تھا مگر وہ تینوں نہیں آ رہی تھیں۔ اس دن جب دونوں کی آمنے سامنے ٹکر ہوئی تھی اس کے بعد وہ صرف ایک ہفتہ دونوں آئی تھیں مگر اس کے بعد انہوں نے آنا چھوڑ دیا تھا۔ شروع میں وہ سمجھا کہ وہ اس کی وجہ سے نہیں آ رہی ہیں مگر اب جیسے ہی اگلا ہفتہ شروع ہوا تھا ان کے نہ آنے پر داؤد کو تشویش لاحق ہو گئی تھی۔ وہ کیوں نہیں آ رہیں؟ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ لائبریرین سے ان کے متعلق معلومات حاصل کر کے کم از کم گھر کا ایڈریس ہی لے لے مگر ہر بار یہ سوچ کر ٹال جاتا کہ شاید وہ آج آ جائیں مگر ہر بار ناکامی ہو رہی تھی۔

تاہم اس نے اب پکا ارادہ کر لیا تھا کہ وہ آج کل میں ضرور معلومات حاصل کرے گا۔ آج بھی آفس سے آنے کے بعد ہاتھ لے کر جیسے ہی لاؤنج میں آیا۔ امی نے اسے دیکھ کر منہ پھلا لیا۔

"یا اللہ یہ میری زندگی میں 'م' نام کی لڑکی ہی کیوں آ گئی۔ کوئی اور کیوں نہیں آئی۔ ایک 'م' نے جان عذاب میں کی ہوئی ہے تو دوسری نے دل کی حالت میں انقلاب برپا کیا ہوا ہے۔ بندہ جائے تو جائے کہاں؟" وہ سوچ کر رہ گیا۔

"میری پیاری امی! کیا کر رہی ہیں؟" وہ جبین کے ساتھ کچن میں تھیں۔ وہ بھی وہیں آ گیا۔ انہوں نے اسے دیکھ کر منہ بنایا تو وہ مسکرا کر آگے بڑھا۔

"بات نہیں کرو مجھ سے۔" انہوں نے اس کے بازو ہٹائے جو داؤد نے ان کے کندھے پر رکھے ہوئے تھے۔

"تو پھر کس سے کروں؟ میرا خیال ہے بابا سے کہہ دیتا ہوں۔ میرے لیے ایک امی کا انتظام کر دیں۔ آپ تو

روٹھی ہیں۔ شاید ان کو ہی ترس آ جائے۔" بھولی صورت بنا کر کہا گیا تھا۔ جبین قہقہہ لگا کر ہنس دیں۔ امی نے ہاتھ پکڑا، اچھا اس کے کندھے پر دو ہاتھ مارے۔

"آپ بیٹے کے لیے تو راضی نہیں ہوتے۔ باپ کی کروانے کے لیے تیار ہو۔" انہوں نے خفگی سے دیکھا۔

"قسم سے بالکل تیار ہوں مگر شرط یہ ہے کہ لڑکی میری مرضی کی ہو۔" اس نے ایک دم کہا تو امی اسے عجیب نظروں سے دیکھنے لگیں۔ جبین بھی متوجہ ہوئی۔

"کوئی ہے؟ کوئی نظر میں ہے ...؟" جبین نے پوچھا تھا۔ وہ ہنس دیا۔

"ہاں مگر ابھی مجھے خود بھی مکمل معلومات نہیں۔ جیسے ہی علم ہوا آپ کو پہلی فرصت میں اطلاع دوں گا۔ باقی کا کام تو آپ ہی کریں گی بلکہ امی خود جائیں گی اس لڑکی کے گھر۔" اگلے ہی پل وہ سنجیدہ ہو کر بتا رہا تھا۔ امی نے ایک گہری سانس لی۔

"تمہیں ماں کی کیا ضرورت ہے؟ جب ماں کی خواہش کی کوئی اہمیت نہیں تو پھر اس کے وجود کی بھی ضرورت نہیں۔ مالک ہو خود مختار ہو۔ سب کر سکتے ہو تم۔" وہ بھری بیٹھی تھیں۔ وہ ایک دم پریشان ہوا۔

"امی پلیز ایسی باتیں تو نہ کریں۔ آپ" "کیا آپ زبردستی کرنا چاہتی ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر اس کے بعد جو ہو گا اس کا الزام بھی مجھے مت دیجئے گا جب میرا دل نہیں مانتا تو زبردستی ..." وہ فوراً سنجیدہ ہو چکا تھا۔ جبین اور امی چپ ہو گئیں۔

"کون ہے وہ لڑکی جس کی خاطر تم یہ سب کر رہے ہو؟" انہوں نے پوچھا تو ان پر ایک شاکی نظر ڈال کر باہر کی جانب بڑھا۔

"کوئی نہیں ہے۔" اس کا انداز جیسے ٹالنے والا تھا۔ جبین فوراً سامنے آ گئی تھیں۔

"کتنی بری بات ہے ... اتنی سنجیدہ گفتگو اس انداز میں ختم کرتے ہو۔ ادھر بیٹھو آرام سے بات کرو۔ تو یہ کتنے جھگڑالو ہو گئے ہو تم..... امی کو تمہاری خواہش عزیز ہے۔ بس وقتی غصہ ہے۔ تم تو عقل مند ہو۔" جبین نے زبردستی اس کا بازو پکڑ کر کچن کی کرسی پر لا بٹھایا۔

"میں دشمن نہیں ہوں بس کی۔ اگر یہ راضی نہیں تو نسرین نے بھی انکار کر دیا تھا مگر میری خواہش تھی کہ وہ لڑکی میری بہو بنے۔ ابھی پرسوں ہی میں اس کے گھر گئی تھی۔ یوں ہی بات چلی تو بتانے لگی کہ وہ ماریہ کا رشتہ دیکھ رہی ہے۔ میں تو چپ رہی..... کتنی خواہش تھی میری۔ مگر نسرین نے تو صرف اس لیے انکار کیا تھا کہ کہیں دوستی اور رشتہ داری میں فرق نہ آ جائے..... مگر میں..." وہ چپ ہو گئیں تو داؤد کو احساس ہوا وہ تو خواہ مخواہ ان سے الجھ بیٹھا ہے۔ اس نے اندر ہی اندر خود کو لعنت ملامت کی۔

"ایم سوری امی! دیکھیے گا اس لڑکی کا نام بھی ماریہ ہے۔ وہ بھی بہت اچھی ہے۔ آپ اس سے جب ملیں گی تو بہت خوش ہوں گی۔" وہ ایک دم کہہ بیٹھا تھا۔

"کیسے لوگ ہیں وہ؟" انہوں نے پوچھا تھا۔

"مجھے زیادہ علم نہیں۔ بس آج کل میں پتہ کر لوں گا۔ دراصل لائبریری میں اسے دیکھا تھا۔ آج کل ہفتہ ڈیڑھ ہو گیا ہے وہ لائبریری نہیں آ رہی پھر جیسے ہی اس کے متعلق تفصیلی علم ہوا آپ کو بتا دوں گا بلکہ اس کے گھر لے کر جاؤں گا۔" وہ خوش تھا۔ امی نے ایک گہری سانس لی۔ وہ خوش تھا تو وہ پھر کیوں ناراض ہوتیں۔ زبردستی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا لی۔

"ٹھیک ہے تم جلدی معلومات حاصل کرو۔ اب میں دیر نہیں کرنا چاہتی۔" انہوں نے ہاں کر کے داؤد کا جیسے دل جیت لیا

تھا۔

"تھینک یو امی، تھینک یو سوچ۔" وہ ایک دم ان کے گلے لگ گیا تھا۔

* *

نور باجی کے ہاں بیٹا پیدا ہوا تھا۔ دادی جان کے ساتھ ساتھ حمزہ اور ماریہ سب جا رہے تھے۔ ان سب کو تایا جان لے جا رہے تھے۔ بڑی پھوپو کے ہاں وہ لوگ بہت کم آتے تھے پھوپو ویسے تو اچھی تھیں مگر جب سے نور باجی کی ساس بنی تھیں ماریہ کے نزدیک مشکوک ہو گئی تھیں۔ اس لیے ماریہ کو ان کی بے تحاشا محبت بھی بناوٹ محسوس ہوتی تھی مگر ان کے ہاں آ کر اسے اپنی رائے بدلنی پڑی۔ وہ تو بہت محبت کرنے والی ساس تھیں۔ نور باجی کو تو پلنگ سے نیچے پیر نہیں رکھنے دیتی تھیں۔ کھانا پینا، دھونا دھلانا سب اہتمام سے پوری کرتی تھیں۔ ایسے میں وہ حیران ہو جاتی۔ نور باجی سچ کہتی تھیں یا پھر پھوپو ڈرامہ باز ہیں جو ان کے سامنے یہ سب کرتی ہیں۔ روزدار بھائی بھی آج کل اپنے شہر میں تھے۔ بہت زیادہ شوخ نہیں تھے، سنجیدہ متین تھے لیکن ان سب سے خوش دلی سے ملے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کون سچ ہے نور باجی یا روزدار بھائی۔

"نور باجی! آپ تو کہتی تھیں کہ پھوپو کوئی ڈکٹیٹر ساس ہیں اور روزدار بھائی بڑے ظالم شوہر ہیں جب کہ مجھے تو سب کچھ برعکس محسوس ہو رہا ہے۔" ایک دن وہ انہیں کہہ بیٹھی۔ وہ ہنستی چلی گئیں اور وہ حیران ہو کر انہیں دیکھے گئی۔

"تم بھی بدھو ہو۔ یہ بھی میں نے تم لوگوں پر رعب جما رہی تھی تاکہ تم لوگ ذرا ہوشیار ہو جاؤ۔ دراصل جب شادی ہوئی تو تب مجھے شادی کے بعد کی زندگی کا کوئی تصور نہیں تھا پھر میں تمہاری طرح نازک مزاج تھی۔ میرا خیال تھا کہ شادی کا مطلب ہے اچھے کپڑے پہننا، میک اپ، خوشبوئیں لگا جانا اور سیر سپاٹے کرنا۔ شادی کے شروع کے دنوں میں یہ سب چلا بھی مگر جیسے ہی دو ہفتے گزرے، گھر کی ذمہ داریاں کندھوں پر آ پڑیں تو میں بوکھلا گئی۔ روزدار سنجیدہ مزاج شخص تھے۔ وہ پریکٹیکل بندے تھے۔ پھوپو بھی خالص گھریلو خاتون تھیں اور مجھ میں سوائے ذہانت اور ڈگریاں اکٹھا کرنے کے اور کوئی خوبی نہ تھی۔ ایسے میں، میں لمحہ لمحہ پریشان ہوتی۔ ہر وقت پریشان ہو کر امی ابو کو فون کرتی تو وہ ڈانٹ دیتیں اور سنجیدگی کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی نصیحت کرتی تھیں۔ میرا مقصد صرف یہ تھا کہ تم لوگوں میں پریکٹیکل زندگی کا احساس پیدا ہو۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ گھریلو زندگی پر بھی توجہ دو اور تم تو ہو ہی میری طرح نازک مزاج اسی لیے میں تمہیں زیادہ ڈراتی تھی اور تم اتنا سہمتی تھی۔" انہوں نے مسکرا کر وضاحت کی تو وہ سر پکڑ کر رہ گئی۔

"آپ مجھے پہلے نہیں بتا سکتی تھیں۔ میں تو اتنا ڈر گئی تھی کہ مجھے تو شادی کے لفظ سے ہی خوف آنے لگا تھا۔ پچھلے دنوں ایک رشتہ آیا تھا۔ کچھ مت پوچھیں کیا کیا حرکتیں کر کے بھگایا تھا اور تو اور آپ کو یاد ہو گا امی کی کزن تجمل آنٹی ہیں نا، ان کا بیٹا دانش اس کی بھی بات گھر چلی تھی مگر میں نے امی پر ایسا اثر ڈالا کہ انہوں نے خود انکار کیا تھا۔" وہ منہ بنا کر بتا رہی تھی۔ نور باجی کا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا۔

"بری بات۔ جو لڑکی رشتہ بھگا سکتی ہے وہ اتنی بدھو نہیں ہو سکتی۔ ویسے مجھے تمہاری سب حرکتوں کی رپورٹ ملتی رہتی تھی مجھے نہیں پتا تھا کہ تم یہ سب میرے تجربے سے سیکھ رہی ہو۔" ان کے ساتھ ساتھ وہ بھی ہنس دی۔

"دیکھ لیں۔ آپ مت جھوٹ بولیں۔ مجھے ڈر تھا جب پھوپو کی ہو کر اس قدر آپ پر ظلم کر سکتی ہیں تو دوسرے لوگوں سے امید ہی نہیں رکھنی چاہیے۔ اس میں بھی ہمارا ہی قصور ہے۔ میں تو بہت کم لاہور آئی ہوں۔ اسی لیے مجھے پھوپو کی فیملی کے بارے میں یہی انفارمیشن حاصل ہے۔"

"چلو اب تو حاصل ہو گئی نا۔ اب جو بھی رشتہ آیا پہلی فرصت میں ہاں کر دو۔ تم تو ویسے بھی پڑھائی سے جلتی ہو۔ ایک دو سال بعد کام چلانے کے لیے تمہارے ہاتھ جب ذمہ داری پڑے گی تو سب سیکھ جاؤ گی میری طرح۔"

"نہ بابا نہ۔ آج کل امی اسی سازش میں لگی ہوئی ہیں۔ ابھی چند سال تو بالکل بھی نہیں۔ پہلے ہی بڑی مشکل سے امی کا دماغ آنٹی تجمل کے بیٹے سے ہٹایا ہے لیکن آج کل وہ بوا رحمت کے ساتھ مل کر کوئی کھچڑی پکا رہی ہیں۔ اللہ نہ کرے انہیں کوئی لڑکا پسند آئے۔" اس نے کانوں کو ہاتھ لگا کر معافی مانگی تھی نور باجی ہنس دی۔

نور باجی کے ہاں وہ بہت خوش تھی۔ پڑھائی سے جان چھوٹی ہوئی تھی۔ روز کہیں نہ کہیں جانے کا پروگرام بنتا تھا۔ وہ صرف ڈیڑھ ہفتہ وہاں رہ پائی تھی کہ حمزہ اور تائی جان نے واپسی کا ارادہ باندھا۔ امی نے فون کر کے اسے ان کے ہمراہ ہی واپس آنے کی سختی سے تاکید کی تھی۔ اس کا دل تو نہیں مانتا تھا مگر انکار کا کوئی سبب نہ تھا سو مجبوراً تائی اور حمزہ کے ساتھ ہی واپس آ گئی تھی۔ امی نے اسے لائبریری جانے کو نہیں کہا تھا۔ اس نے بھی تنہائی کا بہانہ کر کے خود کو گھر میں مصروف رکھا تھا۔

اس دن امی کے ورکشاپ میں چلے جانے کے بعد وہ لاؤنج میں میگزین لے کر بیٹھ گئی۔ چچی جان اور دادی جان دونوں سونے کے لیے اپنے اپنے کمروں میں گھس گئی تھیں گھر پر وہ بالکل تنہا تھی۔ کال بیل ہوئی تو مجبوراً اٹھنا پڑا۔ حمزہ تھا اس نے دروازہ کھول کر دیکھے بغیر کہ اس کے ساتھ اور کون ہے۔ دوبارہ اندر کی طرف قدم بڑھائے اور دوبارہ اپنی جگہ پر آ کر میگزین کھولتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ حمزہ تنہا نہیں اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہے کیونکہ لاؤنج کے دوسرے حصے سے دونوں کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ دراصل یہ ایک بڑا ہال کمرہ تھا۔ اتنی بڑی فیملی میں کمروں کی کمی کو پورا کرنے کے لیے اس ہال کمرے کو درمیانی چھت سے لے کر زمین تک پردہ لگا کر دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ ایک حصہ لاؤنج کے طور پر کام آتا تھا تو دوسرا ڈرائنگ روم کے طور پر اجنبی مہمانوں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ اکثر حمزہ کے دوست احباب آتے رہتے تھے۔ وہ نظر انداز کیے بیٹھی رہی۔

"ماریہ! فٹافٹ اٹھو۔ میرا ایک اہم مہمان ہے۔ پلیز کھانے پینے کو کچھ لے آؤ۔"

وہ جو گھر کے کاموں سے پہلے ہی خار کھائے بیٹھی تھی۔ آج امی کی نگرانی میں ساری صفائی اسی نے کی تھی اور اس وقت سے مسلسل کڑھ رہی تھی۔ اب تو آہستہ آہستہ اسے صفائی کرنا بھی آتی جا رہی تھی۔ اب کہیں جا کر تھوڑا سکون ملا تھا لیکن اب حمزہ کی یہ فرمائش۔

"کیوں نوکرانی سمجھ رکھا ہے تم سب لوگوں نے مجھے۔ جس کا جب جی چاہتا ہے منہ اٹھا کر حکم شاہی عنایت کر دیتا ہے۔ اتنی گرمی میں چائے کا کوئی رواج نہیں ہے۔ فریج میں کوک کی بوتل پڑی ہوئی ہے۔ کیبن میں بسکٹ، نمکو، پیسٹری وغیرہ چیزیں ہوں گی۔ خود جا کر نکالو۔ تمہیں بھی پتا چلے دوستوں کی خدمتیں کیسے ہوتی ہیں اور تمہارے دوستوں کو اس موسم میں تپتی دوپہر میں بھی اپنے گھروں میں چین نہیں جو منہ اٹھائے کھانے پینے کو آ جاتے ہیں۔" حمزہ تو اسے کہہ کر پچھتایا۔ دوسرا اتنا اونچا والیم تھا کہ دوسری طرف آواز با آسانی سنی جا سکتی تھی وہ تپ اٹھا۔

"تم سے تو کوئی بات کہنا ہی فضول ہے۔ نجانے سسرال میں جا کر کیا کرو گی؟ اور اس قدر اونچا والیم ہے کہ توبہ۔ ساری باتیں سنی ہوں گی دلاور بھائی نے۔ پہلی دفعہ ہمارے گھر آئے ہیں۔ کیا سوچتے ہوں گے وہ بھی....." وہ بہت دھیمی آواز میں اسے ڈانٹ رہا تھا۔

"ہاں تو کب کہا ہے میں نے کہ تم آ کر میری منتیں کرو۔ وہ دونوں وہاں جا کر بیٹھ گئی ہیں اور یہاں اکیلی میری جان شکنجے میں پھنسی ہوئی ہے۔ صبح سے کام کر رہی ہوں۔ اب پھر جت جاؤں۔ میں فارغ نہیں ہوں۔ میرا دماغ کھانے کے بجائے جا کر خود ہی اپنے دوست کے لیے اہتمام کر لو۔" اس نے صاف لال جھنڈی دکھا دی۔ وہ بھی اس پر لعنت بھیجتا رہا۔ وہ سر جھٹکتی میگزین پڑھنے لگی

تھی۔فون کی بیل بج اٹھی۔وہ کلس کر کونے میں رکھے فون اسٹینڈ کی طرف بڑھی۔

"نجانے اس بھری دوپہر میں کس کی جان عذاب میں آئی ہوئی ہے۔"بڑبڑا کر ریسیور اٹھایا۔

"ہیلو۔"وہ سخت بیزار تھی۔

"کون .... ماریہ .... میں زویا ہوں۔کیسی ہو تم۔کیسی بے مروت ہو ادھر جا کر فون تک نہیں کیا۔تنگ آ کر سوچا میں ہی کر لیں۔"دوسری طرف سے وہ نان اسٹاپ شروع ہو گئی تھی۔وہ جوان لوگوں کو بہت مس کر رہی تھی ایک دم ساری بیزاری اڑن چھو ہو گئی اور موڈ بھی ایک دم خوش گوار ہو گیا تھا۔ساتھ میں آواز بھی اونچی ہو گئی تھی۔

"ہائے زویا تم..... بڑی بے مروت ہو۔اب فون کر رہی ہو۔"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔بہت مزہ آ رہا ہے۔پتا ہے دائم بھائی کی آج کل خوب شامت آئی ہوئی ہے۔خوب ان کی پٹائی کروائی جا رہی ہے۔وہ بے چارے دہائی دیتے رہ جاتے ہیں مگر کسی کو ترس نہیں ہوتا۔تم تو آ گئی تھیں۔تو رسمیت سب نے تمہیں بہت مس کیا ہے۔"

"ہاں میں بہت مس کر رہی تھی۔یہاں ذرا بھی دل نہیں لگ رہا۔ممی کی وجہ سے آنا پڑا ورنہ....."اس نے بھی جواباً کہا۔

"تمہیں ایک مزے کی بات بتاتی ہوں۔دائم بھائی (زرکا چھوٹا بھائی) نازیہ میں انٹرسٹڈ ہے۔یہ بات نازیہ نے مجھے خود بتائی ہے۔اب سے نہیں بہت پہلے سے ہے نا حیرت کی بات۔"

"کیا واقعی۔یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے۔ان دونوں کی کبھی بنی ہی نہیں۔ہر وقت بچوں کی طرح تو جھگڑتے رہتے ہیں بے چارہ انہیں نانو بندر اور بھی نجانے کیا کیا کہتی رہتی ہے۔مجھے تو ابھی بھی یقین نہیں آ رہا۔"وہ واقعی حیران تھی۔

"یقین کر لو۔نازیہ کا اب بھی وہی رویہ ہے مگر بہت خوش ہے۔پوری گھنی ہے۔بس ہمارے سامنے بنتی ہے اور خود پورا محترم کی محبت میں ڈوبی ہوئی ہے۔"وہ مزے سے بتا رہی تھی۔

"ارے یہ نازیہ کی بچی۔ہمیں کیسے ہر وقت لیکچر دیتی رہتی تھی اور خود کو دیکھو..... ایک دفعہ ہاتھ لگے دیکھنا کیا حشر ہوتا ہے اس کا.. ہم سے چھپایا۔یعنی ماریہ قطب الدین سے۔"دوسری طرف زویا کھلکھلا کر ہنسنے لگی تھی۔وہ بھی ہنس دی۔

"اور تم سناؤ۔لائبریری جا رہی ہو؟"

"نہیں۔تم لوگوں کے بغیر بھلا میں کہیں جا سکتی ہوں۔ خدا خدا کر کے تم لوگوں کا بہانہ کر کے میری اس مصیبت سے جان چھوٹی ہے۔صبح ہوتی ہے تو امی ڈنڈا لے کر سر پر کھڑی ہوتی ہیں۔سارے گھر کی صفائی کرنا پڑتی ہے۔اس کے بعد امی جب سو جاتی ہیں تو کچھ سکون ملتا ہے۔ٹی وی دیکھ لیتی ہوں یا ایف ایم سنتی ہوں اگر حمزہ کا موبائل گھر پر ہو تو پھر اس کا آپریشن کرتی ہوں۔بس اپنی تو یوں ہی بور گزر رہی ہے۔"اس نے آرام سے بتایا۔

"اور پڑھتی کب ہو؟ اور چچی جان تمہیں کچھ نہیں کہتیں؟"اس نے حیرت سے پوچھا۔

"بالکل نہیں۔پتا ہے کل امی نجمل آنٹی کو فون پر بتا رہی تھیں کہ اب ماریہ سلجھنے لگی ہے۔گھر کے کاموں میں دلچسپی لینے لگی ہے۔یہ اور بات ہے کہ مجھے امی کے ہاتھ میں پکڑے ڈنڈے کا زیادہ خوف ہوتا ہے اور امی انہیں یہ بھی کہہ رہی تھیں کہ میں سنجیدہ ہو کر پڑھ رہی ہوں وہ بھی گھر پر۔امی کو تو یہ بھی نہیں پتا کہ میں پڑھ نہیں رہی ہوتی بلکہ تین بجے سے شام چھ بجے تک لان میں برگد کے درخت کے نیچے بیٹھ کر واک مین سنتی ہوں۔"اس نے ہنس کر بتایا تو زویا چیخی۔

"کیا ..... اور اب تک تم بچی کیسے ہو..... چچی کو پتا نہیں چلا.... ؟"

"نہ بالکل نہیں دراصل کتاب لے کر گود میں رکھ کر بیٹھ جاتی ہوں۔بغل میں ریڈیو ہوتا ہے۔کانوں میں واک مین ہوتا ہے اور دوپٹہ اوڑھا ہوتا ہے۔سب سمجھتے ہیں کہ میں ابھی نماز پڑھ کر فارغ ہوئی ہوں اور اس وقت پڑھ رہی ہوں اسی لیے کوئی ڈسٹرب نہیں کرتا۔امی دیکھ دیکھ کر نہال ہوتی ہیں کہ میں پڑھ رہی ہوں۔انہیں کیا علم کہ میں سر ہلا ہلا کر گانے کی لے پر ہونٹوں سے کتاب کے لفظ نہیں بلکہ گانے کے بول نکل رہے ہوتے ہیں۔"وہ خوش ہو کر اپنی ساری کارستانی بتا رہی تھی۔دوسری طرف زویا نے اپنا سر پیٹا۔

"تمہیں شرم آنی چاہیے ماریہ! تم چچی جان کو دھوکہ دے رہی ہو۔نہیں بلکہ خود کو دے رہی ہو۔"

"تو بھلا اس میں دھوکے والی کون سی بات ہے..... انہیں بھی تو میرا مسئلہ سمجھنا چاہیے نا۔بس نہیں چاہتا میرا دل پڑھنے کو پھر زبردستی کا ہے کو۔وہ یوں کریں گی تو میں بھی اسی طرح کروں گی۔تم جانتی ہو کہ کیسے نقل کر کر کے میں یہاں تک پہنچی ہوں۔گر امتحانوں کے دنوں میں تم دونوں ساتھ نہ دیتیں تو میں چھٹی کلاس سے آگے بھی نہ بڑھ پاتی اور بی اے مجھے سب سے مشکل لگ رہا ہے۔انگلش میرے سر سے گزر جاتی ہے۔یہ سب تمہارا اور نازیہ کا قصور ہے۔نہ تم بی اے میں داخلہ لیتیں نہ میری جان شکنجے میں آتی۔اب امی کی تڑی کہ نہیں پڑھو تو تمہاری میری شادی کر دیں گی۔یعنی دوسرے معنوں میں ایک عدد تو میرے سر پر بٹھا دیں گی۔شادی کا مطلب بربادی اور یہ بات امی نہیں سمجھ رہیں اور مجھے ابھی کی عمر میں بھی منظور نہیں۔ان کے ڈنڈے کے خوف سے گھر داری سیکھ تو رہی ہوں مگر سسرال داری نہیں کروں گی اور جو بھی امی میرے لیے منتخب کریں گی اس کا تو ابھی سے ہی اللہ حافظ بلکہ ساتھ میں تم اس کی بھی فاتحہ پڑھ لو۔کسی کو بھی ذرا بھی مجھ سے ہمدردی نہیں ہے۔امی نے تو باقاعدہ میرے لیے رشتے کی تلاش کی مہم چلائی ہوئی ہے ذرا بھی ترس نہیں آتا۔"

"ارے ماریہ! وہ مسٹر یمی والا لڑکا یاد آتا ہے تمہیں۔بالکل ویسا ہی شخص تھا وہ بھی۔میں جب بھی تمہاری شادی کا تصور کرتی ہوں۔مجھے تمہارے ساتھ وہی شخص نظر آتا ہے۔"

"اچھا یاد دلایا تم نے۔مجھے بھی تم سے یہ بات کرنی تھی۔تم نے ماریہ ورنو ساتی کو اس لڑکے سے متعلق آگاہ کیا تھا۔سچ کہہ رہی ہوں نا۔"

"ہوں تم تو جانتی ہو کہ جب تک نازیہ سے ساری روزکی باتیں نہ کر لوں مجھے کوئی بات ہضم نہیں ہوتی پھر مجھے وہ لڑکا پسند بھی آیا تھا۔میں نے جاتے ہی نازیہ کو بتا دیا اور تم لائبریری کیوں نہیں جا رہی وہ بے چارہ تو انتظار کرتا ہو گا تمہارا۔"

"تو کرے میری بلا سے۔تم نے کیوں بتایا نوریہ بی کو وہاں۔وہ ہر وقت مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھتی رہتی تھیں بلکہ اکثر لڑکے کی طرح سلام بھی جھاڑنے لگی تھیں۔"دوسری طرف زویا کھلکھلا کر ہنسی تھی۔

"بڑی بے مروت ہو تم... تم سے جو بھی محبت کرے گا اپنا آپ کھوئے گا۔ویسے ماریہ وہ لڑکا مجھے اچھا لگا ہے۔کتنی زبردست شخصیت ہے۔مجھے ایسے لوگ بہت اچھے لگتے ہیں اور تمہارے ساتھ جچے گا بھی بہت۔کیا خوب گزرے گی جب مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔"

"زویا کی بچی... پٹ جاؤ گی میرے ہاتھ سے۔اپنے اس ہینڈسم کو تو گولی مارو..... ورنہ یہ کام میں کر دوں گا۔اگر آئندہ تم نے اس اشارے سے اس بدتمیز شخص کا ذکر بھی کیا تو پھر تمہیں مجھ سے کوئی نہیں بچا سکتا۔میں تمہیں بھی ہینڈسم بنا دوں گی۔"

"اتنا تو سچ ہے کہ وہ تمہارے ساتھ جچے گا۔"دوسری طرف وہ اب بھی سنجیدہ نہیں تھی۔

"زویا کی بچی... میں تمہارا بھیجہ نکال دوں گی بلکہ اس بدتمیز شخص کے ساتھ تمہیں بھی گولی سے اڑا دوں گی۔سمجھیں تم۔"

"ارے اتنا غصہ۔ضرور گالوں پر لالی آئی ہو گی۔آنکھوں میں کوئی مستی چھائی ہو گی اور ہونٹ اس کا نام گنگنا رہے ہوں

سنے۔ ویسے نام کیا ہے موصوف کا......؟"

"تمہارا سر ......" اس نے جھنجھلا کر ریسیور پٹخ دیا۔ "بدتمیز۔ اسٹوپڈ۔" اسے گالیوں سے نوازتی جوں ہی پلٹی، نظر حصوں کے درمیان پردہ ہٹائے کھڑے شخص کو دیکھ کر پتھر بن گئی۔

"السلام علیکم! کیسی ہیں آپ؟ آپ لائبریری آ نہیں رہی تھیں۔ سوچا میں ہی آپ سے مل لوں۔ مزاج ٹھیک ہیں نا۔" وہ پردہ ہٹا کر آگے بڑھ آیا تھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ وہ ایک دم ہوش میں آئی۔

"تم ...... تم ...... تمہیں جرأت کیسے ہوئی یوں میرے گھر میں گھس آنے کی......؟ نکل جاؤ یہاں سے...... ورنہ شور مچا کر سارے گھر والوں کو اکٹھا کروں گی۔ میں عام لڑکی نہیں ہوں...... سمجھے تم......" وہ واقعی پریشان ہو گئی تھی۔ یہ شخص پیچھا کرتے کرتے اس کے گھر تک آ گیا تھا۔ نجانے آگے کیا ہو؟ اس کا دل خوف سے کانپنے لگا۔

"ابھی میرا ذکر ہو رہا تھا ...... وہ بھی اس قدر اپنائیت بھرے انداز میں۔ سوچا میں خود ہی سامنے آ جاؤں۔ ویسے میرا ذکر کرنے کا ...... مجھے یاد فرمانے کا شکریہ۔ کہیے، بندہ حاضر ہے کیا خدمت کر سکتا ہوں ...... ویسے پہلے یہ بتایئے لائبریری کیوں نہیں آ رہیں؟" وہ اس کے چہرے پر چھائے غصے کی پروا کیے بغیر بہت توجہ سے پوچھ رہا تھا۔ وہ پریشان ہو گئی۔

"تم کون ہوتے ہو ...... کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہو؟ وہاں لائبریری میں اتنے لوگ ہوتے ہیں۔ آخر میرے ہی پیچھے پڑنے کا مقصد کیا ہے؟" وہ جو کسی کو بھی خاطر میں نہ لاتی تھی، اس قدر خوفزدہ ہو کر پوچھ رہی تھی۔ وہ کھلکھلا کر ہنس دیا۔

"تمہیں میرے گھر کا پتا کہاں سے ملا؟" وہ پہلے سے زیادہ خوفزدہ تھی۔ داؤد عالم کو اسے اس حالت میں دیکھ کر لطف آ رہا تھا۔

"لائبریری سے ...... کارڈ پر پتا لکھا تھا۔" وہ سب سمجھ گئی۔

"دیکھو چپ چاپ یہاں سے چلے جاؤ ورنہ ......" وہ ایک دم پریشانی سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ ایک دم یاد آیا حمزہ کا کوئی مہمان آیا ہوا تھا اور یہ شخص ...... یک دم الجھ کر سے رکی۔

"اگر میں نہ جاؤں تو ......؟" وہ پوچھ رہا تھا۔ ماریہ کا غصہ ایک دم امڈنے لگا۔

"تو میں شور مچا کر سب گھر والوں کو اکٹھا کر لوں گی۔ اس کے بعد تمہاری جو درگت بنے گی وہ ملاحظہ کرنا۔" دانت کچکچا کر کہا گیا تھا۔ داؤد عالم کو چھو گیا۔

"واقعی ...... پھر مچائیں شور ...... میں بھی دیکھتا ہوں کون کون آتا ہے؟ لگے ہاتھوں آپ کے اہل خانہ سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔" وہ آگے بڑھ کر بڑے ریلیکس موڈ میں صوفے پر بیٹھ گیا تو ماریہ کا سانس حلق میں اٹکنے لگا۔ عجیب شخص تھا۔

"دیکھیں۔ آپ میری نرمی کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں اور آپ اندر آئے کیسے؟ میں صرف دھمکی نہیں دے رہی۔ میں آپ کا حشر نشر کر دوں گی۔"

"ضرور...... میں بھی تو منتظر ہوں۔ ویسے آپ دھان پان سی لڑکی ہیں۔ میرا حشر نشر کیسے کریں گی؟"

"تم...... تم ...... دفعان ہو جاؤ یہاں سے ......" بے بس ہو کر وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی جیسے اسے مارنے کو کوئی چیز ڈھونڈ رہی ہو۔ اس سے پہلے کہ وہ کامیاب ہوتی، حمزہ کی آواز ڈرائنگ روم سے آنے لگی۔

"داؤد بھائی ...... داؤد بھائی ...... کہاں گئے آپ ...... داؤد بھائی۔" وہ اسے آوازیں دیتا ادھر ہی آ گیا تھا اور ماریہ حمزہ کے منہ سے ان کا نام سن کر ہکا بکا کھڑی تھی۔ یعنی یہ حمزہ کا وہی مہمان تھا جس کی خاطر مدارت کا وہ کہہ رہا تھا۔

"ارے داؤد بھائی! آپ یہاں...... میں آپ کو ادھر دیکھ رہا تھا۔ دراصل مجھے تواضع کے لیے چیزیں تلاش کرنے میں دیر

ہو گئی۔" وہ ہاتھوں میں ٹرے پکڑے ہوئے تھا۔ آگے بڑھ کر اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی پھر اس کی ماریہ پر نظر پڑی تو ٹھٹک گیا۔ پھر داؤد کو دیکھا وہ مسکرا رہا تھا۔ وہ فوراً سنبھل گیا پھر ماریہ کو دیکھا تو غصہ آنے لگا۔ کیسے تھوڑی دیر پہلے بری طرح انکار کر دیا تھا اور اب یوں کھڑی تھی گویا اس ریاست کی مہارانی ہو۔

"داؤد بھائی! ان سے ملیں یہ ماریہ ہے۔ میرے چچا قطب الدین اور نسرین چچی کی بیٹی۔" وہ مجبوراً اس کا تعارف داؤد سے کرا رہا تھا ورنہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ جتنی تیزی سے اونچی آواز میں اس کی زبان چل رہی تھی، صاف پتا چل رہا تھا کہ محترمہ کیا چیز ہے......

"اور ماریہ یہ تمہاری تجمل آنٹی کے بیٹے داؤد عالم ہیں۔ یہ پرسوں بھی آئے تھے آج ادھر سے گزر رہے تھے تو میں انہیں اندر لے آیا۔ تم جانتی ہو نا انہیں۔" وہ بتا رہا تھا اور وہ ہکا بکا دیکھ رہی تھی۔

"کیا ...... ؟" اس کا ذہن ماؤف ہو چکا تھا۔ داؤد عالم، تجمل آنٹی کا بیٹا ...... وہ جو کویت میں تھا جو حال ہی میں یہاں سیٹل ہوا تھا جس کا رشتہ اس کے لیے آیا تھا اور جس کی وجہ سے اس نے ہی برا غلط تاثر قائم کرنے کے لیے کیا کیا جتن نہیں کیے تھے۔

"جی۔ میں ہی ہوں داؤد عالم ...... آپ کی تجمل آنٹی کا بیٹا۔" ماریہ کو لگا وہ صرف اسے زچ کر رہا ہے۔ وہ جان بوجھ کر اسے تکلیف دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ ایک دم لب بھینچ کر اسے گھور کر ایک غصیلی نگاہ ڈالتے ہوئے وہاں سے چلی آئی تھی۔

"وہ تجمل آنٹی کا بیٹا ہے۔" وہ جوں جوں سوچ رہی تھی اس کے دماغ کی رگیں پھولتی جا رہی تھیں۔ کچھ دیر پہلے اپنا ڈوز ایکسٹرا فل والیم میں کھولے نجانے کیا کیا بک رہی تھی۔ اس نے سب سنا تھا۔ اف نجانے وہ کیا سمجھے ......؟ پہلے ہی تجمل آنٹی کو پریشان کیا ہوا تھا اس شخص نے۔

٭ ٭ ٭

زویا اور نازیہ واپس آ گئیں اور پھر جیسے ہی اس نے انہیں داؤد عالم کے متعلق بتایا اور ساری تفصیل گوش گزار کی تو دونوں ہی ہکا بکا ہو گئیں بلکہ چیخ پڑیں۔

"بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ ہینڈسم سا شخص تجمل آنٹی کا وہی سڑیل بد مزاج پتلا سا بیٹا ہے جو بچپن میں آنٹی کے ساتھ ہمارے ہاں آتا تھا۔ نہیں ...... یہ ہینڈسم سا بھلا اس کالے کلوٹے سے لڑکے کا مقابلہ کیسے کر سکتا ہے۔" نازیہ کی حیرت ختم نہیں ہو رہی تھی۔

"جب ہم نے اسے دیکھا تھا تب ہم خود بھی کالی موٹی پلی ہوئی بھینسیں ہوا کرتی تھیں اور یہ تب کی بات ہے جب ہماری ناک بہتی تھی اور رال بھی ٹپکتی تھی۔ ویسے مجھے سب سے زیادہ حیرت اس بات پر ہو رہی ہے کہ اس شخص کا رشتہ ماریہ کے لیے آیا تھا۔ یقین نہیں آتا۔" نازیہ نے سوچتے ہوئے کہا تو ماریہ نے اسے گھورا۔

"تم لوگ اس کی تعریفیں کر رہی ہو یا میرے زخموں پر نمک چھڑک رہی ہو؟" وہ بھنائی تھی۔

"دونوں کام۔" نازیہ نے آرام سے کہا تو وہ چیخ اٹھی۔

"کیا ...... تمہارا دماغ تو درست ہے؟ بجائے یہ کہ میری مدد کرو۔ مجھے زچ کر رہی ہو۔ پتا ہے کل بھی تجمل آنٹی آئی تھیں۔ اپنی بڑی بیٹی جبین کے ساتھ۔ امی بھی بہت خوش تھیں۔ مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ یہ سارا ان کے بدتمیز بیٹے کا قصور ہے۔ بچپن میں کیسا بھیگی بلی بنا رہتا تھا ہر وقت اپنی ماں کے پلو پکڑے پیچھے پیچھے ممیں ممیں کرتا رہتا تھا مگر اب تو جیسے ساری ہوشیاری اس پر ختم ہوتی ہے۔ کتنا بدل گیا ہے وہ......"

سو واقعی نازیہ یا ماریہ سچ کہہ رہی ہے۔ بچپن میں تو وہ بہت بیج تھا۔ تمہیں یاد ہوگا ماریہ ایک دفعہ وہ ہمارے پاس آیا تھا تو ہم نے شرارت سے اسے مرغیوں والے ڈربے میں بند کر دیا تھا اور مرغیوں کا ڈربہ بھی اوپر چھت پر تھا۔ گرمیوں کے دن تھے گرمی بہت پڑ رہی تھی۔ وہ روتا چیختا رہ گیا تھا مگر ہم بھی تین تھے۔ ایسا قابو کیا کہ اسے بند کر کے ہی نیچے اتریں پھر ہم بھول گئے اور جب تجمل آنٹی نکلیں، وہ اسے ڈھونڈ رہی تھیں تو ہمیں یاد آیا تھا کہ ہم اس کا کیا حشر کر چکی تھیں پھر جب اسے ڈربے سے نکالا تو بے ہوش ہو چکا تھا۔ حمزہ سے بتا رہی تھی سو اسے بھی سب یاد آتا گیا۔ خاص طور پر اس واقعے کے بعد پڑنے والی مار۔

"واقعی امی سے بہت مار پڑی تھی کیونکہ اسے ڈربے میں بند کرنے کی تجویز میری ہی تھی۔" اس معصوم اور سادہ سا ... مگر اب تو یہ توبہ ــــ" رونے والی ہو کر دونوں ہاتھ کانوں کو لگائے۔

"اب سوچو اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ ظاہر ہے وہ اب لابیری والی حرکتیں تو نہیں کرے گا مگر اب آرام سے بھی نہیں بیٹھے گا پھر اب تو اور شیر ہو گیا ہوگا۔ جس طرح مجھے علم ہے کہ کس کس طرح مجھے پر اس رشتے کے لیے زور دیتی رہی تھیں یقیناً اس سے بھی بات ہوئی ہوگی۔ وہ اتنا چھوٹا بچہ نہیں کہ میں نظر انداز کروں اور وہ آرام سے بیٹھا رہے۔" یہ واقعی پریشانی والی بات تھی پھر بھی انہوں نے مل کر کافی دیر تک سوچا مگر کوئی حل نکالنے میں ناکام رہیں تو تینوں نے حالات پر چھوڑ دیا۔ البتہ ماریہ نے یہ ضرور فیصلہ کر لیا تھا وہ اس شخص سے ... کبھی بات ہی نہیں کرے گی۔ نجانے اسے کیوں شک سا ہونے لگا تھا کہ وہ یقیناً رشتے سے انکار کی وجہ سے اس کے پیچھے پڑ ... پھر کالج کھل گئے اور ان کی روٹین ایک دم بدل گئی۔ صبح کالج وہاں سے واپس آ کر کھانا کھا کر آرام کرنا اور ... کے بعد کبھی کبھار رنگوں میں بھی جھک لیتا۔ پہلے کی طرح وہ اب بھی پڑھتی کم ہی تھی بلکہ ادھر ادھر ہی سارا وقت پاس کرتی تھی البتہ زویا اور نازیہ سنجیدہ ہو چکی تھیں۔ سب گھر میں ہی ہوتے تھے۔ وہ دونوں رات کے کھانے کا انتظام کرتی تھیں۔ ویسے تو وہ بھی ان کا ہاتھ بٹانے کی کوشش کرتی مگر وہ بجائے سنوارنے کے کام بگاڑتی ہی تھی۔ ایسے میں دونوں غصے سے اسے کچن سے باہر کر دیتی تھیں بلکہ کچھ جب وہ ان کے ساتھ ٹی وی وغیرہ دیکھ رہی ہوتی تو ٹوکتی بھی نہ تھیں۔ یہ ماریہ کے لیے بھی حیرت کی بات تھی پھر دن اوپر تلے گزرتے چلے گئے۔

زویا کمرے میں آئی تو وہ موبائل ہاتھ میں لیے مصروف تھی۔ یہ حمزہ کا موبائل تھا۔ رات کو جب وہ باہر کہیں جاتا تو موبائل گھر ہی چھوڑ جاتا تھا کہ راستے میں چھین نہ لیا جائے اور پھر حمزہ کا موبائل ماریہ کے ہاتھوں کھلونا بنا ہوتا تھا۔ اب بھی موبائل ماریہ کے ہاتھوں میں دیکھ کر زویا تپ گئی۔

"خدا کا واسطہ ہے بی بی یہ تمہارا آخری سمسٹر ہے۔ کچھ تو خدا کا خوف کرو۔ اپنی نہیں تو چچی جان کی عزت کا ہی خیال کر لو۔ کہاں وہ ایم۔ ایس۔ سی میتھ میٹکس اور کہاں تم سی نالائق لڑکی یہ تم ہر وقت موبائل کے ساتھ مت چمٹی رہا کرو...... تنگ آ جاؤ گی۔"

"بے فکر رہو میں، تمہاری چھوٹی باتوں پر پریشان نہیں ہوتی۔ دنیا میں اور بھی غم ہیں پڑھائی کے سوا۔" اسکرین سے نظریں ہٹائے بغیر گنگنا کر ارشاد فرمایا گیا تھا۔ نازیہ کی جان جل کر رہ گئی۔

"رہنے دو نازی! اندھے کے آگے رونا اپنے نین کھونا اور بھینس کے آگے بین بجانے والی بات ہے۔ جب فیل ہوگی پر اماں کے جوتے پڑیں گے تو سب ہوش ٹھکانے آ جائیں گے۔" زویا نے کہا اور اپنی کتابیں لے کر بستر پر بیٹھ گئی۔ ماریہ ہنس پڑی۔

"تمہیں میرے غم میں دبلے ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جب پاس ہونا ہو تو محنت بھی کروں جب فیل ہی ہونا ہے تو کیوں جان کھپاؤں..... تم لوگ اپنی فکر کرو۔"

"مرو تم..... تم سے تو کچھ کہنا ہی فضول ہے۔" نازیہ نے بھی وہیں بیٹھے کشن اٹھا کر اسے دے مارا۔ کالج جانا ماریہ کے

لیے شروع سے ہی تکلیف دہ تھا۔ اب بھی یہی حال تھا۔ اسی لیے وہ ایک دن اگر کالج جاتی تھی تو دوسرے دن چھٹی ضرور کرتی تھی۔ امی اپنے اسکول سے آنے کے بعد گھریلو کاموں میں الجھی رہتی تھیں۔ ایسے میں وہ اب اسے کم ہی جھڑکتی تھیں۔ نور باجی میکے آئی ہوئی تھیں۔ ماریہ کے ہاتھوں ان کا چھوٹا موٹا سا صحت مند آفاق ایک کھلونا تھا۔ کالج سے آتے ہی وہ اسے چمٹ جاتی تھی اور وہ بھی اس کے ساتھ بہت خوش رہتا تھا۔

تجمل آنٹی کے یہاں پارٹی تھی۔ وہ اپنی بیٹی کے ساتھ دعوت دینے آئی تھیں بلکہ صبح ہی صبح زویا، نازیہ اور ماریہ کو آنے کی پر زور تاکید کی تھی۔ امی نے اور دادی جان نے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ انہیں اور نور کے ساتھ صبح کو ہی بھیج دیں گے۔ ماریہ اس حکم شاہی پر تلملا کر رہ گئی۔ دعوت والے دن اس نے بہت کوشش کی تھی وہ نہ جائے مگر امی نے بھی اسے بھیج کر ہی دم لیا۔ سارا راستہ وہ کڑھتی رہی۔ وہ پہلے تجمل آنٹی کے ہاں اس وقت آئی تھیں جب وہ لوگ دوبارہ یہاں سیٹل ہوئے تھے تب پہلی مرتبہ تجمل آنٹی سے اس کی ملاقات ہوئی تھی اور وہ پہلی ملاقات ان کی مدتوں کا عذاب بن گئی، جسے وہ اب تک بھگت رہی تھی۔ نازیہ اور زویا خوب چہک رہی تھیں۔ نور باجی بھی مسکرا رہی تھیں جب کہ وہ ... اندر خوفزدہ ہوتی رہی۔ وہ خود بھی حیران تھی وہ کیسی تو شاید پھر سے یہ ہو گیا تھا کہ داؤد عالم کا ہم ... کر رہی اس کے پیچھے چھوٹنے لگے تھے۔ ... وہ کوئی بھوت تھا پھر نجانے کیوں اسے دیکھ کر وہ ہونے لگی تھی۔ اس کا دل اندر پسلیوں میں ہی دھڑ دھڑ کرنے لگا تھا۔ اسی لیے وہ یہاں نہیں آنا چاہتی تھی ... کب کی چھوڑ چکی تھی۔ داؤد عالم ... کے ہاں بار بار آ چکا تھا اور ہر بار وہ اسی طرح رنج کرتا تھا کہ وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتی تھی۔ ... تو وہ اس سے متوحش رہنے لگی تھی۔ یہاں آ کر بھی یہی حال ہو رہا تھا۔ وہ ایک کونے میں چپ چاپ بیٹھی رہی جب کہ وہ دونوں تو مست ہوئی تھیں۔ گھوم پھر کر سارا گھر دیکھتی رہیں۔ تجمل آنٹی اور جبین دونوں سے ایک طرف بیٹھے رہنے کے بجائے گھر دیکھنے کی آفر کر چکی تھیں، جنہیں وہ کئی بار مسکرا کر ٹال چکی تھی۔

"یہ تجمل آنٹی اور میری بی آخر چاہتی کیا ہیں؟ اور ... کیا ہے؟ میں آخر کیوں اس سے اتنی خوفزدہ کیوں رہنے لگی ہوں۔" وہ سوچ کر رہ گئی۔

پھر شام تک وہ سب کے ساتھ ادھر سے ادھر گھومتی رہی اور حیرت کی بات ہے کہ داؤد عالم ایک دفعہ بھی اس کے سامنے نہ آیا۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ گھر پر نہیں تھا بلکہ وہ گھر پر ہی تھا مگر اس طرح مہذبانہ غائب ہوئے تھا کہ ماریہ کو اس کی سابقہ حرکات پر شبہ ہونے لگا۔

"پورا ڈرامہ باز ہے یہ شخص تو..." وہ سارا دن یہی سوچتی رہی۔ شام سے پہلے ہی امی، دادی جان اور تائی امی چلی آئی تھیں۔ باقی کے لوگ گھر پر ہی رک گئے تھے۔ پارٹی کے بعد چائے کا دور چلا تھا۔ ان لوگوں کے علاوہ ان کے اپنے خاندانی عزیز و اقارب تھے۔ داؤد عالم سب سے ملتا ملاتا ان کے پاس بیٹھتا اٹھتا لاشعوری طور پر ماریہ کی نگاہوں کی زد میں رہا۔ وہ اس پر نظریں ڈالنا بھی گوارا نہیں کرتی تھی مگر... اس نے جب بھی خود کو ڈانٹا اس کا دل ہر بار باغی ہوتا چلا گیا۔

"یا اللہ یہ مجھے کیا ہو رہا ہے؟" چائے پیتے ہوئے وہ مسلسل خود سے لڑ رہی تھی، جھگڑ رہی تھی۔ یوں ہی نظر اٹھا کر اس نے دیکھا تو داؤد عالم کی نظریں خود پر مرکوز دیکھ کر پٹپٹا گئی۔ اس نے ماریہ کو متوجہ پا کر جاندار انداز میں اسمائل پاس کی تھی۔ اس نے گھبرا کر رخ موڑا تو نظر زویا پر جا ٹھہری وہ شاید دیکھ چکی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک شریر مسکراہٹ تھی۔ وہ اندر ہی اندر سلگ اٹھی۔

"بدتمیز۔ جانتا ہے ناں میں اس وقت کچھ نہیں کر سکتی اسی لیے تو......" اس نے سر جھٹکا۔ زویا نے اشارے سے بلایا تو وہ اٹھ کر اس کے پاس چلی گئی۔ وہ اس کا لال بھبوکا چہرہ دیکھ کر ہنس دی۔

"زویا! یہ شخص کسی دن میرے ہاتھوں قتل ہو جائے گا۔" وہ بھناتی ہوئی تھی۔

"اچھا۔ نئی بات ہے..... مگر مجھے لگتا ہے وہ قتل کریں گے..... نہ کہ ہوں گے۔"

تم تو اپنی زبان بند ہی رکھا کرو۔ میرا دل جل رہا ہے اور تمہیں اٹکھیلیاں سوجھ رہی ہیں۔" وہ ایک دم ناراض ہوئی۔

"ارے۔ تم عرض کرو..... بلکہ حکم کرو تو داؤد بھائی کو بتا دوں؟"

"زوئی! میں تمہارا سر پھوڑ دوں گی۔" وہ ایک دم سٹپٹا کر چیخ اٹھی۔ کتنی بدتمیز ہوگئی تھی زویا پھر وہ دونوں وہاں سے نکل کر گھر کے اگلے حصے میں چلی آئیں جو قدرے اونچائی پر تھا۔

"کتنا پیارا گھر ہے جمل آنٹی کا ہے ناں؟" زویا نے بالکونی میں کھڑے ہو کر نیچے جھانکتے ہوئے پوچھا تو وہ سر ہلا گئی۔ جانے کیوں ایسا ہی ایک گھر اس کے تصور میں بھی تھا۔ اس نے کبھی خواب نہیں دیکھے تھے۔ خوابوں کے جزیروں میں بہت دور تک سفر نہیں کیا تھا مگر ایک ایسے ہی خوبصورت چھوٹے سے ہوادار گھر کا تصور اس کے خیالوں میں رہتا تھا اور آج اسے حیرت ہو رہی تھی کہ اس کا تصور اس کے خیالوں کی دنیا سے نکل کر حقیقت میں اس کے سامنے تھا۔ ایسا تو اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

"گھر واپس کب چلیں گے؟" اس نے بمشکل بیٹے آپ کو پہلے پہلے جیسا بہادر بناتے ہوئے کہا تو زویا نے سر ہلایا۔

"پتا نہیں۔ ابھی تک تو ردی جان وغیرہ کے اٹھنے کا کوئی امکان نظر نہیں آرہا۔" وہ ہنس رہی تھی۔

"اب میرا دل گھبرانے لگا ہے۔ تم پتہ کرو بلکہ امی کو کہو کہ اب چلیں۔ یہ کیا کسی کے گھر آکر ہی بیٹھ جائیں۔ میں کہوں گی تو امی مزید پھیل کر بیٹھ جائیں گی جب کہ میرا دل یہاں سے بھاگ جانے کو چاہ رہا ہے۔" زویا سر ہلاتی اندر کی طرف بڑھ گئی تھی اور وہ وہیں کھڑی اس کی واپسی کی منتظر رہی۔

"خیریت۔ یہاں کیوں کھڑی ہیں؟" وہ آسمان پر موجود چاند کو دیکھ رہی تھی جب وہاں سے گزرتے داؤد عالم کی نظر اس کی محویت سے دیکھتے سراپے پر پڑی تو وہ وہیں رک گیا۔

ماریہ نے اس کی آواز پر پلٹ کر دیکھا نظر بلا ارادہ تھی۔ وہ نظروں میں بے پناہ ستائش لیے دیکھ رہا تھا۔ ایک دو لمحے کو نظر ٹھہر گئی تھی۔ وائٹ کلف دار شلوار قمیض میں وہ اپنے بھرپور وجود کے ساتھ سارے ماحول پر چھایا ہوا محسوس ہوا۔ وہ ہمیشہ اس سے لڑتی جھگڑتی ہی ملی تھی مگر آج..... اسے احساس ہوا کہ وہ اس کے یوں غور سے دیکھنے پر مسکرانے لگا ہے تو ماریہ نے فوراً نظر پھیری۔ دل میں ایک دم ہلچل ہونے لگی۔

"بدتمیز۔ دیکھ کیسے رہا ہے نظر بد رکھیں کا۔" اگلے ہی پل اپنے دل کو ڈانٹ کر اس نے اپنے سابقہ موڈ میں لوٹنا چاہا۔

"جی آپ کو میرے یہاں کھڑے ہونے پر اعتراض ہے کوئی۔" وہ جس طرح دیکھ رہا تھا ماریہ کا غصہ لوٹنے لگا۔ اس کی حرکت پر اس نے ٹوکے کو طنزیہ پوچھا تھا۔ وہ ہنس دیا۔

"نہیں۔ ویسے مجھے خوشی ہو رہی ہے تمہیں یہاں دیکھ کر..... مجھے یقین نہیں تھا کہ تم آؤ گی......"

"چلیں۔ اب تو میں آگئی ہوں۔ چاہے زبردستی ہی سہی۔ اب کیا ہو سکتا ہے؟" وہ اپنے موڈ میں واپس لوٹ چکی تھی۔ سینے پر بازو رکھ کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑیں۔

"ہو سکتا ہے۔ بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ ہونے کو تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم مستقل اس گھر میں آجاؤ۔" ماریہ نے تو اسے لاجواب کرنا چاہا تھا لیکن اس نے بھی اس کے اس انداز پر مسکرا کر ایک دم گویا توپ داغ دی تھی۔ وہ پہلے تو ہکا بکا ہوئی پھر نظریں پھیریں اور آخر میں جھنجلا کر رخ بھی موڑا۔

"آپ کا دماغ تو خراب نہیں۔ ہوش میں تو ہیں کیا فرما رہے ہیں؟" اپنے اتھل پتھل ہوتے دل کو زبردستی ڈانٹ کر اسے گھورا۔

"بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ سوچنا ضرور۔ امی وغیرہ کو بھیجوں گا۔ امید تو نہیں انکار ہوگا مگر تم جیسی سر پھری لڑکی سے ہر

فہمی تو تم کی جاسکتی ہے۔" وہ مسکرا کر کہہ رہا تھا۔

ماریہ نے اسے یوں دیکھا جیسے کوئی چیز اٹھا کر اس کے سر پر دے مارے گی۔

"خوش فہمی ہے آپ کی۔ میں آپ جیسے اشارے باز شخص سے شادی کروں۔ کسی باؤلے کتے نے نہیں کاٹا..... مجھے اور آپ کو بہت کیسے ہوئی میرے متعلق ایسا سوچنے کی۔ میں آپ کو مسلسل نظر انداز کر رہی ہوں تو یہ صرف امی کی وجہ سے ہے۔ آپ رشتہ بھیج کر تو دیکھیں میں۔ لبریری میں کی جانے والی آپ کی ساری حرکتیں سارے گھر والوں کو بتا دوں گی۔" اس نے گویا دھمکی دی تھی۔

"آپ سب لڑکیوں کے ساتھ آخر ایک ہی مسئلہ کیوں ہوتا ہے؟ شادی سے انکار کرتے کرتے آخر میں ہاں کہنے والی عادت..... آخر لڑکیاں چاہتی کیوں ہیں کہ لڑکے ان کے پیچھے خوار ہوں۔"

داؤد عالم نے تو زچ کرنے کی حد ہی کر دی تھی۔

"بڑی خوش فہمی ہے آپ کو اپنے متعلق؟ چلیں آپ رشتہ بھیج کر دیکھیں؟ آپ اپنا حق استعمال کریں میں انکار کرتی ہوں۔ پتا چل جائے گا کون کس کے پیچھے خوار ہو رہا ہے..... اور کب تک ہوتا ہے؟"

وہ ایک دم چیلنج کے انداز میں اس کے سامنے جم کر کھڑی کہہ رہی تھی۔ داؤد کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو چکی تھی۔

"اوکے۔ پھر ڈن؟" اس نے ایک دم ہاتھ پھیلایا تو ماریہ ٹپٹا گئی۔ "میرا وعدہ ہے اب کی بار آپ خوار ہوں گی۔" جاندار مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر تھی۔

"شرم آنی چاہیے آپ کو۔" غصے سے ایک دم اس کا برا حال ہو گیا "مجھ سے شرط لگا رہے ہیں؟ جانے خود کو سمجھتے کیا ہے؟" وہ کڑھ کر رہ گئی۔

"ارے آپ تو ناراض ہو گئیں۔ بھئی چیلنج تو آپ کر رہی ہیں؟ میں نے تو صرف آپ کی ہاں میں ہاں ملائی ہے۔ ..... یا پھر میں سمجھوں آپ ابھی سے ہار مان رہی ہیں۔" ماریہ کا جی چاہا اس کا مسکراتا منہ نوچ لے۔ گویا کوئی اثر ہی نہ تھا بلکہ "الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے" والا حال تھا۔

"میں جتنا بھی آپ کا لحاظ کر رہی ہوں آپ اتنا ہی حد سے گزرتے چلے جا رہے ہیں۔ اب کے مجھ سے بات کرنے کی ضرورت نہیں ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔" اسے انگلی سے تنبیہ کر کے وہ آگے بڑھنے کو تھی جب اس کی سائیڈ سے گزرتے داؤد عالم کی مضبوط گرفت میں ماریہ کی کلائی آگئی۔

"بدتمیز انسان۔ میری کلائی چھوڑو۔" ماریہ کے لیے یہ کسی شاک سے کم نہ تھا۔ ایک دم پلٹ کر پھنکاری۔

"اگر نہ چھوڑوں تو؟" داؤد عالم نے تو حد کر دی تھی۔ وہ مزاحمت کرتی اس کی آنکھوں میں دیکھے گئی۔ وہ جیسے آج سے آخری حد تک زچ کرنا چاہتا تھا۔ ایک دم ماریہ مشتعل ہو گئی۔ کسی بھی نتیجے کی پروا کیے بغیر اس نے اپنے دانت اس کے ہاتھ پر گاڑ دیے۔ داؤد بلبلا کر ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ وہ یوں بھاگی جیسے شکاری سے بچ کر کوئی جانور بھاگتا ہے۔

"پوری جنگلی ہے یہ لڑکی تو..... لگتا ہے اب انجکشن لگوانا پڑے گا۔" ہاتھ کی پشت سے خون کی بوندیں نکلتے دیکھ کر داؤد عالم بڑبڑایا پھر اپنی ہی حرکت پر وہ خفیف ہوتے ہنس دیا تھا۔

❀ ❀ ❀

"کتنی پیاری نیند ہے ان دونوں کی اور ایک میں ہوں۔" رات کے دو بجے بستر پر کروٹ بدلتے تھک گئی تو ایک گہری سانس لے کر وہ بستر سے نکل آئی۔ ایک حسرت بھری نظر دونوں پر ڈال کر وہ درمیانی دروازہ کھول کر سائیڈ میں بنی بالکونی میں چلی آئی۔ وہ جب سے داؤد عالم کے گھر سے لوٹی تھی ایک عجیب بے چینی نے پورے وجود کو اپنے حصار میں لیا ہوا تھا۔

"اللہ تمہیں سمجھے داؤد عالم۔ کیوں ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئے ہو۔ آخر کیا بگاڑا تھا میں نے تمہارا۔ اچھی بھلی زندگی گزر رہی تھی۔ ہر غم سے آزاد بے فکر... مگر اب...." وہ وہیں ٹھنڈی زمین پر بیٹھ گئی۔ اس کا دھیان خود بخود داؤد عالم کی طرف چلا گیا تو وہ پہلی نظر کے بعد مسلسل پیش آنے والے واقعات کو یاد کرتی چلی گئی اور پھر آخر میں آج اس کی، کی جانے والی حرکت۔

ماریہ کو کلائی دکھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر اپنے بازو پر اس جگہ انگلیاں پھیریں جہاں اب آگ کی لپٹیں نکلتی محسوس ہو رہی تھیں۔

"یہ مجھے ہو کیا گیا ہے؟ کیوں میں نے اس چھوٹے سے واقعے کو اس قدر ذہن پر سوار کر لیا ہے..... بھول کیوں نہیں پا رہی میں...." اس نے بے بسی سے اپنی دکھتی کلائی پر ہاتھ رکھ دیا۔

"میرا وعدہ ہے اب کی بار آپ خوار ہوں گی۔"

ماریہ کا جی چاہا وہ رو دے۔ وہ تو دوسروں کو بے بس کرنے والی لڑکی تھی۔ کبھی کسی سے بے بس نہیں ہوئی تھی مگر داؤد عالم جیسے جان کی مصیبت بنتا چلا گیا... کس قدر زعم سے اس نے کہا تھا وہ اس وقت کو کوسنے لگی جب وہ سامنے آیا تھا۔ کیا تھا میں وہاں جاتی ہی نہ اور اب... ایک تو ان لوگوں کا گھر کتنا خوبصورت ہے دوسرا ایک ہمارا ہے۔ بغیر نقشے کے بنایا ہوا سب کے کمرے ایک ہی سیدھ میں ہیں۔ نہ ہی لان ہے نہ گیٹ کے نام پر ایک بڑا سا دروازہ... دوران کا گھر... وہ ایک بار پھر وہیں جا پہنچی۔

"کتنا سکون تھا وہاں... اگر چہ وقت دو... گھر تھا لیکن وہ بھی افراتفری نہ تھی اور یہاں ہمارا گھر ہے۔ ایک آ رہا ہے ایک جا رہا ہے۔ دونوں بھائیوں کے بچے دو الگ شور مچاتے رہتے ہیں... ذرا بھی تو پرائیویسی نہیں ہوتی۔" وہ جو اسی زندگی کو زندگی سمجھتی تھی۔ ہر وقت ہلا گلا کرتی رہتی تھی۔ لوگوں کی آمد و رفت سے خوش رہتی تھی۔ اب داؤد عالم کے گھر کا موازنہ کرتے ہوئے اسے اپنا گھر عجیب سا لگا۔ یہ لوگ عالم صاحب سے کسی طرح کم نہ تھے بلکہ ان سے زیادہ خوشحال تھے مگر ان کی زندگی گزارنے کا وہی پرانا انداز تھا جب کہ ان کے ہاں سب کچھ نیا تھا اور شاید یہی کشش تھی جو اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ وہ اتنی سطحی سی لڑکی نہیں تھی مگر اب کے وہ خود بھی اپنی کیفیت کا اندازہ نہیں کر پا رہی تھی۔

"اور اگر داؤد عالم نے سچ مچ جمیل آنٹی کو بھیج دیا تو پھر کیا کروں گی میں؟ امی تو اب انکار کو بالکل نہیں مانیں گی..... اور کیا میں واقعی انکار کر پاؤں گی..." جانے وہ کس نکتے پر آ کر جھجک رہی تھی۔ رات بیتی جا رہی تھی۔ رات کی شبنم ارد گرد کے ماحول کو ٹھنڈا کر رہی تھی مگر ماریہ کو جیسے کچھ ہوش ہی نہ تھا۔ اپنی کیفیت کا تجزیہ کرتے کرتے صبح کا وقت آ گیا اور پھر اسے احساس ہوا کہ زندگی میں پہلی مرتبہ ہوش میں اس طرح پوری رات جاگی ہے..... اور اسی جاگنے نے وہ بات سمجھا دی جو وہ ساری رات کڑھ کڑھ کر سوچتی رہی تھی۔ اس پر یہ انکشاف حیرت انگیز تھا کہ وہ داؤد عالم سے خار کھاتے کھاتے سنجیدہ ہو گئی ہے۔

زویا اور نازیہ کو اگر علم ہو گیا تو میری جان کو آ جائیں گی۔ نیچے چہل پہل ہونے لگی تھی۔ وہ بھی ایک گہری سانس لیتی واپس کمرے میں آ گئی۔ وہ دونوں اب بھی سو رہی تھیں۔ اسے رشک آیا ان کی نیند پر پھر آگے بڑھ کر اس نے زویا کو جھنجوڑ دیا۔

"کیا ہے بھئی..... سونے دو..." وہ جھنجلائی۔ "اٹھو زوئی! مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے..... پلیز اٹھو" اس نے چادر کھینچ لی تھی۔ وہ آنکھیں ملتے اٹھ بیٹھی تھی۔

"کیا ہے۔ اب تمہیں کیا تکلیف ہو گئی؟" ہاتھ منہ پر رکھ کر اس نے جمائی روکی۔

"صبح کا وقت ہے نیچے شاید کچھ لوگ اٹھ گئے ہیں۔ سنو میں بہت پریشان ہوں۔ ساری رات نیند نہیں آئی۔" زویا نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کے انداز میں کوئی بات تھی۔

"کیوں..... تم تو پریشان کرنے والی ہو تمہیں کیا پریشانی آ پڑی؟"

"پلیز مذاق نہیں کرو۔ میں سنجیدہ ہوں یہ سارا اس داؤد عالم کا قصور ہے۔ بڑے دعوے سے کہہ رہا تھا کہ وہ مجھے خوار کرے گا..... بلکہ وہ جمیل آنٹی کو بھیجنے کا کہہ رہا تھا۔ تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟ میرے دل کی حالت بھی عجیب ہو رہی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ بس رونا آ رہا ہے۔" وہ واقعی رو دینے کو تھی۔ زویا نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔ وہ جو کہہ رہی تھی واقعی سچ تھا۔

"کیا..... ؟ مجھے لگتا ہے تمہیں داؤد عالم سے محبت ہو گئی ہے۔" وہ ایک دم اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔

"مجھے بھی یہی لگتا ہے۔" جواباً وہ بغیر چونکے آرام سے بولی تو حیرت سے برا حال ہو گیا۔

"تم ہوش میں تو ہو نا..... ؟" زویا کو لگا ابھی تک وہ نیند میں ہے۔ اکثر نیند میں وہ ایسی ہی حرکتیں کرتی تھی۔ جواباً اس نے شاکی نظروں سے دیکھا۔

"میں ساری رات سوئی نہیں۔" اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ وہ ہنس دی۔

"مجھے سب بتاؤ ہوا کیا ہے؟" زویا نے سنجیدہ ہو کر پوچھا تو اس نے سب بتایا۔ اپنی حرکت سمیت۔

"ارے داؤد بھائی تو بڑے چھپے رستم نکلے۔ میں تو سمجھی تھی انہیں صرف شرارے ہی آتے ہیں مگر وہ تو..." وہ رک گئی پھر شرارت سے دیکھنے لگی۔ ماریہ نے کھینچ کر ہاتھ اس کی کمر پر دے مارا۔

"دفع ہو۔ میں بہت پریشان ہوں... اور تم میری جان جلا رہی ہو۔"

"اس کا صرف ایک ہی حل ہے۔ تم آرام سے شادی کر لو۔ داؤد بھائی کو پیاری سی ہو جاؤ۔ اس طرح تمہاری پڑھائی سے بھی جان چھوٹ جائے گی اور اس گھر سے بھی..." کتنے آرام سے اس نے کہا تھا۔ ماریہ نے عجیب نظروں سے اسے دیکھا۔

"یہ تو وہی بات ہوئی نا۔ اپنے ہی دام میں صیاد آ گیا۔ میں تم سے حل پوچھ رہی ہوں۔"

"تو... اس میں کون سی عجیب بات ہے۔ شادی تو بھی جان کو تمہاری کرنی ہی ہے۔ آج نہیں تو کل اور کیا ہی بہتر ہو کہ وہ بندہ صرف داؤد بھائی ہی ہو۔ جمیل آنٹی کی طبیعت نہایت ہی مخلص اور ملنسار ہے۔ تم جیسی لڑکی صرف ان ہی کے ساتھ گزارہ کر سکتی ہے اور تمہیں سیدھا کرنے کے لیے داؤد بھائی جیسے لڑکے کو ہی ہونا چاہیے۔" زویا باقاعدہ خوبیوں سمیت ذکر کر رہی تھی۔

"اور مجھے تو کچھ آتا ہی نہیں... گھر داری میں تو بالکل کوری ہوں۔ ٹھیک سے چائے بنا نہیں سکتی... مزید کیا خاک کروں گی..." اس نے ایک نیا مسئلہ اٹھایا۔ "اور تم مجھے شادی کا مشورہ دے رہی ہو۔"

"یہ اتنا بڑا مسئلہ تو نہیں۔ تم کم عقل یا پھر سرے سے نااہل تو نہیں ہو۔ اب بھی سنجیدگی سے توجہ دو تو سب کچھ سیکھ سکتی ہو..... بلکہ ہم سے کئی گنا بہتر کارکردگی دکھا سکتی ہو۔ بس دھیان دو۔"

"اور وہ پڑھائی..... شادی کرنے سے کتابوں سے تو جان چھوٹ جائے گی ناں..... مجھے پڑھنا تو نہیں پڑے گا ناں؟" وہ بے چارگی سے پوچھ رہی تھی۔ زویا کا جی چاہا قہقہے لگائے۔ اسے محبت بھی ہوئی تھی تو اپنے مطلب کی۔ وہ شادی کا سوچنے پر آمادہ بھی ہوئی تھی تو صرف پڑھائی سے جان چھڑانے کے لیے۔

"سرین بجی کی تو میں تمہیں گارنٹی دیتی ہوں لیکن داؤد بھائی کے بارے میں مجھے کچھ پتا نہیں۔ چچی تو پہلے ہی تیار بیٹھی ہیں۔ کوئی ایسا رشتہ ملے جو تمہیں سب خامیوں سمیت قبول کریں تو وہ چٹ منگنی پٹ بیاہ کریں۔ ایک دن کی دیر نہ لگائیں۔ اب انہیں موقع مل رہا ہے تو وہ کیوں دیر لگائیں گی... بلکہ خوش ہوں گی ان کا درد سر ختم ہوا۔" وہ اس کے منہ پر اس کی خامیوں کا ذکر کر رہی تھی۔ ماریہ نے گھورنا چاہا مگر گھور نہ پائی۔

"اگر پڑھائی سے جان چھوٹتی ہے تو سودا برا نہیں۔ میں گھر داری سیکھ لوں گی..... بلکہ سب کچھ کر لوں گی... بس داؤد عالم کو پتا نہ چلے۔ میں اس کے لیے یہ سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔" ماریہ کہہ رہی تھی اور زویا اندر ہی اندر ہنس رہی تھی بلکہ جی تو چاہ رہا تھا

کہ اس کا باقاعدہ مذاق اڑائے۔ کل تک یہ لڑکی داؤد عالم سے خار کھاتی تھی۔ اس کا نام سننے کی روادار نہیں تھی اور اب اس سے محبت کر رہی تھی۔ وہ بھی اس انداز میں...... وہ خوب محظوظ ہوئی۔

اگلے دن تک وہ اسی کیفیت میں گھری رہی۔ زویا نے نازیہ کو بھی بتا دیا تھا۔ دونوں ہر وقت اس کا سر کھاتی رہتیں اور وہ ان کے الٹے سیدھے مشوروں پر عمل کرتی۔ اگلے تین چار دن تک ایسی حماقتیں کرتی رہی کہ سارے گھر والے اس کی اس کایا پلٹنے پر حیران ہوتے رہے۔ کہاں وہ کسی کے ہزار ہا روکنے کے باوجود کسی کام کو ہاتھ نہ لگاتی تھی۔ ان تین دنوں میں وہ بغیر کسی کے کہے ہی ہر کام کرنے کو تیار تھی۔

روز نت نئے تجربے کرتے کرتے کبھی ہاتھ جلاتے اور کبھی پیر پر گھی کے چھینٹے گراتے وہ کچھ نہ کچھ کرنے ہی لگی تھی۔ کالج سے آنے کے بعد وہ کچن میں زویا اور نازیہ کے ساتھ کھڑی ہو جاتی تھی۔ کبھی سبزی کاٹ دیتی، کبھی سلاد بنا دیتی، چاول چن دیتی یا برتن دھونے کے ساتھ ساتھ چھوٹے موٹے کام کر دیتی۔

اس دن وہ کچن میں کھڑی کباب تل رہی تھی۔ زویا سوپ بنا رہی تھی۔ کبابوں کے بعد سموسے تلنے تھے جب فرائی پین میں کباب رکھتے چھینٹے اڑ کر اس کے ہاتھوں پر بکھل ہونے بنا گئے تھے وہ کفگیر وہیں پھینک کر پورے کچن میں بریک ڈانس کرنے لگی تھی۔

"ہائے امی جی...... ہائے میرا ہاتھ...... ہائے اللہ" وہ مسلسل دہائی دے رہی تھی۔

"تو بہ ہے تم تو حد کر رہی ہو، دکھاؤ مجھے اپنا ہاتھ۔" زویا جو سوپ بنا رہی تھی یک دم سب چھوڑ کر اس کی طرف بڑھی۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر دیکھا تو دائیں ہاتھ کی پشت اچھی خاصی جل گئی تھی۔ اس نے ماریہ کا چہرہ دیکھا۔ آنسوؤں سے تر تھا اسے ماریہ پر ترس آیا۔

"رہنے دو۔ میں کر لوں گی۔ ماریہ تو یوں بھی ساتھ کام کروائے گی تم جاؤ۔" کیبن سے ٹیوب نکال کر اس کے ہاتھ پر لگاتے ہوئے اس نے کہا تو وہ دوسرے ہاتھ سے چہرہ صاف کر کے پھر سے کام میں سرجھکا نے لگی جب کہ لبوں سے سسکیاں نکل رہی تھیں۔

"یہ تو اب دور ہیں گے۔ میں کب تک یوں ہی بچتی رہوں گی۔ میں کر لیتی ہوں۔" زویا نے اب کے ایک بار پھر بے حد حیران ہو کر دیکھا۔ اس قدر بڑی تبدیلی۔

"سنو۔ تم کوئی ڈرامہ تو نہیں کر رہی ناں...... تمہیں واقعی سچ مچ داؤد عالم سے محبت ہوئی ہے ناں؟" اس کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔ ماریہ شاکی نظروں سے دیکھ کر اپنا ہاتھ چھڑا کر دوبارہ اوون کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

"تمہیں کیا لگتا ہے؟" اس نے دوبارہ چمچ ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

"مجھے تو بہت سیریس حالت لگ رہی ہے۔ رہنے دو۔ اب اتنی بھی سعادت مندی تم پر اچھی نہیں لگتی...... میں کر لوں گی...... داؤد عالم اب اتنے بھی اچھے نہیں کہ تم ان کے لیے اپنے پھول جیسے ہاتھ ہی برباد کر لو۔" اس نے اس کے ہاتھ سے چمچ لینا چاہا مگر وہ ہاتھ پرے کر گئی۔

"ان چند دنوں میں مجھ پر اپنی ذات کے بہت سے انکشافات ہوئے ہیں۔ میں سب کر سکتی ہوں۔ مجھے کبھی احساس تک نہیں ہوا کہ میں جو یہ اوٹ پٹانگ حرکتیں کرتی رہتی ہوں۔ وہ کسی کے لیے ناقابل برداشت بھی ہو سکتی ہیں۔ تم لوگ بھی تو یہی کام کرتے ہو...... مگر اب جب خود یہ سب جھیل رہی ہوں تو لگ رہا ہے میں ہمیشہ سے غلط تھی۔ مجھے یہ سب بہت پہلے سے کرنا شروع کر دینا چاہیے تھا۔ داؤد عالم تو خوامخواہ ایک بہانہ بنا ہے۔"

"ارے...... بس...... بس...... اتنے چرکے ہی کافی ہیں کہیں میں بے ہوش ہی نہ ہو جاؤں...... اف اللہ یقین نہیں آ

رہا۔ اتنی واضح تبدیلی اور وہ بھی تم میں...... مل جائیں داؤد بھائی تو شکر ادا کروں گی کہ ہماری اس قدر سر پھری لڑکی کو سیدھا کر دیا۔" زویا واقعی حیرت زدہ تھی۔

"نہیں۔ تم اسے کچھ نہیں بتاؤ گی۔ وہ پہلے ہی خوش فہمیوں میں مبتلا ہے۔ مزید پھیل جائے گا کہ میں اس کے پیچھے خوار ہو رہی ہوں۔" اس نے فوراً اسے ٹوک دیا تو زویا نے ہنس کر اثبات میں سر ہلایا۔

ہر کوئی ماریہ کی ہمت افزائی کر رہا تھا۔ وہ سب کو خوش دیکھ کر بہت خوش ہو گئی اور پہلی دفعہ اسے محسوس ہوا کہ بعض اوقات دوسروں کو خوش کرنا بھی کس طرح روح کی طمانیت کا سبب بنتا ہے۔"

کل شام اس نے فیرنی بنائی تھی، جسے دیکھ کر زویا اور نازیہ نے خوب مذاق اڑایا تھا۔

"بھئی یہ ہے کیا چیز؟ اسے کم از کم فیرنی نہیں کہہ سکتی میں...... ہاں فرنی کے علاوہ سب کچھ ہو سکتا ہے۔" نازیہ باؤل میں ادھر سے ادھر پانی کی طرح بہتے "مزے" کو دیکھ کر ہنسی تھی۔

"دفع ہو جاؤ۔ تم جیسے بدذوق لوگ کیا جانیں کہ اصل میں فیرنی ہوتی کیا ہے؟" اس نے باؤل اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور پلٹ کر فریزر میں رکھا۔

"سن رہی ہو زویا! میں جو گزشتہ آٹھ سالوں سے کچن میں کام کر رہی ہوں بدذوق ہوں...... اور مجھے فیرنی کا کچھ پتہ ہی نہیں۔" اس نے رونیاں بناتی زویا کو بھی گھسیٹا تو وہ بھنا کر پاؤں پٹختی وہاں سے باہر نکل آئی اور رات کو جب سب چائے نوش فرما رہے تھے تو میٹھے کی طلب ہوئی بلکہ فرمائش ہوئی تھی۔ وہ جو نازیہ کی باتوں پر پہلے ہی بوکھلائی ہوئی تھی، سٹپٹا گئی۔ نازیہ تو موقع کی تلاش میں تھی۔ فوراً فریج سے باؤل نکال لائی۔

"یہ کیا چیز ہے بھئی؟" روحیب بھائی نے باؤل میں جھانکتے ہوئے پوچھا تو وہ خفیف ہو گئی۔

"فیرنی ہے...... وہ بھی ہماری ماریہ نے بنائی ہے۔ ٹیسٹ کریں اور داد دیں بنانے والی کو۔" نازیہ تو پورا "بی جمالو" کا کردار ادا کر رہی تھی۔ وہ دانت کچکچا کر رہ گئی جب کہ روحیب بھائی ہنس دیے۔

"نہ بھئی نہ...... میں تو یہ تجربہ فوراً نہیں کر سکتا۔" انہوں نے ہنس کر کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"دو ادھر میں خود کھا لوں گی۔ خوامخواہ ہی فریزر سے نکال لائی ہے۔" ماریہ کا غصے سے برا حال تھا۔

"نہیں بھئی۔ ہماری بیٹی نے اتنی محنت کی ہے۔ لاؤ نازیہ بیٹے پیالی میں ڈال دو۔ میں کھاؤں گا۔" اسے یوں سب کے مذاق کا نشانہ بنتے دیکھ کر تایا ابو کو فوراً اس پر ترس آیا۔ نازیہ نے پیالی میں فیرنی نما آمیزہ نکال کر انہیں دیا۔ انہوں نے چمچ بھر کر منہ میں ڈالا تو ماریہ کی سانس رکنے لگی۔

"واہ بھئی۔ ذائقہ تو اچھا ہے۔" ایک دو منٹ ذائقہ محسوس کر کے انہوں نے سر ہلایا اور پھر کھانے لگے۔ انہیں اس قدر رغبت سے کھاتا دیکھ کر دوسرے لوگ بھی کھانے لگے۔

"واقعی یہ ماننا پڑے گا...... کہ ذائقہ لاجواب ہے۔ شکل کیا ہے...... شکل تو انسان کی بھی بری ہو سکتی ہے۔ اصل چیز تو باطن کی ہوتی ہے ناں۔" حمزہ بھی اسے چڑا رہا تھا۔ "ویسے اگر ماریہ کی شکل اچھی ہے تو اندر بھی اچھا ہونا چاہیے۔ کیوں تایا ابو...... " وہ باقاعدہ اس کا مذاق اڑانے لگا تو ماریہ بھنا اٹھی۔

"تم تو رہنے ہی دو۔ ایک تو پیالی بھر کر کھا بھی لی ہے اور پھر باتیں کر رہے ہو۔ خود بناؤ تو پتا چلے۔" اس کا غصہ دیکھنے کے قابل تھا۔ سب ہی ہنس دیے۔

"بری بات ہے حمزہ! بہن کا مذاق نہیں اڑاتے۔ ہماری بیٹی نے اتنی اچھی کوشش کی ہے۔ اسے تو انعام ملنا چاہیے۔ بولو

"ماریہ کیا لو گی؟" حمزہ کے والد چھوٹے چچا نے حمزہ کو ٹوک کر اسے پیار سے پوچھا تو وہ ایک دم کھِلی۔

"میں جو مانگوں گی دیں گے ناں۔" اس کی آنکھوں میں ایک چمک تھی۔ انہوں نے سر ہلایا۔

"تو امی سے اجازت دلا دیں۔ میں مزید پڑھنا نہیں چاہتی۔ قسم سے کالج جاتے ہوئے میری جان جاتی ہے۔ کتابوں کو ہاتھ لگاؤں تو نیند آنے لگتی ہے جو کہیں گے کروں گی مگر بی اے نہیں کروں گی۔" سب نے اسے آنکھیں دکھائیں۔ خاص طور پر امی نے جو بیٹی کی پہلی کاوش پر مسکرا رہی تھیں مگر وہ اب گھورنے کا کام سر انجام دے رہی تھیں۔

"تم اگر اس مقصد کے لیے یہ سب کر رہی ہو ناں تو مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر تم یہ سیکھو گی چاہے رو کر یا ہنس کر۔ اس وقت کی اہم ضرورت تعلیم ہے۔ بی اے سے پہلے تو میں تمہاری شادی کا بھی نہیں سوچوں گی۔ کالج چھوڑنے کا خیال ذہن سے نکال دو ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔" امی نے فوراً ڈانٹ دیا تھا۔ اس نے منہ بسور کر سب کو دیکھا۔ سب ہی کا مشفق نظر آئے۔ وہ پاؤں پٹختی باہر کمرے سے نکل گئی۔ ... نسرین بیگم نے اسے وہاں سے نکلتے ہوئے تاسف بھری نظروں سے دیکھا تھا۔

اگلے دن کالج سے ... سواری کی تلاش میں کھڑی تھیں۔ ان کے لیے رکشہ لگوایا ہوا تھا جو انہیں چھوڑنے بھی آتا تھا اور لینے بھی۔ آج اس نے ... ناغہ کر دی تھی۔ صبح جیسے تیسے کر کے وہ آ گئی تھیں مگر اب واپسی کا مسئلہ بنا ہوا تھا۔

"یہ بھی کیا مصیبت ہے۔ گاڑی کا ... چلے تو وہ اب تک کالج ...۔"

تنگ ... نازیہ ... کالج کی دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔

"سواری مل جائے گی۔ تم تو یوں ... جاتی ہو۔" نازیہ نے اس کی مرجھائی صورت دیکھ کر قدرے سکون سے کہا۔ وہ جھنک آتی جاتی گاڑیوں کو دیکھنے لگی۔ وہ یونہی دیکھ رہی تھی جب کوئی بائیک زن سے آگے بڑھی تھی مگر پھر پلٹ کر ان کے قریب آ کر رکی تھی۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ داؤد عالم کو دیکھ کر اس کا دل ایک دم دھڑکنے لگا۔

"یہ یہاں کیسے؟" وہ حیران ہوئی۔

"السلام علیکم! آپ لوگ یہاں کیوں کھڑی ہیں؟ کوئی کنوینس کا مسئلہ ہے؟" اس نے بائیک روک کر دونوں سے پوچھا تھا جب کہ ان دونوں سے قدرے فاصلے پر دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ماریہ کو دیکھا۔

"وعلیکم السلام! جی آج ہمارا رکشے والا نہیں آیا مگر اب کوئی سواری نہیں مل رہی۔" نازیہ نے روانی سے جواب دیا۔

"او آئی سی۔ میں تو ادھر سے گزر رہا تھا۔ آپ لوگوں کو دیکھ کر رک گیا۔ بتائیں اس سلسلے میں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔" کافی مہذبانہ انداز میں وہ پوچھ رہا تھا۔ گزشتہ ملاقات کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ بغور دیکھے گئی۔

"خدمت تو یہ کر سکتے ہیں کہ ہمیں گھر چھوڑ آئیں مگر آپ تو بائیک پر سوار ہیں بھلا یہ خدمت کیسے سر انجام دے سکیں گے۔" زویا نے ہنس کر کہا تو وہ بھی ہنس دیا۔

"میرا خیال ہے ایک فرد تو بائیک پر بیٹھ ہی سکتا ہے کیوں؟" وہ بھی اپنے نام کا ایک تھا۔ مسکرا کر ماریہ کو دیکھا تو وہ فوراً پلٹ گئی جب کہ نازیہ اور زویا ہنس دیں۔

"وہ ایک فرد ماریہ کبھی نہیں ہو سکتی۔ انگور کھٹے ہیں۔ اس لیے ہم میں سے کسی ایک کو منتخب کر لیں۔" زویا نے بھی ... نازیہ اور داؤد کے ہنسنے کے ساتھ وہ بھی جھینپ گئی۔

"میرا خیال ہے۔ دو خواتین تو بیٹھ ہی سکتی ہیں... اگر اعتراض نہ ہو تو۔"

"نہیں جی تین بھی بیٹھ سکتی ہیں... بشرطیکہ ہم میں سے کسی ایک کو بائیک چلانا آتی ہو۔" نازیہ نے بھی برجستہ کہا تو

کھلکھلا کر ہنس دیا۔

"چلیں ... خدمت کرنا ہی چاہتے ہیں تو ماریہ کو لے جائیں۔ ہم تو عادی ہیں۔ وہ اس طرح دھوپ میں کھڑی مر رہی ہے۔ اس سے پہلے کہ ہمیں اس کو اٹھانے کے لیے گھر سے کسی کو بلوانا پڑے آپ اس کو لے جائیں۔" وہ مسلسل چپ تھی۔ زویا نے شرارتاً کہا تھا جو باداؤد عالم نے یوں سانس کھینچی کہ خواہ مخواہ ماریہ چڑ گئی۔

"معاف کیجئے گا زویا جی! مجھے صحیح سلامت گھر پہنچنا ہے اور میری والدہ کو بھی میری ابھی ضرورت ہے۔ کبھی یہ جنگلی بلی بنی ہوتی ہیں اور کبھی خطرناک خاتون.... اب کیا پتہ یہ شیرنی بن کر مجھے ہی دبوچ لیں۔ البتہ آپ دونوں کو لے جا سکتا ہوں۔" وہ سب کے ہاتھ اور ماریہ اندر ہی اندر تپتی جا رہی تھی۔

"ہاں مجھے تو جیسے بڑا شوق ہے تم سے لفٹ لینے کا۔" وہ دل ہی دل میں کڑھ رہی تھی۔ "جی نہیں شکریہ۔ مجھے بھی کوئی شوق نہیں آپ کی اس اعلیٰ و ارفع بائیک کی سواری کا۔ جائیے راستہ ناپیے ناں۔" وہ چپ رہنے والی نہ تھی۔ دل کا کیا تھا ایک چھتر رکھ کر وہ فوراً اس سے دو دو ہاتھ کرنے کو تیار تھی۔

"تھینک گاڈ۔ شکر ہے آپ بول سکتی ہیں۔ میں سمجھا کہیں زبان ... کر بھول چکی ہیں۔" وہ کہہ کر چھتائی۔ اسے پھاڑ کھانے والی نظروں سے گھورا جب کہ نازیہ اور زویا ہنس پڑیں۔

"آپ سے بہتر بول سکتی ہوں اور ویسے بھی مجھے فضول لوگوں سے بات کرنے کی وہ بھی خواہ مخواہ عادت نہیں ہے۔" اپنی خفت مٹانے کو وہ یہ بھی کہہ گئی۔ داؤد عالم نے ایک افسوس بھری سانس خارج کرتے ہوئے زویا اور ... کو شرارت بھری آنکھوں میں دیکھا۔

"مجبوری ہی مجبوری۔ سب جھیلنا پڑ رہا ہے۔ اور کے مجھے ... ہوتا کہ یوں ... ملاقات ہو سکتی ہے تو کسی دوست کی کار ہی لے آتا۔ کم از کم لوگوں کو افسوس تو نہ ہوتا۔" اس نے بھی دل جلانے کی حد کر دی تھی۔ ماریہ نے شاکی نظروں سے دونوں کو دیکھا جو ہنس رہی تھیں۔

"مجھے کوئی افسوس نہیں ہے۔" وہ بھی بولنے پر مجبور تھی تو اس نے سر ہلایا۔ وہ سر پیٹ کر رہ گئی۔

"تو پھر مجھے کچھ جلنے کی بو کیوں آ رہی ہے؟" وہ بھک سے اڑ گئی۔ ... نظروں سے اسے دیکھا۔

وہ آنکھوں میں شرارتی مسکان لیے پوری طرح متوجہ تھا۔ ایک دم وہ آؤٹ ہوئی تھی۔ پاؤں پٹخ کر زویا اور نازیہ پر چڑھ دوڑی۔

"تم دونوں کو گھر جانا بھی ہے یا ہر ایرے غیرے، فضول لوگوں کے ساتھ کھڑے ہو کر یہیں ہانک کر اپنا تماشا کرانا ہے۔" وہ جب بھی آؤٹ ہوتی تھی یوں ہی بولتی تھی۔ زویا سے کتابیں چھین کر کالج کی طرف بڑھی۔

"جب کوئی سواری مل جائے تو بلا لینا۔" ایک سلگتی نظر داؤد عالم اور دونوں پر ڈال کر وہ کالج میں گھس گئی۔ داؤد ہنس دیا۔

"کیا چیز ہے یہ ...؟"

"ویسے داؤد بھائی! یہی حال رہا تو میں سوچ رہی ہوں کہ آپ دونوں کا گزارا کیسے ہوگا؟" نازیہ کے لہجے میں اب بھی شرارت تھی۔ داؤد نے ایک سانس کھینچی۔

"ہو ہی جائے گا۔ تم دونوں دعا کرنا۔ میں گھر خیریت سے پہنچ جاؤں۔ ویسے کسی کو یوں جلتے کڑھتے بددعائیں دیتے چھوڑ کر جانا، اچھی بات تو نہیں مگر کیا کیا جا سکتا ہے..... آپ کی کزن صاحبہ میں انا بہت ہے۔ چاہے اپنا نقصان کیوں نہ ہو۔ وہ پہلے بولتی ہیں پھر سوچتی ہیں۔ ایسے لوگوں کی بددعائیں بڑا اثر رکھتی ہیں۔ چلو ہاتھ تو انجکشن سے ٹھیک ہو سکتا ہے مگر کوئی ہڈی پسلی ٹوٹ گئی تو ... نہیں کر سکتا۔ او کے اللہ حافظ۔" وہ شرارت سے کہہ کر بائیک بھگا لے گیا۔ نازیہ اور زویا ہنستی چلی گئیں۔

وہ ہاتھ لے کر کمرے میں آیا تو کافی دیر سے بجتا موبائل اٹھالیا۔ وہاں آنے والا نمبر دیکھ کر وہ مسکرا دیا تھا۔

"السلام علیکم۔" تولیے سے بال خشک کرتے دوسرے ہاتھ سے موبائل کان سے لگایا۔

"وعلیکم السلام داؤد بھائی کیا حال ہے؟" دوسری طرف زرویا تھی۔ داؤد نے تولیا اسٹینڈ پر ڈال کر خود کو صوفے پر گرالیا۔

"بالکل اے ون۔ تم بتاؤ ادھر کا مطلع کیسا ہے؟ دوپہر کو کافی ابر آلود لگ رہا تھا بلکہ گھر پہنچتے پہنچتے مجھے محسوس ہوا جیسے بارش بھی ہو رہی ہے۔ لگتا ہے کافی گھن گرج کے ساتھ بارش ہوئی ہے اور تمہاری کال بھی اسی گھن گرج کا پیش خیمہ ہے کیا؟" دوسری طرف خوب صورت ہنسی کی جھنکار سننے کو ملی تھی۔

"آپ بھی کیا چیز ہیں؟ اب بس بھی کریں۔ اتنا کافی ہے۔ وہ تو بے چاری جل کڑھ کڑھ کر آدھی ہو گئی ہے بلکہ ہاتھ جلا کر اس کے پھول سے ہاتھوں کا ستیاناس ہو رہا ہے۔ آپ کو ترس نہیں آتا اس پر۔"

"کبھی آتا تھا ترس مگر اب نہیں آتا۔" داؤد نے گنگنا کر کہا تو زرویا ہنستی چلی گئی۔ "مادام! میں نے فرمائش نہیں کی تھی کہ پھول سے ہاتھوں کا ستیاناس کیا جائے۔ آپ کی کزن صاحبہ خود ہی اعلیٰ و ارفع چیز ہیں۔ وہ کسی کی باتوں میں آنے والی نہیں۔" بالوں میں انگلیاں پھیرتے اس نے کہا تھا۔

"مگر وہ آپ کی باتوں میں آ گئی ہے۔ سچ سچ آپ اسے بری طرح خوار کر رہے ہیں۔ پہلے وہ ہر وقت اس بات پر کڑھتی رہتی تھی کہ اسے روز لائبریری پہ اشارے کرنے والا شخص آخر کون ہے؟ اس کا کیا مقصد ہے؟ وہ تو ان ہی دنوں آپ سے ملاقات کرنے پر بضد تھی۔ وہ تو کر بھی لیتی، تمہاری اور نازیہ کی ہر وقت کی بریفنگ نہ ہوتی..... ورنہ آپ کا بھانڈا کب کا پھوٹ چکا ہوتا! آپ کو علم نہیں وہ کیا چیز ہے مگر اسے علم ہو گیا کہ آپ اسے الو بنا رہے ہیں تو خدا کی قسم وہ آپ کی گردن دبوچ لے گی...... جناب چاہ رہے تھے وہ تو ہو گیا۔ اب تو محترمہ جلنے کڑھنے کے ساتھ ساتھ جلے ہوئے خانہ داری بھی ہو گئی ہیں اور بھی نجانے کیا کیا ہونے کے امکانات ہیں۔ اب اس پر ترس کھا لیں۔ اس نے تو کبھی کوئی کام نہیں کیا۔ آپ کی خاطر کیا کیا نہیں کر رہی..... جسے جھاڑو پکڑنا نہیں آتی تھی اس کے ہاتھوں میں چھالے دیکھ کر میرے نازک دل کو تو بڑی تکلیف ہوتی ہے اور آپ کتنے پتھر دل ہیں ذرا بھی اثر نہیں ہوتا۔" وہ رکی تو داؤد نے ایک گہری سانس کھینچی۔

"اثر ہونے کا مطلب ہے۔ اس کو اپنے سر پر سوار کروں..... بلکہ میرا تو خیال ہے کہ اسے تھوڑی اور تربیت مل جائے جب وہ یہاں آئے تو مجھے اس پر زیادہ محنت نہ کرنی پڑے۔ میں جس انداز میں ڈھالنا چاہوں وہ ڈھل جائے۔ ادھر سے اب امی باقاعدہ ناراض ہونے لگی ہیں کہ نہ میں انہیں لائبریری والی لڑکی سے ملوا رہا ہوں اور نہ ہی ادھر ہاں کر رہا ہوں..... پچھلے کچھ دنوں سے بری طرح ان دونوں کی زد پر پڑا ہوں۔"

"آپ تو پھر بھی فائدے میں ہیں جب کہ صرف اپنی ذات سے لڑنا سب سے مشکل کام ہوتا ہے۔ وہ لڑکی جس نے زندگی میں کسی چیز کو سنجیدہ ہی نہ لیا ہو وہ اچانک کسی ایک شخص کی خاطر اپنی پوری زندگی کو ہی بدلنے پر مصر ہو جائے تو اس انقلاب کو آپ کیا کہیں گے..... یہ اچانک تو رونما نہیں ہوا ہوگا..... کتنا اس نے اپنے آپ سے، اپنی عادتوں سے اور اپنی فطرت سے جھگڑا کیا ہوگا۔ صرف اپنی ذات کو نظر انداز کر کے ایک دم کسی کی اہمیت تسلیم کر لینا بہت بڑی بات ہے۔ داؤد بھائی وہ بھی ایک ایسی لڑکی کے لیے جس نے محبت جیسی لغویات کو کبھی گردانا ہی نہ ہو، جس کے نزدیک شادی جیسا فعل صرف حماقت اور اپنی زندگی برباد کرنا ہو وہ ایک دم اپنے آپ کو بدلنے کے لیے تیار ہو جائے بلکہ عملی طور پر اس کا مظاہرہ بھی کرے تو ایسے میں آپ یہ توقع رکھیں کہ وہ خود آگے بڑھ کر اظہار محبت کرے تو آپ غلط ہیں۔ وہ بہت اچھی ہے۔ سونے جیسا دل ہے اس کا۔ پلیز اسے مزید خوار مت کریں۔ وہ بہت ڈسٹرب ہے بلکہ آج جب سے اس نے آپ کو دیکھا وہ متضاد خیالات میں گھری ادھر سے ادھر چکرا رہی ہے۔ چھپکے چھپکے رو چکی ہے۔ پہلی بار اس

نے شادی سے انکار کیا ہے اور اب وہ آپ کی منتظر ہے تو آپ کو بھی اس کے احساسات کا پاس رکھنا ہوگا۔"

داؤد مسکرا دیا تھا۔

"آپ کے کہنے پر میں نے اور نازیہ نے وہ سب کیا ہے جو شاید اس کے علم میں آ جائے تو وہ ہمیں قتل کر ڈالے۔ اسے اپنی انا بہت عزیز ہے اور اگر اسے علم ہو گیا کہ ہم شروع سے آخر تک اس واقعے میں شامل ہیں تو سوچ نہیں وہ کیا کرے۔ .. بہت ہو گیا ڈرامہ اور مذاق آپ کو اب کوئی فیصلہ کرنا ہوگا۔" وہ چپ ہو گئی۔

"ٹھیک ہے میں سوچتا ہوں۔ وہ تو ٹھیک ہے ناں۔ میرے دو چہرے والے مذاق کا اس نے اثر تو نہیں لیا ناں۔"

"ابھی تک تو اس نے آپ کی سچ ولائی کا ہی اثر لیا ہوا ہے۔ مزید کوئی ڈرامہ بازی کیے بغیر لوہا گرم ہے چوٹ لگا لیں تو بہتر ہے ورنہ آج کل گھر میں ایک رشتہ آیا ہوا ہے۔ میری بھابی کے بھائی کا ہے۔ رشتے دار ہیں۔ اب تو وہ سلجھتی جا رہی ہے تو نسرین چچی بھی سنجیدہ ہو رہی ہیں۔ پڑھے لکھے ہیں ماریہ کی دلچسپی زیادہ ہے۔ صرف وہ اس کے بی اے کی منتظر ہیں۔ میرا خیال ہے کہ شادی تو نہیں البتہ منگنی ضرور کریں گی۔" سنجیدگی سے اس نے بتایا تو داؤد عالم ایک دم پریشان ہو کر سیدھا ہوا۔

"کیا... ہوش میں تو ہو تم... اور تم اس رشتے کے متعلق اب بتا رہی ہو... اتنی محنت میں نے کی ہے... اور کوئی اور لے اڑے ناممکن... پہلے کیوں نہیں بتایا تم نے تاکہ میں کچھ سدباب کرتا...." وہ ایک دم ناراض ہو گیا تھا اس پر۔

"مجھے خود بھی علم ہوا ہے۔ وہ لوگ اتوار کے دن آ رہے ہیں۔ دراصل جیسے ہی ہم گھر پہنچے تو ان لوگوں کا فون آ گیا۔ ماریہ تو تبھی کمرے میں بند ہو گئی تھی۔ رو رو کر برا حال ہو رہا تھا اس کا۔ ابھی وہ لیٹی ہے تو میں آپ کو فون کرنے آئی ہوں۔"

"اچھا کیا تم نے... میں امی سے بات کرتا ہوں۔ کل ہی وہ دن... ٹھیک ہو گیا تو کریں گی وہاں اپنی کم عقل کزن کو مت بتانا پہلے ہی اس میں عقل کی کمی ہے۔ خوامخواہ کوئی نیا ایشو اٹھائے گی۔ ناتو ویسے بہت ہے اس میں۔ لیکن میرا مقصد بھی چند دن اور مزا دینے کا ہے... ورنہ یہ چند دن مزید تم لوگوں کو میرا ساتھ دینا ہے سمجھیں۔" وہ ایک دم اسے کہہ رہا تھا۔ دوسری طرف وہ ہنسی۔

"او کے۔ سمجھ گئی باس۔ اور کیا حکم ہے؟" وہ بھی کھل کر ہنسا تھا۔

"حکم یہ ہے کہ لوہا گرم ہے۔ تم مسلسل چوٹ لگاتی جاؤ۔ لوہا مزید چمکتا جائے گا۔" اب وہ ہلکا پھلکا ہو کر کہہ رہا تھا۔ زرویا ہنستی چلی گئی۔

"ٹھیک ہے مگر یہ آخری بار ہے۔ پہلے ہی میں اسے بہت تکلیف دے چکی ہوں۔ آپ اپنا ڈرامہ فونڈ کر لیں۔ اس سے پہلے کہ میں خود بتا دوں۔" اب کے وہ اسے چڑا رہی تھی۔

"ضرور ضرور بتاؤ، اگر تمہیں اپنی گردن پیاری نہیں۔ تمہاری کزن تو ویسے بھی جنگلی بلی ہے پوری۔" داؤد نے آرام سے کہا تھا۔

"ایک منٹ داؤد بھائی! مجھے لگ رہا ہے کہ جیسے دوسرے فون سے کوئی سن رہا ہے۔ میں آپ سے پھر بات کروں گی۔ اللہ حافظ۔" ایک دم عجلت سے کہتے زرویا نے فون بند کر دیا تھا۔ داؤد عالم نے ایک گہری سانس خارج کرتے موبائل سائیڈ پر رکھا۔

ریسیور کریڈل پر رکھ کر وہ جیسے ہی تیز تیز قدم اٹھاتی ٹی وی لاؤنج میں آئی تو وہاں ماریہ کو ریسیور پکڑے دیکھ کر اپنی جگہ پر ٹھہر گئی۔ وہ اس کی داؤد عالم سے ہونے والی تمام گفتگو سن چکی تھی۔ اسے یوں چپ سادھے بیٹھے دیکھ کر زرویا نے خشک ہوتے حلق کو تر کرتے آگے کو قدم بڑھائے۔

"ماریہ!" اس نے قریب پہنچ کر اسے پکارا۔ اس نے کریڈل پر ریسیور رکھ کر اسے جس انداز میں دیکھا۔ زویا کا جی چاہا کہ وہ زمین میں سما جائے۔

"ماریہ میں..... وہ داؤد بھائی......" اس نے اس سے کچھ کہنا چاہا تھا مگر وہ اسے کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر وہاں سے بھاگ گئی۔

"ماریہ! بات سنو میری۔ پلیز ماریہ۔" وہ بھی پیچھے لپکی تھی مگر وہ کمرے میں جا کر دروازہ لاک کر گئی تھی اور وہ بند دروازے کو دیکھتی رہ گئی۔ ماریہ کا ردعمل انتہائی شدید تھا وہ خوفزدہ ہوئی۔

اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے۔ تقریباً سب ہی اپنے کمروں میں سو گئے تھے۔ نازیہ تو بجے ہی سو گئی تھی۔ ماریہ نے جب سے رشتے کا سنا تھا تب سے کمرے میں بند تھی۔ آج تو اس نے کچن میں اس کا ہاتھ بھی بٹایا تھا۔ نسرین بیگم جانتی تھیں وہ رشتے پر یہ خاموش احتجاج کر رہی ہے تو انہوں نے بھی ذرا توجہ نہ دی۔ اب سب نے سوچ لیا کہ پہلے ہی دو رشتے ہاتھ سے گنوا چکی تھی۔ اب وہ نے یا نہ مانے وہ ہاں کر دیں گی۔ اسی لیے اس کا رویہ روٹھا چہرہ بھی نظر انداز کر گئیں۔ زویا کافی دیر تک اسے تسلیاں دیتی رہی تھی پھر وہ بیٹ گئی تھی تو وہ نیچے چلی گئی۔ برآمدے میں ہی رکھا فون اسٹینڈ دیکھ کر اس کے دل میں داؤد سے مسئلہ ڈسکس کرنے کا خیال آیا تو نمبر ملا لیے۔ اسے تو اندازہ بھی نہیں تھا کہ ماریہ نیچے بھی آ سکتی ہے اور پھر دوسرے فون سے اس کی ساری گفتگو بھی سن لے گی۔ وہ اب اس کا ردعمل۔ اس کا دل خوف سے سکڑنے لگا۔ وہ جانے کیا کیے۔ وہ جوں جوں سوچ رہی تھی پریشان ہو رہی تھی۔ وہ کافی دیر تک ادھر ادھر ٹہلتی رہی مگر اسی طرح ساری رات تو نہیں گزر سکتی تھی۔ وہ دوبارہ دروازے کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اس نے تین چار دفعہ دروازہ کھٹکھٹایا تھا مگر وہ نہیں کھلا تھا۔

"پلیز ماریہ دروازہ کھولو۔ میں کس طرح ساری رات کمرے سے باہر نہیں گزار سکتی۔ پلیز......" وہ روہانسی ہو گئی تھی اور تب ہی دروازہ کھل گیا تھا۔ وہ تیر کی سرعت سے اندر داخل ہوئی۔ ماریہ دروازہ کھول کر بستر پر دراز ہو کر سر تک چادر تان چکی تھی۔ اس نے بے بسی سے دیکھا۔

"ماریہ! اگر تم میری بات سن لو تو شاید تمہیں سوچنے میں آسانی ہو۔ بخدا میرا مقصد تمہیں تکلیف دینا نہیں تھا...... بلکہ میں تو......"

"تمہارا اور نازیہ کا جو بھی مقصد تھا۔ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ میں بس اتنا سمجھی ہوں کہ تم دونوں نے میری تذلیل کی ہے اور اس کے بدلے میں تم لوگوں کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔" یک دم سپاٹ آواز میں سب کہہ گئی تھی۔ زویا دیکھتی رہ گئی۔

"ماریہ!"

"پلیز! مجھے نیند آ رہی ہے..... اور ہاں مجھ سے بات کرنے کی ضرورت نہیں۔" پھنکارتی آواز تھی۔ زویا تو کئی لمحے کھڑی رہی۔ ہاں وہ جانتی تھی کہ ماریہ اس معاملے میں کس قدر شدت پسند ہے۔

* * *

صبح کے وقت ابو امی اور داؤد عالم تھے۔ داؤد سوچ رہا تھا کہ امی سے کیسے بات کرے..... امی تو اب اس سے ناراض رہنے لگی تھیں۔ جب سے اس نے لائبریری والی لڑکی کے متعلق آگاہ کیا تھا۔ وہ اس لڑکی کے گھر جانا چاہتی تھیں مگر وہ کوئی سرا ہاتھ نہیں پکڑا رہا تھا۔ پہلے اس نے ماریہ کی جانب سے خود انکار کیا تھا اور اب ایک اقرار۔

"امی! وہ مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔" کھانا کھاتے ہوئے اس نے گفتگو کی ابتدا کی۔

"ہاں کہو......" انہوں نے سرسری سا کہا۔

"وہ امی میں چاہتا ہوں کہ آپ نسرین آنٹی کے ہاں آج جائیں۔ ان کی بیٹی ماریہ کے لیے۔" اٹک اٹک کر اس نے کہہ ہی دیا۔

"کیا......؟" امی تو امی عالم صاحب بھی حیران رہ گئے۔

"یہ کیا مذاق ہے؟ تم جانتے ہو داؤد! کہ مجھے ایسا مذاق قطعی پسند نہیں کہ جس میں کسی کی بیٹی وغیرہ پر حرف آئے۔ پہلے انکار اب اقرار...... یہ کیا بات ہوئی بھلا......" وہ خفگی سے کہہ رہی تھیں۔

"میں پہلے بھی راضی تھا...... یہ ایک لمبی بات ہے پھر کبھی بتاؤں گا۔ فی الحال تو آپ لوگ آج ان کے ہاں جائیں۔ ماریہ کے لیے اتوار کو ایک رشتہ آ رہا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگ ان لوگوں سے پہلے بات کر لیں تو اچھی بات ہے۔" اس نے آرام سے کہا تھا۔ امی نے ابو کو دیکھا۔

"تم بھول رہے ہو کہ تم اس لڑکی کے لیے پہلے ہی انکار کر چکے ہو۔ اب میں کس منہ سے ان کے ہاں جاؤں؟" امی کو اچانک یاد آیا تھا۔ "اور وہ لڑکی جس کا تم ایک بار ذکر کر رہے تھے۔ اسے کس کھاتے میں ڈال رہے ہو۔"

"امی! وہ لڑکی نسرین آنٹی کی بیٹی ماریہ ہی ہے...... وہ بیچ میں غلط فہمی کی وجہ سے جان بوجھ کر انکار کیا تھا اور اب اقرار کر رہا ہوں تو اس کی بھی وجہ ہے کہ میں اس لڑکی کو کھونا نہیں چاہتا۔ آگے آپ بہتر سمجھتی ہیں۔" وہ کھانا ختم کر چکا تھا۔ وہ وہاں سے اٹھ کر چلا گیا تھا۔ امی ابو بھی چپ چاپ ایک دوسرے کی شکلیں دیکھتے رہ گئے۔

زویا اس سے بار بار بات کرنے کی کوشش کر چکی تھی مگر اس کی چپ نہیں ٹوٹی۔ بہت سنجیدگی کے ساتھ وہ کالج گئی تھی اور حیرت کی بات تھی اس نے پہلی دفعہ سارے پیریڈ اٹینڈ کیے تھے اور تو اور پہلی دفعہ اس نے لیکچر کے دوران نیچے سے سوال بھی کیا تھا۔ واپس آ کر وہ کچن جانے کے بجائے کمرے میں گھس گئی تھی۔ نماز ادا کر کے قرآن مجید پڑھتی رہی۔ قرآن مجید بند کیا تو کتابیں کھول لیں۔ زویا تو سب جانتی تھی مگر نازیہ بھی حیران ہوئی اور پھر جب اسے زویا سے ساری حقیقت کا علم ہوا تو وہ بھی چپ کی چپ رہ گئی۔

شام کی چائے کی ذمہ داری بڑی بھابی نے اس پر عائد کی تھی، جسے اس نے نہایت خاموشی سے نبھایا بھی تھا۔ ابھی وہ لوگ چائے پی رہے تھے جب تجمل آنٹی اور عالم انکل چلے آئے۔ ان کے ساتھ ان کا داماد اور جبین بھی تھیں۔ ان کو دیکھتے ہی وہ کمرے میں گھس کر دروازہ لاک کر گئی تھی۔ اسے نہیں پتا وہ لوگ کب گئے اور کیا کیا باتیں ہوئیں؟ بس وہ تو اپنے اندر کی آگ سے نبرد آزما تھی۔ وہ لوگ چلے گئے تو وہ کمرے سے نکلی۔ عشاء کی نماز ادا کی۔ وہ امی کے کمرے میں چلی گئی۔ وہ جائے نماز پر کھڑی تھیں۔ ابھی انہوں نے نماز شروع ہی کی تھی۔ وہ ان کے بستر پر لیٹ گئی اور جب تک انہوں نے نماز مکمل کی وہ چھت کو گھورتی رہی۔ آدھے گھنٹے بعد انہوں نے جائے نماز سمیٹا تو وہ تب ہی اسی حالت میں تھی۔ وہ جائے نماز ایک طرف ڈال کر اس کے پاس بیٹھ گئیں۔

"ماریہ! کیا بات ہے...... چندا کوئی بات ہوئی ہے؟" وہ جتنی اس کی حرکتوں پر خائف رہتی تھیں اتنی ہی اس سے محبت بھی کرتی تھیں۔ اس کا سر اپنی گود میں رکھ کر بالوں میں انگلیاں پھیریں۔

"امی! یہ تجمل آنٹی وغیرہ کیوں آئے تھے؟" ان کے سوال کو نظر انداز کرتے اس نے پوچھا تھا۔ وہ پہلے تو چونکیں پھر بجھ کر مسکرا دیں۔

"تم جانتی ہو...... بلکہ جو سمجھ رہی ہو وہ سچ ہے وہ ایک دفعہ پھر اپنے بیٹے کے لیے رشتہ لے کر آئی ہیں۔"

"امی جان پلیز! آپ انکار کر دیں۔ مجھے نہیں کرنی اس داؤد عالم سے شادی۔ اس کے علاوہ آپ جہاں کہیں گی میں تیار ہوں مگر ادھر نہیں۔" وہ ایک دم بھر گئی تاہم خود کو رونے سے باز ہی رکھا۔

"مگر ماریہ..." انہوں نے اس قدر دو ٹوک انداز میں کچھ کہنا چاہا تو اس نے روک دیا۔

"امی پلیز! زویا کی ممانی کے بھائی کا جو رشتہ آ رہا ہے وہ مجھے منظور ہے۔ آپ ان لوگوں کو ہاں کہہ دیجیے گا۔" وہ انتہائی سنجیدہ تھی بلکہ خطرناک حد تک۔

اس روپ میں تو انہوں نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"ماریہ" ان کے لب ہلے تھے۔

"امی! میں بہت بری ہوں۔ مجھے اب احساس ہو رہا ہے۔ میں ایک لمبے عرصے سے آپ کے لیے تکلیف کا سبب بنتی رہی ہوں۔ میں نے زندگی کو کبھی سنجیدگی سے لیا ہی نہیں۔ میرے نزدیک زندگی کا نام صرف کھیل تماشا تھا اور اس کو میں پوری زندگی سمجھتی رہی ہوں...... لیکن اب لگتا ہے کہ زندگی اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہے... مگر اب میں اپنے سارے رستے گم کر بیٹھی ہوں۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کہاں جاؤں؟ کس راستے پر قدم رکھوں؟ کون سا رستہ اچھا ہے کون سا برا؟" وہ ایک دم ان کی گود میں منہ چھپا کر بکھر گئی۔ نسرین بیگم پریشان ہو گئیں۔

"میں نے تعلیم کو قدر و اہمیت کو کبھی پرکھا ہی نہیں۔ مجھے ہمیشہ زہر لگتی تھی۔ میرا بس چلتا تو میں ساری کتابیں بھٹی میں جھونک دیتی۔ میری جان جاتی ہے اس لفظ سے مگر اب پتا ہے کہ میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ تعلیم انسان کو شعور دیتی ہے کہ وہ معاشرے میں مقام بنا سکے۔ لوگوں کو پرکھ سکے... نقاب چہروں کے پیچھے چھپی اصلیت اخذ کر سکے۔ اپنے اردگرد کا جائزہ لے سکے۔ تعلیم تو نام ہی ادراک کا ہے اور میں نے کیا درست کیا؟ میں جب بھی سوچتی ہوں تو مجھے ہر طرف ریزہ ریزہ نظر آتا ہے۔ امی میں ایسی کیوں تھی...؟ بتائیں میں ایسی کیوں تھی... مجھے زندگی کو سمجھ کیوں نہ آیا...؟" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور اسے یوں بلک بلک کر روتے دیکھ کر نسرین بیگم کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے تھے۔

"ماریہ! میری جان میری چندا۔ کچھ بتاؤ تو سہی... کیا ہوا ہے؟" وہ تڑپ اٹھی تھیں۔

"امی آپ کی ماریہ ہار گئی۔ زندگی سے ہار گئی۔" وہ مزید پھوٹ پھوٹ کر روئی۔

اور کافی دیر تک روتے رہنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ وہ ایک تسلسل سے کیا حماقت کیے جا رہی ہے اور امی کیا سوچ رہی ہوں گی۔ احساس ہوتے ہی اس نے ایک دم سر ان کی گود سے اٹھا لیا تھا۔ شرمندہ ہوتے ہوتے اپنا چہرہ صاف کیا پھر امی کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ وہ ابھی بھی پریشان اس کا چہرہ کھوج رہی تھیں۔

"ایم سوری امی! میرا مقصد آپ کو پریشان کرنا نہیں تھا۔ رئیلی سوری۔" اس کے ہاتھ پکڑ کر وہ ندامت سے کہہ رہی تھی۔ انہوں نے بغور جائزہ لیا۔ "تمہارے رونے کی وجہ کیا ہے؟" انہوں نے سنجیدگی سے پوچھا تھا۔

"وہ بابا یاد آ رہے تھے۔" یہ سچ بھی تھا جب سے زویا اور نازیہ کی حقیقت علم میں آئی تھی تب سے اپنے یتیم ہونے کا احساس شدت سے ہو رہا تھا۔ تب سے وہ یہی سوچ رہی تھی کہ اس کے سر پر باپ کا سایہ ہوتا تو کیا تب بھی زویا اور نازیہ اس کے ساتھ یہ سب باتیں کرتیں۔ کل سے اب تک اسے اپنا آپ بہت حقیر لگ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے دونوں نے بیچ چوراہے میں اس کی بولی لگا دی ہو۔

"اس کے علاوہ......؟" وہ اتنی جلدی مطمئن ہونے والی نہ تھیں۔

"اس کے علاوہ اپنی غلطیوں کا احساس ہے۔ آپ کو پریشان کرنے اور مسلسل تکلیف دینے کا پچھتاوا ہے۔ کبھی بھی آپ کی بات نہ ماننے کا احساس... تکلیف دہ باتوں کی یاد...... رئیلی امی جی۔ مجھے لگتا ہے کہ ہر انسان کی زندگی میں آگہی کا ایک لمحہ ضرور آتا ہے اور وہ میری زندگی میں کل رات آیا تھا۔ میں ماضی میں جو بھی کر چکی ہوں اس کو بدل تو نہیں سکتی مگر میرا وعدہ ہے حال اور مستقبل

میں آپ مجھے بالکل ویسا ہی پائیں گی جیسا کہ آپ چاہتی ہیں۔ میں اپنے آپ کو سنوار لوں گی۔ آپ کے معیار پر پورا اترنے کی کوشش کروں گی۔ آپ چاہتی تھیں نہ کہ میں بہت پڑھوں اگرچہ کتابوں سے میری جان جاتی ہے مگر میں پڑھوں گی صرف آپ کے لیے۔"

وہ ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے سب کہہ رہی تھی اور وہ خوشی کے ساتھ اس کی اس کایا پلٹ جانے پر حیران ہو رہی تھیں۔

زویا کی ممانی اگلے دن اتوار کے روز اپنے بھائی کا رشتہ لے کر آئی تھیں۔ جسے سوچ کر بتانے کا کہا گیا تھا۔ اس نے امی کو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ دوسرا رشتہ قبول کر لیں۔ اب پتا نہیں وہ سب کیا فیصلہ کرتے ہیں۔ ماریہ کی جان سولی پر لٹکی ہوئی تھی۔ کالج جانا اور گھر بھی وقت دینا ایسے میں دل کی شکستہ ہستی کو نظرانداز کر کے صرف سامنے نظر آنے والے منظر کو ہی ملاحظہ کرنے کے لیے مشکل ہی نہیں ناممکن بھی تھا مگر اب وہ جس طرح ان سب حالات سے پوری استقامت کے ساتھ نبرد آزما تھی اس پر وہ خود بھی حیران تھی کہ اس کے اندر اتنی طاقت کہاں سے آ گئی ہے یا پھر ایک انکشاف نے اس کے اندر برسوں سے چھپے بزدل لمحوں کو کھرچ پھینکا تھا۔ وہ نادان تو ضرور تھی مگر بے عقل نہیں۔ اچھی سمجھ بوجھ والی لڑکی تھی۔ بس اپنے آپ کو استعمال ہی نہیں کیا تھا اور اب وہ خود کو آزمانا چاہتی تھی۔ زویا اور نازیہ نے ہر ممکن طریقے سے اس سے بات کرنا چاہی مگر وہ انہیں بات کرنے کا موقع ہی نہیں دیتی تھی۔ تنگ آ کر زویا رو دی۔

"یہ سب داؤد بھائی کی وجہ سے ہوا ہے۔ ان ہی کا پلان کیا ہوا ڈرامہ تھا۔ ہمارا قصور تو صرف اتنا تھا کہ ہم نے ان کا ساتھ دیا۔ صرف اور صرف ماریہ کے بہتر مستقبل کے لیے مگر وہ ہمیں ہی مجرم سمجھ رہی ہے۔ مجھ سے تو بات کرنے پر آمادہ ہی نہیں۔ کم از کم حقیقت تو جان لے پھر چاہے جو مرضی سزا دے لے مگر اس طرح چپ کی مار تو مت مارے۔" ماریہ کے سامنے وہ رو دی تھی۔

"وہ شروع سے ہی کم عقل ہے۔ اب بھی حماقت کر رہی ہے۔ بے وقوف کہیں کی..... میرا تو دل چاہ رہا ہے کہ کس کر تھپڑ لگاؤں۔" زویا کا رونا اس سے برداشت نہیں ہوا۔ غصے سے برا حال ہو رہا تھا۔ "میں داؤد بھائی کو سب بتا دوں گی۔ مجھ سے نہیں برداشت ہوتی اس کی ناراضگی۔ زندگی میں اس طرح اس نے کبھی بھی نہیں کیا۔ ان چار پانچ دنوں میں کتنی بدل گئی ہے وہ۔ داؤد بھائی جانیں اور ان کا پلان۔ ہم تو خوامخواہ پھنسے ہیں۔ اب تو نیکی کا کوئی زمانہ ہی نہیں رہا۔" آنسو صاف کرتے اس نے فیصلہ کیا۔ نازیہ نے بھی گردن ہلائی پھر دونوں نے مل کر داؤد عالم کو فون کیا۔ ساری بات بتا کر وہ اسے ماریہ کا ردعمل بھی بتانے لگیں۔

"داؤد بھائی! اس نے ممانی کے بھائی کا رشتہ بھی قبول کر لیا ہے۔ تاہم چچی جان نے فیصلہ دادی اماں اور تایا ابو پر چھوڑ دیا ہے۔" وہ اسے بتا رہی تھی اور وہ پریشان ہوا۔

"دماغ تو خراب نہیں ہو گیا اس لڑکی کا جب اس نے سن ہی لیا تھا تو تم اس کو ساری بات بتانے کی کوشش تو کرتیں......"

آخر میں وہ زویا پر ہی چڑھ دوڑا۔

"اچھی بات ہے۔ آپ دونوں کی نیکی جرم گناہ لازم والی بات فٹ آتی ہے ہم پر۔ ایک تو ہم گیند کی طرح ادھر سے ادھر لڑھک رہے ہیں۔ آپ دونوں کی بھلائی چاہ رہے ہیں۔ اور الٹا ہم ہی کو الزام۔ واہ بھئی واہ کیا دستور ہے آپ کے ہاں نیکی کا بدلہ اتارنے کا بھی۔ لعنت۔" زویا کی زبان آج تیز دھاری تلوار بنی ہوئی تھی۔ داؤد سٹپٹا گیا۔

"ایم سوری۔ تم اس سے بات کرنے کی کوشش کرو۔ یہ بھلا کیا بات ہوئی؟ جب وہ مجھ سے محبت کرتی ہے تو پھر دوسرا رشتہ قبول کر لینے کی کیا تک ہے بھلا۔"

"یہ تو آپ اسی سے پوچھیں۔ اب ہم کسی بھی معاملے میں آپ کا ساتھ نہیں دیں گے۔ آپ جانیں اور وہ پاگل لڑکی.... آج کل تو بڑی بدل گئی ہے...... اور کچھ فائدہ ہوا ہو یا نہ ہو یہ ضرور ہوا کہ جس لڑکی کو سالوں تک کوئی ایک لفظ بھی نہیں آ سکا تھا وہ صرف پانچ دنوں میں سر سے پاؤں تک بدل گئی ہے..... اور دکھ کی بات یہ ہے کہ آپ کے لیے اس نے خود کو بدلنے کی کوشش ضرور کرنا چاہی تھی مگر بدلی وہ اپنے لیے ہے، صرف اور صرف اپنے لیے..... تا کہ ہم اور آپ جیسے لوگ اس کی ذات کو اشتہار نہ

بنائیں۔" داؤد عالم کو سب کہہ کر زویا نے فون بند کر دیا اور داؤد عالم کتنی دیر تک ہکا بکا بیٹھا رہا تھا پتھر کی مانند۔

"وہ کون ہوتی ہے... میرے لیے انکار کرنے والی... ایسی کی تیسی..." اس نے موبائل زور سے پٹخ کر پھینکا۔ "ایک دفعہ ہاتھ لگ جائے... ایسی سزا دوں گا کہ ساری عقل ٹھکانے آ جائے گی... بے وقوف... جنگلی بلی... احمق..." کمرے میں چکر لگاتا مسلسل کڑھ رہا تھا۔

"تم صرف میری ہو ماریہ بی بی۔ میں وہ بچپن والا داؤد نہیں ہوں۔ سیدھا سادا الو سا جسے اگر تم کھینچ کر کانچ کے کمرے میں بند کر دو اور کچھ مزاحمت بھی نہ کر پاؤں۔ تمہیں تو اب میں عقل سکھا دوں گا۔" مکّا اٹھا کر دیوار پر مارتے اس نے ہونٹ بھینچے۔

* * *

وہ ممی کو انکار کر کے کچھ مطمئن سی ہو گئی تھی۔ دادی جان کی زبانی داؤد عالم کے رشتے کی منظوری سن کر سکتے میں آ گئی تھی۔ ہل جل حرکت نہ کر سکی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ممی نے اسے یہ خبر دی تھی تب سے اب تک وہ گنگ بیٹھی ہوئی تھی۔

"نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا... ایک آوارہ بدتمیز شخص ہی میرے لیے رہ گیا ہے۔ میں لاکھ سزا کی حق دار لیکن یہ سزا مجھے قطعی منظور نہیں۔ میں اپنی غلطیاں تسلیم کرتی ہوں... اپنی سب بے وقوفیوں پر نادم ہوں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایک ایسے شخص کا ساری زندگی کے لیے قبول کر لوں جو دوسروں کے ساتھ مل کر میری ذات کا اشتہار لگاتا ہے۔ لائبریری کی حرکتوں کو میں نظر انداز کر دوں گی مگر اپنے دل کا کیا کروں جس نے پہلی دفعہ اسی کے نام دھڑکنا سیکھا تھا۔ کتنا زعم تھا اس شخص کو خود پر کہ وہ مجھے خوار کرے گا لیکن نہیں... میں کیوں خوار ہوں... وہ ہوگا... وہ کون ہوتا ہے اتنا بڑا دعویٰ کرنے والا اوروں کے ساتھ مل کر میری ذات کے پرخچے اڑانے والا۔ مجھے کیوں ذہن کو ... کر دینے والا... میری اپنی نظروں میں ہی میری تذلیل کرنے والا... نہیں داؤد عالم... بالکل نہیں... غلطی میں نے ہی کی اور نازیہ کی باتوں میں آ گئی۔ میں اب بھی سوچتی ہوں کہ شاید تمہاری طرف کبھی راغب نہ ہو پاتی جو اگر یہ دونوں نہ ہوتیں... کیسے ہر وقت مجھ سے تمہارا ذکر کرتی تھیں... لائبریری میں کی جانے والی حرکتیں... ہمارے گھر آنا اور پھر اس کے بعد واقعات... کس طرح انہوں نے مجھے برین واش کیا اور میں بھی کتنی بے وقوف نکلی جو ان کی باتوں میں پھنستی چلی گئی تھی... میں احمق ہوں اور کم عقل بھی مجھے زندگی کا سلیقہ ہی نہیں تھا۔ مجھے سوائے لڑنے کے کچھ آتا ہی نہ تھا اور تب میں نے سوچا تھا کہ میں تمہارے لیے خود کو بدل لوں گی۔ محبت نے میرے دل میں جگہ بنائی تھی اور میں کتنی احمق نکلی... مجھے پتا نہیں تھا کہ وہ محبت نہیں تھی بلکہ یہ تو تذلیل تھی جو تم لوگوں کو رشتے سے انکار کر کے میں نے کی تھی۔ تم مجھ سے بدلا لینا چاہتے تھے... تم مجھے اپنی نظروں سے گرانا چاہتے تھے... تم تو ایک عام شخص کی طرح ہی میرے سامنے آئے تھے اتنی دیر تک منظر پر رہے اور پھر جب یہ منظر میرے دل پر نقش ہونے لگے تو تم نے سارے خوابوں کو اکھاڑ پھینکا۔ کاش اس رات میں نیچے نہ آتی۔ زویا کو فون پر مصروف دیکھ کر چپکے چپکے باتیں کرتے دیکھ کر میرے دل میں اس کی باتیں سننے کا خیال پیدا نہ ہوتا اور نہ ہی میں ساری گفتگو سنتی۔ نہ ہی یہ اذیت سہتی کہ تم مجھ سے محبت نہیں کرتے بلکہ میری انا کو کچلنا چاہتے ہو... میں پاگل بے عقل سی بے وقوف لڑکی تھی۔ میرے پاس سوائے انا کے اور تھا ہی کیا اور تم اسے چھیننا چاہتے تھے... نجانے تم نے یہ سب کیوں کیا؟ بس میں تو صرف یہ جانتی ہوں کہ میری ذات کی تذلیل کی گئی ہے اور یہ زویا، نازیہ... میری کوئی بہن نہیں تھی مگر یہ دونوں میری سب کچھ تھیں... لیکن انہوں نے کیا صرف ایک غیر شخص کے لیے میرا برسوں کا اعتماد ریزہ ریزہ کر دیا۔ تنکوں سے بھی حقیر ہو کر رہ گئی ہوں میں۔ ان کا جو بھی مقصد تھا لیکن مجھے تو صرف ایک بات ہی سمجھ میں آتی ہے کہ انہوں نے ایک اشارے باز شخص کی خاطر میری انا کے بدلے میری محبت، میرے جذبوں اور سب سے بڑھ کر میری ذات کی بولی لگائی ہے... کاش میں ان پر کبھی دوبارہ اعتماد کر سکوں... داؤد عالم اس سب کے

لیے میں تمہیں معاف نہیں کروں گی... میری بددعا ہے جس طرح میں روز تڑپتی ہوں، سسکتی ہوں تم بھی تڑپو... تم بھی خوار ہو... سکون کو ترس جاؤ تم... میری محبت کا مذاق اڑایا تم نے کبھی سکھی نہ رہو۔" ان چند دنوں میں اس نے اپنے آپ کو کس قدر تنہا اور اکیلا کر لیا تھا۔

"بابا کی وفات کے بعد مجھے لگتا تھا کہ میری زندگی میں کوئی خلا آ گیا ہے۔ میں ہر وقت روتی رہتی تھی اور سارے گھر والے میرے آنسوؤں سے پریشان ہو جاتے تھے۔ ان سب نے مجھے غیر معمولی توجہ دی تھی۔ پیار، محبت، اپنائیت اتنا ملا کہ میں بگڑتی چلی گئی۔ میری زندگی میں توازن ختم ہوتا چلا گیا اور میں غیر متوازن ہوتی گئی۔ پہلے کتابوں سے دل اچاٹ ہوا پھر پڑھائی... پتا نہیں پاس کیسے ہو گئی؟ امی نہ ہوتیں تو میں شاید ان پڑھ ہی رہتی... اور پھر وقت سرکتا گیا اور اس زندگی کو میں نے اپنا نصب العین بنا لیا۔ کوئی کیا کہتا ہے کس چیز میں میری بہتری ہے؟ کون مجھے سکھانا چاہتا ہے؟ میں نے دھیان دینا چھوڑ دیا تھا اور شاید اس سب میں میرا اپنا قصور تھا جس کا نتیجہ اب میں بھگت رہی ہوں... نہ ہی میری شخصیت اس قدر غیر متوازن ہوتی اور نہ ہی میری زندگی میں داؤد عالم کا نام ہوتا۔" رو رو کر برا حال ہو رہا تھا۔ جیسے کمرے میں اندھیرا پھیلا اور پھر یہ اندھیرا اس کی آنکھوں اور ذہن میں بھی چھاتا چلا گیا... اور جب ہوش آیا تو ہر کوئی پریشان چہرہ لیے اس پر جھکا ہوا تھا۔

وہ بستر پر تھی۔ اس نے بے دھیانی میں سب کو دیکھ کر نظریں ممی پر روک دیں۔

"ممی..." اس کے لبوں سے سسکاری نکلی۔

"ہاں صدقے... کیا ہوا میری چندا کو..." انہوں نے جھک کر اس کی پیشانی چوم لی۔

"ممی! مجھے شادی نہیں کرنی... نہیں کرنی... پلیز منع کر دیں... داؤد سے نہیں کرنی... کسی سے نہیں کرنی۔" وہ یک دم ہذیانی انداز میں چیخنے لگی۔ امی دادی اور وہاں موجود ہر شخص اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔

"ماریہ... ماریہ..." مگر وہ تو ہاتھوں سے پھسلتی چلی گئی۔

"ہائے میری بچی... کیا ہو گیا ہے...؟" وہ دوبارہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ نسرین بیگم کی تو اپنی حالت بگڑنے لگی۔

دوبارہ جب اسے ہوش آیا تو کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا۔ ماریہ کی نظر سب چیزوں کا جائزہ لینے لگی۔ جب پہلے ہوش آیا تھا تو وہ اپنے کمرے میں تھی مگر اب امی کے کمرے میں تھی۔ امی بستر کے دوسری طرف سو چکی تھیں۔ آہستہ آہستہ اسے یاد آتا گیا کہ وہ عصر کے قریب اپنے کمرے میں تھی جب بے ہوش ہوئی تھی اور اب اس نے گھڑی دیکھی تو رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔

"یا اللہ میرے دل کو مضبوط کر دے۔ میں یہ کیا پاگل پن کر رہی ہوں۔ مجھے استقامت بخش... مجھے میرے اپنوں کے سامنے شرمندہ نہ کرنا۔ میں پہلے ہی بہت سی حماقتیں کر چکی ہوں۔ اب سرخرو کر دے۔" بے آواز روتے ہوئے وہ صبح تک دعا مانگ رہی تھی۔

اگلے دن سب ہی اسے نارمل دیکھ کر مطمئن ہو گئے تھے۔ تاہم اس سے کسی قسم کا کوئی سوال جواب نہیں کیا گیا تھا۔ زویا اور نازیہ شرمندہ شرمندہ سی اس کے سامنے آنے سے کتراتی رہیں جب کہ نسرین بیگم اس کے اس ردعمل پر شش و پنج میں پڑ گئی تھیں کہ کیا کریں؟ ایک دن چاہا کہ کھل کر ماریہ سے بات کریں مگر رات اس کی حالت دیکھ کر دل اس طرح ڈرا ہوا تھا کہ وہ دوبارہ کوئی ذکر چھیڑ کر کسی بھی قسم کا کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتی تھیں۔ تاہم جمیل آنٹی سے زیادہ انہیں اپنی بیٹی عزیز تھی۔ داؤد ہر لحاظ سے معقول تھا لیکن ماریہ کی جگہ نہیں لے سکتا تھا۔

"ایم سوری ماریہ! یہ سب ہماری وجہ سے ہوا ہے... اگر تم ہماری بات سن لو تو تمہیں فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی پھر جو کہو گی سزا دو گی ہم بخوشی برداشت کر لیں گے لیکن پلیز ہم سے یوں منہ نہ موڑو۔" وہ اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی تھی جب نازیہ اور زویا

اس کے پاس آ گئی تھیں۔ وہ نادم تھیں، شرمندہ تھیں۔ ماریہ نے ایک گہری سانس لی۔

"میں تم لوگوں سے ناراض نہیں ہوں لیکن آئندہ تم مجھ سے کوئی ذکر نہیں کرنا۔ خاص طور پر یہ مجھے بہت تکلیف دیتا ہے۔" ان کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس نے مسکرا کر کہا تھا تو دونوں نظریں چرا گئیں۔

وہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی ہوئی تھی کہ تجلی آنٹی، اس کی بیٹی اور داماد، انکل اور...... داؤد آئے تھے۔ شاید ان کی وساطت سے سن کر آئے تھے۔ ان کو دیکھ کر اس کی بھنویں تن گئیں۔ دل تو چاہا چیخ چیخ کر ان سے کہے کہ وہ اس کے گھر سے نکل جائیں لیکن وہ برداشت کر گئی جب تک ان کے پاس بیٹھی رہی چہرہ سپاٹ ہی رہا۔

داؤد عالم گاہے بگاہے اس پر نظر ڈال لیتا تھا لیکن وہ تو دیکھنا کیا ایک نظر ڈالنا بھی قابل نفرت سمجھ رہی تھی۔ وہ اس کے تیور دیکھ کر بیزار ہو گیا۔ وہ کچھ دیر ان کے پاس بیٹھی رہی۔ بالکل چپ چاپ اور سپاٹ چہرے لیے۔ جب ضبط چھلکنے لگا تو معذرت کر کے بڑے ہی پروقار قدموں سے چلتی وہاں سے نکل آئی۔ داؤد عالم کی نگاہوں نے باہر نکلنے تک اس کا پیچھا کیا تھا۔

"کیا یہ میری بات سن پائے گی؟" وہ سوچ کر رہ گیا۔

بڑے باتوں میں مصروف تھے۔ سب ہی ٹی وی لاؤنج میں تھے سوائے اس بے وقوف کے۔ وہ جبین کے پاس سے اٹھ کر زویا اور نازیہ کے قریب چلا گیا۔

"سنو میں ماریہ سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"آئم سوری۔ ہم آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ وہ محترمہ پہلے والی لڑکی نہیں رہی۔ ...... وہ واقعی بدل گئی ہے۔ داؤد بھائی پہلے ہی اس کی طبیعت خراب ہے۔ آپ کو نہیں پتا بات ہمارے گھر قیامت آتے آتے رہ گئی تھی۔ وہ کس بری طرح ہمارے ہاتھوں سے پھسلتی چلی گئی تھی۔ وہ تو شکر ہے کہ ڈاکٹر موجود تھا فوری ٹریٹمنٹ دینے سے وہ سنبھل گئی۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اسے کسی بھی قسم کے صدمے سے دور رکھیں ورنہ اس کا دوبارہ نروس بریک ڈاؤن ہو سکتا ہے اور ہم کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتیں۔" نازیہ نے صاف انکار کر دیا تھا۔ وہ بے بسی سے دیکھتا رہ گیا۔

"پلیز! میں صرف اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ معاملہ صاف کرنا چاہتا ہوں ایک دفعہ...... پلیز صرف ایک دفعہ میں احتیاط کروں گا کوئی ایسی بات نہیں ہو گی جو اس کی طبیعت کو دوبارہ سے خراب کرنے کا سبب بنے۔" وہ انتہائی عاجزی سے کہہ رہا تھا کہ زویا کا دل پسیج گیا۔

"ٹھیک ہے ...... لیکن میرا نام نہیں آنا چاہیے۔" اٹھتے ہوئے اس نے تنبیہ بھی کی۔

وہ اسے لے کر کمرے میں گئی تو وہ وہاں نہ تھی۔ وہ اسے تلاش کرتے رہے جو گھر کی پچھلی جانب بنی سیڑھیوں پر بیٹھی ہوئی تھی۔ چاند آخری تاریخوں کا تھا۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ صرف ایک ساٹھ واٹ کا بلب تھا جس کی روشنی بہت مدھم تھی۔ وہ نجانے کیا سوچ رہی تھی۔ بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹے ہوئے تھے۔ سب سے چھپ کر وہ یہاں آ بیٹھی تھی۔ زویا اسے اشارہ کر کے وہاں سے چلی گئی۔ وہ چلتا ہوا اس کے عقب میں آ کھڑا ہوا۔

"ماریہ ......" بہت آہستگی سے پکارا گیا تھا لیکن وہ ایک دم ہڑبڑا کر سیدھی ہوئی۔

"آ...... آپ ......" اس کی آواز لڑکھڑا گئی۔

"کیسی ہو......؟" اس کے زرد چہرے کو نظروں کے حصار میں لیتے بہت محبت سے پوچھا تھا۔ جواباً وہ استہزائیہ ہنس دی۔

"کم از کم ویسی نہیں ہوں جیسا کہ آپ کو مجھے دیکھنے کی خواہش تھی۔" وہ طنزیہ کہہ رہی تھی۔

"تم خوامخواہ خود کو اذیت دے رہی ہو۔ اگر آرام سے بات سن لو...... معاملہ ٹھیک ہو جائے گا۔" داؤد عالم نے بات شروع کی تھی۔

"داؤد عالم صاحب! کیسا معاملہ؟ آپ شاید بھول رہے ہیں ...... ہمارے درمیان کبھی کوئی معاملہ طے ہی نہیں ہوا اور پھر آپ کس معاملے کی بات کر رہے ہیں؟" اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ داؤد نے لب بھینچے۔

"ماریہ! تم جانتی ہو کہ میں تمہیں پسند کرتا ہوں۔ یہ رشتہ میری پسند سے بھیجا گیا تھا ...... لیکن اس سے پہلے کے واقعات سے تم بے خبر ہو۔ میں تمہیں وہی سب کچھ بتانا چاہتا ہوں کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں...... اسی لیے میں نے......"

"پلیز داؤد صاحب! اتنے مقدس جذبے کی یوں تضحیک نہ کریں۔ آپ کیا جانیں محبت کسے کہتے ہیں ...... ؟ لائبریری کی چار دیواری میں بیٹھ کر اشارے کرنے والا شخص کیا جانے کہ جذبے کیا ہوتے ہیں ...... ؟ کسی کی تذلیل کرنے والا شخص مجھے ان لفظوں کو اپنے منہ سے نکال کر تو ہین کرنے والا نا قابل نفرت لگ رہا ہے ...... " اس کا ہر لفظ زہر میں ڈوبا ہوا تھا۔

"تم آخر میری بات کیوں نہیں سنتیں ...... ؟ پہلے اصل بات تو جان لو پھر کوئی رد عمل بھی ظاہر کرنا۔" وہ ایک دم اشتعال میں آ گیا تھا لیکن اپنے لب و لہجے پر بمشکل کنٹرول کر پایا۔

"میں کچھ نہیں سننا چاہتی ...... اور کس زعم میں آپ میرے سامنے آ کر اس طرح بات کر رہے ہیں ...... ؟ مائنڈ اٹ داؤد صاحب! میں ہمیشہ آپ کی نازیبا حرکات برداشت کی ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میرے ہی گھر میں اس طرح میری بے عزتی کریں ...... اور کس دعوے پر آپ یہاں تک چل کر آئے ہیں ...... کاش میرا حق ہے میں نے کہا تھا کہ آپ اپنا حق استعمال کریں اور میں اپنا حق استعمال کروں گی۔" وہ مضبوط لہجے میں کہہ رہی تھی اور پھر قدم اٹھا کر اس کو بالکل نظر انداز کر کے جانے کو تھی کہ اچانک داؤد عالم نے بڑھ کر اس کا بازو کھینچ کر روکنا چاہا تھا۔

"تم میری بات سے بغیر نہیں جا سکتیں ...... سمجھیں تم ......" وہ غیر متوازن اس کے بازو سے آ لگی تھی۔ ماریہ کو یوں لگا جیسے اس کے پورے بدن میں کرنٹ لگ گیا ہو۔

"چھوڑیں مجھے۔ کاش میں آپ کی اس حرکت پر آپ کا منہ نوچ سکتی۔" پھولی سانس سمیت وہ کہہ کر جھٹکے سے اپنا بازو چھڑوا کر وہاں سے بھاگ نکلی۔

"آئی ڈیم اٹ۔" اس نے جھنجھلا کر دائیں ہاتھ کا مکا بنا کر دیوار پر دے مارا۔ داؤد عالم کو اگر اس کی خراب طبیعت کا احساس نہ ہوتا تو وہ دو منٹوں میں اس کا سارا دماغ درست کر دیتا مگر اب لب بھینچ کر رہ گیا۔

* * *

امی نے اس سے انکار کی وجہ پوچھی تھی اور اس کے پاس کہنے کو بہت کچھ تھا لیکن وہ ایک لفظ بھی نہ کہہ پائی۔ بالکل خاموشی سے ان کے سامنے سے اٹھ آئی۔ اسے رہ رہ کر داؤد عالم پر غصہ آ رہا تھا۔ کس قدر زعم سے، دھڑلے سے اس سے بازپرس کر رہا تھا جیسے اس نے باقاعدہ اس کے سامنے اظہار محبت کیا ہو۔ اس سے عہد و پیمان باندھے ہوں اور اب وہ مکر رہی ہو۔ اسے بھولنے سے بھی کچھ بھول نہیں رہا تھا۔ اس نے اللہ سے اپنے حق میں سکون قلب مانگا تھا اور پھر سب کچھ اللہ پر چھوڑ کر پر سکون ہو گئی تھی۔

تجلی آنٹی کے ہاں سے ڈھیروں ساز و سامان آیا تب اسے احساس ہوا کہ امی نے ان کو ہاں کہہ دی ہے۔ وہ بوکھلا کر رہ گئی اسی دن لیے ان کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

"امی! میرے انکار کے باوجود آپ نے ان لوگوں کو ہاں کہہ دی...... میری ذرا بھی اہمیت نہیں آپ کی نظروں

ممی ۔۔۔ ؟" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ ان کا دل پسیجا مگر اگلے ہی لمحے انہوں نے دل پر پتھر رکھ لیا۔

"تم جب تک مجھے انکار کی وجہ نہیں بتاؤ گی۔ میں تمہاری بات نہیں مانوں گی..... ناحق شادی نہ کرنے کی چھوٹی سی ضد پر اتنا اچھا رشتہ ہاتھ سے گنوا دیتی۔" وہ کہہ رہی تھیں۔ وہ چند لمحے چپ چاپ انہیں دیکھتی رہی۔

"تب تو آپ کو صرف رشتہ گنوانا تھا مگر اب آپ بیٹی کو بھی گنوا دیں گی۔" ایک دم روتے ہوئے کہہ کر وہاں سے نکل آئی تھی۔ ساری رات روتی رہی۔ سب اس کے پاس آئے تھے مگر اس نے دروازہ ہی نہیں کھولا تھا۔

سب کو ہی اس کی فکر تھی مگر وہ تو جیسے کمرے میں بند ہو کر باہر نکلنا بھول گئی۔ خوب رو دھو کر ساری کسر نکالنے کے بعد کمرے سے نکلی۔

"کسی کو میرا احساس نہیں۔" وہ خود ترسی کا شکار ہونے لگی پھر نجانے ذہن میں کیا سمائی کہ فون لے کر بیٹھ گئی۔ داؤد عالم کے موبائل کا نمبر ڈائری میں درج تھا۔ اپنی سرخ ہوتی ناک کو صاف کر کے اس نے نمبر ملایا۔ بیل جا رہی تھی پھر کال ریسیو کر لی گئی تھی۔ اب اس کی آواز آ رہی تھی۔

"ہیلو" وہ کہہ رہا تھا۔

"داؤد عالم صاحب! میں نے زندگی میں آپ جیسا گھٹیا انسان نہیں دیکھا۔ حیرت ہے میری اس قدر شدید نفرت کے باوجود آپ لوگوں نے ہمارے گھر دوبارہ رشتہ بھیجنے کی ہمت کیسے کر لی؟ اور ہاں یاد رکھنا داؤد عالم..... وہ لڑکیاں ہوں گی جن سے کبھی تمہارا واسطہ پڑا ہوگا..... جو تمہیں خوار کرنے کا دعویٰ کرتے تھے اور میں کہتی ہوں میں تمہیں خوار کروں گی ..... اس قدر رسوا کروں گی کہ تم اپنے آپ سے بھی نظر نہ ملا سکو گے..... جس طرح میں بالکل تنہا ہوتی جا رہی ہوں ..... تم بھی ہوتے جاؤ گے دیکھنا ذرا۔" اس کی آواز پہچان کر ماریہ نے دل کی ساری بھڑاس نکالی اور پھر اس کی کوئی سنے بغیر ریسیور کریڈل پر رکھنے کے بجائے اسٹینڈ پر پٹخ دیا اور نئے سرے سے رونا شروع کر دیا اور پھر سے کمرے میں بند ہو گئی۔

سارا دن بغیر لباس بدلے، کچھ کھائے پیے بغیر کمبل سر تک تانے وہ لیٹی رہی۔ کتنے دنوں سے آنسو بہا رہی تھی۔ اب تو آنکھیں بھی خشک ہو گئی تھیں۔ عصر کے قریب جب کمرے کی گھٹن اور حبس سے جی گھبرانے لگا تو باتھ روم میں گھس گئی۔ نہا کر ایک سادہ سا سوٹ نکال کر زیب تن کیا اور باہر نکل آئی۔ سب نے ہی اسے دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا۔ امی، چچی، تائی، دادی جان، نور باجی، بھابیاں، بچے سب ہی خوش تھے۔ وہ بھی خاموشی سے سب میں شامل ہو گئی۔

رات کو حمزہ، زویا، نازیہ، نور باجی اور بچوں کا آؤٹنگ کا پروگرام تھا۔ سب ہی سب نے گھسیٹنا چاہا۔ اس نے منع کر دیا تو دادی جان نے ٹوک دیا۔

"چلی جاؤ بچے! طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔ اس طرح گھر میں بند رہو گی تو اور طبیعت خراب ہو گی۔" محبت سے اس کی پیشانی چومتے انہوں نے کہا تو اسے احساس ہوا کہ اس کے ساتھ تو جو کچھ بھی ہوا وہ ایک طرف..... وہ سب کے ساتھ کیا کر رہی ہے؟ ایک دفعہ پھر وہی سب غلطیاں اور بے وقوفیاں دہرا رہی ہے۔ انسان ایک دفعہ ٹھوکر کھا کر سیکھ جاتا ہے اور وہ بار بار ٹھوکر کھانے کے کام کر رہی ہے۔ اس نے اپنے آپ کو ڈانٹا۔ کپڑے تو نہ بدلے البتہ ہونٹوں پر لپ اسٹک لگا لی۔ شال لے کر جب وہ باہر آئی تو وہاں لاؤنج میں چچی، آنٹی اور انکل آئے بیٹھے تھے۔ وہ بغیر ان سے ملے سائیڈ سے ہو کر وہاں سے نکل آئی۔

آؤٹنگ کے دوران کافی ہلا گلا کیا گیا تھا۔ وہ لوگ پارک میں آئے تھے۔ بچوں کے ساتھ حمزہ خود بچہ بنا ہوا تھا پھر نور باجی بھی اس کی طبیعت کی تھیں۔ خوب لطیفے سنا سنا کر ایک دوسرے کو محظوظ کرتے رہے۔ حمزہ بچوں کو لے جھولوں کی طرف چلا گیا تو نور باجی اپنے بچے کو سنبھالتی نازیہ کے ساتھ پارک کے ایک گوشے میں مٹی کے برتن بیچنے والے آدمی کے پاس جا کر برتن دیکھنے لگیں۔ ماریہ

کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔

"آؤ ماریہ ہم بھی گھومیں۔ یہ کیا ایک ہی جگہ آ کر بیٹھ گئے ہیں۔ ذرا مزہ نہیں آ رہا۔" اس کا ہاتھ پکڑ کر وہ کہہ رہی تھی۔ ماریہ نے ہاتھ جھٹکنا مناسب نہ سمجھا۔ خاموشی سے اس کے ساتھ ہو لی وہ دونوں پارک سے گزرتے ہوئے دوسری جانب جا رہی تھیں۔ درختوں کے اندھیرے میں زویا نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ وہ تیز قدم اٹھاتی پیچھے ہٹ گئی تھی

"زویا ..." وہ واپس کیوں پلٹی تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ عقب سے کسی سے ٹکرا گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ سیدھی ہوتی۔ اس کی کلائی پر گرفت مضبوط ہو چکی تھی۔

"داؤد بھائی پلیز میں نے رسک لیا ہے۔ پلیز خیال رکھیے گا۔ کوئی ایسی حرکت نہ کیجیے گا کہ مجھے پچھتانا پڑے۔" وہ پتھر بنی اپنے اس قدر قریب کھڑے شخص کو دیکھ رہی تھی جب زویا کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔

"تو زویا نے میرے ساتھ دھوکہ کیا ہے؟" ماریہ نے سوچا۔

"پلیز ماریہ غلط مت سمجھنا۔ تم جو بھی رویہ اپنائے ہوئے تھیں۔ اس کے لیے یہ سب بہت ضروری تھا۔ تم داؤد بھائی کی بات سن لو پھر کوئی فیصلہ کرنا۔" وہ نرمی سے اسے کہہ کر تیز تیز قدم اٹھاتی نظروں سے غائب ہو گئی اور اس کے ساکن وجود میں حرکت پیدا ہوئی تھی۔

"چھوڑو مجھے۔ تمہیں ہمت کیسے ہوئی۔ یہ سب کرنے کی؟" آگے کی بجائے وہ پھنکاری تھی۔ "تو رہ بھی سے میری بات ہو چکی ہے۔ وہ حمزہ کو سنبھال لیں گی۔ تم چلو میرے ساتھ۔" اس کے سوال کے جواب میں اس نے اس کا بازو گھسیٹا۔

"چھوڑو مجھے نہیں جاؤں گی میں تمہارے ساتھ کہیں بھی۔ دھوکے سے لائے ہو تم لوگ مجھے۔" وہ چیخ رہی تھی، مزاحمت کر رہی تھی۔ لیکن داؤد عالم کے جھٹکے سے دبو دہے وہ آگے کھنچی جا رہی تھی۔

"میں شور مچا دوں گی۔ اگر تم نے میرا بازو نہ چھوڑا تو ..." وہ چیخی تھی۔ مگر ادھر کس کو کہاں تھا۔ وہ اسے لے کر پارکنگ میں کھڑی گاڑی کے پاس آیا تھا۔ لاک کھولا اور اسے اندر گھسیٹ دیا۔

"دروازہ کھولو ... داؤد عالم تم اچھا نہیں کر رہے۔ پچھتاؤ گے تم..." وہ رو دی۔ دوسری طرف آ کر بیٹھتے ہوئے اس نے اگنیشن میں چابی لگا گھمائی اور پھر اس کی طرف پلٹا جو ہاتھوں میں چہرہ دیے رو رہی تھی۔

"مگر تم اتنی جذباتی کیوں ہو ..... ؟" وہ مکمل طور پر متوجہ ہوا تھا۔ ماریہ نے تڑپ کر ہاتھ ہٹائے آنسوؤں سے بھری شاکی نظریں اس پر جما دیں۔

"تم اچھا نہیں کر رہے..... پچھتاؤ گے تم....." وہ پھر رو دی تو داؤد نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کی۔ ماریہ نے دوبارہ رونا شروع کر دیا اور پھر کافی دیر تک آنسو بہاتے رہنے کے بعد اچانک احساس ہوا تو ہاتھ ہٹا کر دیکھا۔

"تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو..... ؟" وہ خوفزدہ ہوئی تھی۔ رات کے اندھیرے میں کچھ سمجھ نہیں پائی تھی۔

"افق کے اس پار۔" دوسری طرف کافی غیر سنجیدہ جواب موصول ہوا تھا۔ اس کے آنسو پھر بہہ نکلے۔

"داؤد دیکھو اگر تم مجھے کسی ایسی ویسی جگہ پر لے گئے تو میں جان لے لوں گی اپنی بھی اور تمہاری بھی....." آنسو پھر بہہ نکلے

وہ تم پہلے ہی فدا ہو چکی ہے۔ خالی جسم کا کیا کرو گی؟" ادھر تو جیسے اثر ہی نہ تھا۔

"داؤد! میں سچ کہہ رہی ہوں۔ گاڑی روکو ورنہ میں کود جاؤں گی۔"

"دروازہ لاک ہے۔ اس لیے اگر تم یہ حماقت کرو گی بھی کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ یہ گاڑی ایک دوست کی ہے اس سے مانگ کر

لایا ہوں۔ تمہیں اگر کچھ ہو گیا تو وہ بیچارہ پھنس جائے گا۔" نہایت سکون سے جواب ملا تھا۔ ماریہ کا طیش کے مارے برا حال ہو گیا
ایکدم ہاتھ مار کر اسٹیئرنگ گھما ڈالا۔ وہ جو توقع ہی نہیں کر رہا تھا ایک دم بوکھلا گیا۔

"میں زندہ تو تمہارے ساتھ کہیں نہیں جاؤں گی۔ اب لاش ہی ملے گی تمہیں۔ بیٹھ کر ماتم کرنا روتے رہنا ساری عمر۔" وہ اس وقت مرنے یا مار دینے کا سوچے ہوئے تھی۔ وہ جو اسٹیئرنگ سے اس کے ہاتھ ہٹانے میں ناکام ہوا تھا اس نے بازو سے پکڑ کر اسے اپنے شکنجے میں لے کر دوسرے ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھالتے پاؤں بریک پر رکھ کر اس کی ساری مزاحمت بے کار کی۔

"تم واقعی ہی جنگلی ہو پوری کی پوری۔ عزت راس نہیں ہے تمہیں۔" وہ ایک دم خونخوار ہو کر اس کی طرف پلٹا تھا۔ گاڑی رک چکی تھی۔ وہ اس کے بازو کے حلقے میں تھی۔ اس کے اس طرح بولنے پر سہم کر اس کے کندھے پر سر رکھ کر رو دی۔ وہ لب بھینچے ساکت رہا۔

"کیسی آفت ہے لڑکی۔ زویا کہتی ہے یہ بدل گئی ہے مگر مجھے تو اس میں ایک چیز بھی بدلی نہیں لگ رہی۔ ویسی کی ویسی ہے۔ مرنے مارنے کو تیار۔" اس کے بالوں میں ہاتھ رکھ کر اس نے ہلکا سا دباؤ ڈالا تھا۔ وہ فوراً سیدھی ہوئی تھی پھر بغیر اس کی طرف دیکھے رخ موڑ کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ اپنی بے خبری پر اسے رہ رہ کر تاؤ آنے لگا۔ وہ اس کے حصار میں تھی۔ اس کے کندھے پر سر رکھے رو رہی تھی۔ ماریہ کو خود پر غصہ آنے لگا۔ داؤد نے مسکرا کر اسے دیکھا اور گاڑی اسٹارٹ کی۔ رات کے اندھیرے میں ہر منظر غیر واضح تھا۔ بس گاڑی تیزی سے آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ داؤد نے نظریں گھمائی۔ وہ سوں سوں کرتی انگلیاں مروڑتی دیکھنے کے قابل لگ رہی تھی۔

پھر اچانک گاڑی کو بریک لگ گئی۔ وہ چونک گئی یہ جانی پہچانی جگہ تھی۔

"سوری مادام! آ گئی ہے ہماری منزل۔ میرا ارادہ تھا کہ گاڑی میں اچھے خاصے مذاکرات ہو جائیں گے۔ خواہ مخواہ دوسرا احسان بھی لیا لیکن تمہارے تیور دیکھ کر میں تو ڈر ہی گیا تھا۔ عافیت اسی میں تھی کہ کسی پرسکون جگہ بیٹھ کر آرام سے بات کر لی جائے۔" اس کی طرف آ کر گاڑی کا دروازہ کھول کر جھکتے ہوئے اس نے ساری بات بتائی۔

"مجھے کوئی بات نہیں کرنی۔ بس مجھے واپس جانا ہے
وہ اس وقت اپنے گھر میں سے کہہ رہا تھا۔ وہ اب پہچان گئی تھی کہ وہ کہاں ہے؟

"تو میڈم! جب تک ساری بات کلیئر نہیں ہو گی آپ یہاں سے ہلیں گی بھی نہیں... چلو آؤ۔" اس نے دوبارہ کہا تھا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی تو داؤد نے اس کا بازو پکڑ کر باہر کھینچا۔

"تم کیوں چاہتی ہو کہ میں تمہیں بار بار چھوؤں......" وہ کہہ رہا تھا وہ فوراً گاڑی سے اتر گئی۔

"شٹ اپ۔ تم مجھ سے اس طرح کی بات مت کرو۔ نہیں جانا مجھے تمہارے گھر سمجھے تم؟" اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کرتے وہ چیخی بھی تھی لیکن داؤد نے دروازہ لاک کر کے گیٹ کے پاس جا کر لاک کھولا اور پھر اسے اسی پکڑے اندر کی طرف بڑھتا چلا گیا تھا۔

ڈرائنگ روم میں لا کر اس نے اس کا بازو چھوڑ دیا تھا اور پھر اس نے آگے بڑھ کر تمام لائٹس آن کی تھیں۔ کمرہ روشنی میں نہا گیا۔

"بیٹھو۔" وہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ روشنی میں اس کے چہرے کے خدوخال واضح ہو رہے تھے۔ رونے سے چہرہ کافی سرخ ہو چکا تھا اور ناک دہکتا انگارہ بنی ہوئی تھی۔

"کیا پیو گی... بلکہ یہ بتاؤ کیا خدمت کروں میں تمہاری؟" وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ داؤد نے صلح جو انداز میں پوچھا تو وہ

بلکہ پھاڑ کھانے والی نظروں سے دیکھنے لگی۔

"زہر......" "اندر بھی زہر بھرا تھا۔ وہ کھل کر مسکرایا۔

"زہر کیوں... بلکہ اپنی محبت کا امرت گھول کر پلاؤں گا بشرطیکہ تم آرام سے بیٹھ جاؤ۔" وہ اس کی اس بات پر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ وہ مسکراتا چلا گیا تھا۔ واپس لوٹا تو ہاتھ میں ٹرے تھی جس میں کھانے پینے کی چیزیں تھیں اور کولڈ ڈرنکس کے گلاس تھے "اپنے گھر میں تو تم نے منہ پھٹ انداز میں مہمان داری کرنے سے انکار کر دیا تھا مگر میں ایسا نہیں ہوں۔ کھاؤ یہ سب اور میری امی کے ذائقے کی داد دو۔ بلکہ یہ سب سیکھنے کی کوشش بھی کرنا۔ مجھے یہ سب بہت پسند ہے۔" ٹرے ٹیبل پر رکھتے ہوئے اس کی زبان مسلسل چل رہی تھی۔ وہ ناگواری سے دیکھنے لگی۔ کئی لوازمات تھے اس نے دوبارہ نظر نہ ڈالی۔

"میں یہاں یہ سب اڑانے نہیں آئی تھی۔ تمہیں جو کہنا ہے وہ کہو تا کہ میں اپنے گھر جا سکوں۔" اس کے انداز میں ذرا بھر بھی رعایت نہیں آئی تھی۔

"تم بیٹھو تو سہی۔ تھانیداروں کی طرح کھڑی مجھے گھورے جا رہی ہو۔" وہ ہنس رہا تھا۔ وہ خاموشی سے بیٹھ گئی۔ جانتی کہ جب تک وہ اپنی منوا نہ لے جانے نہیں دے گا۔ تاہم اس نے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔ "میں نہیں کہتا کہ یہ ایک بڑی لمبی چوڑی داستان ہے لیکن یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ یہ یکطرفہ محبت نہیں تھی۔ یہ تب کی بات ہے جب میں امی کے ساتھ تم لوگوں کے گھر آتا تھا۔ تم اچھی تھی اور مجھے تمہاری شرارتیں اچھی دلچسپ لگا کرتی تھیں لیکن مجھے تم جس طرح ہرٹ کیا کرتی تھیں تو مجھے تم پر غصہ بھی آتا تھا۔ یہاں سے جانے کے بعد مجھے تم لوگوں کی خیریت ملتی رہی اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہ تم کیسی ہو اب تم کیا کر رہی ہو۔ رفتہ رفتہ میرا ذہن ایک واضح امیج بنا چکا تھا کہ تم ایسی ہو سکتی ہو یا ویسی؟ پھر ان دنوں جب جبین باجی کی شادی تھی تو امی تم لوگوں کے ہاں آئی تھیں۔ واپسی پر وہ کچھ تصاویر ساتھ لے کر گئی تھیں۔ ان تصاویر میں ہنستی مسکراتی لڑکی مجھے بہت اچھی لگی تھی۔ امی اور جبین جس طرح خصوصی طور پر تمہارا ذکر کرتی تھیں وہ وہ دیکھنے کا تجسس پیدا ہو گیا لیکن میری مصروفیت ایسی تھیں کہ میں کبھی یہاں نہ آ سکا۔ یہاں جب امی اور ابو دوبارہ سیٹل ہوئے تو انہوں نے مجھے فون کر کے تمہارے متعلق بات کی تھی اور میں ایک دم سنجیدہ ہو کر سوچنے لگا تھا لیکن حنا جو ان دنوں یہاں امی ابو سے ملنے آئی ہوئی تھی اس نے مجھے فون پر تمہارے متعلق تفصیل بتایا تھا کہ تم کس قسم کی لڑکی ہو؟ کیسی ہو؟ ذمہ دار ہو کہ نہیں؟ تعلیم کے متعلق تمہارے کیا نظریات ہیں اور گھر داری میں تمہارا کیا رول ہے؟ یقین کرو ماریہ جب مجھے ہر معاملے میں تمہاری صفر کارکردگی کا جب علم ہوا مجھے دکھ ہوا تھا۔" وہ کوک لے کر اس کے سامنے والے صوفے پر آ بیٹھا تھا۔ وہ جو اس کی طرف سے چہرا موڑے ایک ایک لفظ بغور سن رہی تھی۔ اور حیران ہو رہی تھی سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔ بظاہر اسے دیکھنا چاہیے تھا لیکن وہ صرف سن رہی تھی۔

"میں اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا ہوں اور لاشعوری طور پر امی کی خواہش ایسی بہو کی ہے جو ان کے ساتھ ساتھ اس گھر کی بھی پوری ذمہ داری اٹھائے جب تم یہ نہیں کر سکتی تھیں اور میں صرف پسند کی بنیاد پر اتنا بڑا رسک بھی نہیں لے سکتا تھا۔ اگر میں امی کی اس بات کو درست بھی مان لیتا کہ تم یہاں آ کر سیکھ لوگی تو تمہیں بہت ٹائم لگتا جب کہ میں اپنے گھر کے معاملے میں بہت حساس ہوں اور شاید تم سے شادی کر کے پچھتاتا بھی۔ اسی لیے میں کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ مجھے امی کو انکار کرنا چاہیے یا پھر اقرار......؟" ماریہ جو صرف اسے دیکھ رہی تھی اس کی بات پر ہونٹ بھینچ کر سر جھکا گئی۔ داؤد نے اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹرے میں پڑا گلاس اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔

"تم ساتھ ساتھ یہ لو..... ورنہ یہ گرم ہو جائے گا۔" ماریہ نے خاموشی سے گلاس لے لیا تھا۔ وہ بھی اپنا گلاس لے دوبارہ صوفے پر جا بیٹھا۔

"میں اسی کشمکش میں تھا کہ مجھے آنا پڑا۔ میں اپنے گھر سے جدا ہو کبھی نہیں رہا اور وہاں مجھے اسے ماتجا رہنا پڑ رہا تھا اس لیے میری کوشش تھی کہ میرا تبادلہ یہاں ہو جائے تا کہ وہاں کی پریشانی ختم ہو ایک دن نسرین آنٹی ہمارے ہاں آئیں۔ وہ امی سے

تمہاری نالائقیوں اور بے وقوفیوں کا ذکر کر رہی تھیں۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ امی صرف اور صرف نسرین آنٹی کی محبت میں باتیں کر رہی
دارو غفاری ہیں جب کہ میں ایسا نہیں چاہتا تھا اور اتفاق سے ان کو واپسی پر لینے کے لیے زویا، نازیہ اور زیب بھائی آئے تھے۔
نسرین آنٹی کو ہمارے گھر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ واپسی پر لینے آئے تو میری نازیہ اور زویا سے ملاقات ہوئی تو مجھے وہ دونوں اچھی
لگیں۔ وہ زیادہ تر تمہاری ہی باتیں کرتی رہیں اور میں خاموشی سے سنتا رہا اور پھر میں واپس چلا گیا۔ وہاں جا کر مسلسل سوچتے سوچتے یہ
بات ذہن میں آئی کہ تم اتنی بری بھی نہیں ہو۔ اچھی عادت کی مالک ہو۔ بس گھرداری اور تعلیم کی طرف سے غفلت برت رہی ہو۔ اس
میں اپنے لیے تمہارے اندر یہ احساس پیدا کروں تو کہ تم اپنے آپ کو بدل لو۔ کیا ہی اچھا ہوا اس خیال کا آنا تھا کہ میں ایک دم پرجوش ہو
گیا اور پھر تمہارے گھر فون کیا تھا۔ فون نازیہ نے اٹھایا تھا۔ ہلکی پھلکی بات چیت کے بعد میں نے اندازہ لگایا کہ وہ میرا ساتھ دے گی
یا نہیں؟ زویا اور نازیہ دونوں مجھے قابل اعتبار لگیں اور پھر میں یہاں مستقل آ گیا۔ یہاں آنے کے بعد میں حنا کے ذریعے نازیہ
زویا سے ملتا رہا اور انہیں اپنے ساتھ ملانے کو کہا تھا۔ پہلے تو وہ نہ مانیں۔ ان کا خیال تھا کہ تم دوسری شادی کے چکر میں نہیں آ سکتیں اور
دوسرا تم کبھی کسی بدھو کی... میرے نظریات درست کرتے کہ اللہ تعالیٰ نے عورت کی فطرت میں اتنی لچک ضرور رکھی ہے کہ وہ خود کو
حالات کے دھارے میں موڑ سکے۔ تم بھی تو ایک لڑکی ہی ہو اور جس رخ سے میں تمہاری ذات میں انوالو ہونا چاہتا تھا وہ میرے لیے
مشکل نہ تھا۔ بس ضروری یہ تھا کہ تم ناراض نہ ہو اور نہ ہی میں کچھ غلط کروں پھر اس کے بعد لائبریری آنا روز تمہیں اسمائل پاس کرنا
سلام جھاڑ دینا تو صرف تمہیں اپنی طرف متوجہ کرنا تھا۔ نازیہ اور زویا مجھے اچھی طرح جانتی تھیں۔ وہ تمہارے غصے سے بھی باخبر تھیں اور
بے ماریہ تمہیں ٹھنڈا کر دیتی تھی۔ اس طرح یہ سب ہوتا چلا گیا۔

وہ ہولے ہولے سب ... کافی پشیمان تھی۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اب کیا کرے؟ گلاس خالی کر کے خود
ٹیبل پر رکھ دیا۔

"کافی دیر ہو گئی ہے۔ مجھے اب چلنا ہوگا۔" اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے ماریہ نے سوچا۔

"ماریہ! تم یقین کرو۔ اس سب ڈرامے کا مقصد نہ ہی تمہاری ذات کو نقصان پہنچانا تھا اور نہ ہی تمہاری توقیر کم کرنا تھا۔
میں نے امی کو کچھ نہیں بتایا۔ وہ تو خوش ہے کہ میں تمہارے ساتھ شادی کے لیے رضامند تب ہوا جب یہ جان لیا کہ اب تم اس موڑ پہ
کہ میں جس طرح چاہوں تمہیں اپنی خواہش کے مطابق ڈھال سکتا ہوں۔ محبت دنیا کی سب سے خوبصورت اچھائی ہے۔ تمہیں اپنی
طرف انوالو کر کے میرا مقصد تمہاری انا ختم کرنا نہیں تھا۔ میرا صرف یہ خیال تھا تم اپنے اندر اتنی لچک پیدا کر لو کہ جب میں شادی کر کے
تمہیں اپنے گھر لاؤں تو تمہیں اس گھر کی ذمہ داری نبھانے میں کوئی اعتراض نہ ہو۔ دنیا کی ہر لڑکی سیکھ جاتی ہے یہ کام۔ ہماری حنا بھی
بالکل تمہارے جیسی تھی لیکن امی نے اس کی شادی فوراً کر دی تھی۔ گھر کی ذمہ داریوں میں پڑ کر وہ اپنا سارا بچپنا بھول گئی اور مجھے
تمہارے متعلق جو کچھ بھی علم ہوا اس سے صرف ایک ہی نتیجہ نکلا تھا کہ تم حنا کی طرح سمجھو گی نہیں بلکہ سمجھاؤ گی۔ وہ بھی اپنے طور پر
آ کر اور مجھے صرف ایک ایسی عورت چاہیے تھی جو نہ صرف مجھے پسند ہو بلکہ اس میں تمام خوبیاں بھی ہوں۔ تم ایسی تھیں نہیں مگر
تمہارے اندر اس خامی کے متعلق احساس تو اجاگر کر سکتا تھا اور میں نے صرف یہی کیا اور یہی میرا مقصد تھا۔" وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔
ماریہ کو لگا جیسے وہ ایک دم فیصلے کی دہلیز پر آ کھڑی ہوئی ہے۔

"ایم سوری۔ سب کہتے ہیں میں جذباتی ہوں۔ میں واقعی بہت جذباتی ہوں۔ مجھے جب فون پر آپ اور زویا کی گفتگو کا
علم ہوا تو مجھے صرف یہی محسوس ہوا کہ ایک غیر آدمی صرف میری ذات کے پرخچے اڑانا چاہتا ہے۔ میرے جذبات کو غلط روش پر ڈال
کر صرف مجھے پامال کرنا چاہتا ہے..... ایم سوری" وہ انگلیاں چٹخاتے واقعی ہی شرمندہ تھی۔ "ایسے میں میرا ردعمل کچھ غلط نہ تھا۔ میری
زندگی بالکل ویسے ہی گزری ہے جیسی ابھی آپ نے ابھی ذکر بھی کیا ہے۔ میں بہت غیر ذمہ دار اور نالائق قسم کی لڑکی واقعی ہوں

واقع زویا اور نازیہ کی باتوں سے میرے اندر یہ احساس پیدا ہونے لگا کہ میں ان کی طرح نارمل انداز میں زندگی کو نہیں لے رہی اور پھر
آپ کا بھی خیال رہتا تھا اور واقعی میں اس طرح کی لڑکی نہ تھی لیکن زویا اور نازیہ کی ہر وقت کی جانے والی برین واشنگ نے ہی میرے
اندر آپ کا احساس جگایا تھا۔ ان کی ہر وقت باتوں، چھیڑ چھاڑ، ہنسی مذاق نے ہی مجھے آپ کی طرف متوجہ کیا تھا ورنہ شاید میں زندگی
کے عام سے نارمل امور کی طرح اس قسم کے جذبات سے بھی نابلد رہتی۔ ...اور جو کچھ کے بعد ہوا بحیثیت لڑکی غلط نہ تھا۔ کم از کم آپ کو
مجھے سب بتانا چاہیے تھا۔ آپ نہیں تو زویا اور نازیہ تھیں ناں مگر انہوں نے آپ سے وعدہ نبھایا میرا خیال نہ کیا یہی اصل دکھ تھا جس کی
وجہ سے میں اتنی جذباتی ہوتی چلی گئی تھی۔" نظریں اپنے ہاتھوں پر جمائے وہ ناخن کھرچنے لگی۔

"چلیں جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔ اب کیا ارادہ ہے؟" وہ مسکرا کر پوچھ رہا تھا۔ وہ اس کی بات کا مطلب سمجھ کر جھینپ گئی۔

"میں نے اب سوچ لیا تھا میں بھی زویا اور نازیہ کی طرح گھر پر توجہ دوں گی۔ یہ ایک عورت کے لیے بہت ضروری ہے کہ
سب سیکھے۔ میں نالائق ضرور ہوں بیوقوف نہیں۔ ان چند دنوں میں مجھے بہت اچھی طرح اندازہ ہو گیا ہے۔" اس کی بات ٹالنے پر اس
نے اسے گھور کر دیکھا۔

"یہ تو میں جانتا ہوں کہ تم اب سیریس ہو ہی جاؤ گی۔ انسان کو صرف ایک جھٹکا ہی کافی ہوتا ہے۔ میں اپنی بات کر رہا ہوں۔
میرے گناہ معاف کیے جانے کے قابل ہیں کہ نہیں..." وہ اپنے موڈ میں واپس لوٹ چکا تھا۔ ماریہ کو امید نہ تھی کہ وہ پھر سے راست
اصل بات کی طرف آ جائے گا۔ اب بری پھنسی تھی۔

"آپ نے مجھے اتنی تکلیف دی کہ میں آپ کو اتنی جلدی معاف کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ لائبریری سے لے کر اب
تک ایک ایک حرکت قابل گرفت ہے۔" اس نے آرام سے کہا۔

"کیا...؟" وہ چیخا۔ "تم ہوش میں تو ہو لڑکی۔"

"بالکل۔" ماریہ پر کوئی اثر نہ تھا۔ وہ تاسف بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔

"زیادہ خوش فہم ہونے کی ضرورت نہیں۔ بی اے تو تمہیں کرنا ہی ہے۔ بلکہ اس کے بعد بھی میں چاہوں گا کہ تم
پڑھو۔" اس نے پڑھائی کا ڈراوا دیا تھا۔ وہ ہنس دی۔

"کروں گی...... بلکہ میرا ارادہ ہے کہ کم از کم امی کی طرح ایم اے تو ضرور کروں گی۔ یہ کیا اتنی لائق فائق تعلیم یافتہ
ماں کی بیٹی ایف اے پاس اچھی لگتی ہے کیا... بلکہ پہلے اپنی تعلیم مکمل کروں گی پھر امی کی طرح ٹیچنگ کروں گی اور پھر اس کے بعد
....." وہ شرارت سے کہہ رہی تھی۔ اس سے پہلے اس کا پروگرام لمبا ہوتا داؤد نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

"بس زیادہ پھیلنے کی ضرورت نہیں۔ میں صرف بی اے تک انتظار کر سکتا ہوں۔ عورت کے لیے اصل چیز اس کا گھر
ہونا چاہیے۔ بی اے کر وقت کی ضرورت ہے۔ باقی رہنے دو...... بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ سب سیٹ ہوتا جائے گا...... اگر مجھے
محسوس ہوا کہ تمہیں تعلیم کی ضرورت ہے تو میں خود تمہاری مدد کروں گا لیکن ابھی نہیں۔"

"اچھا جی۔" وہ ہنس دی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے کوئی تگڑا سا جواب دیتا اس کا موبائل بج اٹھا۔ اس نے جھنجھلا کر
اسکرین دیکھا۔ موبائل کی یہ مداخلت اسے بہت گراں گزری اس وقت۔ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر ماریہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی تھی۔

"تمہیں تو میں ابھی دیکھتا ہوں۔ پہلے اس رقیب روسیاہ سے نمٹ لوں۔" وہ جھینپ گئی تو وہ موبائل سننے لگا۔

"داؤد بھائی بڑی بری بات ہے۔ مجھے گھر سے جوتے پڑوانے کا ارادہ ہے کیا... آپ ایک گھنٹہ کہہ کر آئے تھے اب
ڈھائی گھنٹے ہو رہے ہیں۔ خدارا کچھ تو احساس کریں۔ گھر سے آپ کے والدین رخصت ہو چکے ہیں اور آپ ہیں کہ...... جہاں کہیں
بھی ہیں فوراً پہنچیں۔" دوسری طرف زویا تھی جو حمزہ کے موبائل سے کال کر رہی تھی۔ داؤد نے ایک گہری سانس لی۔

"اگر میں نہ آؤں تو......" اپنے سامنے کھڑی ماریہ پر ایک گہری نگاہ ڈال کر کہا۔

"ارے یہ حوصلوں کے علم اتنے بلند کیسے ہو گئے...... محترم بھائی صاحب! لگتا ہے کہ مذاکرات کافی کامیاب رہے ہیں۔" زویا داؤد کے لہجے کی کھنک محسوس کر کے کہہ رہی تھی۔ وہ ایک دم قہقہہ لگا گیا۔

"بہت زیادہ۔ میرا تو دل چاہ رہا ہے ابھی اسی وقت کسی قاضی وغیرہ کا انتظام کروں۔" ماریہ کے قریب آ کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اس نے کہا۔ موبائل آف کر کے جیب میں ڈالتے ہوئے وہ ماریہ کی طرف خفیف سا جھکا۔

"اور آپ کیا فرماتی ہیں مادام...... ؟ سیدھے قاضی کے پاس نہ چلے چلیں۔ ایمان سے یہ دل بڑا بے ایمان ہو رہا ہے اس وقت۔" دل پر ہاتھ رکھ کر وہ خاص فدویانہ انداز میں کہہ رہا تھا۔ ماریہ فوراً پیچھے ہٹ گئی۔

"نہ...... نہ...... نہیں...... گھر...... گھر چلیں...... بہت دیر ہو رہی ہے۔" اس جیسی پر اعتماد لڑکی کنفیوز ہو گئی تھی۔ وہ اسے دیکھے گیا تھا۔ وہ مزید خود میں سمٹ گئی تھی۔

"آہا...... یہ دل بھی کیا چیز ہے...... اچھے بھلے ہوش مند شخص کو بھی پاگل کر دیتا ہے۔" وہ گنگنا کر پوچھ رہا تھا۔ ماریہ ہنس دی تھی۔

"ڈونٹ ڈو پلیز" اس کی آنکھوں میں شرارت سے چمکنے لگے۔ وہ مسکرایا۔

"تم بھی نا...... اچھا پھر گھومنے کرو دونوں۔" ٹھیک ہے چلتے ہیں۔ کل اچھی طرح ڈریس اپ ہونا۔ میں تم کو اگر تمہارے گھر والوں نے اجازت دی تو ایک اچھا سا ڈنر بھی باہر کریں گے۔" وہ منصوبہ بنا رہا تھا اور ماریہ نے مسکراتے ہوئے اسے جھلملاتی آنکھوں سے دیکھا۔

یہ میری قسمت کا درخشاں ستارہ تھا۔ شکر ہے اسے اپنی نالائقیوں سے اسے کھو نہیں دیا۔ وہ نہ جانے اور بھی کیا کہہ رہا تھا تو بس اسے دیکھ رہی تھی۔ صرف اپنی قسمت کے درخشاں ستارے کو محسوس کر رہی تھی۔

"یا اللہ تیرا شکریہ ہے۔" وہ دل ہی دل میں اللہ کا شکر بجا لائی کہ یہ خالص نایاب موتی اس کی متاع تھی۔

مسافر لوٹ آئے ہیں

اس نے آٹھ برس بعد اپنی سرزمین پر قدم رکھا تھا۔ پورے آٹھ سال بعد جہاں سے نکلتے ہوئے اس نے سوچا تھا کہ وہ یہاں کبھی بھی پلٹ کر نہیں آئے گا مگر ایک عرصے بعد وہ پھر پلٹ آیا تھا اسی شہر بےداد میں۔ جہاں اس کا وجود رگ رگ زخمی ہوا تھا۔ روح میں کئی گہرے زخم لگے تھے۔ گھاؤ ایسے تھے کہ آٹھ سال کا طویل دورانیہ اور تنہائی بھی انہیں مندمل نہ کر سکی تھی۔

اسی زمین میں جہاں وہ نامہرباں وجود رہتا تھا۔ جس نے اس کے وجود سے جان کھینچ لینے کی بھی کوشش کی تھی۔ اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی مانگ لی تھی۔ اور وہ تھا کہ صرف اور صرف اس کی خواہش کا احترام کرتے، اس کی خوشیوں کی خاطر اپنے دل کی پروا کیے بغیر اس کی عمر بھر کی تنہائی اور ہجر سے پٹی عمر بھر کی قید اپنے حصے میں لکھوا لی تھی۔ صرف اور صرف اس کے جذبوں کا احترام کرتے اور اب اگر وہ پلٹا بھی تھا تو صرف اور صرف اس کی خاطر، ایک دفعہ پھر اپنی روح، جسم کو اذیت کے گہرے سمندر میں دھکیلنے کی خاطر اپنے وعدے کی پاسداری کی خاطر جو اس نے اس سے کیا تھا۔ اب کس چاہتا تھا کہ آگے کن حالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اپنے وعدے کو نبھانے چلا آیا تھا۔ جب محبت کی ہے تو پھر سود و زیاں کا حساب بےکار رہتا ہے۔ یہ حقیقت بہت پہلے اس نے جان لی تھی۔

ٹیکسی سے اتر کر کرایہ ادا کر کے اس نے اپنے اطراف کو دیکھا۔ یہ وہی گاؤں تھا جہاں وہ بڑے فخر، غرور و شان کے ساتھ بھی چلتا تھا۔ اور اب یہ وہی علاقہ تھا جو اس نے گزشتہ آٹھ سال سے اپنے لیے شجر ممنوعہ کی طرح بنا رکھا تھا۔ بہت کچھ بدلا تھا۔ مگر سامنے نظر آنے والی حویلی اسی شان و شوکت کے ساتھ اپنی جگہ پر کھڑی تھی جیسا کہ وہ آٹھ سال پہلے چھوڑ کر گیا تھا۔

گیٹ پر دستک دیتے ہوئے اسے چاچا جانی اور بی بی جان کا خیال آ رہا تھا۔ اسے یوں اپنے سامنے دیکھ کر نہ جانے ان کی کیا کیفیت ہو۔ وہ کچھ بھی اندازہ نہیں کر پا رہا تھا۔

"جی صاحب...... کس سے ملنا ہے؟" ایک نوجوان سا لڑکا پوچھ رہا تھا۔ بلکہ سر سے پاؤں تک جائزہ بھی لے ڈالا تھا۔ سالک نے اپنا بیگ زمین پر رکھا۔

"مجھے قمر الزمان صاحب سے ملنا ہے۔ بہت دور سے آیا ہوں۔"

"جی مگر وہ اس وقت کسی سے نہیں ملتے۔ اگر آپ نام بتا دیں تو سہولت رہے گی۔ ورنہ آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔" ملازم نے ادب سے بتایا تھا شاید وہ اس کے حلیے سے متاثر ہوا تھا۔

"میں ان کا بھتیجا سالک ہوں۔ انیس الزمان کا بیٹا۔" اس نے اپنا حوالہ دیا تھا۔ ملازم کی آنکھوں میں ایک دم حیرت سمٹ آئی تھی۔ بغور دیکھا تھا پھر بوکھلا گیا۔

"سلام سرکار...... معاف کیجئے۔ مجھے علم نہیں، نیا آیا ہوں نا...... مگر بڑے سرکار سے اکثر آپ کا نام سنا ہے۔ آپ

چھوٹی بی بی کے شوہر ہیں نا۔۔۔" وہ فوراً احترام بجا لایا تھا۔ زمین پر پڑا اس کا بیگ اٹھا لیا تھا۔ پہلے ہی موڑ پر اسے چھوٹی بی بی کا حوالہ بہت ناگوار گزرا تھا۔

"آئیں۔۔۔ سرکار۔۔۔ آئیں۔۔۔" وہ اندر بڑھ گیا تھا۔ ملازم پیچھے پیچھے چلنے لگا تھا۔ یہ وسیع و عریض آسائشات کی حامل کوٹھی اندر سے بھی ویسی ہی تھی جیسی وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ اندر آنے کے بعد سب سے پہلے اس کا سامنا سراج بابا سے ہوا تھا۔

"سالک بیٹا۔۔۔!" بابا اپنی جگہ ساکن ہو گئے تھے۔

"السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔۔۔ تم سالک ہو نا۔۔۔ واقعی میری آنکھیں سچ دیکھ رہی ہیں نا۔۔۔ یہ تم ہی ہو نا۔۔۔" بابا اسے برسوں بعد سامنے دیکھ کر بدحواس سے ہو گئے تھے۔ وہ مسکرا دیا۔

"یہ میں ہی ہوں بابا۔ سالک۔۔۔ بدنصیب۔۔۔" آخری لفظ اس نے اس قدر آہستگی سے کہا تھا کہ بابا کو سنائی نہیں دیا تھا۔ وہ بس خوش تھے اسے اپنے سامنے دیکھ کر۔

"میں بڑے سرکار کو بتاتا ہوں۔" بابا سراج فوراً اندر بڑھ گئے تھے۔ وہ بھی ان کے پیچھے ہی قدم بڑھانے لگا تھا۔

"کیا کہہ رہے ہو تم۔۔۔ سالک آیا ہے۔۔۔ سالک۔۔۔" سراج بابا کی طرح چاچا جانی بھی ششدر تھے۔ وہ دروازے پر ہی رک گیا۔

"چاچا جانی۔۔۔" اس کے ہونٹ ہلے تھے۔ وہ دروازے پر ہی رک گیا۔

پھر آگے بڑھ آئے تھے۔ دونوں بازوؤں میں سمیٹ لیا تھا۔

"سالک۔۔۔ بیٹا۔۔۔ میری جان، تو کہاں تھا؟ اتنے برسوں تڑپایا ہمیں، ہم ترس گئے تھے تمہاری صورت کو۔۔۔ تمہارے وجود کو، کوئی یوں بھی کرتا ہے۔ مانا ہم نے جبر کیا تھا مگر تم نے بھی تو حد کر دی۔ سالوں کی دوری حائل کر دی اپنے اور ہمارے درمیان کچھ نہ سوچا۔۔۔ ہم کیسے جئیں گے، کیسے رہیں گے۔" وہ روتے جا رہے تھے۔ وہ بس ان کے سینے سے لگا اپنی اور ان کی برسوں کی پیاس بجھا رہا تھا۔ وہ بھی مرا تھا، ان کے بغیر ایک ایک پل جان کنی کے عمل سے گزر رہا تھا۔ کیسے بتا دیتا یہ سزا تو مقدر میں تھی اور نجانے کب تک رہے جو خود اس کی اپنی منتخب کردہ تھی۔

"کہاں تھا تو۔۔۔؟ نیویارک میں تو نہیں تھا، پھر کہاں چلا گیا تھا۔۔۔" وہ پوچھ رہے تھے۔ سراج بابا اپنی آنکھیں صاف کرتے باہر نکل گئے تھے۔ وہ چاچو کو دیکھنے لگا۔ کتنے نڈھال اور ضعیف ہو گئے تھے وہ۔ پہلے والا دم خم نہیں رہا تھا۔ اس نے انہیں بستر پر بٹھایا۔

"میں یہاں سے جانے کے صرف ایک دو ماہ بعد ہی نیویارک سے واشنگٹن شفٹ ہو گیا تھا اور پھر وہاں سے انگلینڈ اور انگلینڈ سے جرمنی چلا گیا تھا۔" سہولت سے بیٹھ کر بتانے لگا تھا۔

"اور اتنے برسوں میں ایک دفعہ بھی خیال نہ آیا کہ یہاں ہم پر کیا گزری؟ تمہارا یوں لاپتا ہو جانا ہمیں کس درد سے دوچار کر گیا تھا۔ تمہاری ماں کیسے کیسے نہیں روئی۔۔۔ تمہاری چچی، اور اسوہ نے تمہیں کتنا یاد کیا ہے۔" وہ ابھی بھی غمزدہ تھے۔ وہ سر جھکائے بیٹھا رہا۔ اس دوران سراج بابا ٹرالی سجائے اندر داخل ہوئے تو وہ حیران ہوا۔ اس کے خیال میں اس کی آمد کی خبر سراج بابا نے تقریباً سب کو دے دی ہوگی مگر کوئی بھی نہیں آیا تھا خاص طور پر بی بی جان اور چاچی۔

"بی بی جان اور چاچی جان کہاں ہیں؟" اس نے پوچھا تھا۔ اسوہ کا نام لینے میں احتیاط ہی برتی۔

"ہماری برادری میں ایک شادی ہے، اسوہ اور وہ دونوں وہیں گئی ہیں۔ میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی گھر پر ہی رہ گیا تھا۔" اس

نے سر ہلایا۔

"سالک بیٹے فریش ہو لو۔۔۔ پھر کچھ کھا پی لو۔" سراج بابا نے کہا تو وہ سر ہلا کر اٹھ گیا۔ چاچو کے روم میں ہی اس نے منہ ہاتھ دھویا تھا۔ ملازم اس کا بیگ بھی یہیں رکھ گیا تھا۔ کپڑے نکال کر بدلے اور پھر چاچا جانی کے ساتھ ہی کھانے لگا۔ کھانے کے دوران وہ اس سے گزرے ماہ و سال کے متعلق ہی پوچھتے رہے تھے۔ وہ اپنی طرف سے ان کو تسلی بخش جواب دیتا رہا تھا۔

"تم آرام کرو۔۔۔ نیویارک سے پاکستان کی فلائٹ بہت تھکن زدہ کر دیتی ہے۔ اوپر سے یہاں گاؤں میں آنا۔" وہ کافی تھک چکا تھا اور چاچو نے اس کے چہرے سے اندازہ بھی لگا لیا۔ سوائے نصیحت کرتے کمرے سے نکل گئے تھے۔ وہ ان کے بیڈ پر ہی لیٹ گیا۔ جرمنی سے وہ تین دن پہلے ہی نیویارک پہنچا تھا۔ کامران کے فون کی وجہ سے کہ اتنے سالوں بعد اس کے گاؤں سے اس کے نام کوئی خط آیا ہے۔ شروع کے دو سالوں تک تو خوب رابطہ ہوا تھا اسے ہر جگہ تلاش کرنے کی کوشش کی گئی تھی، خاص طور پر کامران بیچارہ اس سلسلے میں کافی پریشان بھی رہا تھا مگر پھر رفتہ رفتہ اس کی تلاش کی کوششیں سرد پڑ گئی تھیں۔ برسوں بعد اس کے نام کوئی خط آیا تھا۔ وہ خود بھی حیران تھا۔ اس کا پتا یا موبائل نمبر کا صرف کامران کو علم تھا سو وہ پہلے نیویارک پہنچا تھا۔ خط اسوہ کی جانب سے ہی لکھا گیا تھا۔ آٹھ سال پہلے کیے گئے وعدے کی یاد دہانی کرائی گئی تھی مگر وہ بھی اس شرط پر کہ وہ روبرو آ کر کوئی فیصلہ کرے۔ چاہتا تو کبھی وعدہ نبھاتا اس کی خواہش کے احترام میں وہیں بیٹھے بیٹھے آدھا وعدہ پورا کر دیتا اور اس کی خواہش پوری کر دیتا مگر اس کی شرط بھی وہ ٹال نہیں سکتا تھا۔ جب بچھڑنا طے ہے تو پھر ایک دفعہ روبرو ہونے میں کیا حرج ہے؟ شاید وہ اسے آخری دفعہ دیکھنا چاہتا تھا۔ اور اس کا لکھا خط بھی کیا تھا صرف چند الفاظ تھے۔

"سالک!

میں آپ کے فیصلے کی منتظر ہوں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ آپ اپنا وعدہ نبھائیں مگر ایک شرط ہے سب کچھ روبرو طے ہو۔

اسوہ"

اور یہ چند الفاظ اس کی ذات کو کس طرح ادھیڑ گئے تھے یہ صرف وہی جانتا تھا۔ اور اب وہ یہاں تھا اس گھر میں جہاں اس نے اپنی عمر کے کئی حسین دور گزارے تھے۔ وہ انہی باتوں میں الجھا ہوا تھا جب نیند کی دیوی نے اسے آ لیا تھا۔

سراج بابا نے اسے اٹھایا تو وہ باہر نکل آیا۔ ساری حویلی دیکھ ڈالی تھی۔ چاچا جانی باہر جاگیر کے معاملات دیکھنے چلے گئے تھے۔ سراج بابا کو چائے کا کہہ کر وہ لائبریری میں چلا آیا تھا۔ اس لائبریری میں اس کے ذوق و شوق کی سب کتابیں موجود تھیں۔ وہ چہل قدمی کر رہا تھا جب باہر جیپ رکنے کی آواز پر ٹھٹک گیا تھا۔ شام کے سائے گہرے ہو گئے تھے۔ چاچا جانی کے علاوہ اس کی ابھی کسی اور سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اٹھ کر کھڑکی کے پاس آ گیا۔ ڈرائیور گاڑی کے دروازے کھول رہا تھا۔ سالک کا دل اس کی کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا تھا۔ بی بی جان، چاچی جان اور اسوہ گاڑی سے اتری تھیں۔ دل چاہ رہا تھا کہ اڑ کر جائے اور بی بی جان کے قدموں میں جھک جائے۔ دیارِ غیر میں کس قدر یاد آئی تھیں وہ ہر پل، ہر لمحہ۔ ان کی شفیق و مہربان ممتا بھری گود کی گرمی اسے اذیت کی بھٹی میں جھلسانے لگی تھی مگر وہ مجبور تھا۔ اپنے دل کے ہاتھوں، اور اب۔۔۔ وہ دروازے کے قریب آ کھڑا ہوا۔ اوپری منزل پر واقع یہ لائبریری نیچے کا سارا منظر واضح کر دیتی تھی۔ بی بی جان، چچی جان اور اسوہ تینوں صوفوں پر آ کر گر گئی تھیں۔ وہ برسوں بعد انہیں دیکھ رہا تھا عجب لگ رہا تھا۔

"سراج بابا۔۔۔ بابا جانی کہاں ہیں؟" چادر اتارنے کے بعد اسوہ نے پوچھا تھا۔

"چھوٹی بی بی! وہ زمینوں پر گئے ہیں۔ کہہ گئے تھے کہ وہ تھوڑی دیر میں لوٹ آئیں گے۔" بابا نے بتایا تھا۔ وہ کمرے سے

نکل آیا۔ اب سالک کا رخ نیچے کی جانب تھا۔

"کیا بات ہے بابا، بہت خوش ہیں؟" اسوہ بابا کو مسلسل مسکراتے دیکھ کر پوچھ رہی تھی۔ بی بی جان اور چچی جان بھی متوجہ تھیں۔

"جی چھوٹی بی بی، بات ہی کچھ ایسی ہے۔ آپ بھی سنیں تو حیران ہوں گی۔ آج برسوں بعد اس حویلی کی خوشیاں لوٹ آئی ہیں۔" سالک سیڑھیاں اترنے لگا تھا۔

"ایسی بھی کیا خوشی آگئی؟ کچھ بتاؤ تو سہی......" بی بی جان نے بھی پوچھا تھا۔

اسوہ چادر اتار کر صوفے کی پشت پر ڈال کر اپنے گھنے آبشار ایسے کھلے بالوں کو آگے کر کے انگلیاں پھیر رہی تھی جبکہ یہاں وہاں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس کی نظر سیڑھیاں اترتے سالک پر ٹھہری تو ایکدم اٹھ کھڑی ہوئی۔ لمحوں میں بدحواس ہوئی تھی جبکہ باقی سب اس طرف متوجہ نہیں تھے سوائے سراج بابا کے۔

سالک بیٹا آئے ہیں، وہ دیکھیں بڑی سرکار۔" وہ اس تک پہنچ گیا تھا۔

جب بابا نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے انکشاف کیا تھا۔ بی بی جان اور چچی جان بھی ایک دم پلٹی تھیں اور اسوہ کا تو کاٹو تو بدن میں خون نہیں والا حال تھا۔

"السلام علیکم بی بی جان..." وہ والہانہ انداز سے اس کی طرف بڑھا تھا۔ اسوہ اپنی جگہ حیران وساکت تھی۔ ابھی اسے دن ہی کتنے ہوئے تھے خط لکھے ہوئے اور اتنی جلدی وہ روبرو تھا۔ اس کی حیرانگی کے برعکس چچی جان اور بی بی جان حیران تھیں۔

"تم سالک، تم آگئے بچے، کہاں چلے گئے تھے۔ اتنے سال گزار دیے۔ کتنے ظالم تھے تم..... ماں کے ضبط کو آزماتے رہے، کہاں تھے؟ یہ ہوا سالک..... میرا بچہ۔" بی بی جان اسے بازوؤں میں لے کر گرمجوشی سے روتی بے قرار ہو رہی تھیں۔ وہ بمشکل مسکرا سکا تھا۔ ایک نگاہ غلط اسوہ پر اٹھ گئی تھی جو اس کی آمد پر حیران ہوتی اپنے ہاتھ مسل رہی تھی اور ہونٹ کاٹ رہی تھی۔

"السلام علیکم چچی جان کیسی ہیں آپ؟" بی بی جان سے جدا ہو کر وہ چچی جان کی طرف بڑھ گیا تھا۔

"ہمارا ضبط آزما کے پوچھتے ہو کہ کیسے ہیں..... جی رہے ہیں۔" وہ آبدیدہ ہو گئی تھیں۔ اس کا چہرہ ہاتھوں میں چھپائے پیشانی چومتے کہہ رہی تھیں۔ وہ شرمندہ سا ہو گیا۔ جانتا تھا یہ شکوے، یہ شکایتیں برحق تھیں۔

"کب آئے.....؟" صوفے پر بیٹھتے ہوئے وہ پوچھ رہی تھیں۔ وہ بھی بی بی جان کو سہارا دیتے ان کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا جبکہ اسوہ ابھی بھی کھڑی تھی۔ اسی طرح ساکت وصامت۔

"آج دوپہر کو....." مختصر بتایا پھر ایک نظر اسوہ پر پڑ گئی۔ وہ یہاں سے جانے کو پر تول رہی تھی۔

"یہ اسوہ ہے، جانتے ہو یا اسے بھی بھول گئے ہو۔ ماں چچا اور چچی کی طرح۔" بی بی جان نے اسے ایک دم کٹہرے میں لا کھڑا کیا تھا۔ گویا دونوں کی جان مشکل میں ڈال گئی تھیں۔ وہ ہنس دیا تھا۔ ایک عجیب سی نظر اس وجود پر ڈالی جو سر جھکائے کھڑی تھی۔ کتنی بدل گئی تھی وہ۔ جب وہ یہاں سے گیا تھا تو بالکل مختلف تھی۔ اب سنجیدہ سی، خوبصورتی کے سب پیمانوں پر پورا اترتی، چند لمحوں کو اس کی توجہ سمیٹ گئی تھی۔ اس نے ایک گہری نظر اس کے سراپے پر ڈالی تھی۔

"میں کچھ بھی نہیں بھولا بی بی جان۔ سب یاد ہے۔" اس کا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی تلخ ہو گیا تھا۔ بی بی جان کو ایک دم ملال نے آ لیا۔ انہوں نے اس کے ساتھ کم زبردستی کی تھی کیا۔ اس نے تو پھر بھی اعتراض تک نہیں کیا تھا صرف بغیر بتائے آٹھ سالوں تک بغیر کوئی نام ونشان چھوڑے قطع تعلق کر گیا تھا اور اب تو وہ اعتراض کا بھی حق نہیں رکھتی تھیں۔ نہ جانے کون کون سے دکھ تھے جو آنکھوں

سے بہہ نکلے تھے۔

"ہاں ہم گنہگار تھے۔ اگر وہ زبردستی نہ کرتے تو نہ جانے کیا دن دیکھنے پڑتے۔" چچی جان اپنی دختر نیک اختر پر ایک کٹیلی نگاہ بھی ڈال کر دل ہی دل میں کہہ رہی تھیں۔ اب اسوہ کے لئے مزید کھڑے رہنا محال تھا۔ وہ بغیر چادر اٹھائے بھاگتے ہوئے زینہ طے کرتے اوپر چلی گئی تھی۔ سب نے اسے جاتے دیکھا تھا۔ سالک سر جھکا گیا تھا۔ اس کا مقصد چچی جان کو شرمندہ کرنا نہیں تھا۔ اس سارے قصے میں بھلا ان کا کیا قصور؟

رات کے کھانے تک وہ دونوں خواتین کے درمیان ہی گھرا رہا تھا۔ چچا جانی بھی شام کے بعد آگئے تھے۔ مختلف سوالات کرتے رہے تھے۔ وہ مختصر بتاتا گیا۔ پھر ملازمہ نے کھانا لگ جانے کی اطلاع دی تو وہ سب کی سربراہی میں کھانے کی ٹیبل پر آ گیا۔

"جاؤ اسوہ کو بلا لاؤ۔" زبیدہ چچی جان نے حکم دیا تھا۔ وہ "جی اچھا" کہہ کر چلی گئی تھی۔ بی بی جان اور چچی جان اس کے لئے کھانا لگا رہی تھیں۔ سراج بابا نے کھانے پر خصوصی اہتمام کروایا ہوا تھا۔ کئی قسم کی ڈشز تھیں جو کبھی وہ بہت رغبت سے کھاتا تھا مگر اب جیسے کھانے پینے سے بھی دل اچاٹ ہو گیا تھا جو مل جاتا تھا کھا لیتا تھا۔

"چھوٹی بی بی کہہ رہی ہیں وہ کھانا نہیں کھائیں گی، انہیں بھوک نہیں ہے۔" زبیدہ نے آ کر اسوہ کا انکار سنایا تھا۔ چاچا جانی، بی بی جان اور چچی جان سب کے ہاتھ رک گئے تھے۔ وہ صرف دیکھ کر رہ گیا تھا۔ اسے دیکھنے کے بعد اس نے سوچا تھا کہ وہ بدل گئی ہے مگر اب اس کا کھانے کے لئے انکار کرنا، اپنی رائے بدلنا پڑی تھی وہ اب بھی ویسی ہی تھی۔ کسی کا بھی خیال نہ کرنے والی۔ وہ کچھ سے جانتا تھا۔ یہ تنگی اس کے مزاج کا حصہ نہیں تھی مگر اب جب سے وہ اس گھر میں آیا تھا مسلسل اک کھنچاؤ کی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔

"اسے جا کر کہو کہ فوراً کھانے کی میز پر آئے، بھوک نہیں ہے تب بھی۔" چاچا جانی کے چہرے پر خشمگیں سی کیفیت رقم ہو گئی تھی۔ چچی جان نے ہی درشتی سے کہا تھا۔

"رہنے دو رافیہ! شادی میں پیٹ بھر کر کھایا ہوگا، بھوک نہیں ہوگی۔" بی بی جان نے فوراً کہا تھا۔

"پھر بھی بھابی بیگم، سے خیال تو کرنا چاہیے..... یہ بالکل ناشائستگی والی بات ہے۔ سب یہاں موجود ہیں اور وہ غائب ہے۔" چچی جان نے دبی دبی آواز میں کہا تھا۔

"کوئی بات نہیں..... تم یہ بریانی چکھو سالک، تمہیں بہت پسند ہے نا۔" بی بی جان یوں لے رہی تھیں، جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ مگر سالک جانتا تھا کہ اس گھر کی روایتیں کیا ہیں؟ اور ان روایتوں سے انحراف کی سزا کیا ہے۔ اسوہ اس سزا کو کاٹ چکی تھی اس کے باوجود ہٹ دھرمی اور ضدی طبیعت برقرار تھی۔

کھانے کے بعد باتوں اور چائے کا دور چلا تھا۔ بی بی جان تھکی ہوئی تھیں خود چچی جان بھی مگر سالک کی خوشی میں رات گئے تک باتیں ہوتی رہی تھیں۔ گزرے دنوں کی، رشتہ داروں کی، گزشتہ حالات وواقعات کی، بہت سے تذکرے تھے، بہت سے قصے کہانیاں تھیں، وہ دلچسپی سے سنتا رہا پھر چاچا جانی تھکاوٹ کا کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے تو چچی جان بھی ساتھ ہو لیں۔ بی بی جان اور سالک دونوں وہیں بیٹھے رہے تھے۔ اسوہ اوپر جانے کے بعد نیچے نہیں آئی تھی۔ چچی جان خود جا کر بلانے گئی تھیں مگر اس کا انکار ہاں میں نہیں بدل سکا تھا۔

"سن سالک، جو بھی ہوا، سب بھول کر اک نئی زندگی شروع کر..... اسوہ اگر بہت نہیں بدلی تو پہلے جیسی بھی نہیں رہی۔ تو کیوں دل کو روگ لگا رہا ہے۔ کب تک یوں سودائیوں کی طرح پھرے گا۔ اپنا گھر آخر اپنا ہی ہوتا ہے۔ جو سکون، محبت گھر اور بیوی سے حاصل ہوتی ہے وہ اور کہیں سے بھی نہیں مل سکتی۔ میں جانتی ہوں تمہارے ساتھ بہت زیادتی ہوئی ہے۔ پہلے تمہارے بابا جانی

گزر گئے اور پھر اسوہ، دل لگانے سے، یا قطع تعلق کر لینے سے مسائل حل نہیں ہوتے بلکہ اور الجھ جاتے ہیں۔ اس حویلی کو سہاروں کی ضرورت ہے۔ تم اپنے بابا کے وارث ہو، اکلوتے، اور تمہارا کوئی وارث نہیں۔ جب سے تمہاری شادی ہوئی ہے، اب تک تین چار بچے ہو جانے تھے مگر تم خوامخواہ کی ناراضگی لئے، بغیر کسی سے کچھ کہے چلے گئے۔ اسوہ کا بھی نہ سوچا۔ وہ جیسی بھی تھی تمہاری بیوی تھی۔ اسے بھی کچھ نہ بتایا، اور جو تڑپے وہ علیحدہ..... اب تو ہم یہ سمجھ بیٹھے تھے کہیں خدانخواستہ تم..... میرے منہ میں خاک، کہا ہوتا تھا۔ ہر جگہ جہاں تم مل سکتے تھے پتا کروایا تھا۔ کچھ علم ہی نہیں ہوتا تھا۔ خاندان والے اور دیگر رشتہ دار سوچ بیٹھے تھے کہ اب تم اس دنیا میں نہیں رہے، کسی حادثے کا شکار ہو گئے ہو گے، اگر زندہ ہوتے تو کبھی نہ کبھی کوئی نہ کوئی رابطہ تو ضرور کرتے، اور تم نے بھی اور دی۔ ...دل اتنا پتھر کر لیا تھا کہ ماں بھی یاد نہ رہی۔" اس کا سر اپنی گود میں رکھے بالوں میں انگلیاں پھیرتے وہ سب کہہ رہی تھیں اور وہ خاموش ہی رہا۔ جواب بہت سے تھے مگر کوئی فائدہ نہیں تھا۔

"اسوہ اب بدل گئی ہے۔ شاید وہ پچھتا بھی رہی ہے۔ تم کھلے دل سے کام لو، اسے معاف کر دو۔ ساری زندگی کا معاملہ ہے۔ وہ عزت ہے اس خاندان کی۔ بہت کچھ سہا ہے اس نے۔ بہت انتظار کیا ہے۔ اب اسے انتظار کی اذیت سے نکال لو۔ سب رنجشوں کو بھلا کر دل سے اک نئی زندگی کا آغاز کرو۔"

اس کی کشادہ پیشانی پر بوسہ دیتے انہوں نے نصیحت کی تھی۔ وہ دل مسوس کے رہ گیا۔

کیسی زندگی، کیسی خوشی، وہ تو یہاں صرف اپنا وعدہ نبھانے آیا تھا جو اس نے شاید اسوہ سے نہیں اپنی محبت سے کیا تھا۔ اسوہ کو شاید گوہر مقصود مل گیا تھا، جو بھی الٹے برسوں بعد اس نے رابطہ کیا تھا۔ اسی پرانے ایڈریس پر، اور اسوہ کی قسمت تھی کہ اسے وہ خط مل گیا تھا اور سب یہاں آ بھی گیا تھا۔

"رات گہری ہو گئی ہے بیٹا، سو جاؤ، آرام کرو، تھک گئے ہو گے۔" اسے ڈھیر سارا پیار کر کے وہ چلی گئی تھیں۔ اس نے گھڑی دیکھی، ایک بج رہا تھا۔ ورنہ گاؤں میں اتنی دیر تک بھلا لوگ کب جاگتے تھے۔ آج صرف اس کی وجہ سے سب نے اپنی روٹین خراب کی تھی۔ تھکے تھکے اعصاب لیے وہ اپنے کمرے میں جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اپنے کمرے میں داخل ہونے کے بعد اس کی نظر سیدھی بیڈ کے بالکل وسط میں لیٹے وجود پر پڑی تھی۔ قدم جہاں تھے وہیں تھم گئے۔

"اسوہ" وہ شاید بھول گیا تھا کہ وہ کمرے میں بھی ہو سکتی ہے۔ وہ جب آٹھ سال پہلے یہاں سے گیا تھا تو تب بھی اسی کمرے میں تھی اور اب بھی..... عجیب لڑکی تھی تب بھی وہ سے نہیں سمجھ سکا تھا اور اب بھی نہیں..... جب دلوں میں گنجائش نہیں تھی تو کمرے میں یک ساتھ رہنے کی بھی بھلا کیا تک تھی۔ اس نے شادی کے دنوں میں اسوہ سے کہہ دیا تھا کہ وہ چاہے تو علیحدہ کمرہ لے سکتی ہے خاص طور پر ڈریسنگ روم جس کے ذرا سی کمرے میں گھستے تھے تب بھی وہ ڈھیٹ تھی اور اب بھی۔ تب اس نے سمجھا تھا کہ وہ اسے صرف اذیت دینے اور اپنی بات منوانے کے لئے اسے زچ کر رہی ہے مگر اب تو وہ آزاد تھی اس کے باوجود اس کمرے میں تھی۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ کیا چاہتی ہے؟

مدھم خوابناک نیلگوں روشنی پورے کمرے کو اپنے سحر میں جکڑے ہوئے تھی۔ وہ سر جھٹک آگے بڑھا تھا۔ سراج بابا اس کا بیگ کمرے میں رکھ گئے تھے۔ لائٹس جلا کر دیکھا تو وہ کہیں بھی نہیں تھا۔ اسے ڈریس چینج کرنا تھا، ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ہر چیز اپنی جگہ بہت نفاست سے سجی ہوئی تھی۔ کہیں کوئی گرد اور بے ترتیبی نہیں تھی۔

"کہاں رکھا ہے بیگ بابا نے....." ادھر ادھر دیکھنے کے بعد اس نے کچھ جھک کر بیڈ کے نیچے بھی دیکھ ڈالا وہاں بھی نہیں تھا۔ اسے کوفت سی ہونے لگی۔ یونہی الماری کی طرف بڑھ گیا۔ پہلا دروازہ کھولا ساری کیبن زنانہ سوٹوں سے بھری پڑی تھی۔ اس نے دوسرا پٹ کھولا تو سکون ملا، اس کے کپڑے سلیقے سے ہینگرز پر لٹکائے رکھے تھے۔ دیگر اشیاء بھی نچلے درازوں میں موجود تھیں جو وہ ساتھ

لایا تھا جن میں کچھ تحفے تھے، کتابیں تھیں۔ اس کے روزمرہ استعمال کی کئی دیگر اشیاء تھیں۔ ایک ترتیب سے سیٹ تھیں۔ وہ جب تک یہاں تھا شلوار قمیص ہی پہنتا تھا مگر جب سے یہاں سے گیا تھا شلوار قمیص کو جیسے ہاتھ لگانا ہی بھول گیا تھا۔ اس نے رات کی مناسبت سے ایک ٹی شرٹ اور ٹراؤزر نکال لیا تھا۔ بیگ سے یہ سب سامان الماری تک کیسے پہنچا، یہ سوال غور طلب تھا مگر پھر سراج بابا کا سوچ کر مطمئن ہو گیا۔ کم از کم اسوہ کی جانب سے اسے یہ خوش فہمی کبھی بھی نہیں ہو سکتی تھی۔

کپڑے لے کر باتھ روم میں گھس گیا۔ کپڑے چینج کر کے آیا تو نظر سیدھی بیڈ پر آ ٹھہری۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوا تھا وہ سر تا پا چادر اوڑھے سوئی ہوئی تھی۔ اب شاید کروٹ بدلی تھی۔ چادر اب آدھے وجود پر تھی۔ وہ دوپٹہ نہیں اوڑھے تھی۔ جس لباس میں وہ شادی سے لوٹی تھی ابھی بھی اسی میں ملبوس تھی۔ میک اپ کی موجودگی بھی برقرار تھی۔ اس کے کالے سیاہ گھنے لمبے بال سرہانے بیڈ پر بکھرے ایک عجیب سا منظر پیش کر رہے تھے۔ محو خواب چہرہ ہر سو چاندنیاں سی بکھیر رہا تھا۔ چہرے پر سے نظر ہوتی ہوئی اس کے وجود کا طواف کرنے لگی تھی۔ ہونٹوں سے مرصع سوٹ کی فٹنگ بہت نمایاں تھی۔ وہ لیٹی بھی کچھ اس طرح سے تھی کہ گلے کی گہرائی اور واضح ہونے سے بہت سے چھپے راز کھول رہی تھی۔ وہ نظر ہٹا گیا تھا۔ اسے ہمیشہ سے خود پر بہت کنٹرول تھا۔ اتنا عرصہ ہو گیا تھا، وہ پہلے اس کے نکاح پھر کمرے میں تھی اس کے باوجود اس کے ہاتھ اس کے وجود تک کے لمس سے محروم تھے۔ جب نکاح میں تھی تب بھی اسے چھونے کی کبھی خواہش ہی نہیں کی تھی اور پھر جب رخصتی ہو گئی تھی وہ مکمل طور پر اس کے حق میں تھی تو تب بھی سالک نے بہت سی پابندیاں عائد کر لی تھیں۔ رخصتی کے بعد وہ کئی دفعہ اس کے بہت قریب آ کر بھی دور ہو گیا تھا مگر شاید وہ بھی اپنے نام کی ایک تھی۔ کچھ بچی جان نے نام بھی اپنی صاحبزادی کا چن کر رکھا تھا اسوہ۔ مگر نام کے برعکس بالکل الٹ واقع ہوئی تھی۔ یہاں سے جانے سے پہلے دونوں نے بمشکل ایک ہی ایک ساتھ گزارا تھا اور وہ اسے چڑانے کو ہر وہ کام کرتی تھی جو سالک کو ناپسند ہوتا تھا۔ تھکن سے برا حال تھا مگر وہ بیڈ کے بالکل درمیان میں تھی وہ بھی اس کا حصہ کی کچھ نہیں تھا... سمجھتے ہوئے وہ ڈریسنگ روم کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بیڈ سے تھوڑا دور وہ ایک ہی تھا۔ دوسرا ابھی چیک کیا وہ بھی لاک تھا۔ اسے حقیقتاً غصہ آنے لگا۔ جانے کس کس سے۔

"عجیب مصیبت ہے۔" ایک کاٹ بھری ناپسندیدہ ناگواری نظر اسوہ پر ڈالی تھی، جو بے خبر گہری نیند میں غرق تھی۔ کمرے سے باہر بھی نہیں جا سکتا تھا۔ دیر کمرے تو کافی تھے۔ اب یہ علم نہیں تھا کہ وہ بھی لاک ہیں یا کھلے ہوئے ہیں۔ دوسرے اگر کسی کے علم میں یہ بات آ جائے تو نہ جانے کیا ہو۔ وہ وہیں... صوفے پر گر گیا۔ اور سر ہاتھوں میں تھام لیا۔

"کیا کیا جائے اب؟" پرسوچ نظروں سے بیڈ کو دیکھتے وہ رات گزارنے کا طریقہ سوچنے لگا۔

اسوہ کو اکثر سوتے میں پیاس لگ جاتی تھی۔ حلق خشک سا ہونے لگتا تھا۔ اکثر رات کو وہ اٹھ کر پانی پیتی تھی۔ اس کے لئے وہ ہمیشہ جگ اور گلاس سائیڈ ٹیبل پر ضرور رکھتی تھی۔ رات کا نجانے کونسا پہر تھا اسے حلق میں کانٹے چبھتے محسوس ہوئے۔ لیٹے لیٹے ہی سائیڈ ٹیبل پر ہاتھ مار کر لیمپ روشن کیا۔ ہلکی مدھم سی روشنی ہر سو پھیل گئی تھی۔ جگ خالی تھا، رات غصے میں وہ پانی بھرنا بھول گئی تھی۔ شادی میں بھی اس نے کچھ نہیں کھایا تھا مگر آ کر بھی کمرے میں بند ہو گئی تھی۔ سر شام ہی بغیر کپڑے بدلے ایسے لیٹی تھی کہ اب آنکھ کھلی تھی۔ ہلکی مدھم سی روشنی میں رسٹ واچ پر نگاہ کی تو غور کرنے سے اندازہ ہوا ساڑھے تین کا وقت ہو چکا ہے۔ بیڈ سے اترتے ہوئے اس نے بیڈ کی دوسری سائیڈ خالی دیکھی تھی۔ اس کی سوچ کے مطابق اسے کمرے میں ہی ہونا چاہیے تھا مگر لو سیٹ صوفہ بھی خالی تھا۔ گلاس لے کر وہ آگے بڑھی مدھم روشنی میں زمین پر پڑی کسی چیز سے ٹکرا کر منہ کے بل گری تھی۔ خوف سے ہلکی سی چیخ بھی نکل گئی۔ گلاس ہاتھ سے چھوٹ کر قالین پر گر کر چھناکے کی آواز سے نہ صرف اس کا دل سہما گیا تھا بلکہ قالین پر لیٹا سالک بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا۔

اسوہ اس کے اوپر بے توازن انداز میں گری تھی۔ تو سالک نے بازوؤں کا سہارا دیا تھا۔

"کون؟" اسوہ سرعت سے پیچھے ہٹی تھی مگر اپنا توازن برقرار رکھنے میں ناکام رہی تھی۔

"اسوہ......" ہلکی مدھم روشنی میں سالک اسے پہچان گیا تھا۔ کچھ نا سمجھ آنے کی کیفیت لئے دیکھنے لگا۔ پھر ہاتھ بڑھا کر اسوہ کو پیچھے ہٹایا جو ابھی خاصی بے توازن سی تھی۔

"یہ کیا تماشا ہے۔" وہ جھنجلا سا گیا تھا۔ ابھی تو مارے بندھے آنکھ لگی تھی اور وہ ابھی ڈسٹرب ہو گیا تھا۔

"وہ..... میں..... پانی...... گلاس......" وہ بوکھلائی سی ٹھیک سے وضاحت بھی نہ کر سکی۔ سر پیچھے کرنے کی سعی میں ہلکی سی چیخ بھی لبوں سے آزاد ہو گئی۔ پیچھے ہٹتے ہوئے اس کا پاؤں کسی کانچ پر پڑ گیا تھا۔ وہ سسکاری بھر کر وہیں بیٹھ گئی۔

"اب کیا ہوا ہے؟" اپنی نیند کے خراب ہونے اور اسوہ کے یوں ڈسٹرب کرنے نے اسے اچھا خاصا جھنجلا دیا تھا اور کر عاجزانہ سی تھیں مگر جب نظر اس کے خون آلود پاؤں پر پڑی تو ٹھٹک گیا۔ ارد گرد کانچ بکھرے ہوئے تھے وہ ننگے پاؤں تھی۔ کانچ شاید گہرا چبھا تھا خون بہہ رہا تھا۔

"یہ کیسے ہوا؟" وہ تنا پتھر بھی نہیں تھا، یہ لڑکی تو اس کے دل میں دھڑکتی تھی۔ سانسوں میں رہتی تھی۔ مسام جاں کو مہکاتی تھی بے اختیار وہ اس کی طرف بڑھا تھا۔

"اٹھو یہاں سے..... یہ زخمی ہونے کا ارادہ ہے کیا؟" وہ جو سے دعویٰ تھا کہ اس کے ہاتھوں نے کبھی اس کے وجود کو نہیں چھوا تھا بے اختیار انداز میں اس کا بازو پکڑ کے جھنجلائے ہوئے لب و لہجے سے کہتے اسے کھڑا کر رہا تھا۔

"جو لوگ روح تک زخمی ہوں، انہیں یہ چھوٹے موٹے زخم تکلیف نہیں دیتے۔ آپ رہنے دیں، شکریہ۔" تلخی سے اپنا بازو سالک کی گرفت سے آزاد کروایا تھا۔ جبکہ چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ ہونٹوں سے سسکیاں نکل رہی تھیں۔ کھڑا ہونا محال تھا۔

"تم ....." سالک نے کچھ کہنا چاہا تھا پھر لب بھینچ لئے۔ خون تیزی سے بہہ رہا تھا اس وقت اسے فوری ٹریٹمنٹ کی ضرورت تھی۔ مگر وہ کہاں باتوں کو سمجھ رہی تھی۔ ضدی دماغی تو شروع سے ہی تھی۔

"مجھے بھی کوئی ضرورت نہیں ہے ہمدردیاں کرنے کی، مگر اس وقت خون بہت بہہ رہا ہے۔ ادھر بیٹھو بستر پر ادھر تو ہر طرف کانچ ہی کانچ ہیں۔" اس کی پروا کئے بغیر اس کی کمر میں بازو ڈال کر اسے اٹھا کر بستر پر لے آیا تھا۔ اسے امید نہیں تھی وہ اتنی جلدی یہ کرے گا۔ چہرہ پھیر گئی تھی۔ نظریں ملانے کا یارا نہیں تھا۔ کہاں صدیوں کی دوری تھی اور کہاں یہ قربت تھی۔

"کمرے میں فرسٹ ایڈ باکس تو ہوگا؟" اسے بستر پر بٹھا کر اس کا پاؤں دیکھتے سر اٹھا کر اس کے رخ پھیرے چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ اسی پوزیشن میں نفی میں سر ہلا گئی۔

"نیچے کچن میں رائٹ سائیڈز کی کیبن نمبر ۴ میں رکھا ہوا ہے۔" وہ بمشکل کہہ سکی تھی۔ درد سے برا حال تھا۔ سالک نے کس قدر تشویش سے اسے دیکھا۔ پھر فوراً اٹھا اور باہر نکل گیا۔ جب واپس لوٹا تو ہاتھ میں فرسٹ ایڈ باکس تھا۔ وہ قالین پر ہی گھٹنوں کے بل بیٹھ کر خاموشی سے روئی اور ڈیٹول سے اس کا پاؤں صاف کرنے لگا تھا۔

"لگتا ہے کانچ گہرا ہے۔" خون کسی بھی طور پر نہیں رک رہا تھا۔ خود کلامی سا انداز تھا۔ تکلیف سے بے حال ہوتی وہ منہ پہ ہاتھ رکھے چیخوں کو دبانے لگی۔ وہ کانچ نکالنے لگا۔

"نہیں..... پلیز....." کانچ نکالتے ہوئے یکدم اسوہ نے تکلیف سے تڑپ کر اس کا ہاتھ پیچھے ہٹایا۔

"ڈونٹ وری...... ہلکا سا زخم ہے۔ تھوڑی دیر میں درد ختم ہو جائے گا۔" اس کی سسکیاں اس کے لئے برداشت کرنا مشکل تھا۔ اس کے آنسوؤں سے وہ ہمیشہ ہار جاتا تھا یا شاید یہ اس کی کمزوری تھی وہ کسی کو بھی تکلیف میں یا روتے نہیں دیکھ سکتا تھا پھر

یہاں تو معاملہ ہی دل کا تھا۔ وہ کیسے خود پر جبر کرتا۔ بہت نرمی سے کہا تھا جبکہ اسوہ بار بار سسکی میں بلا رہی تھی۔ کانچ نکلا تو اس کی چیخ نکل گئی۔

"امی! امی۔"

"ٹیک اٹ ایزی اسوہ! ابھی مرہم لگے گا تو ٹھیک ہو جائے گا۔ درد نہیں ہوگا۔ بلیو می۔" نجانے وہ کس رو میں کہہ رہا تھا۔ انداز و لہجہ انتہائی نرم و محبت لئے ہوئے تھا مگر درد سے بے حال ہوتی اسوہ کیا خاک غور کرتی۔

ماہر مرہم ساز کی طرح اس نے منٹوں میں اس کے پاؤں کی بینڈیج کر دی تھی۔ مرہم لگانے سے درد کی شدت میں کچھ کمی آئی تو اسوہ کے آنسو بھی کم ہوئے اور سسکیاں میں بھی کمی آئی۔ وہ ایک نظر بینڈیج کرنے کے بعد اسوہ پر ڈال کر سامان سمیٹتے فرسٹ ایڈ باکس سائیڈ کی دراز میں رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

قالین پر جا بجا چھوٹے بڑے کانچ بکھرے ہوئے تھے۔ وہ ایک ایک کر کے چننے لگا۔ کچھ وقت لگا تھا، پھر کانچ ڈسٹ بن میں ڈال کے وہ کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھی اسوہ نے آنکھیں نیم وا کر کے اسے باہر نکلتے دیکھا تھا پھر ہونٹوں پر زبان پھیرتی ردگرد دیکھنے لگی۔ وہ قالین پر ہی لیٹا ہوا تھا۔ یہاں سے چلے گئے پیچھے ہی وہ اکثر قالین پر سوتا تھا۔ وہ کیوں چاہا وہ بہت کوشش کے بھی پوچھ نہیں سکی تھی۔ نہ ہی کبھی دل میں ملال جاگا تھا مگر آج اس حادثے نے اس کی سوچ کا رخ بدل ڈالا تھا۔

سالک کمرے میں لوٹا تو چھوٹی سی ٹرے میں دودھ کا گلاس تھا اور ساتھ میں کچھ گولیاں تھیں۔

"دودھ پی کر یہ میڈیسن لے لو۔ درد میں افاقہ ہوگا۔" ٹرے اس کے سامنے رکھتے وہ کہہ رہا تھا۔ وہ ایک ٹک کو اسی اونچے لمبے چوڑے مرد کو دیکھ سکی تھی۔

"شکریہ..... مجھے نہیں دودھ پینا۔" مزاج میں اب بھی گرم دلی پن تھا۔ صاف انکار کیا تھا۔

"تمہیں پلانے یا خدمت کرنے کا مجھے بھی شوق نہیں ہے۔ تمہاری سسکیوں سے مجھے نیند نہیں آنے کی جبکہ میں سونا چاہتا ہوں۔ یہ گولیاں درد میں افاقہ کریں گی۔" سالک کے لہجے میں آئی نرمی شاید چند لمحوں کے لئے آئی تھی۔ اس کا کڑوا لہجہ سن کر وہ اپنے لب و لہجے کو بھی کڑوا ہونے سے نہیں روک سکا تھا۔

"مجھے بھی کوئی شوق نہیں تھا۔ کس نے کہا تھا راستے میں لیٹنے کو سارا قصور آپ کا ہے۔" تب ہی ناقابل برداشت جملہ کہہ دیا ہوتا میں خود ہی کمرے سے نکل جاتی۔ کم از کم آپ کو زمین پر سونے کی زحمت تو نہ اٹھانا پڑتی۔ دوسرے میں نے دعوت نہیں دی تھی ہمدردی جتانے کی۔ منع کیا تھا میں نے" وہ اس سے زیادہ تند لہجے میں کہہ گئی تھی۔ سالک کے اندر اشتعال سا ابھرنے لگا۔ یہ سب رہا ورنہ نرمی کڑواہٹ کا مظاہرہ کرنا اشتعال انگیزی وغیرہ قسم کے جذبات اس کی طبیعت کا خاصا نہیں تھے۔ وہ تو شروع سے ہی بہت تحمل مزاج تھا یہ تو دو تین دن سے یہ کیفیت ہو گئی تھی۔ آتے ہوئے وہ خواہ مخواہ کامران سے جھگڑ پڑا تھا۔ یہاں آنے کے بعد اب یہ طنزیہ جملے وہ ایکدم اپنے ہونٹوں کو سختی سے بھینچ گیا۔ بہر حال وہ تکلیف میں تھی۔ اور اسے اس وقت میڈیسن کی ضرورت تھی۔

"پلیز اسوہ! ہر بات میں ضد اچھی نہیں ہوتی۔" ایکدم نرمی سے کہہ رہا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اسوہ نے گلاس تھام لیا۔ اس نے دل ہی دل میں شکر کا کلمہ پڑھا، بغیر مزید کوئی نخرہ دکھائے اس نے میڈیسن بھی کھا لی تھی۔ اس نے ٹرے ایک طرف رکھ کر کمرے میں بچھی چادر بچھا رہی تھی۔ اسوہ اب بیڈ کے کنارے پر تھی۔ باقی سارا بیڈ خالی تھا پہلے صوفے پر پہلی رات میں ہی یہ تلخ تجربہ اسے ہو چکا تھا۔ سو دوبارہ زمین پر سونے کے بجائے بیڈ کی دوسری طرف آ کر تکیہ درست کیا۔

"تم صوفے کی یا لائٹس جلتی رہنے دوں؟" اس نے پوچھا تھا۔ وہ کوئی جواب دئے بغیر دراز ہو کر چادر سر تک تان گئی تھی۔ وہ

چند لمحے تاسف بھری نظروں سے اس کی پشت کو گھورتا رہا پھر آگے بڑھ کر لائٹس آف کر دیں۔

اسوہ نے بیڈ پر دوسرے وجود کو لیٹتے محسوس کر کے اندھیرے میں چادر چہرے سے ہٹالی تھی۔ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے وہ غیر محسوس طریقے سے دائیں سے بائیں طرف کروٹ بدل گئی تھی جدھر وہ تھا۔

* * *

اسے آئے کتنے دن ہو گئے تھے۔ پہلے تو رشتہ داروں سے ملنا ملانا رہا پھر وہ بھی ختم ہو گیا۔ ہر وقت حویلی میں رہنے پر بور ہونے لگا تو چچا جانی کے ساتھ زمینوں اور باغات پر چلا جاتا تھا۔ وقت آرام سے گزرنے لگا تھا۔ وہ جس مقصد کے لئے آیا تھا اس کی طرف سے، ابھی تک کوئی پیش رفت نہیں ہوئی تھی۔ بہت چاہنے کے باوجود وہ خود بھی کوئی بات نہیں کر پا رہا تھا۔ شروع کے چند روز پچھتا رہا مگر جب اسوہ کے اطوار دیکھے تو نجانے کیوں دل اپنے وعدے سے منکر ہونے کو چاہنے لگا تھا۔ گزرے وقت نے اسے کافی بدل دیا تھا۔ وہ حیران تھا، وہ موڈی سی، تنک چڑھی سی، ضدی، جھگڑالو لڑکی نجانے کہاں جا چھپی تھی۔ اب تو جب بھی اسے دیکھتا وہ ایک نئے روپ میں ہی نظر آئی۔ کبھی بی بی جان کی خدمت کر رہی ہے، کبھی چچی جان کے ساتھ لگی ہوئی ہے، کبھی کچن میں مصروف ہے تو کبھی حویلی کے دوسرے کاموں میں الجھی ہوئی ہے۔ ملنے ملانے والے، لوگ اس کی سیرت و خوش گفتاری کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے تھے۔ وہ اسے نہ پہلے سمجھ سکا تھا اور نہ ہی اب بلکہ اب تو سالک کا پندار بھی مشکوک سا ہونے لگا تھا اس کی طرف سے۔ وہ نجانے کیا کھیل کھیلنا چاہتی تھی۔ کتنے عرصے بعد خود اس نے خط لکھ کر اسے بلوایا تھا اور اب یہاں وہ تھا تو یوں بنی ہوئی تھی جیسے کوئی واسطہ نہ ہو۔ وہ اسے سمجھنے سے قطعی قاصر تھا۔ بظاہر وہ خود کو پر سکون رکھے ہوئے تھا مگر اسوہ کے انداز و اطوار دیکھ کر اس کے اندر تلاطم برپا ہونے لگتے تھے۔ کبھی دل خوش کن احساسات میں گھرنے لگتا تھا تو کبھی بے شمار منفی سوچیں اسوہ کے گزشتہ رویے یاد آ آ کر اس کے دل کا سکون تباہ کرنے لگتے تھے۔ وہ کیا کرے وہ بے بس سا خود کو عجیب احمق سا محسوس کرنے لگا تھا۔

کچھ پہلی رات جو اتفاق ہوا تھا پاؤں میں کانچ لگنے سے اگلے تین چار دن تک وہ شدید بخار میں مبتلا رہی تھی۔ اس کی بیماری کے دوران تو اس کے نزدیک ہمت ہی نہیں ہوئی تھی کہ ایک لفظ بھی کہہ سکے بعد میں اس نے کئی دفعہ بات شروع کی تو وہ ادھر ادھر ہو گئی تھی۔ اور اس کی یہی حرکت اسے سب سے زیادہ کھٹک رہی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ بات جلد از جلد نمٹ جائے وہ چچا جانی کے ساتھ زمینوں پر نکلا ہوا تھا، باغات کے کچھ معاملات تھے۔ چچی جان کے ساتھ سے شہر جانا پڑ گیا تھا۔ دونوں عصر کے قریب گاؤں پہنچے تھے رستے میں اسوہ، اور اس کی مشترکہ پھوپو کا گھر پڑتا تھا، چچا جان، بہن کے گھر اتر گئے تھے۔ وہ تنہا ہی حویلی پہنچا تھا۔ سارے دن کی بھاگ دوڑ نے اسے تھکا دیا تھا۔ آتے ہی وہ صوفے پر گر گیا تھا۔ پانی کی طلب ہو رہی تھی اٹھ کر جگ دیکھا وہ خالی تھا۔ پھر بوتل لینے کو اٹھنے منہ دراز ہو گیا تھا۔ بی بی جان اور چچی جان سے پہلے ہی سامنا ہو گیا تھا۔ اسوہ کہیں دکھائی نہیں دی تھی۔ شاید حویلی میں نہیں تھی وہ کمرے آ گیا تھا۔ ابھی اسے لیٹے کچھ دیر ہی ہوئی تھی کہ دروازہ کھلا اور کوئی اندر داخل ہوا تھا۔ اس نے چہرے کا رخ بدلا تو اسوہ چھوٹی ٹیبل پر کھانے کی ٹرے رکھ رہی تھی۔

"کھانا کھا لیں... بی بی جان نے بھجوایا ہے۔" شاید اسے عادت تھی بی بی جان یا چچی جان کے کہنے پر ہی اس کے کام کرتی تھی۔ یہاں سے جانے سے پہلے رخصتی سے پہلے اور اب بھی اسوہ نے اس کا جب بھی کوئی کام کیا تھا بی بی جان یا چچی جان کا حوالہ ضرور دیا تھا۔ اس کے دل میں حسرت ہی رہی تھی کہ وہ خود سے بھی اس کے لئے کوئی کام کرے۔ یہ ایسی واحد ان ہونی خواہش تھی جو وہ اپنا حق سمجھتا تھا مگر واہ ری قسمت...... وہ اٹھ بیٹھا...... ایک گہری مگر بھرپور نظر اس کے اجلے، بجلیاں گراتے سراپے پر ڈالی۔ سوائے چند بار کے اس نے آج تک اسے نکھرے ہوئے حلیے میں نہیں دیکھا تھا۔ رواج کے مطابق لباس زیب تن کئے ہونٹوں پر

ہی لپ اسٹک لگائے نازک سی گولڈ کی جیولری پہنے ہوئے تھی۔ پتا نہیں یہ بناؤ سنگھار بھی اس نے کسی کے کہنے پر کیا تھا یا...... اس کے ہاتھوں میں پڑے سونے کے کنگنوں اور کانچ کی چوڑیوں کی کھنکناہٹ سالک کو ڈسٹرب کرنے لگی تھی۔ وہ اٹھ کر باتھ روم میں گھس گیا۔ منہ ہاتھ دھو کر آیا تو وہ الماری میں سر دیئے نہ جانے کیا تلاش کر رہی تھی۔ وہ نظر انداز کئے ٹرے اپنے آگے سرکا کر کھانے لگا تھا۔ اس دوران وہ الماری سے ہٹی تو ڈریسنگ کی ترتیب شدہ چیزوں کو نئے سرے سے ترتیب دینے لگی۔ سالک کی اگرچہ ساری توجہ کھانے پر تھی مگر اس کی موجودگی بھی نظر انداز نہیں کر پا رہا تھا۔ ہر ہر حرکت اور ہر ہر انداز کو بغور دیکھ رہا تھا۔ اوپر سے اس کی چوڑیوں کی کھنک۔ وہ کھانا ختم کر چکا تھا، نیپکن سے ہاتھ صاف کر کے ٹرے پرے کھسکائی تو ادھر ادھر مصروف اسوہ بھی قریب آ گئی۔

"بیٹھو مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔" تکیے کے سہارے کمر سیدھی کرتے ہوئے وہ بیٹھ گیا تھا۔ وہ ٹرے اٹھا رہی تھی جب اس نے کہا تھا۔ وہ سیدھی کھڑی ہو گئی۔

"کہیے، میں سن رہی ہوں۔" وہی اکھڑ لہجہ تھا۔ تند خو...... وہ الجھا...... سب کے ساتھ اس کا رویہ بہت ملنسار، ور محبت کرنے والا ہوتا تھا۔

"مجھے کھڑے کھڑے ہی تم سے یہ بات کرنا ہوتی تو میں آکر یہاں کمبا کمرہ رہتا۔ بہت پہلے یہ مسئلہ حل ہو چکا ہوتا۔ چند منٹ کے لئے تم بیٹھو۔" اس کا لہجہ سخت تھا۔

"ایم سوری۔ . . میں نیچے کچن میں کچھ کام چھوڑ کر آئی ہوں۔ بیٹھنے کا میرے پاس وقت نہیں۔ تنی دیر بھی جو رکی ہوئی تھی تو بی بی جان کی تاکید تھی ورنہ...... بہر حال اگر آپ کی بات وضاحت طلب یا طویل ہے تو پھر کر لیجئے گا۔" وہ سالک کے لہجے کی سختی سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہوئی تھی۔ جانے لگی تو سالک ایک دم اٹھ کر اس کے راستے میں آیا۔ اسوہ کے لئے یہ عمل باعث حیرت تھا۔ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"جب تمہارے پاس وقت ہی نہیں تھا تو میرے، ہماری زندگی میں ایک دفعہ پھر کیوں در آئیں تم؟ کیوں بلوایا مجھے؟ یہ خط کیا معنی رکھتا ہے؟ کیا چاہتی ہو اب تم؟" اپنی جیب سے خط نکال کر اس نے اس کے سامنے لہرایا تو بجائے وہ شرمندہ ہونے کے مسکرانے لگی۔ مسکراہٹ بھی بڑی طنزیہ سی تھی اور نظروں کی کاٹ حد سے سوا۔

"کیا چاہتی ہوں میں؟" اس نے خود سے دہرایا تھا پھر ہنس دی۔ "بڑے عرصے بعد یہ سوال کرنے کا خیال آیا۔" وہ سالک کی آنکھوں میں دیکھنے لگی تھی۔ وہ لب بھینچ گیا۔ "آپ کو کیوں بتاؤں میں کیا چاہتی ہوں...... ہٹیے پیچھے.. اس وقت میں مصروف ہوں بعد میں یہ بات زیر بحث لے آئیے گا۔ بے فکر رہیے کہیں نہیں بھاگی جا رہی میں۔ جبکہ بقول آپ کے آپ کچھ عرصے تک ہی رکنے آئے ہیں۔" کتنا پر اعتماد انداز تھا۔ شکست دیتا ہوا۔ نجانے وہ کیا تھی۔ ہمیشہ اسے مجبور کر دیتی تھی مگر اس دفعہ وہ مجبور نہیں ہونا چاہتا تھا۔ محبت میں انا بھی شامل ہونے لگی تھی۔ اب کے اس کے لئے اپنی ذات کی توہین برداشت نہیں تھی۔ اپنے رشتے کی پامالی گوارا نہیں تھی۔

"لسٹ ارونچ اسوہ، تم کہیں نہیں جاؤ گی۔ میری بات سنے اور میرے سوال کا جواب دیئے بغیر......" انگلی اٹھا کر غصے سے کہا۔

"آپ مجھے روک بھی نہیں سکیں گے۔ میں ضرور جاؤں گی۔" اس نے مسکرا کر سالک کی غصہ بھری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس کے ضبط کو آزمایا تھا۔ انداز و لہجہ نہایت چیلنجنگ تھا۔ اچھا خاصا کول مائنڈڈ سالک ایک دم لوز ٹمپرڈ ہوا تھا۔

"کیا سمجھتی ہو؟ میں اگر کچھ نہیں کہتا تو بے بس و مجبور ہوں۔ مائنڈ اٹ تم میری بیوی ہو... سارے اختیار رکھتا ہوں میں تم

ہو......" اس کے ہاتھوں سے ٹرے چھین کر میز پر پٹختے ہوئے اس کا بازو تھام کر اسے بستر پر دھکیلتے وہ غرایا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے اپنی نیچر، طبیعت اور مزاج کے خلاف کچھ کیا تھا۔ اسوہ نے منہ کے بل بستر پر گرنے کے بعد کوئی حرکت نہیں کی تھی۔ وہ پہلے ہی پاؤں میں الجھ کر کچھ قالین اور کچھ بستر پر گر گیا تھا۔

"اب مجھے جواب دو...... کیوں بلوایا تھا تم نے مجھے؟ کیا ارادے ہیں تمہارے؟" اس کا رخ سیدھا کیا تھا۔ پھر سے گندمی دراز کالے سیاہ بالوں کی چوٹی آگے آ گئی تھی۔ کہنیوں کے سہارے وہ ابھی بھی بے ترتیب نیم دراز تھی۔ جبکہ نظر اس سے گریزاں تھیں۔ سالک کی کن پٹیاں جلنے لگیں۔

"جواب دو اسوہ، مجھے، میں کچھ بکواس کر رہا ہوں۔" آج تو اس کا لب و لہجہ کیا ہر انداز ہی نرالا تھا۔ اسوہ صرف ایک نظر اس پر ڈال کر رہ گئی۔ برسوں کی خواہش آج شاید پوری ہو گئی تھی۔

"میں نے خط میں ظاہر کر دیا تھا کہ میں کیا چاہتی ہوں۔" چند ثانیے بعد اس کی مضبوط آواز گونجی تھی۔ سالک صرف دیکھ رہا۔ دل میں بہت کچھ آن واحد میں ٹوٹ گیا تھا۔ شاید حالات بدل گئے ہوں۔ شاید اس کی سوچ نے کچھ مثبت رخ اختیار کیا ہو۔ شاید کے گمانوں میں الجھ نہ جانے کیا کچھ، شعور میں آ کر اب اسے انسانے لگی تھیں۔ ذہن پر، دل پر کچوکے لگانے لگی تھیں۔ اس کے اندر کے متحمل مزاج کم گو آدمی کو تندخو، متحمل مزاج جلنے لگی تھیں۔

"تم......" وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا تھا۔ اسوہ اگرچہ اس وقت خود کو مضبوط ظاہر کر رہی تھی۔ مگر اس کی لمحہ بہ لمحہ بدلتی کیفیت اسے اندر ہی اندر ہراساں کر رہی تھی۔

"تم...... تمہاری ہر خواہش پوری کروں گا...... پہلے تمہیں میرے آٹھ سالوں کا قرض ادا کرنا ہو گا۔ کیونکہ ہے...... میں وعدے کا پکا انسان ہوں۔ جو کہتا ہوں کرتا ہوں۔ کہو سودے بازی کرو گی۔" اپنی محبت کو دل کے کسی کونے میں دفن کرتے ہوئے اپنے مزاج و عادات کے خلاف اس نے اس کا نازک وجود چٹانی گرفت میں لے لیا۔ پہلی دفعہ استحقاق سے بھرپور انداز میں اس کو اپنے حلقے میں مقید کر لیا تھا۔ وہ پھڑ پھڑا کر رہ گئی۔

وہ یہ سب کیوں کر رہا تھا وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔ شاید اس کے لاشعور میں بہت کچھ ٹوٹ گیا تھا۔ اس کا مان...... اس کے برسوں سے قائم کئے گئے مفروضے، محبت کی طاقت...... اتنے سالوں کا ضیاع...... اگرچہ وہ مائنڈ میک اپ کر کے آیا تھا اپنے دل کو بہلا کر، سمجھا کر آیا تھا مگر اب دل ہر حقیقت ماننے سے انکاری تھا۔ دماغ کے آگے سب دلیلیں بے کار تھیں۔ دل و نگاہ سب صرف یہ دیکھ رہے تھے کہ یہ لڑکی جو اس کی بیوی ہے۔ اس کی غیرت و عزت، انا و مردانگی، عزت نفس و خودداری پر گہری چوٹ لگانے کا سبب بنی ہے۔ اس کی محبت کی پامالی کا سبب بنی ہے۔

"کیوں...... دل گیا تمہیں بنا گوہر مقصود...... تمہارا محبوب عالی جو تمہیں کہا تھا کہ وہ تمہیں بہن کے علاوہ کچھ نہیں سمجھتا...... اب کیسے اس نے تمہیں بہن کے علاوہ کچھ اور بنا لینے کی جرأت کر لی ہے۔ بھئی شوہر ہوں تمہارا...... مجھے نہیں بتاؤ گی۔" ہاتھ سے اس کی تھوڑی اٹھا کر اوپر کرتے اپنے چہرے کے قریب لے جاتے ہوئے وہ پوچھ رہا تھا۔ پہلے والا سالک کہیں نہیں تھا...... آنکھوں میں ایک عجیب سا استہزاء تھا۔ اسوہ کا وجود کٹنے لگا۔ اس کی بات کا مفہوم وہ بخوبی سمجھ گئی تھی۔ کچھ کہنے کے بجائے وہ اپنے لب کترنے لگی تھی۔ سالک کی سانسوں کی حدت و گرمی اس کا چہرہ سلگائے دے رہی تھی۔ اوپر سے اس کی یہ قربت...... اس کے وجود کی سحر انگیزی...... دست و نگاہ کی کہر میں لپٹی ہوئی ٹھنڈک...... اس کے پورے وجود میں ایک پھریری سی دوڑا گئی تھی۔

"آپ کو اس سلسلے سے کوئی دلچسپی نہیں ہونی چاہئے۔ آپ اپنے وعدے کا سوچیں۔" اس کا لہجہ زہرخند ہو گیا تھا۔

"کیوں...... کیوں...... دلچسپی نہیں ہونی چاہئے اسوہ بیگم؟ تمہیں اتنا یقین و اعتماد کیوں ہے کہ میں اپنے وعدے کو نبھاؤں

کرنے اتنی دور سے آیا ہوں۔ ہیں بولو، تمہاری اتنی خوش فہمی کس سلسلے میں ہے کہ میں اپنا کوئی حق استعمال نہیں کروں گا۔ مائی ڈیئر وائف اتنی جلدی تو ہم بھی رہائی نہیں دیں گے۔" یہ لب و لہجہ اس کی عادت نہیں تھا۔ وہ ہر ہر لفظ اپنے مزاج کے خلاف بول رہا تھا۔ ہر حرکت اس کی طبیعت کے متضاد تھی۔ اسوہ صرف دیکھ کر رہ گئی۔ نجانے دل کو خوشی ہوئی تھی کہ کیا ہوا تھا۔

"اس لئے سالک صاحب کہ نظر شناسی کی صلاحیت آپ میں سرے سے ہے ہی نہیں۔ اپنی ذات کے گرد فصیلیں کھڑی کرتے کرتے بالکل ڈھے گئے ہیں۔ کبھی اپنی ذات سے نکل کر دیکھیں تو میرا مطلب بر اتنیں لگے گا۔" اتنی گہری چوٹ لگا جائے گی اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ اس کے وجود کے گرد اس کے ہاتھ ایک دم ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ وہ استہزائیہ ہنسی۔

"اسوہ......" اس نے تنبیہی پکارا تھا مگر پہلے والی مروت شامل نہیں تھی۔

"میں جو ہوں...... جیسی ہوں، اچھی یا بری، ڈنکے کی چوٹ پر ہوں۔ جن اختیارات کا آپ آج مجھے حوالہ دے رہے ہیں وہ گزشتہ کئی برسوں سے ہمارے درمیان ہیں۔ آپ کیا سمجھتے ہیں آپ مجھے کسی کمزور لمحے یا دلی تسکین کا سبب بنا لیں گے۔ اگر آپ کو یہ بات کی تو ہیں گوارا نہیں تو مجھے بھی نہیں۔ مگر اتنی جرأت ہے کہ سب کے سامنے مکمل کر انکار کر سکتی ہوں۔ جب مجھے پہلے ذہنی طور پر گوارا نہیں تھی اب تو بالکل بھی نہیں۔" وہ نہ جانے کیا کہہ رہی تھی اس کی سمجھ سے باہر تھا سب کچھ۔

"کیا بکواس ہے یہ؟" سالک کی سمجھ میں واقعی کچھ نہیں آیا تھا۔ کمزور لمحوں کا مفہوم چبھنے لگا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ اس کے وجود کے گرد سے ہٹا لئے تھے۔ وہ ہنس دی تھی۔ صاف مذاق اڑاتی ہوئی ہنسی تھی۔ وہ بمشکل خود پر کنٹرول کر سکا۔

"سالک صاحب! پہلے اپنے اختیارات کی بجائے واقف ہو لیں پھر قدم بڑھائیں۔ یہ بکواس نہیں ہے حقیقت ہے۔" وہ بپھرتی ہوئی جھٹکے سے بستر سے اتر گئی تھی۔ سالک اسے دیکھ کر رہ گیا تھا۔ اسوہ نے آگے بڑھ کر کھڑکی سے دو پردے ہٹا دیے۔

"اپنے حقوق کی دھمکی اچھی لگی۔ مگر ہر انسان میرے جیسی نیچر کا حامل نہیں ہوتا۔ جب میں نے آپ سے گزشتہ آٹھ سالوں کا حساب نہیں مانگا تو میں بھی مجبور نہیں ہوں کہ آپ کو اپنی ایک ایک جنبش کا جواب دوں۔ جبکہ ہمارے درمیان طے پایا تھا کہ ہم کبھی بھی ایک دوسرے کی زندگی میں مداخلت نہیں کریں گے۔ اپنے اپنے دائرے میں رہیں گے۔ آپ نے مجھے اپنے ہر حقوق سے آزاد قرار دیا تھا تو پھر اب یہ تماشا کیا ہے؟ آپ کو بلانے کا مقصد صرف یہی تھا کہ بی بی جان آٹھ سالوں سے انتظار کرتے کرتے تھک گئی ہیں۔ وہ دل کی مریضہ بن چکی ہیں۔ سب مجھے الزام دیتے ہیں۔ جب میرا قصور تھا تب ہر الزام میں آسانی سے سہہ گئی تھی مگر اب برداشت کرنا ناممکن ہے۔ چھ ماہ پہلے انہیں شدید ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ ان کے دل کا صرف ایک ہی روگ ہے اور وہ آپ ہیں۔ سب نے منع کیا تھا کہ آپ کو یہ بات نہ بتائی جائے مگر آپ بلند تھے سو شوق پورا ہو گیا ہو گا۔ جبکہ نہ مجھے آپ سے کوئی سروکار ہے اور نہ ہی آپ کے کسی وعدے سے۔ اب میرے لئے کوئی وعدہ...... کوئی بات، کوئی ربط تک...... کچھ اہمیت نہیں رکھتی۔ مجھے زندگی گزارنی ہے اور اسی حویلی میں گزارنی ہے۔ میں نے نہ پہلے آپ کی زندگی میں شامل ہونے کی کوشش کی ہے اور نہ اب کروں گی۔ آپ کو خط لکھنا صرف ایک بہانہ تھا۔ سب سمجھتے تھے کہ مجھے علم ہو گا کہ آپ کہاں ہیں؟ جبکہ میرے فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا۔" وہ بغیر رکے کتنا کچھ سنا گئی تھی۔ خاص طور پر بی بی جان کے بارے میں انکشاف نے اسے دہلا دیا تھا۔ اپنی ذات کا ماتم کرتے ہوئے وہ باقی ہر حقیقت، ہر شے کو فراموش کر بیٹھا تھا۔ کچھ دیر پہلے حاوی ہونے والا سارا جوش، سارا اشتعال، ساری فرسٹریشن منٹوں میں ہوا ہو گئی۔ اسوہ اب آہستہ آہستہ نارمل ہونے لگا تھا۔

"اور ہاں ایک بات اور سالک صاحب! جس عالی کا طعنہ آپ مجھے دیتے رہتے ہیں اور ساری حویلی والے دیتے رہتے ہیں اگر وہ مجھے سگی بہن کی طرح سمجھتا تھا تو میں نے اسے سگے بھائی والا مقام دیا تھا۔ میں نے یا اس نے جھوٹ کیوں بولے؟ اپنی ذات پر کیچڑ کیوں برداشت کیا؟ کاش اس کے متعلق سوچتے، نہ مجھے کل کوئی گوہر مقصود ملا تھا اور نہ ہی اب ملا ہے۔ اور جو ملا تھا......" وہ

باہر نکلنے سے پہلے دروازے پر ہی رکتے سب کہہ رہی تھی۔ وہ ایک انکشاف کے بعد دوسرا کر رہی تھی اور سالک کیفیت عجیب سے عجیب تر ہوتی جا رہی تھی۔

"خیر..... میں آپ کو یہ سب کیوں بتا رہی ہوں شاید اس لئے کہ آپ نے کچھ دیر پہلے پوچھا تھا کہ میں کیا چاہتی ہوں..... کاش سالک صاحب! یہ سوال آپ آٹھ سال پہلے کرتے........ نہ مجھے آپ کی کسی وعدہ ایفائی سے غرض ہے اور نہ ہی کسی اور بات سے۔" سرد سے لہجے میں اتنا کچھ کہہ کر وہ باہر نکل گئی تھی۔ پیچھے سالک کو حیران و ششدر چھوڑ کر۔

"یہ سب کیا تھا......؟" اس کے سامنے ایک بڑا سا سوالیہ نشان تھا۔ اس کی ذات گہرے بھنوروں میں گم ہونے لگی تھی۔ ہر طرف ماضی کی فلم چلنے لگی تھی۔ گزشتہ واقعات ایک ایک کر کے اس کے ذہن کے پردے پر چھانے لگے تھے۔

* * *

"مگر بابا جانی یہ کیسے ممکن ہے۔ ابھی تو صرف میں جونیئر کیمبرج میں ہوں۔ نو بابا جانی..... وہ مجھے پسند نہیں۔ وہ ابھی بہت چھوٹی ہے۔ مغرور بھی ہے۔" کل ہی لوٹا تھا جب آج صبح ہی بابا نے اسے اپنے روبرو طلب کر کے ایک خواہش ظاہر کی تھی۔ وہ ایک دم غصے سے ہی کھڑا ہو گیا تھا۔

"مگر ہم زبان دے چکے ہیں۔ شروع سے ہی ہماری یہی خواہش تھی۔ اسوہ بہت اچھی بچی ہے۔ بس عمر ہی ایسی ہے کہ شرارتی سی ہے۔ پھر وہ سارے گھر کی لاڈلی بھی تو ہے۔ سو کچھ ضدی اور، کھڑ مزاج ہے مگر بدتمیز ہرگز نہیں۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے۔ اگر تمہیں اس کے چھوٹے اور مغرور ہونے پر اعتراض ہے تو وقت کے ساتھ ساتھ وہ سمجھ جائے گی ابھی تو بچی ہے۔ لیکن ابھی ہم تم دونوں کی شادی کر رہے ہیں۔ میری ایک خواہش ہے، زندگی کا کچھ بھروسہ نہیں۔ میں مرنے سے پہلے تمہاری دلہن دیکھنا چاہتا ہوں۔" بابا آخر میں جذباتی ہو گئے تھے۔ اعتراض تو اس کے پاس بہت سے تھے مگر بابا کے سامنے وہ چپ ہو گیا تھا۔ اس کی زندگی کا ہر فیصلہ بابا جانی نے ہی تو کیا تھا۔ پہلے بھی اب بھی۔ بچپن سے لے کر اس عمر تک، اسے بابا جانی سے خاص انسیت تھی۔ اس کے لئے ان کا ہر کہا لفظ حرف آخر ہوتا تھا۔ اس کے مزاج، عادات، اخلاق و کردار، پر ان کی شخصیت کی گہری چھاپ رقم تھی۔ کبھی بھی اس نے ان کا دل دکھانے، ور ان کا حکم ٹالنے کی کوشش نہیں کی تھی مگر اب ان کا حکم..... وہ عجیب دوراہے پر آ کھڑا ہوا تھا۔ پھر وہ جس دور میں تھا کہ پسند جیون ساتھی کے خواب وغیرہ کوئی انہونی بات تو نہیں تھی۔ وہ خود بھی کم گو، سنجیدہ مزاج متین سی فطرت کا مالک تھا۔ بس اس کا آئیڈیل بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ اب اسوہ کا نام سن کر اس کی سوچیں منتشر ہونے لگی تھیں۔ وہ قطعی سالک کے لئے موزوں نہ تھی لیکن بابا جانی آج کل بیمار رہنے لگے تھے۔ گزشتہ ماہ ان کا روڈ ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ ان کی بیک بون متاثر ہوئی تھی۔ بیماری نے انہیں بہت حساس بنا ڈالا تھا۔ اب ہر وقت انہیں یہی گمان رہنے لگا تھا کہ کہیں کوئی لمحہ زندگی کی ڈور سے انہیں جدا نہ کر دے۔ سالک ان کی زندگی کی پہلی اور آخری خواہش تھا۔ اکلوتی اولاد تھا۔ اسوہ انہیں شروع سے ہی پسند تھی۔ اب انہوں نے دونوں کے نکاح کے لیے اصرار کیا تھا تو وہ پہلو تہی کی کوئی راہ تلاش نہیں کر پا رہا تھا۔ بہر حال اس حالت میں وہ بابا کو ہرٹ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ خاموشی سے کمرے سے نکل آیا تھا۔

بابا کے کمرے سے نکل کر ابھی وہ کاریڈور کراس بھی نہیں کر پایا تھا کہ سامنے ہی وہ آ کھڑی ہوئی۔ جس کے نام کی کڑواہٹ اس کی زندگی میں گھلنے والی تھی۔

"ہیلو کزن۔" مسکراتی آنکھیں اور کھلکھلاتا لہجہ تھا۔ وہ چپ چاپ کھڑا رہا۔ اسے اسوہ کی یہ بدتمیزی بہت زہر لگتی تھی کہ وہ کوئی حوالہ استعمال کئے بغیر اسے صرف کزن یا سالک کہتی تھی۔

"امی جان بتا رہی تھیں کہ آپ رات کو ہی لوٹی ہیں۔ کیسی طبیعت ہے؟"

"ٹھیک ہوں۔ تم کیسی ہو؟ اور اسٹڈی کیسی چل رہی ہے۔" اس نے تحمل سے پوچھا تھا۔

"بالکل اے ون۔ اور اسٹڈی کا پوچھتے ہی مت وہ چل نہیں رہی دوڑ رہی ہے۔ ہمیشہ کی طرح ٹاپ آف دی لسٹ میں رہوں گی۔" پُر اعتماد لہجہ، بے پرواہ بے فکر انداز تھا۔ اپنی جسامت کی وجہ سے اپنی باتوں کے برعکس وہ بہت کم عمر بلکہ کم سن سی بچی ہی لگتی تھی۔ جبکہ دونوں میں صرف سال ڈیڑھ سال کا فرق تھا۔ مگر اس کی نظر میں وہ بچی ہی تھی۔

آپ کو تو آنا ہی نہیں تھا اگلے ماہ آپ کے امتحان ہونے والے ہیں۔ پھر اب کیسے آئے؟" وہ آگے بڑھا تو وہ پوچھنے لگی۔ بلا کی باتونی تھی۔ مجال ہے کسی کو چپ رہنے دے۔

"بابا نے فون کر کے بلوایا تھا۔" وہ بھی ساتھ ہی چل رہی تھی۔ ایک دو دفعہ اس کا کندھا سالک کے کندھے سے مس ہوا تھا وہ شعوری طور پر دو قدم مزید آگے بڑھ گیا تھا۔

"کیوں؟" سادہ سا انداز تھا وہ چونک گیا مگر ظاہر نہ ہونے دیا۔

"بس ملنا چاہتے تھے۔" مختصراً بتایا۔

اتنی جلدی..... ابھی چندرہ دن پہلے ہی تو مل کر گئے تھے۔ وہ حیرت سے کہہ رہی تھی۔ وہ بات کی کھال نکالنے میں ماہر تھی۔ وہ چپ ہی رہا۔

"چلیں اچھی بات ہے۔ ایک دو دن رہیں گے ہی ناں۔ آج کل میرے ٹیسٹ ہو رہے ہیں۔ تھوڑی سی ہیلپ کروا دیجئے گا۔" سالک نے جان چھڑانے والے انداز میں فوراً سر ہلا دیا تھا۔ جانتا تھا وہ تھکی ہی نہیں ہے کہ حق حاکم نہیں تھی۔ کیا ہے؟ کیوں ہے؟ کے سوالات کے کرا سے زچ کر دیتی تھی۔ بس اس کی ہیلپ ہوتا تو ایک بہانہ ہوتا تھا اصل مقصد تو سے چڑانا ہوتا تھا مگر مجال ہے جو کبھی اس نے مدد کا غبار باہر آنے دیا ہو۔ اوپر سے اسے حویلی کے طور طریقے اور اصولوں کی پاسداری کا ہمیشہ خیال رہتا تھا۔ ہر بات میں شائستگی، رواداری، تحمل مزاجی کے وصف کا خیال رکھتا تھا۔ شور شرابے سے سخت نفرت تھی اور وہ تھی کہ بالکل متضاد تھی۔ شعلہ و جوالہ، ہر وقت ایک ہنگامہ برپا رکھنے والی، ضدی، اکھڑ، تند خو سی لڑکی تھی۔ اگر یہ کہا جاتا کہ ایک مشرق اور دوسرا مغرب ہے تو یہ بے جا نہ ہوتا۔ وہ واقعی ایسی ہی تھی۔

وہ سے چھوڑ کر بی بی جان کے پاس آ گیا وہ کچن میں ملازموں سے اس وقت صبح کا ناشتہ تیار کروا رہی تھیں۔

"بی بی جان مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

"ہاں کہو نا..... میں سن رہی ہوں۔" انہوں نے اسی مصروف سے انداز میں جواب دیا۔

"یہاں نہیں میرے کمرے میں چلیں۔" بی بی حیران ہوئیں پھر اس کے ساتھ اس کے کمرے میں آ گئیں۔

"بی بی جان میں اسوہ سے نکاح نہیں کروں گا۔" اس نے چھوٹتے ہی کہا تھا۔ اس وقت کمرے میں داخل ہوتی اسوہ دروازے پر ہی ٹھٹک گئی تھی۔

"ہیں..... کیا کہہ رہے ہو تم..... " بی بی حیران تھیں۔ اتنا مؤدب بیٹا انکار کیسے کر سکتا ہے۔

"بی بی جان! ہم بالکل مختلف ہیں۔ ہمارے عادات و اطوار، مزاج، سوچ، ہر لحاظ سے مختلف ہیں۔ آپ بابا جانی کو سمجھائیں۔ وہ مجھ سے میچ نہیں کرتی..... ایک کزن کی حیثیت سے میں اسے قبول تو کر سکتا ہوں مگر بیوی کی حیثیت سے قطعی نہیں۔" الجھا ہوا دو ٹوک انداز تھا۔ بی بی جان حیران ہوئیں انہیں اس انکار کی امید نہیں تھی۔

مگر ہم سب کچھ طے کر چکے ہیں۔ پرسوں تمہارا نکاح ہے۔ ابھی اسوہ کو اس معاملے کی خبر نہیں کی مگر تمہارے بابا جانی

زبان دے چکے ہیں۔ اور تم جانتے ہو انہیں اپنی زبان کا کتنا پاس ہوتا ہے۔" بی بی جان نے کچھ غصے سے کہا تو وہ بے چارگی سے دیکھنے لگا۔

"زبردستی تو نہیں بی بی جان! بس مجھے اسوہ پسند نہیں۔" اسوہ دھک سی کھڑی رہ گئی تھی۔

"تو پھر کون پسند ہے۔ وہی لڑکی جس کی تصویر تم لائے تھے۔ وہ جو تمہارے دوست کی بہن ہے۔" بی بی جان پوچھ رہی تھیں اور اسوہ الٹے قدموں واپس مڑ گئی تھی۔ اب مزید سننا اس کی برداشت سے باہر تھا۔

"نہیں بی بی جان! آپ غلط سمجھ رہی ہیں، مجھے اس انداز میں کوئی بھی پسند نہیں بس میں ابھی یکسوئی سے پڑھنا چاہتا ہوں۔ پلیز بی بی جان! وہ تو میری کلاس فیلو ہے۔ میرے دوست کی بہن ہے۔ وہ جو تصویر تھی وہ گروپ فوٹو تھی آپ نہ جانے کیا کہہ رہی ہیں۔ اپنے سالک پر ذرا بھی اعتبار نہیں۔" وہ نروٹھے پن سے گویا ہوا تھا۔ بی بی جان کو اس پر یکدم پیار آ گیا۔

"مجھے پتا ہے تم ایسے نہیں ہو۔ ہم پر بھروسہ کرو ... حرج کا کیا ہے ... کون سا ہم شادی کر رہے ہیں، صرف نکاح ہوگا۔ جب تم دونوں تعلیم سے فارغ ہو جاؤ گے تو شادی بھی ہو جائے گی۔ درمیان میں اچھا خاصا وقت ہے۔ اسوہ کے مزاج میں لاپروائی کا عنصر غالب ہے مگر پھوہڑ اور بدتمیز نہیں ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ سمجھ جائے گی۔" بی بی جان اسے سمجھا رہی تھیں۔

"مگر بی بی جان" [illegible]

"ہم پر اعتبار ہے ... تو بھروسہ رکھو ... ہم والدین ہیں تمہارے دشمن نہیں۔ تمہارے بابا جانی کی یہ خواہش ہے زندگی کے اس تکلیف دہ دور میں کیا تم ان کا کہنا نامراد کرو گے۔" بی بی جان نے جیسے فرار کی ساری راہیں ہی مسدود کر دی تھیں۔

"مجھے دنیا میں سب سے بڑھ کر آپ دونوں پر اعتبار ہے۔" وہ یکدم جذباتی ہو گیا تھا۔

"تو پھر یقین رکھو بیٹے ہم ان شاءاللہ اس اعتبار کو ختم نہیں ہونے دیں گے۔"

وہ چپ رہا تھا مزید بحث کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ نکاح کی تقریب بہت دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ بابا جانی تو جیسے ہر شوق پورا کرنا چاہتے تھے۔ ان کا بس چلتا تو رخصتی بھی کر دیتے مگر پھر دونوں کی تعلیم کا خیال تھا۔ دونوں ہی کم عمر تھے۔ ابھی بہت وقت تھا یکدم مطمئن ہو گئے تھے۔ نکاح کے اگلے دن ہی سالک کو واپس جانے کی پڑ گئی۔

"ابھی کچھ دن ٹھہر جاتے۔" بی بی جان اس کے بیگ میں کپڑے رکھ رہی تھیں۔ وہ کوئی جواب دیے بغیر آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے بال بنانے لگا۔ بی بی جان کو دو تین دنوں سے اس کی خاموشی بری طرح کھل رہی تھی۔

"سالک ناراض ہو ..." کپڑے چھوڑ کر پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"تو پھر اتنے چپ کیوں ہو۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔ اتنی پیاری، بھولی بھالی ہنس مکھ سی لڑکی تمہارا نصیب بنی ہے۔" وہ اب اسے سمجھا رہی تھیں۔

"کچھ وقت دیں بی بی جان! پلیز جب یوں اچانک زندگی میں ایک ایسا واقعہ رونما ہو جائے جو وہم و گمان میں بھی نہ ہو تو انسان کا شاک زدہ ہو جانا یقینی ہے۔" وہ کافی ڈسٹرب تھا۔ بی بی جان نے اس کی پیشانی چوم لی۔ ایک دم ہی بہت پیار آیا اس پر۔
میری دعا ہے اللہ تمہیں ڈھیروں خوشیاں اور سکھ دے۔ اسوہ اچھی لڑکی ہے تمہاری ہم عمر ہی ہے۔ تم بہت جلد مطمئن ہو جاؤ گے دیکھ لینا۔" اس کا چہرہ ہاتھوں میں بھر کر انتہائی یقین سے کہا تو وہ مسکرا دیا۔

"اور ہاں ... جانے سے پہلے تم ذرا اسوہ سے بھی مل لینا۔" وہ دوبارہ کپڑوں کی طرف متوجہ ہو گئیں وہ اس تجسس پر حیران ہوا۔ "کیوں؟"

"وہ بھی تمہاری طرح بڑی جذباتی ہو رہی تھی۔ پہلے تو مان ہی نہیں رہی تھی، کہتی تھی کہ تم اسے بالکل کزنوں کی طرح

... سمجھا پھر تمہارے بابا جانی نے ہی بات کی تو نہ جانے کیسے راضی ہوئی تھی۔ تین دن کمرے سے نہیں نکلی۔ نکاح کے وقت بھی بخار تھا اب تو کچھ دیر پہلے تپ رہی تھی۔ ایک سو چار بخار ہے۔ بی بی بھی بے حد ہو رہا ہے۔ تم اسے دل سے ... حساس سے عاری سمجھتے ہو۔ دیکھ لو وہ تم سے زیادہ حساس ہے۔" بی بی جان بتا رہی تھیں وہ چپ چاپ سنتا رہا۔ بہر حال وہ پہلی سے پہلے کزن تھی۔ جیسی بھی تھی سب گھر والوں کی لاڈلی تھی اگرچہ تھی تو بری اسے بھی نہیں لگتی تھی۔ اس کی بیماری کا سن کر اس کی سوچ مثبت سمت گھومنے لگی تھی۔

رخصت کے وقت سب سے ملنے کے بعد وہ اس کے کمرے میں بھی آیا تھا۔ وہ بستر پر بے سدھ لیٹی ہوئی تھی۔ چچی جان قریب ہی پریشان بیٹھی تھیں۔ اسے دیکھ کر خوش ہوئیں۔ وہ حدود کا خاص خیال رکھنے والا بندہ تھا۔ خاص طور پر اسوہ کے کمرے میں بہت کم آتا تھا۔ اب بھی جھجک رہا تھا۔

"آپ کیوں گئے سالک! آؤ ... اندر آؤ۔" بے سدھ لیٹی اسوہ نے بھی آنکھیں نیم وا کر کے اسے دیکھا تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھ رہا تھا اس نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔

"بی بی جان ذکر کر رہی تھیں کہ اسوہ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ میں واپس جا رہا تھا سوچا طبیعت پوچھ لوں۔" وہ وضاحت پیش کر رہا تھا۔ چچی جان مسکرا دیں۔

"بس شاید موسم کا اثر ہو گیا ہے۔ ایک سو چار بخار ہے۔ بلڈ پریشر کا تو پوچھو ہی نہیں۔ میں حیران ہوں، اس عمر میں ..." اسوہ کی پلکیں لرز رہی تھیں وہ بمشکل نظریں ہٹا سکا۔ [illegible] چہرہ کیوں دل کے بہت قریب لگ رہا تھا۔ شاید رشتہ بدل گیا تھا اس لئے۔

اسے نہیں علم کہ اسوہ کبھی بیمار بھی ہوئی ہو، پہلی دفعہ ہے بخار آیا تھا سب ہی پریشان اور متفکر تھے، اور بی بی جان نے جو جتائی تھی وہ بھی نظر انداز کی جانے والی نہ تھی۔

"سو رہی ہے اسوہ۔" اس کی پلکیں لرز رہی تھیں مگر آنکھیں وا کرنے کی کوشش نہیں کی تھی اسی لئے اس نے چچی جان سے پوچھا تھا۔

"شاید ... تھوڑی دیر پہلے تو جاگ رہی تھی۔" چچی خواہ مخواہ شرمندہ ہوئیں۔

کوئی بات نہیں، مجھے دیر ہو رہی ہے۔ میں چلتا ہوں، میری طرف سے ضرور پوچھیے گا۔" وہ اپنی رواداری اور شائستگی کی بدولت سارے خاندان میں سراہا جاتا تھا اب بھلا کیوں نہ کرتا۔ چچی جان نے سر ہلایا تھا۔

وہ باہر نکلا تو چچی جان بھی اسے گاڑی تک چھوڑنے باہر تک آئیں۔ باقی لوگوں سے وہ مل چکا تھا۔ اس کے کمرے سے نکلنے کے بعد اسوہ نے آنکھیں کھول لی تھیں۔ آنسو قطار در قطار رخساروں پر بہتے چلے گئے تھے۔ دل کی عجیب سی حالت ہو رہی تھی۔ ہر بات اپنے اختیار سے باہر محسوس ہو رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ چند دن پہلے تک زندگی بہت حسین تھی۔ اب اچانک ہی ساری رونق، ساری خوشیاں کہیں کھو گئی ہیں۔ زندگی سے ایک دم جی اچاٹ سا ہونے لگا تھا۔

وہ ہوسٹل میں تھا جب بی بی جان کا فون آیا تھا۔ "تمہارے بابا جانی کی طبیعت سخت خراب ہے، جلدی آنے کی کوشش کرو۔" چاچا جان کی اطلاع نے اس کے اعصاب پر بم پھوڑا تھا۔ اب بار بار چھٹیاں لینا بھی مشکل تھا مگر وہ مجبور تھا۔ جیسے تیسے کر کے چھٹیاں لے کر وہ حویلی پہنچا تو وہاں ایک کہرام برپا تھا۔ اس کے آنے سے پہلے ہی بابا جانی اسے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔

بی بی جان پر ایک سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔ ساری حویلی جیسے طوفان کی زد میں آ گئی تھی۔ اپنے ہاتھوں سے اس نے بابا جانی کو لحد میں اتارا تھا۔ پھر کتنے دن اسی خاموشی میں گزر گئے۔ چچی جان کی بڑی بیٹی منتہیٰ جو پھوپھو کے گھر بیاہی گئی تھی۔ وہ بھی یہیں تھی۔

اسوہ چچا جانی، چچی جان سب ہی غمزدہ تھے اور وہ تھی کہ خود تنہا سے تنہا ہوتا جا رہا تھا۔ ہر لمحہ یونہی لگتا تھا کہ جیسے اس کا سب سے قیمتی سرمایہ کہیں کھو گیا ہو۔

اسے چائے کی طلب تھی سراج بابا کو کہہ کر وہ صوفے پر آ بیٹھا تھا۔ ابھی اسے بیٹھے چند پل ہی گزرے ہوں گے جب اسوہ بھی ادھر آ گئی تھی۔ نہ جانے کیا بات تھی چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ وہ ادھر اُدھر دیکھے بغیر کونے میں کشن پر جا بیٹھی تھی۔ گھٹنوں میں منہ دیئے وہ نجانے کس کا غم منا رہی تھی۔ نکاح کے بعد تو وہ اسے دوسری دفعہ دیکھ رہا تھا۔ بہت کم وہ اس کے سامنے آئی تھی۔ پہلے والی کوئی بات ہی نہیں رہی تھی اس میں۔ اوپر سے بابا جانی کا دکھ، اسے علم تھا وہ بابا جانی سے بہت پیار کرتی تھی۔ چچا جانی سے بھی بڑھ کر۔ اور بابا بھی تو اس پر جان دیتے تھے۔ وہ اٹھ کر اس کے قریب آ گیا۔ نہ جانے کیوں اس کا رونا دل کو مضطرب کئے دے رہا تھا۔

"اسوہ۔" اس کی پکار پر اس نے ایک دم سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر اپنے دوپٹے سے چہرہ خشک کر لیا۔ "کیا بات ہے؟ کیوں رو رہی ہو؟" اس کا لہجہ بہت نرم اور محبت لئے ہوئے تھا۔

"نہیں کوئی بات نہیں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ پیچھے کی طرف قدم بڑھاتے وہ کچھ فاصلے پر ہو گئی تھی۔ "آئم سوری..... میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا۔ مجھے نہیں علم تھا کہ آپ یہاں ہیں۔" نجانے اس کے لہجے میں کیا تھا، طنز، تحقیر، بے بسی یا غم کی کیفیت وہ سمجھے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ وہ جس طرح بدک گئی تھی [illegible] کمرے سے نکل گئی تھی۔

"تم کیا جانو..... وہ حقیقت تو میں واقعی ہو گیا ہوں۔ تم بابا جانی کی بہت چہیتی تھیں اور اب......" وہ لب بھینچ گیا تھا۔ نظریں دروازے پر ہی جمائے [illegible] سراج بابا چائے لے کر آ گئے تھے۔

زندگی گزرنے لگی تھی۔ اسوہ کے لئے اس کی محبت دن بہ دن بڑھتی جا رہی تھی مگر وہ بہت حدود کا خیال رکھتا تھا۔ کبھی آگے بڑھ کر اسوہ کی خیریت دریافت نہیں کی تھی اور کبھی اس کی زندگی میں مداخلت کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ دستور والا بندہ تھا۔ اس کی تربیت ان ہی خطوط پر ہوئی تھی۔ وہ ہر رشتے کو عزت و احترام دیتا تھا پھر محبت کرتا تھا۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ اسوہ کے دل میں اس کے لئے کیا احساسات ہیں۔ بس وہ اس سے محبت کرنے لگا تھا۔ نکاح کے بول دلوں میں انسیت پیدا کر دیتے ہیں۔ سو اس کا دل بھی اسوہ کے نام پر دھڑکنے لگا تھا۔ وہ اس کی تھی، اس کے نکاح میں تھی۔ جانتا تھا وہ جب چاہے گا رخصتی کروا لے گا۔ اس سے پہلے وہ تعلیم حاصل کرنا چاہتا تھا۔ شروع میں اسوہ اس سے کتراتی رہی تھی مگر پھر رفتہ رفتہ اس نے بھی اس تعلق کو قبول کر لیا تھا۔ وہ پہلے کی ہی طرح ہو گئی تھی۔

شوخ و چنچل، اکھڑی ضدی، بلکہ اب تو اس کے اندر کچھ اور بھی وصف پیدا ہو گئے تھے۔ طنز و استہزاء، اس کا سامنا ہوتا تو ہر بات طنز سے شروع ہو کر طنز پر ختم ہوتی تھی۔ کبھی وہ حیران ہوتا اور کبھی چڑ جاتا تھا مگر کبھی منفی انداز میں نہیں سوچا تھا۔ ہاں اسے اس کے مزاج کی لاپروائی اور ضدی و اکھڑی طبیعت سخت ناپسند تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ رخصتی سے پہلے وہ اپنے آپ کو چینج کر لے۔ اسی لئے دبے دبے لفظوں میں وہ اکثر بی بی جان، چچی جان اور ملیحہ سے بھی کہہ چکا تھا۔ وہ سب اسے سمجھاتی تھیں مگر وہ بھی نجانے کس مٹی سے بنی ہوئی تھی کہ پہلے سے زیادہ خودسر بنتی جا رہی تھی۔ خود سے وہ کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھتا تھا اور اسوہ کو جیسے اس کی پرواہ نہیں تھی۔ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے وہ سمجھنے سے قاصر تھا اور پھر وقت کچھ اور گزر گیا تھا۔

ایف اے کے بعد اسوہ نے ساری حویلی والوں کو زچ کر رکھا تھا۔ ایف اے میں اس کی فرسٹ پوزیشن آئی تھی۔ اس نے پھر ٹاپ کیا تھا۔ اسی لئے وہ بضد تھی کہ لاہور جا کر ہوسٹل میں رہ کر مزید تعلیم حاصل کرے گی۔ قریبی کالج صرف ایف اے تک تھا۔ جبکہ ان کے خاندان میں پرائیویٹ اعلیٰ سطح پر تعلیم حاصل کرنے پر کوئی پابندی نہیں تھی مگر عورت ذات کا ہوسٹل میں جا کر پڑھنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔

ان دنوں وہ اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر جانے کی تگ و دو میں تھا۔ کاغذات تیار ہو رہے تھے۔ حویلی کی خواتین نے اسے اسوہ کی اس ضد سے قطعی بے خبر رکھا ہوا تھا۔

وہ نہا کر باہر نکلا تو اپنے کمرے میں اسوہ کو دیکھ کر چونکا۔ اپنے حلیے کا احساس ہوتے ہی اس نے فوراً بیڈ سے کپڑے اٹھائے۔ ایک ناپسندیدگی کی نظر اسوہ پر ڈالی جو شاید آئی ہی اس مقصد کے لئے تھی کہ اسے زچ کرے۔

"کسی کے کمرے میں آ کر بیٹھنے کا یہ کونسا طریقہ ہے؟" مانا کہ ان دونوں کے درمیان ایک گہرا رشتہ تھا مگر اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ یوں کمرے میں آتی۔ اس کا دل اس کی طرف سے بدگمان ہوا۔

"کسی کے کیوں، میں اپنے شوہر کے کمرے میں اس کے بیڈ پر بیٹھی ہوں۔ ایسی کونسی معیوب حرکت ہے یہ۔" ترکی بہ ترکی جواب ملا تھا۔ لہجہ طنزیہ تھا آنکھوں میں شرم و حیا نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اسے افسوس ہوا۔

"اسوہ" وہ ٹوک گیا۔ وہ اس وقت باتھ گاؤن میں ملبوس تھا۔ بغیر اس کو کچھ کہے وہ باتھ روم میں گھس گیا۔ شلوار قمیص پہن کر آیا تو وہ اسی طرح ریلیکس موڈ میں بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگائے اس کی منتظر تھی۔

"مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔" [illegible] سالک چپ رہا۔ تولیے سے بال خشک کرتے اسے صرف دیکھا۔ یہ وہی اسوہ تھی [illegible] جو دن بدن بگڑتی جا رہی تھی۔ یہ سالک کی [illegible] تھی۔

"میں مزید پڑھنا چاہتی ہوں۔ لاہور جا کر ہاسٹل میں رہ کر۔" وہ حیران ہو کر دیکھنے لگا۔ پڑھنے پر نہیں لاہور جا کر ہاسٹل میں رہ کر پڑھنے پر ہوا تھا۔ وہ جانتا تھا اس وقت اگر کمرے میں آئی ہے تو کوئی چھوٹی بات نہیں ہو گی۔ ایک گہری سانس لی۔

"تم مجھے اطلاع دے رہی ہو کہ اجازت مانگ رہی ہو؟" تولیہ ایک طرف پھینک کر وہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ گہرے آتشی لباس میں وہ خود بھی آگ کی طرح دہک رہی تھی۔ سالک کی آنکھوں میں رنگ سے اترنے لگے۔ مگر اس کے اگلے الفاظ سن کر اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

"دونوں ہی نہیں..... صرف یہ پوچھنے آئی ہوں کہ اس حویلی کے مرد جب ہر عیاشی افورڈ کر سکتے ہیں، خود باہر جا کر پڑھتے ہیں تو پھر اس حویلی کی عورتوں پر پابندی کیوں؟" وہ سوالیہ نشان بنی جواب کی منتظر تھی۔ سالک بڑی مشکل سے اپنے غصے کے اشتعال کے ردِ عمل پر قابو پا سکا تھا۔ خاص طور پر "عیاشی" کے لفظ پر دماغ گھوم گیا تھا۔ در پردہ وہ کیا کہنا چاہ رہی تھی، کیسے کہہ رہی تھی وہ بخوبی سمجھ گیا تھا۔

"اسوہ حد ہوتی ہے۔ کچھ کہتے ہوئے لفظوں کے چناؤ کا خیال کیا کرو۔" وہ صرف یہی کہہ سکا تھا۔ یک دم مشتعل ہو جانا اس کی نیچر نہیں تھی۔ سب بھی برداشت کر گیا تھا۔

"میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ میں کیا کہہ رہی ہوں اور کیا لفظ استعمال کر رہی ہوں۔ جب آپ باہر جا کر پڑھ سکتے ہیں تو میں تو صرف اسی ملک میں رہ کر پڑھنا چاہتی ہوں پھر بابا جانی اور امی جان دونوں مجھ پر پابندی کیوں لگا رہے ہیں۔ جبکہ سب جانتے ہیں میں جو ایک دفعہ سوچ لیتی ہوں وہ کرتی بھی ہوں۔ سب میری فطرت سے واقف ہیں۔ اگر مجھے خود اجازت نہیں دیں گے تو میں درمیانی رستہ نکال لوں گی مگر یوں چھپ کر نہیں پڑھوں گی۔" اور وہ درمیانی رستہ کیا ہو سکتا تھا وہ بخوبی سمجھ رہا تھا وہ ایسی ہی ضدی تھی کچھ بھی کر سکتی تھی۔

"تو تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟" اس نے آرام سے پوچھا تھا۔

"کچھ بھی نہیں..... صرف اتنا باور کرانا چاہتی ہوں کہ میں اسوہ ہوں، کوئی قیدی یا بے جان وجود نہیں ہوں۔ یہ زندگی میری ہے اسے اپنی مرضی سے گزاروں گی۔ کسی کی خاطر خود کو بدل نہیں سکتی۔ آپ کو گوارا ہے تو ٹھیک ورنہ......" اس ورنہ کے آگے

کیا تھا وہ یہ بھی سمجھ گیا تھا۔ دل تو چاہا کہ خوب سنا دے مگر دل کسی کام کا نہیں رہا تھا جو اسے دیکھتے ہی ہر بات بھول جاتا تھا۔ اگر کچھ یاد رہتا تھا تو وہ "اسوہ" کا نام ہوتا تھا۔

"اور ہاں سالک صاحب..... میں اپنی ذات میں کسی کی مداخلت برداشت نہیں کرتی۔ آپ پاس جو کچھ ہے۔ میں کبھی آپ کی مجبوری نہیں بنوں گی اور یہی خواہش میری بھی ہے کہ آپ بھی راہ میں کبھی حائل نہیں ہوں گے۔"

وہ دروازے کے پاس رک کر کہتے اپنی بات کر کے کمرے سے نکل گئی تھی۔ سالک کی ذات زلزلوں کی زد میں چھوڑ کے وہ جانتا تھا اسوہ رویوں نے اسے محسوس کروا دیا تھا کہ نکاح کے لفظ ایک کے دل میں ایک جیسے جذبات پیدا کرنے کا سبب نہیں بنے وہ جانتا تھا کہ وہ اسے ناپسند کرتی ہے۔ اس کے طنزیہ رویے، کاٹ دار جملے اسے یہ باور کروانے کو کافی تھے مگر اس حد تک وہ اس کی ذات کی نفی کر جائے گی اسے امید نہیں تھی۔ اسوہ کے متعلق دل میں جو چند خوش فہمیاں برقرار تھیں اس گفتگو کے بعد وہ بھی اپنی موت آپ مر گئی تھیں۔ اس کے متعلق ناپسندیدگی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

سالک نے چچا جان سے بات کی اور انہیں اسوہ کے لاہور جا کر پڑھنے پر راضی کر لیا تھا۔ وہ شوہر تھا اسے کوئی اعتراض نہیں تھا تو بھلا وہ کیا کہتے۔ اس کا ایڈمیشن سالک نے خود کروا دیا تھا۔ ہاسٹل میں رہنے کا بھی بندوبست ہو گیا تو وہ اپنے کام کرنے میں لگ گیا۔ اسوہ لاہور چلی گئی تو وہ بھی نیویارک آ گیا۔

سب ہی اکثر بیشتر فون کرتے رہتے تھے سوائے اسوہ کے۔ اسوہ کے نام کا ورد اب اسے مستقل لاحق رہنے لگا تھا مگر دونوں سے خاص طور پر بی بی جان سے اس کی خیریت کی اطلاع ملتی رہتی تھی۔

وقت گزرنے لگا تھا اسی بھاگ دوڑ میں تین سال گزر گئے۔ پہلے سال چھٹیوں میں وہ ایک ماہ کے لئے پاکستان گیا تھا پھر دوبارہ نہیں گیا تھا۔ اس دفعہ چھٹیاں ہوئیں تو وہ بغیر اطلاع کے پاکستان پہنچ گیا۔ اسوہ نے گریجویشن کے بعد ایک دفعہ پھر ایم اے کرنے کے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا تھا۔ وہ حویلی پہنچا تو سب ہی خوش ہوئے۔ اسوہ لاہور میں ہی تھی، پنجاب یونیورسٹی میں ہی پڑھتی تھی۔ گھر والوں نے اسے فون کر کے اس کی آمد کی اطلاع دے دی تھی مگر وہ سخت دل کٹھور لڑکی نہیں آئی تھی۔ ڈرائیور لینے گیا تو اس نے آنے سے انکار کر دیا اور اسے واپس بھیج دیا۔ سالک کو دکھ تو بہت ہوا مگر برداشت کر گیا۔ چچا جان کو لاہور کچھ کام تھا۔ منڈی میں فصلیں بکوائی تھیں، باغات کی فصل بھی بھیجنی تھی۔ وہ جا رہے تھے اس نے انہیں منع کر دیا اور خود چلا آیا۔ سارا کام نمٹانے کے بعد ایک ہوٹل میں بیٹھا چائے پی رہا تھا جب فائیو اسٹار ہوٹل میں ایک خوش شکل وڈیسنٹ سے لڑکے کے ساتھ ایک اور لڑکی کی موجودگی میں اسوہ داخل ہوئی تھی۔ چادر ابھی بھی اس نے اوڑھی ہوئی تھی مگر وہ مسلسل کسی بات پر مسکرا رہی تھی۔ وہ تینوں چلتے ہوئے اس کے عقب میں رکھی ٹیبل پر آ بیٹھے تھے۔

"اسوہ دیکھ لو..... یہ عالی کسی دن ضرور مجھ سے پٹے گا۔" وہ دم سادھے سانس روکے بیٹھا ہوا تھا جب دوسری لڑکی کی آواز سنائی دی تھی۔ اسوہ نے اسے بالکل نہیں دیکھا تھا۔ کیونکہ اس کی کرسی کی پشت سالک کی پشت کی طرف تھی۔

"عالی! مت تنگ کرو نا اسے......" یہ اسوہ کی آواز تھی جو وہ لاکھوں میں بھی پہچان سکتا تھا۔

"مادام! ہم آپ کو تو کچھ نہیں کہہ رہے...... آپ کے لئے ہمارے دل میں جو محبت ہے یہ محترمہ اس سے جیلس فیل کر رہی ہیں۔" یہ اس لڑکے کی آواز تھی جواباً اسوہ کی ہنسی سنائی دی تھی۔

"تم بھی بس نا۔"

"کیوں؟ محترمہ کہکشاں صاحبہ! غلط کہہ رہا ہوں میں کیا میں محبت نہیں کرتا اسوہ سے، کر سکتی ہو تم مجھے چیلنج۔" وہ دوسری لڑکی سے مخاطب تھا۔ سالک کے لئے برداشت مشکل ہو رہی تھی۔

اسے لگ رہا تھا کہ اگر اس لڑکے نے مزید کچھ اور بکواس کی تو وہ اس کا گریبان پکڑ لے گا۔ مگر وہ بڑی مشکل سے خود پر کنٹرول کر رہا تھا۔

"ہاں..... ہاں میں محبت کرتا ہوں تمہیں بھی، اور تمہاری اس مادام کو بھی۔ دیکھ لینا تم دونوں، کیدو کا کردار ادا نہ کیا تو کہنا...... بڑے آئے محبت کرنے والے دو آفاقی دل۔" وہ لڑکی لڑ رہی تھی۔

"ہا ہا ہا..." لڑکے کے قہقہے بے اختیار تھے جن میں اسوہ کی ہنسی بھی صاف سنائی دی تھی۔

"ہاں کرتے ہیں ہم محبت..... اسوہ وہ گانا کیا ہے، ہاں یاد آیا...... اگر دو دل مل جاتے تو بگڑتا کیا زمانے کا..... اگر دو دل......"

سالک کے لئے اب یہ سب برداشت کرنا ممکن نہیں تھا مگر اس وقت سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں مفقود ہوتی جا رہی تھیں۔ کھڑے ہو کر اس نے اپنا رخ اس ٹیبل کی طرف کیا تھا۔

"ویٹر..... ویٹر جوس ٹیبل پر رکھتا سرو کر رہا تھا جب اس نے پکار لیا تھا۔ اس کی آواز تھی یا یوں ہی اسوہ نے پلٹ کر دیکھا تھا۔ وہ آنکھوں میں نفرت ہی نفرت لئے دیکھ رہا تھا۔ نظریں گھور رہی تھیں۔ ویٹر فوراً اس کی طرف آیا تھا۔

"یہ بل اٹھا بینا۔" ویٹر کو کہہ کر ایک آخری حقارت بھری نظر اسوہ پر ڈال کر وہ بے لیے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا تھا۔ اسوہ جو صورتحال سمجھ بھی نہیں سکی تھی اسی رخ بیٹھی رہ گئی۔

"ہیلو..... مادام..... تمہیں کیا ہو گیا..... کوئی سانپ سونگھ گیا ہے یا کوئی جن بھوت دیکھ لیا ہے۔ میرا خیال ہے جن ہی دیکھ لیا ہے۔ میرا اسوہ ڈیئر سسٹر! مجھے بھی تو جن دکھاؤ۔ زندگی میں کبھی پہلے کبھی جن نہیں دیکھا۔" وہ سیدھی ہو گئی تھی۔ مسلسل ذہنی رو بہکی ہوئی تھی۔ جبکہ عالی مسلسل بکواس کر رہا تھا۔

"یہ یہاں کیا کر رہے تھے۔" وہ ایک ہی سمت سوچ رہی تھی۔ "اگر وہ کچھ کہتے تو ملے بھی لیتے۔ مگر خیر..... مجھے کیا؟ میں کون انہیں پسند ہوں اوپر سے اس قدر آزاد منش ہوں میں عالی اور کہکشاں کے ساتھ دیکھ کر جل بھن ہی گئے ہوں گے۔" وہ بہت حتمی ہو کر سوچ رہی تھی۔

* * *

کل سے لے کر ماما جانی کے کئی فون آ چکے تھے کہ وہ کب آ رہی ہے۔ ڈرائیور انہوں نے کل ہی بھیج دیا تھا۔ اس کی اہم اسائنمنٹ تھی اگر فکر نہ ہوتی تو فوراً چلی جاتی اور اسائنمنٹ جن پروفیسر صاحب کی تھی وہ تو بے عزتی کرنے میں ماہر تھے۔ وہ صرف اسائنمنٹ جمع کروانے کو رکی ہوئی تھی۔ پروفیسر صاحب کا چوتھا پیریڈ تھا اسائنمنٹ جمع کروا کے وہ فوراً گاڑی میں آ بیٹھی تھی۔ ویسے تو ایک گاڑی بمعہ ڈرائیور ہر وقت اس کے ساتھ ہوتی تھی مگر جب بھی گاؤں سے اسپیشل بلاوا آتا تھا تو گاڑی بھی اسپیشل ہی آتی تھی۔

گاؤں پہنچی تو بی بی جان اور امی جان سب ہی خوش ہوئے البتہ بابا سرد سے انداز میں ملے تھے۔ سالک کہیں دکھائی نہ دیا۔ سارا دن سکون سے گزر گیا تھا مگر رات بابا جان نے اسے جو حکم سنایا وہ ساکت سی رہ گئی۔

"اب تم لاہور نہیں جاؤ گی۔ میں نے تمہاری رخصتی کی تاریخ فکس کر دی ہے۔ سالک بہت کم چھٹیوں پر آیا ہے۔ اسے واپس بھی جانا ہے۔ میں اب اس ذمے داری سے سبکدوش ہونا چاہتا ہوں۔" کھانے کی ٹیبل پر سب ہی تھے سالک بھی تھا۔ بڑے سرد سے انداز میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس انکشاف پر بھی اس نے سر نہیں اٹھایا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ پہلے سے باخبر ہو جبکہ چچی جان اور بی بی جان دونوں حیران ہوئی تھیں۔

"مگر بابا جانی! میرا لاسٹ ایئر ہے۔ میں کیسے چھوڑ سکتی ہوں۔ ایک ہفتے بعد میرے سمسٹر ٹیسٹ ہونے والے ہیں۔"

سالک اب بھی چپ تھا جیسے چپ شاہ کا روزہ رکھا ہو۔ بی بی بھی کچھ الجھ گئی تھیں۔ نہ کوئی مشورہ نہ کوئی صلاح ایک دم یہ فیصلہ اور پھر سالک کی خاموشی۔

"بس ...... بہت کرلی پڑھائی تم نے۔ منشی کو میں نے فون کر دیا ہے وہ کل پہنچ جائے گی۔ آپ سب خواتین مل کر شادی کی تیاری آسانی سے کر لیجئے گا۔" اب ان کا اشارہ راضیہ اور بی بی جان کی طرف تھا۔

"مگر اتنی جلدی...... ابھی سالک ماشاءاللہ پڑھ رہا ہے۔ اسوہ بھی ابھی ہوئی ہے۔ بعد میں سہولت سے کام ہو جائے گا۔" بی بی جان نے کہا تھا۔

"نہیں بھابی بیگم! جب سہولت سے کام ہوگا...... یہ لڑکی ہماری عزت کو بٹہ لگا چکی ہوگی۔ میں کچھ نہیں دیکھوں گا۔ بہت کر لی اس نے اپنی من مانی اب صرف رخصتی ہوگی۔"

"مگر ...... بابا جانی ......" بابا جان نے کچھ بھی نہ کہتے ہوئے سے بیچ چوراہے پر لا کھڑا کر دیا تھا اور سالک، اس کی نظریں بے اختیار اس پر اٹھ گئیں۔ چند دن پہلے سے جو نظریں دکھائی دی تھیں اب بھی وہی نظریں تھیں وہ تب سمجھ نہیں سکی تھی مگر اب سالک کی آنکھوں میں واضح کہ شک اسے اپنی موت آپ مر گیا تھا۔

"نہیں ...... بابا جانی نہیں ...... وہ ... کسی میں کچھ بھی نہیں کہہ سکی تھی۔ نجانے بے اعتباری سے سب کو دیکھے گی۔ کیسے یقین کر لے، یہ جو اتنے پیارے رشتے تھے، جن کے بارے میں اسے یقین تھا کہ وہ اس پر انگلی نہیں اٹھا سکیں گے وہ اس کو شک کی نظر سے دیکھ رہے تھے اور یہ شک کی مار اتنی اذیت ناک تھی کہ اسے اپنا جسم نیل و نیل ہوتا محسوس ہوا۔ دل تو چاہا کہ چیخ چیخ کر کہے وہ سب غلط ہیں۔ ان کی سوچیں غلط ہیں وہ بالکل بے گناہ ہے۔ وہ شخص جسے اس کے ساتھ منسوب کیا جا رہا ہے وہ تو اسے بھائیوں کی طرح عزیز ہے۔ مگر وہ ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکال سکی۔ صرف نفی میں سر ہلاتی بھاگتے ہوئے اپنے کمرے میں جا کر بند ہو گئی تھی۔

احتجاج، جھگڑے، بھوک ہڑتال ہر حربہ اس نے استعمال کر دیکھا تھا مگر بابا جان کا فیصلہ نہیں بدلا تھا۔ وہ یوں بے موت نہیں مرنا چاہتی تھی۔ جھولی تو اس کی پہلے ہی خالی تھی، بلکہ دل میں ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی مگر وہ جسمانی طور پر بھی خالی ہونے کو تیار نہیں تھی۔ خاص طور پر سالک کے نام پر تو کبھی بھی نہیں۔ سالک کے نام سے اسے ایک نفرت سی محسوس ہونے لگتی تھی کجا کہ ساری زندگی۔

"بی بی جان! آپ بابا جانی کو سمجھائیں ...... میں مر جاؤں گی۔ یوں نہیں کریں۔" اس دن بی بی جان اس کے کمرے میں آئیں تو وہ ان کے پاؤں پڑ گئی۔ بی بی جان ایک دم تڑپ اٹھی تھیں۔ یہ نازوں پلی لڑکی انہیں بہت عزیز تھی اس کا یوں تڑپنا رونا دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ ایک دم اسے اٹھا کر سینے سے لگایا۔

"اللہ نہ کرے، مریں تمہارے دشمن۔ صرف شادی ہی تو ہو رہی ہے تمہاری۔" انہوں نے اس کے لمبے سیاہ بکھرے بال کانوں کے پیچھے اڑسے ہوئے تھے۔

"بی بی جان نہیں...... میں مر جاؤں گی۔ سچ میں مر جاؤں گی۔ میں نے جیسے تیسے اس نکاح کو قبول کر لیا تھا مگر یہ شادی ...... بی بی جان! مجھے صرف پڑھنا ہے۔"

"ادھر بیٹھو...... یہ پانی پیو۔" انہوں نے اسے بستر پر بٹھایا تھا۔ پانی پلایا تو اسوہ کو کچھ سکون ملا۔ "وہ لڑکا کون تھا؟" بی بی جان نے پوچھا تھا۔ وہ ساکت رہ گئی۔

"بی بی جان آپ بھی۔" وہ یقین کرنے کو تیار نہ تھی، بی بی جان نظریں پھیر گئیں۔

"کیوں بتاؤں کون تھا وہ لڑکا؟ کوئی بھی ہو...... مگر آپ کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں۔ آپ اسے جو بھی معنی پہنائیں مجھے فرق نہیں۔" وہ ایک دم طیش میں آ کر کہتی گئی تھی۔ اس وقت اپنا کوئی ہوش نہیں رہا تھا۔

"جائیں ...... آپ یہاں سے...... مجھے پیدا کرنے والے، مجھے نہ سمجھ سکے، آپ تو پھر اس شخص کی ماں ہیں جس نے مجھے دیکھا تھا ایک غیر مرد کے ساتھ۔ جائیں یہاں سے پلیز چلی جائیں میری نظروں کے سامنے سے...... ورنہ میں کچھ کر بیٹھوں گی۔" وہ اپنے ہوش و حواس کھونے لگی تھی۔ ایک دم چیختے ہوئے کہہ رہی تھی۔ بی بی جان ڈر گئیں۔ فوراً باہر نکل گئیں۔

وہ سالک سے ایک دفعہ ملنا چاہتی تھی۔ اس سے اپنا قصور پوچھنا چاہتی تھی۔ پوچھنا چاہتی تھی کہ اگر اس حد تک نفرت کرتا تھا تو درمیان میں یہ تعلق نہ بناتا۔ نجانے کہاں ہوتا تھا، کسی کو کچھ علم بھی نہیں تھا۔ وہ رات دیر تک انتظار کرتی رہی آخر کار وہ گھر آ ہی گیا۔ وہ کمرے سے باہر نکل آئی، وہ اوپر جا رہا تھا۔ کچھ دیر کھڑی رہی پھر سوچ کر آگے قدم بڑھا دیے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا وہ اندر داخل ہو گئی۔ وہ صوفے پر بیٹھا پانی پی رہا تھا اسے دیکھ کر ٹھٹکا۔

"تم اس وقت ......" رات کے دو بج رہے تھے۔ اور وہ اس کے کمرے میں بلا جھجک آ گئی تھی۔

اب کی دفعہ اس کی یہ حرکت ہمیشہ سے زیادہ بری لگی۔

"ہاں میں ...... میں کوئی وضاحت پیش کرنے نہیں آئی ورنہ ہی تم سے کوئی بھیک مانگنے آئی ہوں۔ بس اپنا حق مانگتی ہوں مجھے طلاق چاہئے۔ صرف اور صرف طلاق......"

"چٹاخ ......" اس سے پہلے کہ اس کا لفظ مکمل ہوتا سالک کا ہاتھ اس کے رخسار پر اپنے نشان چھوڑ گیا تھا۔ وہ نازوں پلی لڑکی تھی، بلبلا اٹھی۔ ... درد پر ساری رات بے چین رہتی تھی۔ اب سسک اٹھی۔

"بکواس نہیں کرو۔ میں نے ہمیشہ تمہاری بدتمیزیوں کو نظرانداز کیا ہے۔ تمہاری ہر بکواس کو چپ ہو کے سنا ہے۔ اب نہیں۔" وہ پہلی دفعہ بے غصے کا اظہار کر رہا تھا۔ وہ رخسار پر ہاتھ رکھے اسے دیکھے گئی۔ ... کوئی آنسو بہا ورنہ ہی درد جاگا۔ بس ایک سسکی خارج ہوئی تھی پھر لب دانتوں تلے دبا لیے تھے۔ اتنی سختی سے کہ خون نکلنے کا خدشہ ...

"میں بکواس نہیں کر رہی۔ میں تمہیں پسند نہیں کرتی۔ میں تمہارے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتی۔ مجھے واقعی طلاق چاہئے۔ اگر سیدھے ... بات نہیں ... تو میں اس حویلی سے بھاگ جاؤں گی۔" وہ نفع و نقصان کی تمیز کئے بغیر صرف اور صرف اسے سنا رہی تھی۔ ... وہ اس کی اس جرأت پر اسے دیکھتا رہ گیا۔

"...اس لڑکے کے ساتھ مجھے ہوٹل میں بیٹھے دیکھا تھا نا ...... وہ میرا کلاس فیلو ہے سالک! ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔"

سالک کو لگا اس کے کانوں میں کسی نے سیسہ انڈیل دیا ہو۔ بے غیرتی کی انتہا تھی یا برداشت کی کہ سب سن کر بھی وہ اپنے ہاتھ کو پہلو میں گرا گیا تھا۔

"دفع ہو جاؤ میرے کمرے سے۔ پلیز گیٹ لاسٹ۔" وہ حلق کے بل چیخا تھا وہ پرسکون کھڑی رہی۔ وہ ضبط کرتے کرتے نڈھال ہونے لگا۔

"پلیز سوہ جاؤ یہاں سے۔ پلیز جاؤ۔ میں تمہاری کوئی بات نہیں مان سکتا۔ اگر میں نے ایسا کیا تو وہ ہوگا کہ میں اپنے آپ کو ختم کر لوں۔"

"تمہارے مر جانے سے مجھے کیا فائدہ ہوگا۔" وہ ظالم تھی یا احساس سے عاری وجود۔ سالک دیکھے گیا۔

"اسے دھمکی نہ سمجھنا۔ تم نے اگر مجھے طلاق نہ دی تو میں چلی جاؤں گی۔ کہیں بھی۔ مگر تمہاری خلوت گاہ کی زینت بن کے تمہاری کسی انتقامی حس کی تسکین کا باعث نہیں بنوں گی۔ تم مجھے زبردستی اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتے۔" نفرت و حقارت سے کہہ کر اسے ... کمرے سے نکل گئی تھی۔ سالک بیڈ پر گر گیا۔

"سالک یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" بی بی جان بہت پریشان سی تھیں۔ وہ مسکرایا۔ صرف خالی خولی ہنسی تھی بھرم رکھنے کو، اب شاید ساری عمر یہی ہنسی دی تھی۔

"سوہ مر جائے گی۔ تم ذرا اس کی حالت دیکھو تو پریشان ہو جاؤ۔ پانچ دن سے وہ کمرے میں بند ہے۔ نہ کسی سے ملتی ہے، اور نہ کسی سے بات کرتی ہے۔ اب تو روتی بھی نہیں۔" بی بی جان رونے لگی تھیں۔

"بی بی! وہ کہتی ہے اسے طلاق چاہئے۔ وہ شادی کرنا چاہتی ہے اسی لڑکے سے، جس سے وہ محبت کرتی ہے۔" سر جھکائے بتا گیا۔ بی بی جان نے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔

"آپ نے کہا تھا نا بی بی جان، وہ سدھر جائے گی مگر وہ نہیں سدھری میری زندگی کو اپنے نام کا روگ لگا گئی ہے۔ میں کسی سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں تو بس اسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔ چچا جان سے فوراً رخصتی کی بات کی تھی کیا علم تھا کہ وہ مجھ سے حقیقت اگلوا لیں گے۔ بی بی جان اب سب روکنا ناممکن ہے۔ یہ چچا جان کی ضد بن گئی ہے۔"

"اس کا کوئی حل بھی ہے؟" کتنے خاموش پل سرک گئے تھے۔ تب بی بی جان نے لب کشائی کی تھی۔

"ہاں ہے اگر اسوہ تھوڑی دیر انتظار کر لے۔ میں اسے طلاق دے دوں گا اگر وہ مان جائے ورنہ چچا جان اسے مار دیں گے مگر شادی ملتوی نہیں کریں گے۔ بعد میں وہ صرف میرے ذمے داری ہوگی۔ میں معاملہ ہینڈل کر لوں گا۔" وہ سوچ سوچ کر کہہ رہا تھا۔ بی بی جان پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ وہ خاموشی سے کمرے سے نکل گیا۔ پھر سب کچھ بہت "نا نا" ہوا تھا۔ بی بی جان نے بڑی مشکلوں سے سوہ کو راضی کیا تھا۔ منتوں سے، خوشامد سے، مان سے، دھمکی سے، محبت سے، آخرکار وہ ہار گئی تھی۔ رخصتی پر آمادہ ہو گئی تھی۔ صرف اس وعدے پر کہ بعد میں وہ جو چاہے گی وہی کرے گی۔ کسی کی کوئی بات نہیں مانے گی۔ اور بی بی جان نے اس کی بات مان لی تھی۔ سالک کو بھی سمجھ آ رہی تھی وہ جو چاہتی ہے بھلا، کیا چاہ رہی تھی زندگی سے اسوہ سے۔

وہ حجلہ عروسی میں پہنچا تو وہ سر تک چادر تانے سو چکی تھی یا سونے کا مظاہرہ کر رہی تھی وہ جان نہیں سکا۔ وہ اس لڑکی کو کبھی بھی نہیں سمجھ سکا تھا۔ دل تو اپنا بھی خالی ہو چکا تھا۔ وہ دل جہاں اسی کی محبت سے ہر سو روشن تھا اب وہاں ویرانے ڈیرہ جما کر بیٹھے تھے۔ کوئی حسرت، کوئی خواب، کوئی خواہش نہیں تھی۔ اس کی غیرت، مردانہ، بری طرح پامال کی گئی تھی۔ اگر بی بی کا احساس نہ ہوتا تو وہ واقعی اسے اب تک اپنی زندگی سے علیحدہ کر چکا ہوتا۔ وہ سب کچھ یوں کرنا چاہتا تھا کہ اس لڑکی کو معاشرہ رد نہ کرے۔ ایک نظر اس کے سوئے ہوئے وجود پر ڈال کر وہ باتھ روم میں گھس گیا تھا۔

* * *

"میں سالک انیس الرحمان ہوں۔ اسوہ قمر الزماں کا شوہر۔" وہ اس خوبرو ڈیسنٹ سے خوبرو نوجوان کے ساتھ کھڑا تھا۔

"اوہ..... آپ اسوہ کے شوہر ہیں۔ ریئلی بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ بیٹھیں..... میں عالی ہوں، وہ آ کیوں نہیں رہی..... میرے پاس اس کا کوئی کنٹیکٹ نمبر نہیں تھا ورنہ اب تک ضرور آ چکا ہوتا آپ کے گاؤں۔"

وہ باتونی تھا۔ سالک کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ یونیورسٹی آیا تھا لوگوں سے پوچھتے وہ بمشکل اس تک پہنچا تھا۔

"اس کی شادی ہو گئی تھی اس لئے نہ آ سکی۔" اس نے بتایا مگر عالی کے رویے پر الجھ گیا۔

"اوہ، ریئلی بہت مبارک ہو۔ ویسے بڑی بے مروت ہے آپ کی مسز۔ وہ تو ایسا مائنڈ کیونکہ اس نے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ کسی کو بلائے نہ بلائے اپنی شادی میں مجھے اور کہکشاں کو ضرور بلائے گی۔ بڑا بھائی بھائی کہتی تھی جا کر بھول ہی گئی کہ یہاں کوئی بھائی بھی ہے جو اس کی فکر میں دبلا پتلا ہو رہا ہے۔" اس کے الفاظ سالک کو حیران کئے دے رہے تھے۔ اس کے اپنے شکوک علیحدہ اس کو تنگ

کر رہے تھے۔ اور اسوہ نے جو کہا تھا، وہ ساکت سا دیکھے گیا۔ (کیا وہ سب جھوٹ تھا)

"ویسے آپ کو اس نے سفارش کے لئے بھیجا ہو گیا۔ مگر جا کر بتا دیجئے گا، مادام کو کہ میں اور کہکشاں اسے اس بے ایمانی پر بلکہ بے وفائی پر کبھی معاف نہیں کریں گے۔" وہ کہہ رہا تھا سالک اپنی ہی نظروں میں گرتا جا رہا تھا۔

"بڑی انسیت ہے آپ دونوں میں۔ اسوہ بہت ذکر کرتی ہے آپ کا۔" کچھ تو کہنا تھا اسے۔ اب کیسے بتاتا اسے کن حوالوں سے یاد کرتی ہے۔ مجھے میں کتنی نفرت ہوتی ہے۔

"جی ہاں۔ اعلیٰ قسم کی محبت ہے ہم میں۔ ساری یونیورسٹی والے جلتے تھے ہم دونوں سے۔ دراصل اسوہ کا کوئی بھائی نہیں اور میرے کوئی بہن نہیں۔ ایک تھی اس کا نام بھی اسوہ تھا مگر بچپن میں ہی انتقال کر گئی۔ مجھے بڑی حسرت تھی کسی بہن کی۔ اسوہ کو دیکھا تو یوں لگا مجھے سوہ میری بہن مل گئی ہے۔ میں نے ہی دوستی کے لئے ہاتھ بڑھایا تھا ورنہ اس نے کبھی یونیورسٹی میں کسی لڑکے سے بات تک نہیں کی۔ سب لڑکے جلتے تھے میری اور اس کی دوستی سے۔ بلکہ بعض لوگ تو ہمیں غلط نظروں سے بھی دیکھتے تھے مگر ہمارے دلوں میں کوئی کھوٹ نہیں، یہ ہم جانتے ہیں یا ہمارا اللہ۔" وہ اور بھی نجانے کیا کیا کہہ رہا تھا۔

"اسوہ تو مجھے بالکل سگی بہن کی طرح عزیز ہے۔ اس کی شادی میں نہ آ سکا اور اس بے وفا نے بھی نہیں بلایا، ساری عمر ناراض رہوں گا میں اس سے۔"

سالک چونکا۔ احساس ذلت تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

"یہ کیا کر دیا میں نے..... " کچھ وقت اس کے ساتھ گزارنے کے بعد وہ جب لوٹا تو ایک پچھتاوا اس کے ساتھ تھا۔ وہ تو آج اسوہ کی خاطر اس عالی سے ملنے آیا تھا اس لئے کہ وہ دونوں کے درمیان سے نکلنا چاہتا تھا۔ بڑی خاموشی کے ساتھ مگر اس سے پہلے وہ دونوں طرف کے راستے صاف کر دینا چاہتا تھا۔ لیکن قسمت... اس کی چھٹیاں ختم ہونے والی تھیں وہ واپس جا رہا تھا۔ پچھلے دنوں گھر میں جو جنگ پڑی رہی تھی اس کی بدولت اب اس کا یوں جانا سب کو ہی غمزدہ کر رہا تھا۔ اسوہ کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا نہ ہی اس کے یہاں رہنے سے اور نہ ہی کہیں چلے جانے سے۔ وہ بس اپنا نام اس کے نام سے علیحدہ کرنا چاہتی تھی۔ اس کی صرف ایک ہی خواہش تھی کہ وہ اسے طلاق دے دے۔ اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے طنز پر طنز کرتے استہزا اڑاتے اس نے نہ صرف خود کو اذیت میں مبتلا کر رکھا تھا بلکہ ساری حویلی والے سخت پریشان تھے۔ اس کی طلاق والی ضد بی بی جان اور سالک کے درمیان سے نکل کر باقی سب کے درمیان بھی موضوع گفتگو بن گئی تھی۔ اسوہ کو پروا نہیں تھی کہ کوئی اس کے متعلق کیا کہتا ہے۔ بس اسے صرف ایک ہی دکھ مارے جا رہا تھا کہ سب نے اس کے کردار پر شک کیا تھا بغیر اسے کوئی صفائی کا موقع دیئے اسے قربان گاہ کی طرف دھکیل دیا گیا تھا۔

وہ ڈھلتی سہ پہر کے قریب حویلی کے وسیع لان میں بائیں طرف صوفہ نما پتھر سے بنے بنچ پر ٹانگیں اوپر کئے کتنی دیر سے بیٹھی تھی۔ سردیوں کی یہ دھوپ جسم کو بہت بھلی لگ رہی تھی۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے اندر اٹھتے دونوں طوفان سے نبرد آزما تھی جو ہر وقت اسے یہی اکسا رہا تھا کہ وہ یہاں سے کہیں بھاگ جائے کسی ایسے کونے میں جا چھپے جہاں کوئی انسان نہ ہو، کوئی غلط نظر نہ ہو، سالک نہ ہو۔

سالک اپنے کمرے کی کھڑکی سے نیچے اسے صحن میں بنچ پر بیٹھے کتنی دیر سے دیکھ رہا تھا۔ لمبے بال ارد گرد بکھرے ہوئے تھے۔ فیروزی سادہ سے کاٹن کے سوٹ میں چہرے پر حزن و ملال کی کیفیت لئے وہ عجب سوگوار سی کیفیت میں بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ چل کر کمرے سے نکل آیا۔ لان میں آیا تو وہ ابھی وہیں تھی۔ آنکھیں بند کئے ارد گرد سے بیگانہ۔ جب سے عالی سے ملاقات ہوئی تھی اسے اپنا آپ عجیب مجرم سا لگنے لگا تھا۔ کتنی دفعہ اس سے بات کرنا چاہی تھی مگر وہ کوئی موقع ہی نہیں دیتی تھی۔

"اسوہ..... " وہ اس کے پاس آ کھڑا ہوا تھا۔ اسوہ نے اس پکار پر آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ بنچ کی پشت سے کمر لگا کر

وہ سیدھی ہوگئی۔ بغیر ہونٹوں کو حرکت دیے وہ اسے دیکھے گئی۔

"ایم سوری......" وہ حیران ہوئی، وہ کس لئے معافی چاہ رہا تھا۔ مگر خاموشی ہنوز برقرار تھی۔

"میں کچھ دن پہلے عالی سے ملا تھا۔" وہ سر جھکائے کہہ رہا تھا۔ وہ ساری بات سمجھ گئی، ایک تلخ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آ ٹھہری۔ تو اب کیا صفائی پیش کرنے آیا ہے۔

"تو پھر......" سالک نے اسے دیکھا۔ اس کے تاثرات ناقابل فہم تھے۔

"میں نے تمہیں اور اسے غلط سمجھا۔ عالی سے مجھے علم ہوا کہ وہ تمہیں صرف ایک بہن سمجھتا تھا۔"

"تو عالی کو بھی سارا قصہ سنا دیا ہوگیا۔" وہ اندر ہی اندر تلخ ہوگئی۔

"نہیں۔ جھوٹ ..."

"کیا بکواس ہے یہ عالی نے کہا اور آپ سالک صاحب آپ نے یقین کرلیا۔ حیرت ہے۔"

غلطی کے احساس سے اگرچہ وہ شرمندہ سا تھا مگر وہ کس قدر مطمئن تھا وہ ایک نظر میں ہی سمجھ گئی تھی۔ اس کی ساری زندگی کی نیک نامی، اس کی تعلیم داؤ پر لگ گئی تھی، جب وہ لوگ کے دیکھتے انگاروں پر جھلس رہی تھی تو پھر وہ اسے کیوں مطمئن ہونے دیتی۔ اس کے چہرے کے یہ اطمینان... عالی کے الفاظ اس کے اندر کی تملاہٹ کو مزید دو چند کر گئے تھے۔

"عالی نے جھوٹ بولا، آپ نے سچ مان لیا۔ کیوں... مجھ سے زیادہ دوسروں پر اعتبار ہے۔ حیرت ہے، اور یہ عالی بھی کتنا جھوٹا ہے، جینے مرنے کے دعوے... ایک ساتھ کرکے اب بدعہدی کر رہا ہے۔ حیرت ہے۔ شاید دنیا کے سارے مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔" وہ پاگلوں کی طرح ہنستے ایک دفعہ پھر سالک نعمان الرحمان کو اذیت میں مبتلا کر گئی تھی۔ وہ ایک دفعہ پھر بے یقینی و بے اعتمادی کی لپیٹ میں آنے لگا تھا۔

"اسوہ، وہ تم سے اس انداز سے محبت نہیں کرتا... تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔"

اس نے ایک اور کوشش کی۔ شاید خود کو بہلانا چاہ رہا تھا۔

"ہرگز نہیں مجھے غلط فہمی نہیں ہوئی۔ آپ کون ہوتے ہیں میرے معاملے میں، اتنی تفتیش کرنے والے اچھا...... عالی سے کنفرم کرنے گئے ہوں گے۔ اب میں سمجھی۔ اور عالی کتنا بزدل نکلا ہے، کتنا جھوٹا اور مکار، محبت کو تماشا بنا دیا ہے اس نے۔ جب میں نہیں ڈری تو کیوں ڈر رہا ہے۔ پاگل...... آپ کو دیکھ کر جھوٹ بول گیا ہوگا۔ ہیں نا۔" وہ یوں ظاہر کر رہی تھی جیسے اس خبر نے اسے بہت شاک زدہ کر دیا ہے۔ وہ پاگلوں کی طرح، سیدھا کہتی جا رہی تھی۔ اس وقت اس کی آنکھوں سے آنسو بھی بہہ رہے تھے۔ سالک عجب کشمکش میں پڑ گیا۔

"عالی...... میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ کم از کم میرا بھرم تو رہنے دیتے۔" وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپائے پہلے سے زیادہ شدت سے رو رہی تھی۔ سالک کے لئے اس صورتحال کو سمجھنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ اس کے الفاظ، عالی کے لئے اس کا یوں تڑپ تڑپ کر رونا...... وہ سب دیکھ رہا تھا۔ دل ایک دفعہ پھر بے یقینیوں کی زد میں آتا جا رہا تھا۔

"ہو سکتا ہے، مجھے دیکھ کر عالی نے واقعی جھوٹ بولا ہو۔ ورنہ اسوہ یوں پاگل نہ بنتی۔" اس کا یوں رونا اسے پھر سوچوں کے بھنور میں دھکیل گیا تھا۔

"کیوں گئے تھے آپ اس کے پاس...... کیوں گئے تھے؟ میری طرف سے آپ لوگوں کی عزت و ناموس کو خطرہ تھا، جب میں آپ لوگوں کی قید میں ہوں تو کیا تماشہ بنوانے لگے تھے مجھے...... میرا رہا سہا بھرم بھی توڑ دیا ہے۔" اب وہ الفاظ سوچ سمجھ کر ادا نہیں کر رہی تھی۔ وہ واقعی اس وقت جنونیت میں مبتلا ہو رہی تھی۔ جو جی میں آ رہا تھا، کہہ رہی تھی۔ اذیت تھی کہ کوئی حد نہیں تھی۔

"میں کرتی ہوں محبت اس سے .... ساری عمر کروں گی...... اس نے مجھے دھتکار دیا ہے پھر بھی...... میرا بھرم کھو دیا ہے پھر بھی...... جو کرنا ہے آپ لوگوں کو کرلیں۔ مجھے پروا نہیں۔ مگر مجھے نہ آپ سے غرض ہے نہ ہی کسی اور سے۔ نفرت کرتی ہوں میں آپ سے سنا آپ نے۔" وہ چیخ چیخ کر کہتی اندر بھاگ گئی تھی۔ وہ وہیں کھڑا رہا۔ سالک کو اپنی ٹانگیں بے جان سی محسوس ہو رہی تھیں۔ ایک دفعہ پھر اسوہ اسے بے موت مار گئی تھی۔

وہ جا رہا تھا مگر جانے سے پہلے کوئی فیصلہ کرنا چاہتا تھا۔ اسوہ اب کچھ نہیں کہتی تھی۔ جب سے اس نے اسے عالی سے ملاقات کے متعلق باخبر کیا تھا، وہ بالکل چپ ہوگئی تھی۔ اب اس کی طرف سے نہ ہی کوئی طنز سننا پڑتا تھا اور نہ ہی کوئی استہزائیہ جملہ۔ وہ خاموش ہوگئی، یوں بالکل چپ چاپ، ویران سی۔ بہت چاہنے کے باوجود وہ اپنے دل سے اسے نکال نہیں پا رہا تھا۔ وہ کسی اور کی بے وفائی کا سوگ منا رہی تھی مگر سالک کو ہر لمحہ کچوکوں پر گھسیٹ لاتی تھی۔ ایک طرف وہ اس سے نفرت محسوس کرتا تھا مگر دوسری طرف اس کی محبت شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ اس نے جانے سے پہلے ایک فیصلہ کیا تھا۔ کسی کو اعتراض نہیں تھا، مگر اپنے اندر اسوہ سے بات کرنے کی ہمت نہیں پاتا تھا۔ اس نے چاہا تھا کہ اس کی عدم موجودگی میں اسوہ پھر سے اپنا تعلیمی سلسلہ شروع کردے۔

اگلے دن اس کی فلائٹ تھی جانے سے پہلے وہ اس سے بات ضرور کرنا چاہتا تھا۔ وہ کمرے میں آیا تو وہ بیڈ کی کراؤن سے ٹیک لگائے دیوار پر موجود پینٹنگ پر نظریں جمائے کسی غیر مرئی نقطے کو تک رہی تھی۔ اس کو دیکھ لینے کے باوجود اپنا شغل جاری رکھا تھا۔

"اسوہ...." وہ بستر پر اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھا تو اس نے اپنے اعتبار کے قاتل کو دیکھا۔

"صبح میری فلائٹ ہے۔ میں نے تمہاری یونیورسٹی بات کرلی ہے۔ ایک دو دن کی چھٹیاں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتیں۔ تم یونیورسٹی چلی جانا۔ اپنی تعلیم کا سلسلہ شروع کرو۔"

"نہیں ... مجھے نہیں پڑھنا ..." ایک دم انکار کر دیا تھا اس نے۔ سالک چپ سا ہوگیا۔ کتنے لمحے خاموش سرک گئے اس سے مزید بات کرنے کے لئے ہمت مجتمع کرنے لگا۔

"آپ مجھے کب طلاق دیں گے۔ اگر آپ یہ سوچ کر خوش ہو رہے ہیں کہ عالی سے دھوکہ کھا کر میں یونہی آپ کے ساتھ ساری زندگی گزار دوں گی تو یہ آپ کی بھول ہے۔ اگر مجھے میرا گوہر مقصود نہیں ملا تو میں یہ سمجھوتہ بھی نہیں کروں گی۔ مجھے ہر حال میں طلاق چاہئے۔" کتنی نفرت تھی اس کی آنکھوں میں۔ سالک اس کے لہجے میں الجھ گیا۔ جو کسی بھی جھجک سے پاک تھا۔ سخت دل... وہ تڑپ کے بستر سے اٹھ گیا۔

اسوہ کے لئے اس کا یہ انداز ناقابل برداشت تھا۔ وہ جا رہا تھا اور جانے کب آتا۔ جانے سے پہلے وہ بھی ایک فیصلہ چاہتی تھی، ساری عمر اذیت میں نہیں گزار سکتی تھی۔ اس نے عالی کے نام کا جو داغ خود پر لگوا لیا تھا اب وہ کبھی نہیں اترنا تھا۔ ساری عمر کی سزا تھی، مگر سالک مطمئن رہے یہ اسے گوارا نہیں تھا اس کی ذات پر کیچڑ اچھالنے کا سبب بھی یہی شخص بنا تھا وہ کیسے فراموش کر دیتی۔ کیسے معاف کر دیتی کیسے پرسکون رہنے دیتی؟

"ٹھیک ہے۔ میں وہاں جا کر تمہیں کاغذات بھیج دوں گا۔ بس یا کچھ اور......" وارڈ روب کا دروازہ کھول کر اپنا سامان نکالتے اس نے سنجیدہ سے لہجے میں کہا تو اسوہ چونک گئی۔ اتنی جلدی وہ مان گیا تھا۔ اتنی جلدی..... اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ شاید نفرت بہت گہری تھی۔

"نہیں......" پھنسی پھنسی آواز سے وہ صرف یہی کہہ سکی۔ سالک نے اسے صرف ایک نظر دیکھا۔ "پہلے میں نے سوچا تھا کچھ عرصہ اس معاملے کو رہنے دوں گا، حالات سازگار نہیں، چچا جان اور چچی جان بھی نہیں مانیں گے۔ مگر خیر...... تمہیں بہت جلدی ہے تو میں جاتے ہی سب سے پہلے یہی کام کردوں گا۔"

"نہیں...... مجھے کوئی جلدی نہیں، آپ جب چاہیں فیصلہ کر دیں۔" نہ جانے کیسے اسوہ کے لبوں سے پھسلا تھا۔ سالک نے حیران نظروں سے اسے دیکھا تو وہ خود نظریں چرا گئی۔ کہاں وہ جلدی فیصلہ ہونے کے لئے بے تاب تھی اب وہ مانا تھا تو وہ مہلت دے رہی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

"پہلے میرے سامنے عالی تھا۔ اب کوئی بھی نہیں۔ مگر یہ طے ہے، مجھے آپ کے ساتھ زندگی نہیں گزارنی۔ آپ امریکہ جا رہے ہیں، جب بھی امی جان اور بابا جانی مانے میں اطلاع کر دوں گی۔ آپ کو اپنے وعدے کی پاسداری کرنا ہوگی۔" کتنا دو ٹوک انداز تھا۔ سالک کی مکمل نفی کرتا ہوا۔ اس نے مزید کچھ نہیں کہا تھا صرف سر ہلا دیا تھا۔

اس کے بعد ایک خاموشی تھی اور یہ خاموشی آٹھ سالوں پر محیط ہو گئی تھی۔ وہ پہلے نیویارک پہنچا تو دل چاہا [illegible] آخری سال تھا مگر وہ بمشکل وہاں دو ماہ ہی گزار پایا تھا۔ کامران کو کسی فلیٹ کی تلاش تھی۔ اسے اپنا فلیٹ دے کر وہ وہاں سے [illegible] نکل گیا تھا۔ پاکستان سے اپنے ساتھ، اچھی خاصی رقم لایا تھا۔ نجانے کہاں کہاں گھومتا رہا، رقم ختم ہوئی تو غم روزگار نے آ لیا۔ تو چھوٹی موٹی جابز کرتا رہا پھر اسی دوران اس کی ملاقات ایک ترا نامی لڑکی سے ہوئی۔ وہ تو پہلے ہی چوٹ کھایا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ وقت گزارنے لگا۔ وہ کسی میوزیکل گروپ میں ڈانسر تھی۔ اس کو اپنے گروپ کے ساتھ انگلینڈ شو کرنے جانا تھا اسے بھی اپنے ساتھ لے گئی۔ وہ اس سے بہت شدت سے محبت کرتی تھی مگر ہر ممکن کوشش کے سالک اپنے دل سے اسوہ کو نہیں نکال پایا تھا۔ محض دوستی کا رشتہ نبھاتا رہا، کئی بار اس نے شادی کا کہا مگر وہ ٹال گیا۔ ترا اپنے گروپ کے ساتھ ملکوں ملکوں گھومتی تھی۔ اسے بھی اپنے ساتھ گھسیٹنا چاہتی تھی مگر وہ کسی گوشے میں چھپ کر چپ چاپ زندگی گزار دینا چاہتا تھا۔ آخرکار اس کی طرف سے ہار کر وہ ہمیشہ کے لئے اس کی طرف سے قطع تعلق کر گئی۔ [illegible] مختلف کورسز کرتا رہا۔ ادھوری تعلیم مکمل کی اور پھر اسے جرمنی کی ایک کمپنی میں بہت اچھی پوسٹ پر جاب کی آفر ہوئی تو وہ جرمنی چلا گیا۔ اپنی زندگی میں وہ آہستہ آہستہ مطمئن ہونے لگا تھا کہ ایک دن کامران کا فون آ گیا کہ کئی سالوں بعد ایک دفعہ پھر اس کی حویلی سے اس کے نام ایک خط آیا ہے، خط لکھنے والی اسوہ ہے۔ وہ سخت حیران ہوا۔ ایک عرصے سے اس کی تلاش کی کوششیں سرد پڑ چکی تھیں۔ شروع شروع میں جب اس نے نیویارک چھوڑا تھا تو کامران اس کی وجہ سے سخت پریشان ہوا تھا۔ چچا جانی جیسے اسے زمین کی تہہ سے نکالنے کے درپے تھے۔ دو دفعہ خود آئے تھے امریکہ مگر بے مراد لوٹ گئے اور اب اسوہ کا خط [illegible] پھر وہ نیویارک پہنچ گیا تھا۔ خط پڑھتے ہی وہ سخت اذیت میں مبتلا ہو گیا مگر یہ طے تھا کہ اسے واپس جانا ہے اور اب اگر وہ ہوتا تو اسوہ کا یہ انکشاف کہ نہ وہ عالی سے محبت کرتی تھی اور نہ ہی اسے کسی اور کی تلاش تھی۔ ایک دفعہ پھر اسے پچھتاوے کی گہری دلدل میں دھکیل گیا تھا۔ وہ ہمیشہ اسوہ کو غلط سمجھتا رہا تھا۔ وہ بہت گہری لڑکی واقع ہوئی تھی۔ کبھی کچھ نہیں کہتی تھی۔ اب اس کا رویہ [illegible]..... وہ ایک دفعہ پھر الجھ گیا تھا۔

* * *

ماضی کی یادوں سے نکلا تو احساس ہوا وہ کتنا کچھ غلط کر چکا تھا۔ اسوہ کا کہاں کہاں قصور تھا، ایک دم سب واضح ہو گیا تھا۔ مگر اب بھی اس کی انتہا درجے کی نفرت اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ عالی کے واقعے سے پہلے بھی وہ بے حد متنفر رہتی تھی۔ اس کے بعد میں جو کچھ بھی وہ کرتی یا کہتی رہی تھی وہ تو اس کا ردعمل تھا۔ انصاف سے ہر پہلو پر غور کیا تو احساس ہوا وہ کہیں بھی غلط نہیں تھی۔

کالی گہری رات ہر طرف چھائی ہوئی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد وہ کمرے میں آ گیا تھا۔ اسوہ کتنا وقت گزرنے کے بعد بھی کمرے میں نہیں آئی تھی۔ وہ یونہی منتظر رہا۔ نجانے کب آنکھ لگ گئی تھی۔ اپنی طرف سے تو وہ اسوہ کا انتظار کر رہا تھا۔ یونہی اس کی آنکھ کھلی تو [illegible] خالی الذہنی کی کیفیت میں لیٹا رہا۔ آنکھیں جب دیکھنے کے قابل ہوئیں تو وہ چونکا۔ اپنے وجود سے مس کرتا دوسرا وجود بلاشبہ اسوہ کا

تھا۔ اس کا پورا وجود سالک کے سینے پر تھا۔ اس نے ہاتھ ہٹانا چاہا مگر ہٹا نہ پایا۔ کانچ کی چوڑیوں سے سجا خوبصورت سفید بازو ملگجی مدھم روشنی میں بہت بھلا لگ رہا تھا۔ اس کا سر اس کے کندھے سے چھو رہا تھا۔ وہ چونکہ اسے سوچتے سوچتے ہی سویا تھا اب اسے یوں اپنے اس قدر قریب دیکھ کر دل ایک دم مطمئن ہونے لگا تھا۔ اس کے وجود کا لمس سالک کے اندر ایک نئی زندگی دوڑا رہا تھا۔ وہ گہری نیند میں غرق تھی۔ سالک نے بے ساختہ دایاں بازو اس کی کمر کے گرد لپیٹ دیا تھا۔ اپنی کیفیت اپنے جذبات بہت بھلے لگ رہے تھے۔

میں جانتا ہوں میری غلطی ناقابل معافی ہے۔ مگر میں تمہارا اعتماد جیتنے کی کوشش ضرور کروں گا تم جو میری زندگی ہو، بھلا تم سے جدا ہو کر میں جی سکتا ہوں۔ کبھی نہیں۔ اسی لئے تو نیویارک چھوڑ دیا کہ کہیں تم مجھے میرا وعدہ یاد نہ دلا دو۔ ملکوں ملکوں گھوما ہوں، برسوں خاک چھانی ہے، صرف اور صرف تمہارے لئے۔" اس کی پیشانی پر اپنے ہونٹ رکھتے وہ عجب کیفیت میں غرق تھا۔ کمرے کی تنہائی، اپنے رشتے کا استحقاق، سحر انگیز ماحول اور اپنی گزشتہ غلطیاں سب اسے اپنے حصار میں مقید کر رہی تھیں۔

"آئی ایم سوری، رئیلی سوری۔" بہت نرمی سے اس نے اسے خود سے مزید قریب کر لیا تھا۔ یوں کہ دونوں کے دل ایک ساتھ دھڑکنے لگے تھے۔

وہ اسوہ سے کھل کر ہر مسئلے پر بات کرنا چاہتا تھا۔ وہ اب اپنے رشتے کو ایک واضح شکل دینا چاہتا تھا۔ اسوہ کی زندگی میں کوئی نہیں تھا یہ خیال اس کی روح تک کو سرشار کر جاتا تھا۔ وہ کتنا ہلکا پھلکا ہو گیا تھا وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ اس نے اسوہ سے کوئی وعدہ بھی کیا ہے۔ دوسری طرف اسوہ شاید سب سمجھ رہی تھی۔ اس سے بچنے کی [illegible] کترانے لگی تھی۔ کچھ کہنے کا بھی موقع ہی نہیں دیتی تھی۔ رات کو بھی دیر سے جب وہ سو جاتا تھا تو کمرے میں آتی تھی۔ جب [illegible] تھا تو وہ اس کے سامنے سے جا چکی ہوتی تھی۔

اس دن وہ کچن میں مصروف تھی، شومئی قسمت کہ کوئی ملازم بھی موجود نہیں تھا۔ وہ پانی پینے آیا تو جب وہ اسے کچن کے دروازے پر دیکھ کر ٹھٹکی تھی۔ پھر نظر انداز کر کے اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

"ایک گلاس پانی مل جائے گا۔" اسے متوجہ نہ دیکھ کر پوچھا تو وہ فریج بند کر کے چولہے کے پاس جا کھڑی ہوئی جیسے سنا ہی نہ ہو۔

"اسوہ ....." وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اس نے تیزی سے ایک طرف پڑا گلاس اٹھا کر پانی بھر کر اسے تھما دیا۔ سالک نے گلاس تھاما تو وہ واپس چولہے کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

"مجھے تم سے بات کرنی ہے۔ پلیز کچھ دیر کے لئے کمرے میں چلو۔" اس نے اپنا مدعا بیان کیا تھا۔

"مگر مجھے آپ سے کوئی بات نہیں کرنی۔ میرا وقت ضائع مت کریں۔ جائیں آپ یہاں سے۔" تلخی سے جواب ملا تھا جیسے وہ بمشکل خود کو برداشت کر رہی ہو۔

"اسوہ ..... رئیلی سوری..... میں....." اس نے کچھ کہنا چاہا تو وہ خونخوار انداز لئے پلٹی۔

"بس سالک صاحب بس، ایک لفظ بھی نہیں۔ آپ کی یہ سوری میری ذات پر اچھالا گیا کیچڑ نہیں دھو سکے گی۔ آپ کی غلاظت مجھے باکردار ثابت نہیں کر سکے گی۔ میں نے ہر الزام سہہ لیا۔ تمغے کی طرح اپنے سینے پر سجا لیا۔ اس لئے نہیں کہ کسی آج کے دن کے لئے کہ آپ صرف سوری کے چند الفاظ سے میری ذات خرید لیں۔ آپ نے جو دیکھا نہ وہ جھوٹ تھا، نہ عالی سے محبت میری جھوٹ تھی۔

ہاں اگر کچھ جھوٹ تھا تو ہمارے درمیان یہ تعلق ہے۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ میرے دل میں، اور میری زندگی میں آپ کے لئے قطعی گنجائش نہیں ہے تو پلیز میرا ضبط مزید مت آزمائیں۔ برسوں ترسی ہوں اب کہیں جا کر زندگی گزارنے کا ڈھنگ سیکھ پائی ہوں۔ اب یوں میری راحت کھوٹی کریں۔ اپنے والدین کی نظروں سے ایک دفعہ گری ہوں دوبارہ اٹھ نہیں سکی۔ اب کیا چاہتے ہیں،

جان لینے کے در پے ہیں کیا؟"

وہ رو پڑی تھی۔ یہاں آنے کے بعد وہ پہلی دفعہ اس کے سامنے یوں ضبط کھوئی تھی۔ اس کا دکھ بہت بڑا تھا۔۔۔ چپ ہو گیا۔ سالک کو اپنی زیادتیاں بہت بڑی لگیں۔

"آئی ہیٹ یو..... رئیلی آئی ہیٹ یو..... میں جانتی تھی کہ آپ مجھے ناپسند کرتے ہیں، میں یہ بھی جانتی تھی کہ آپ کی پسند میں نہیں کوئی اور ہے۔ آپ نے بی بی جان سے میرے نکاح کرنے پر بہت اعتراض کیا۔ مجھے نہ جانے کیا کیا کہا ہے..... میں واقعی بہت پاگل تھی۔ زندگی میں آپ کے علاوہ کچھ اور دکھائی ہی نہیں دیا تھا۔ میں تو صرف آپ کے قریب رہنا چاہتی تھی۔ کسی نہ کسی بہانے اسی لیے چھوٹی موٹی حرکتیں کر جاتی تھی مجھے نہیں معلوم تھا اس کی اتنی بڑی سزا دیں گے۔ مجھے تو صرف یہ لگتا کہ مجھے برا بھلا کہتے ہیں اور خود کسی اور لڑکی کو پسند کرتے ہیں۔ اسی لیے آپ کو چڑانے لگی تھی۔ تاکہ یہ جو زبردستی کا تعلق قائم ہوا ہے ختم ہو جائے۔ آپ کے قریب جب بھی آنا چاہا آپ نے بری طرح دھتکار دیا۔ پتھر بنے رہے۔ اب آپ کی نفرت میں۔۔۔ اس لیے ضد کر کے لاہور چلی گئی۔ اگر مجھے علم ہوتا کہ آپ کی نفرت اتنی گہری ہے، مجھے یوں ذلیل و رسوا کرے گی، کبھی لاہور نہ جاتی میں جو پاگلوں کی طرح آپ کو صرف پوجتی تھی، شدید نفرت کرنے لگی۔ میرا اعتماد میرے ماں باپ، ان کی محبت سب کچھ مجھ سے چھین لیا۔ وہ عادل حسن کا نام میری رسوائی کا سبب بن گیا وہ تو مجھے صرف بھائیوں کی طرح عزیز تھا۔ وہ مجھے بہن کا مان دیتا تھا۔ پھر بھی اس کی محبت اور خلوص کو کیسے نظر انداز کر دیتی۔ اور یہی میری غلطی تھی۔ اور آپ نے اسی غلطی سے فائدہ اٹھایا۔ اتنی زیادہ نفرت کرتے تھے تو کہا ہوتا، میں خود ہی کوئی بہانہ بنا کر چلی جاتی مگر یوں رسوا کر کے..... " وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر شدت سے رو رہی تھی۔ وہ جانے کیا کیا کہہ رہی تھی، سالک کو اپنے وجود سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اتنی بدگمانیاں، اس نے کب نفرت کی تھی، کب وہ اعتراضات تھے اور وہ اپ اعتراضات کو اتنا پیچ رہے لگی اتنا کچھ سوچ لے گی۔ تنی نفرت، وہ ششدر تھا۔ اس نے تو کبھی سوچا تک نہ تھا۔ وہ یوں سوچے گی، وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

"اسوہ....." وہ آگے بڑھا تو اسوہ پیچھے ہٹ گئی، سرعت میں ہٹ گئی۔

"نہیں سالک..... آپ نے صرف اپنی نفرت کا اظہار کیا تھا مگر مجھ سے سب کچھ چھین لیا۔ وہ محبت جو بچپن سے اس دل میں پنپتی چلی آئی تھی آپ کی نفرت سے کھو گئی۔ میرا بس نہیں چلتا تھا کہ میں کیا کر ڈالتی۔ ان دنوں صرف ایک ہی ضد تھی کہ مجھے طلاق لینی ہے۔ پھر آپ بھی واں گئے۔ دل میں ایک خوش فہمی تھی کہ شاید آپ سختی سے رد کر دیں اس تقاضے کو مگر....." چپ ہو گئی۔

سالک نے اسے کندھوں سے تھام لیا..... لرزتا وجود اور لرزنے لگا۔ اس نے خود میں بھینچ لیا۔

"اسوہ....." سالک کے لب کپکپائے تھے صرف۔

"آپ چلے گئے۔ میں لمحہ لمحہ مری، ہر ایک کی نظر میں میں مجرم تھی۔ میں گنہگار تھی۔ بابا جانی نے کبھی بلایا نہیں۔ امی جان نے کبھی پاس بٹھا کر کوئی بات نہیں کی۔ اگر بی بی جان نہ ہوتیں تو یہ آٹھ سال مجھے مار دیتے۔ جینے کی خواہش تو پہلے ہی ختم ہو گئی تھی۔ آپ کا یوں گمنام ہو جانا مزید حوصلے پست کر گیا۔ میری جو ضد تھی کہ صرف طلاق لینی ہے، وہ جیسے کہیں مٹ گئی تھی۔ چند دن ایک خیال، مسلسل آ رہا تھا کہ شاید آپ میری طرف سے کسی پیش رفت کے منتظر ہوں۔ بی بی جان کا ہارٹ اٹیک تو صرف بہانہ تھا، میں ضبط نہ کر سکی۔ ادھورے ایڈریس پر خط لکھ دیا۔ کیا لکھتی ہمارے درمیاں کچھ تھا ہی نہیں۔ بی بی جان کی طرف سے پریشان کر کے بھی بلا سکتی تھی۔ بس وہی بھولا بسرا وعدہ یاد آ گیا۔ یہی سوچ کر اگر آپ کی نفرت اتنی ہی گہری ہے تو میری نفرت کو انجام تک پہنچانے کے لیے تو ضرور آئیں گے۔ اللہ سے دعائیں مانگی تھیں۔ اور آپ آ گئے مگر میری ذات کا سارا حوصلہ آپ کو دیکھتے ہی جیسے کہیں گم ہو گیا۔ لمحوں میں دل اس خوف میں مبتلا ہو گیا کہ آپ اب مجھے طلاق دے دیں گے۔ میں یقین دلاتی ہوں میں آپ کی زندگی میں

مداخلت نہیں کروں گی۔ مگر خدارا مجھے اپنے والدین کی نظروں میں اب رسوا نہ کریں۔ مجھے میری زندگی جینے دیں، برسوں حوصلہ کیا ہے پھر زندہ ہوئی ہوں۔ اب میرے رہے سہے بھروسے کی عمارت مسمار مت کریں۔ مجھے طلاق نہیں چاہیے۔ کبھی نہیں۔" سالک خود پشیمان ہو گیا۔ وہ برسوں چپ رہی تھی، آج کھلی تھی، طلاق کے خوف نے اسے بولنے پر مجبور کر دیا تھا وہ سب کچھ جو برسوں سے بلکہ بچپن سے دل کے نہاں خانوں میں چھپا ہوا تھا۔ وہ ایک ایک کر کے کہتی گئی تھی۔ وہ کیا سوچ رہا تھا اور کیا نکلا تھا۔

سالک کی وہ حالت تھی کہ بیان کرنا مشکل تھا۔ وہ اس سے اتنی محبت کرتی تھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس قدر جذباتی تھی، گزرے واقعات فراموش کر دینے والے نہ تھے۔ اس کا کہا ایک ایک لفظ سچا معلوم ہو رہا تھا۔ سالک کا دل مانتا جا رہا تھا۔ نادم ہوتا جا رہا تھا۔

* * *

اسوہ پھپھو کے ہاں گئی ہوئی تھی۔ ایک ہفتہ ہونے کو آیا تھا۔ اس کی غیر موجودگی سب کو کھٹک رہی تھی۔ سب ہی اسے مس کر رہے تھے اور وہ تھی کہ اپنے دل کا سارا غبار نکال کر سالک کو کچھ بھی کہنے کا موقع دیے بغیر اگلے دن بی بی جان کے ساتھ پھپھو کے ہاں چلی گئی تھی۔ بی بی جان تو دو دن رہ کر آ گئی تھیں مگر وہ وہیں رہ گئی تھی۔ اس کی غیر موجودگی سب سے زیادہ سالک کو محسوس ہو رہی تھی۔ وہ جب سے آیا تھا وہ اس کا ہر کام خاموشی سے سرانجام دے رہی تھی۔ جب سے گئی تھی کمرے میں بے ترتیبی سی پھیلتی جا رہی تھی۔ کپڑوں سے لے کر کھانے تک بغیر اس کے کہے ہر چیز حاضر کر دیتی تھی، خاموشی سے۔ بس صرف اتنا جتاتی تھی کہ وہ بی بی جان کے کہنے پر یہ سب کر رہی ہے مگر اب ہر بات روز روشن کی طرح عیاں ہوتی جا رہی تھی۔ وہ جو سمجھتا رہا تھا۔ اسوہ تو اپنے دل کا غبار نکال کر منظر سے ہٹ گئی مگر اسے پشیمانی و پچھتاووں کے گہرے سمندر میں دھکیلتی جا رہی تھی۔ اس کا ایک ایک آنسو، ایک ایک لفظ، انی کی طرح دل میں چبھتا جا رہا تھا۔ کسی پل قرار نہ تھا۔ کسی پل چین نہ تھا۔ جو سوچا تھا وہ کب نکلا تھا، اور جو سامنے آیا تھا وہ کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ کب کبھی سوچا تھا کہ وہ بھی اس سے محبت کرتی ہو گی اور اب جب سب باتیں روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی تھیں تو دل تب بھی بے کل تھا۔ بچپن سے لے کر اب تک کے سارے واقعات ایک ایک کر کے ازبر ہوتے گئے تھے۔

"کیا بات ہے سالک..... ؟ آج کل کچھ پریشان ہو، کمرے سے نکلتے ہی نہیں۔" وہ بیٹھا نہ جانے کیا کیا سوچ رہا تھا جب بی بی جان کمرے میں داخل ہوئی تھیں، ہر سو اندھیرا تھا۔ انہوں نے لائٹس آن کیں۔ وہ فوراً سیدھا ہوا۔ بی بی جان اس کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔

"نہیں..... ویسے ہی..... کوئی کام تھا کیا؟" وہ مسکرایا تو وہ بغور دیکھنے لگیں۔

"اسوہ اور تم میں کوئی بات ہوئی ہے۔" انہوں نے یکدم پوچھا تھا وہ بوکھلا گیا۔

"نہیں..... " نظریں خود بخود پھیر گیا۔

"میں نے فون کیا تھا۔ ڈرائیور کو بھی بھیجا، وہ آئی نہیں رہی۔ آج پھر فون کیا تو کہہ رہی تھی دو تین ہفتے رہے گی۔" انہوں نے آگاہ کیا تو وہ دیکھے گیا۔

"کیا بات ہے میرے بچے..... مجھے نہیں بتاؤ گے۔ تم دونوں مجھ سے چھپے ہوئے نہیں ہو۔ اب کیا مسئلہ ہے۔" وہ بڑی بے تحاشا محبت سے لگاوٹ کا مظاہرہ کیے پوچھ رہی تھیں۔

"نہیں بی بی جان، کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اب تو جیسے سارے مسئلے حل ہو گئے ہیں۔" وہ بدقت تمام مسکرا دیا تھا مگر افسردہ تھا۔ مسکراہٹ میں کوئی رنگ نہیں تھا۔

"مجھ سے چھپا رہے ہو... مجھ سے..." انہوں نے جیسے اسے زچ کر دیا تھا۔

"کیا بتاؤں بی بی جان۔" نادم سا سر جھکا کر رہ گیا۔

"وہی جو اسوہ کے یہاں سے جانے کا سبب بنا ہے۔"

"قسم لے لیں بی بی میں نے اسے نہیں بھیجا، مجھے تو علم بھی نہیں تھا۔"

"یہی تو پوچھ رہی ہوں کیوں علم نہیں تھا۔ جبکہ تمہیں پتا ہونا چاہیے تھا۔" ان کا لہجہ اب سخت ہو گیا تھا۔ باز پرس کرتا ہوا۔

"بی بی جان! اچھا ہوا ہے وہ منظر سے غائب ہے۔ اگر وہ یہیں رہتی تو شاید میں یکسوئی سے اپنی غلطیاں کبھی نہ جان پاتا۔" بی بی جان چپ رہیں۔ پھر اس نے شروع سے لے کر آخر تک سب کہہ سنایا۔ بی بی جان کی بھی وہی کیفیت تھی جو اس کی ہوئی تھی۔ اسوہ کی روداد سن کر۔ وہ بھی شاکڈ تھیں۔

"بہت برا کیا بچے، بہت برا... وہ جذباتی تو شروع سے ہی تھی۔ اتنے بڑے الزام کو اپنے سر لے لیا۔ کبھی ایک لفظ نہ ہی ظاہر کرتی رہی کہ جیسے..." وہ چپ ہو گئیں۔ آنسو ایک ایک کر کے بہنے لگے۔

"بی بی جان میں خود میں حوصلہ نہیں پاتا کہ اس کی طرف قدم بڑھاؤں۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ میری وجہ سے صرف میری وجہ سے وہ اپنے والدین کی نظروں میں گری۔"

اس نے بی بی جان کی گود میں سر رکھ لیا تھا۔ شروع سے ہی وہ اس کے ہر درد کی امین تھیں۔ اس کے ہر دکھ سکھ میں اس کے ساتھ رہی تھیں۔ اب بھی اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔

"بس میرے بچے، کچھ غلطیاں انسان دانستہ کرتا ہے اور کچھ نادانستگی میں سرزد ہو جاتی ہیں۔ اگر یہ غلطیاں نہ کرے تو اسے زندگی کی قدر نہ ہو۔ یہ آزمائشیں، یہ غلطیاں اسے سبق سکھاتی ہیں۔ شرمندہ ہو کر کمرے میں بند ہونے سے کچھ نہیں ہوگا۔ وہ سب کچھ کہہ کر اپنے دل کا غبار نکال چکی ہے تو تم بھی سب کچھ بھول کر قدم بڑھاؤ، جا کر اسے لے آؤ وہ شاید تمہاری راہ دیکھ رہی ہو۔ میں نے کہا تھا نا وہ بہت اچھی ہے، تم نے دیکھ بھی لیا ہے۔ بس تم دونوں کو ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ چھوٹی چھوٹی بدگمانیوں کو اپنی جگہ دل میں دے دی کہ حقیقت کا اصل چہرہ کہیں چھپ گیا۔ تمہیں میں اکثر سمجھاتی تھی نا کہ سب جذبے چپ کی زبان سے عیاں نہیں ہوتے کبھی کبھی زبان سے بھی کام لینا پڑ جاتا ہے۔ اگر تم ہر بات دل میں رکھنے کے بجائے کبھی کبھار اسے اچھے انداز میں کچھ کہہ دیتے، ہنس کر بات کر لیتے تو بات اتنی نہ بڑھتی۔ پرانی قدریں بس قدریں رہ گئی ہیں۔ یہ نیا دور ہے، ہر انسان کے لئے دوسرے سے زیادہ اپنی ذات مقدم ہے تو بیٹا! انسان کو حالات کے مطابق ہی چلنا چاہیے نا۔"

وہ خاموش رہا تھا۔ یہ حساب تو اسے بھی تھا کہ کیا تھا وہ اپنی جبلت اور مزاج کے برعکس کبھی ہنس کر اپنی ذات سے نکل کر اس کی ذات کو بھی اہمیت دے لیتا۔ اسے دعویٰ تھا کہ نکاح سے لے کر رخصتی تک اس نے کبھی اسے چھو کر نہیں دیکھا۔ یہ اتنی فخر کی بات نہیں تھی۔ بحیثیت شوہر وہ حق رکھتا تھا اور خاص طور پر لڑکیاں تو اس معاملے میں حساس ہوتی ہیں۔ نجانے اس کے دل میں کیا کیا جذبات تھے جو اس کی سرد مہری کی وجہ سے ہمیشہ دل کے اندر ہی قنوطیت کا شکار ہوتے گئے ہوں گے جبکہ اسوہ نے کہا تھا۔

"نظر شناسی کی صلاحیت آپ میں سرے سے ہے ہی نہیں۔ اپنی ذات کے گرد فصیلیں کھڑی کرتے کرتے پاگل ہو گئے ہیں۔ کبھی اپنی ذات سے نکل کر دیکھیں۔"

اور واقعی اب اس نے اپنی ذات سے نکل کر دیکھا تو بہت سے راز کھل گئے تھے۔

"اب کمرے میں بند ہو کر مت بیٹھو۔ باہر نکلو...... اگر برا نہ لگو تو جا کر اسوہ کو لے آؤ...... جب ہر معاملہ کلیئر ہو گیا تو یہ منہ چھپا کر بیٹھے رہنا کیوں...... ہمت کرو، اب وہ خود تو تمہیں کہنے سے رہی کہ مجھے لے جاؤ۔ بہرحال کچھ ناراضگی کا حق تو اس کا

بھی بنتا ہے۔" بی بی جان ہلکے پھلکے انداز میں کہتے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ وہ بھی مسکرا دیا۔ انہوں نے گویا اسے ایک راستہ دکھا دیا تھا۔

"شکریہ بی بی جان۔" انہوں نے ہمیشہ سیدھے رخ اس کی رہنمائی کی تھی۔ ابھی تک وہ الجھا ہوا تھا کہ کیا کرے ان کی باتوں سے اس کے اندر ہمت پیدا ہوئی تھی۔ اسوہ کا سامنا کرنے کی۔

"اللہ تم دونوں کو خوش رکھے۔ میری دعا ہے۔ میں راضیہ اور قمرالزمان سے بھی بات کروں گی، ماں باپ ہیں اس کے آخر کتنا بھی ناراض رہیں، اولاد کی محبت پلٹنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ پھر وہ کون سا واقعی ناراض ہیں بس غصہ ہے جب حقیقت کھلے گی تو دل خود بخود صاف ہو جائیں گے۔" اس کی پیشانی چوم کر وہ باہر نکل گئی تھیں۔ وہ سوچنے لگا تھا۔

* * *

منتہیٰ کے چھوٹے واثق کو لے کر وہ باہر لان میں بیٹھی ہوئی تھی۔ باقی بچے بھی ردگرد تھے۔ منتہیٰ اور وہ دو ہی بہنیں تھیں۔ منتہیٰ اس سے تین سال بڑی تھی۔ کم عمری میں ہی اس کی شادی کر دی تھی وہ خوش قسمت تھی عبدالرزاق بھائی بہت اچھے اور محبت کرنے والے انسان تھے۔ سب کا ہی ادب کرتے تھے۔ وہ اکثر آتی رہتی تھی پھر ہوئے خصوصی دعوت وہ بچے کی غرض سے آئی تھی۔ ہفتہ ہو گیا تھا یہاں آئے ہوئے۔ واپس جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ کچھ وہ بچپنا ہی تھی کہ نہ جانے کس کمزور لمحے میں بہہ کر وہ سالک سے سب کچھ کہہ گئی تھی جو وہ برسوں سے برداشت کر رہی تھی۔ وہ اذیت وہ دکھ وہ تکلیف وہ نفرت سب کچھ۔ اب دل بہت ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ بالکل خالی سا۔ شاید یہ کہہ لینے کا اثر تھا برسوں کا غبار تھا، بچپن کی یادیں تھیں جنہیں وہ سالک کے سامنے ایک ایک کر کے دہراتی گئی تھی۔

پہلی دفعہ سالک کی طرف سے وہ جب بدگمان ہوئی تھی جب بی بی جان نے اس سے نکاح کا کہہ دیا تھیں اور وہ انکار کرتے ہوئے اس کی خامیاں گنوا رہا تھا۔ اس کے دل میں سالک کا بہت بلند مقام تھا۔ بہت محبت کرتی تھی وہ اسے۔ بہت چاہتی تھی، ایک دم اس کی زبان سے اپنے لئے ناپسندیدگی سن کر وہ پتھرا سی گئی تھی۔ اذیت تھی کہ حد نہیں۔ اوپر سے یہ انکشاف روح کو گھائل کرنے کو کافی تھا کہ وہ اس سے نہیں بلکہ کسی اور سے محبت کرتا ہے۔ اس کی پسند کوئی اور ہے، وہ یقین کرنے کو تیار نہیں تھی۔ سالک نے اس کی ذات کی نفی کی تھی۔ بحیثیت کزن وہ مروت اختیار کر لیتا تھا مگر جب نکاح ہوا تو وہ اس سے بھی گئی۔ مجبوراً ہی سہی وہ نکاح پر راضی ہو گئی تھی سالک اپنی ذات کی نفی کے باوجود دل میں اسے اپنا بنانے کی خواہش ایسی زور آور تھی کہ وہ اپنی عزت نفس کی پامالی بھی گوارا کر گئی۔ پھر وہ عمر بھی تو ایسی تھی ضدی سی۔ چاند کو چھونے کی تمنا تھی، ہر حال میں چھونا چاہتی تھی۔ پھر وہ اس کا بن گیا تھا اور یہی وہ دور تھا کہ جب اس نے اسے جلانا شروع کر دیا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ سالک اس سے اتنی نفرت کرتا ہے کہ اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ عام لڑکیوں کی طرح اس کے بھی جذبات تھے، پھر دونوں میں جو رشتہ تھا اس کے تقاضے بھی کچھ انوکھے نہ تھے۔ مگر وہ اس کے جذبات کہاں سمجھنے والا تھا۔ جب بھی نظر ڈالی ناپسندیدگی کی ڈالی۔ جب بھی بات کی سمجھانے والی کی جبکہ اس کے کان لاشعوری طور پر کچھ اور سننے کے منتظر رہتے تھے۔ جو زیادہ چڑچڑی ہوتی گئی۔ طنزیہ جملے بولنا اپنا مشغلہ بنا لیا۔ جس کام سے، جس عادت سے اسے نفرت ہوتی تھی وہ سب سے زیادہ اس کا اظہار کرتی۔ پھر یوں ہوا کہ ایک دو دفعہ کا ٹوکنا اسوہ کے دل میں بدگمانیوں کی ایک فصیل کھڑی کر گیا۔ اسے ضد ہو گئی اسے چڑانے کی، اسے زچ کرنے کی۔ اپنے اندر کی تلملاہٹ وہ چڑچڑاپن وہ اسی طرح نکالنے لگی تھی۔ گفتگو کرتے وقت وہ زیادہ سے زیادہ ایسے الفاظ استعمال کرنے لگی تھی جو اسے سخت ناپسند ہوتے تھے یا وہ اشتعال میں مبتلا ہو سکتا تھا۔ اس کی گفتگو سے ناپسندیدگی کا اظہار سالک کے چہرے سے بخوبی ہو جاتا تھا مگر وہ ہمیشہ خود پر کنٹرول کر جاتا تھا جبکہ وہ اسے آخری حد تک دیکھنا چاہتی تھی۔ لاہور جانے کا فیصلہ اور اس سے پہلے کی گفتگو بھی اسی زمرے میں آتی تھی مگر وہ بجائے اشتعال کے بہت تحمل کا مظاہرہ کر گیا تو وہ ایک دفعہ

پھرنا کام ہوئی تھی اس کا خیال تھا کہ یہ شخص اسے اس حد تک ناپسند کرتا ہے کہ کچھ بھی کر سکتا ہے اور بعد میں یہ سچ ثابت ہوا۔

عالی کے ساتھ اس کی ذات کو منسوب کرنا سالک کی نفرت کو کھل کر سامنے لے آیا تھا۔ وہ شاک میں مبتلا ہو گئی تھی۔ جب یقین ہو گیا کہ اس پر الزام لگانے اور شک کرنے والی کوئی اور ذات نہیں صرف سالک انیس الرحمان ہے تو برداشت کی مشکل ہو گیا تھا پھر تو جیسے اس کے دل میں بھی محبت نہیں رہی تھی بے پناہ نفرت آ گئی تھی۔ وقت اور حالات نے اس کا ساتھ نہیں دیا تھا مگر اس نے اپنے آپ کو ٹوٹ کر گرنے نہیں دیا تھا۔ رخصتی سے لے کر سالک کے وطن چھوڑنے تک وہ اس الزام پر کاربند رہی تھی۔ پھر آج تھی کیوں نہ یہ الزام تو اس کے محبوب شوہر کی طرف سے ملا تھا۔ محبت تو جیسے اپنی موت آپ مر گئی تھی، اس کے بعد اس نے صرف اور صرف سالک سے نفرت کی تھی انتہائی زیادہ کہ اس نے اس کی موت کی دعائیں مانگی تھیں۔

وہ چلا گیا وہ اس کی تنہائی نفرت سب گزرتے وقت کی دھول ثابت ہوئے۔ شروع سالوں میں وہ صرف اور صرف اسے اذیت دینے کی خاطر کوئی پیش رفت کیے بغیر جیتی رہی مگر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اس کی بے چینی بڑھتی گئی۔ لوگ یہاں اس کی گمشدگی کی طرح طرح کی باتیں کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ اس کی نفرت بھی اعتدال پر آ گئی مگر ختم نہ ہو سکی۔ آٹھ سال بعد اسے بس یونہی خیال آیا تھا شاید وہ آ جائے شاید وہ کہیں رکھ دے ہو۔ کسی کا منتظر ہو۔ نہ جانے کیوں آہستہ آہستہ یہ خیال تقویت پکڑنے لگا اور پھر بی بی جان کی خراب طبیعت نے اسے خط لکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اب آیا تھا تو پہلے والا سالک نہیں تھا جس پر کسی بھی بات کسی بھی طنز یا کسی کی بھی استہزاء کا اثر نہیں ہوتا تھا تحمل مزاجی کی جگہ اشتعال انگیزی جڑ پکڑنے لگی تھی۔ اس نے پہلی ہی رات یہ بات محسوس کر لی تھی۔ مگر لوٹ کر آنے والے کو وہ سر آنکھوں پر نہیں بٹھا سکی تھی کیا اس کی نفرت ابھی باقی تھی۔ ہاں یہ سچ تھا پہلے والی حالت نہیں رہی تھی مگر ختم بھی نہیں ہوئی تھی اسی لیے تو سالک کا ضبط آزمانے کے چکر میں وہ اپنی تمام اس پر عیاں کر گئی تھی۔ اس نے کبھی عالی سے محبت نہیں کی تھی بلکہ بھائی کی سی محبت تھی۔ پھر تو جو ہوا تھا وہ شاید، ماحول یا حالات کا اثر تھا اب یہ حالت تھی کہ اس کے اندر سالک کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ برسوں وہ اپنی ذات کی توہین کرواتی آئی تھی اب ایک دم سالک کے قدموں میں جا بیٹھنے کے خیال سے ہی عجیب سا محسوس ہونے لگا تھا۔ اگر وہ قصوروار تھی تو قصوروار سالک بھی تھا۔ اسے ضرور آنا چاہیے تھا۔ بات کرنی چاہیے تھی مگر آٹھ دن گزرنے کے باوجود وہی انتظار کا موسم برقرار تھا۔ دل میں محبت و نفرت کچھ بھی نہیں تھا۔ بس عجیب سی کیفیت تھی، جسے وہ کوئی نام نہیں دے سکی تھی۔

عاتق رونے لگا تو وہ لے کر اندر آ گئی منتہٰی کو پکڑا کر وہ کمرے میں آ گئی۔ باہر کا موسم اچھا ہو رہا تھا اگرچہ سردیاں تھیں مگر آسمان پر چھائے بادل بھلے لگ رہے تھے۔ کپڑے نکال کر وہ باتھ روم میں گھس گئی۔ نہا کر نکلی تو باہر بارش ہو رہی تھی ہلکی ہلکی۔ بال سنبھالتی کمرے کی کھڑکی سے دیکھنے لگی۔ برسوں بعد اسے بارش اچھی لگی تھی۔ شاید دل کا موسم بدل رہا تھا اسی لیے۔

اپنے بیگ سے مختلف چیزیں نکال کر وہ آئینے کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ وہ جب بھی پھوپو کے گھر آتی تھی تو جیولری وغیرہ ساتھ لاتی تھی ورنہ اسے یوں ہی دیکھ کر پھوپو کا لیکچر خاصا جھاڑ پلانے والا ہوتا تھا۔ یہاں آتے ہوئے وہ کنگن پہنے تھی۔ دوسرے ہاتھ میں ست رنگ خوبصورت کانچ کی چوڑیاں تھیں، جو ہر سوٹ کے ساتھ بھلی لگتی تھیں۔ نہانے سے پہلے اس نے اتاری تھیں آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر پہنیں۔ جیولری بھی نکال کر پہن لی۔ آج کتنے دنوں بعد بننے سنورنے کو جی چاہ رہا تھا ورنہ حویلی میں تو صرف بی بی جان کی خاطر کوئی ہار سنگھار کر لیتی تھی۔ لپ اسٹک لگا کر آنکھوں میں کاجل لگا کر اس نے اپنے اوپر ایک تنقیدی نظر ڈالی تھی۔ عمر اگرچہ تیس سال تھی مگر جسامت اس کی اب بھی ۲۳ سالہ لڑکیوں جیسی تھی۔ گزرتے آٹھ سالوں نے اس کے سراپے پر کوئی فرق نہیں ڈالا تھا۔ بس یہ ہوا تھا کہ پہلے سے کچھ سنجیدہ میچور ہو گئی تھی۔ جو شاید گزرتے وقت کا تقاضا تھا۔ دوپٹے کو سلیقے سے اوڑھ کر سینڈل اڑس کر وہ باہر نکل آئی۔

"ارے......واہ......یہ چاند کدھر سے نکل آیا ہے۔" بلیک سوٹ میں اس کی سفید رنگت چاندنی کی طرح چمک رہی تھی۔

منتہٰی نے اسے دیکھتے ہی چھیڑا تھا۔ وہ جھینپ سی گئی۔

"لگتا ہے سالک نے تمہیں پہلے ہی اپنی آمد کی اطلاع دی ہوئی تھی۔" اس کے سجے سجائے سراپے پر پیار بھری نگاہ ڈال کر منتہٰی نے مزید کہا تو وہ حیراں ہوئی۔

"کیا ...... سالک! ...... کہاں ہیں وہ؟" اس نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

"ڈرائنگ روم میں امی کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں۔ ابو بھی وہیں ہیں۔" وہ ہونٹ کاٹنے لگی۔

"شاید تمہیں لینے آئے ہیں۔ میں تمہارے کمرے میں گئی تھی جانے تم باتھ روم میں تھی۔"

اس کا دل خوش فہمیوں میں گھرنے لگا۔ "مجھے لینے ......" منتہٰی ہنس پڑی۔

"اچھی لگ رہی ہو بلکہ بہت پیاری...... سالک سے نظر ضرور اتروا لینا۔ کہیں ......" وہ اسے چھیڑ رہی تھی۔ اور اس کا دل خود بخود دھڑکنے لگا۔ چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ وہ بھی اپنی کیفیت پر حیران ہوئی۔ "تو کیا اس نے دماغ نے اتنی جلدی ہار مان لی ہے۔" اس نے خود سے پوچھا۔

"ہاں......" اندر سے کوئی چیخا۔ وہ ڈر گئی جبکہ ابھی وہ وقت بیتانا چاہتی تھی۔

"چلو اندر ...... انتظار کر رہے ہوں گے تمہارا حضرات۔" وہ اس پر جیسے اچھالتے کچن کی طرف چلی گئی تھی۔ وہ لرزتی ٹانگوں سمیت اندر داخل ہوئی وہ پھوپھا جان کے ساتھ مصروف گفتگو تھا۔ سالک نے اسے دیکھا۔

"السلام علیکم۔" وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ جانے کیوں دل امڈ رہا تھا اور خوف بھی تھا کہ اگر اس نے جانے سے انکار کر دیا یا پھر اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو جھٹک دیا تو ...... لیکن اسوہ کا سلام کرنا اور چلے ہوں ...... اس نے سر ہلایا۔ وہ ایک طرف پھوپو کے ساتھ بیٹھ گئی۔ گلاس وال سے باہر دیکھا بارش رکی ہوئی تھی۔

"اسوہ کو کچھ دن رہنے دیتے تم ...... کافی عرصے بعد آئی ہے لڑکی۔" وہ شاید اپنی آمد کا مقصد بتا چکا تھا۔ پھوپو نے اسے دیکھتے ہی کہا تو اس نے اسوہ کو دیکھا جیسے جاننا چاہ رہا ہو کہ اس کی کیا مرضی ہے۔ چلنا چاہتی ہے یا نہیں۔

"ہم پھر آ جائیں گے فی الحال جانے دیں۔" اسوہ خاموش تھی اسی نے کہا۔

"کھانا تو کھا کر جاؤ گے نا۔" انہوں نے پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں ...... موسم کا کچھ پتا نہیں۔ دوسرے میں گھر بتا کر نہیں آیا۔ کھانے تک نہیں رک سکتا۔ شہر گیا ہوا تھا راستے میں یہاں آ گیا ہوں۔ بی بی پیچھے پریشان ہو رہی ہوں گی۔ ابھی تو بارش رکی ہوئی ہے۔ پتا نہیں کب شروع ہو جائے۔" اسوہ انگلیاں چٹخا رہی تھی جبکہ وہ سہولت سے کہہ رہا تھا۔

"یہ خوب کہی تم نے پہلی دفعہ تم دونوں اکٹھے میرے گھر میں ہو، ایسے کیسے جانے دوں۔" پھوپو کھانا نہ کھانے والی بات پر ناراض ہوئیں۔

"موسم خراب نہ ہوتا تو شاید رک جاتا۔ پھر کبھی سہی۔ اب تو ان شاء اللہ آتے رہیں گے۔" اسوہ نے ایک دم سر اٹھا کر اسے دیکھا وہ بھی دھری متوجہ تھا۔ وہ فوراً نظروں کا زاویہ بدل گئی۔ دل نے گویا ایک دم لے بدلی تھی۔ (کیا واقعی سب کچھ بدل چکا ہے)

"ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی۔" پھوپو نے کہا تو اس نے اسوہ کو دیکھا۔

"اسوہ تیار ہو ...... چلیں ......" وہ یوں کہہ رہا تھا جیسے پہلے سے اس کا اس کے ساتھ پروگرام طے ہو۔ ایک دم چونک کر دیکھا پھر سر اثبات میں ہلایا۔

"میں بیگ لے آؤں۔" وہ باہر نکل گئی تھی۔

پھوپو کے ہاں سے بھی نکلتے کافی دیر ہو گئی تھی۔ آسمان پر بادل ایک دفعہ پھر چھانے لگے تھے ہر طرف اندھیرا ہونے لگا تھا

وہ اس کے ساتھ جیپ میں فرنٹ سیٹ پر بیٹھی بالکل خاموش تھی۔ خاموش تو وہ بھی تھا مگر عجیب سی خاموشی دونوں اطراف سے کہہ رہی تھی۔ وہ نظر انداز کیے اپنا دھیان تیز طوفانی ہوا کی طرف مبذول کیے ہوئے تھی۔ موسم کے تیور خطرناک تھے۔ پھر بارش کا بھی کوئی بھروسہ نہیں تھا۔ ابھی تھوڑا ہی فاصلہ طے ہوا تھا کہ پھر تیز بارش شروع ہو گئی تھی۔ وہ ہراساں سی ہو گئی۔ باہر طوفانی بجلی کڑک چمک رہی تھی۔ ایسے موسم سے ہمیشہ ہی اسوہ کی جان نکلتی تھی۔ وہ ایک دم پردے برابر کر کے سالک کی طرف سمٹ آئی۔

"پلیز یہ پردے آگے کر دیں۔ باہر بجلی کڑک رہی ہے۔" خوف سے کپکپاتی آواز تھی۔ سالک نے چونک کر اسے دیکھا۔ گاڑی کا ماحول بھی تاریک سا ہو رہا تھا ایسے میں اسوہ کا چہرہ چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ اس نے اپنی طرف کے پردے برابر کیے تو وہ کچھ پرسکون ہوئی۔

"بارش کافی تیز ہو گئی ہے۔ ابھی گاؤں کا کافی فاصلہ باقی ہے۔ ایسی طوفانی بارش کے آثار تو نہیں تھے۔" اس نے ہی بات شروع کی تھی۔ "مجھے بہت خوف آ رہا ہے جلدی چلیں۔" سردی سے اس کے دانت بجنے لگے۔ وہ مسکرایا۔ دل چاہا کچھ اس کے کہے مگر پھر خاموش ہو گیا نجانے اس کا کیا ری ایکشن ہو۔ موسم خاصا خراب ہو گیا تھا۔ حویلی تک پہنچنا ذرا مشکل تھا۔ قریبی گاؤں میں ان کا ایک باغ تھا۔ ساتھ میں ریسٹ ہاؤس بھی تھا۔ اس نے گاڑی ادھر موڑ دی۔

"یہ آپ ادھر کدھر جا رہے ہیں حویلی چلیں۔ گاؤں میں۔"

"ابھی حویلی جانا مشکل ہے۔ ہر طرف اندھیرا ہے۔ ڈرائیونگ کرنا مشکل ہے۔ ہوا کا رخ بھی تو نجانے کدھر ہے۔ موسم ٹھیک ہوتا ہے تو چلتے ہیں۔"

"مگر آپ جا کہاں رہے ہیں؟" وہ بے حد پریشان ہو گئی تھی۔

"یہاں ہمارا قریب ہی ریسٹ ہاؤس ہے۔"

"آپ سے بہتر تو پھوپھو کا گھر ہی تھا۔ خوامخواہ…" اسوہ کو غصہ آنے لگا تھا۔ اس نے رخ موڑ کر دیکھا۔ وہ خالی آنکھیں پھیلائے اندھیرے کو گھور رہی تھی۔ چہرے پر ایک ناگواری رقم تھی۔ ہونٹ ایک دوسرے میں بھنچ گئے تھے۔ وہ چپ رہا۔

چوکیدار نے ریسٹ ہاؤس میں پہنچتے ہی گیٹ کھول دیا تھا۔ وہ گاڑی اندر لے آیا۔

"آؤ۔" گاڑی سے اترتے اس نے اسوہ سے کہا۔ تو وہ چپ چاپ اتر آئی۔ برآمدے تک پہنچتے وہ اچھی خاصی بھیگ گئی تھی۔

"نور خان کمرہ کھول دو۔ اور گاڑی سے سامان بھی لے آؤ۔ احتیاط سے۔" ملازم جو کہ چوکیدار تھا اس نے فوراً دروازہ کھول دیا تھا۔ وہ ہاتھ مسلتی اندر چلی آئی۔ سالک ساتھ ساتھ تھا۔

"یہ سائیڈ پر کمرہ ہے۔ یہ چابی لے لو۔" سالک نے گیلے بال جھٹکتے اپنی جیب سے چابی نکال کر اسے تھمائی تو وہ خاموشی سے اس کے بتائے گئے کمرے میں آ گئی۔ اس نے گیلی چادر اتار کر بستر پر پھیلائی۔ سردی لگ رہی تھی۔ ابھی وہ سردی کا سدباب کرنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ لائٹ چلی گئی۔ باہر بجلی کڑک رہی تھی اندر بجلی بھی چلی گئی تھی۔ اسوہ کا دل خوف سے سمٹنے لگا۔

"سالک……" اس کے حلق سے ہلکی سی سسکی نکل گئی۔

"سالک…… سالک……" وہ بے اختیار پکارنے لگی۔ کمرے میں بالکل اندھیرا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ مگر بجلی کی کڑک چمک ایک بار چمک کر معدوم ہو جاتی تھی کھڑکی کے شیشے سے یہ منظر بالکل واضح محسوس ہو رہا تھا۔ تبھی کمرے کا دروازہ کھلا اور کوئی اندر داخل ہوا تھا۔

"سالک……" اس نے پکارا تھا مگر جواب ندارد تھا۔

وہ کمرے میں ادھر سے ادھر پلٹی تو کسی سے ٹکرا گئی۔ ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

"اسوہ……" سالک کی آواز انتہائی قریب سے سنائی دی۔ اس کا وجود سالک کے حصار میں تھا۔ اسے کچھ تسلی ہوئی۔

"سالک لائٹ جلائیں مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔" وہ اس کے سینے میں منہ دیئے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ دل کی حالت حد سے سوا تھی۔

"میں نے نور خان سے کہا ہے وہ بندوبست کرتا ہے۔" اپنی جیب سے موبائل نکال کر اس نے اسکرین جلائی تو ہلکی سی روشنی ہوئی جو بہت کم تھی۔

"تم سکون سے بیٹھو……" وہ بستر کے کنارے ٹک گئی۔ چند سیکنڈ بعد کمرہ روشنی میں نہا گیا تھا۔ اسوہ نے سکون کا سانس لیا۔

جنریٹر آن کیا گیا تھا۔ سالک نے اسوہ کو پرسکون ہوتے دیکھ کر حویلی کے نمبرز ملائے۔ سراج بابا تھے، انہیں مختصراً صورتحال سے آگاہ کر کے ریسٹ ہاؤس میں اپنی موجودگی کا بتا کر فون بند کر دیا۔ شام ہو چکی تھی۔ جبکہ بارش رکنے کے قطعی آثار نہ تھے۔ لگتا تھا جیسے انہیں رات یہیں گزارنا پڑے گی۔ وہ کھڑکی سے ہٹ کر اسوہ کی جانب آ گیا جو دوپٹے سے بے نیاز خوبصورت جدید تراش خراش والے لباس میں خوب جچ رہی تھی۔ چادر بستر پر پھیلی ہوئی تھی۔ ہاتھوں کو مسلتی وہ کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ سالک نے آگے بڑھ کر بجلی کا ہیٹر آن کیا پھر اس کی طرف آ گیا۔

"اسوہ……" اس کے سامنے بستر پر بیٹھا تھا۔ وہ سر اٹھا کر چند سیکنڈ دیکھ کر رہ گئی۔ سالک کی نظروں کی چمک بے تحاشا تھی۔ جو اس کے لیے حیران کن ضرور تھی مگر ناقابل فہم نہیں تھی۔

"جی……" وہ صرف یہی کہہ سکی تھی۔ سالک نے اس کے کپکپاتے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے۔ ٹھنڈے یخ ہاتھ تھے۔ وہ ہتھیلیوں کو اپنے ہاتھوں سے رگڑتے حرارت پہنچانے لگا تھا۔

"اگر میں تم سے کہوں کہ میں نے کبھی تم سے نفرت کی ہی نہیں۔ صرف محبت کی ہے تو تمہارا کیا جواب ہو گا۔" کتنا غیر متوقع سوال تھا۔ وہ شاکڈ سی دیکھتی رہ گئی۔

"آ…… آ…… آپ……" وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ "ہاں اسوہ، یہ سچ ہے۔ میں نے تمہیں کبھی ناپسند نہیں کیا۔ میرے اعتراضات صرف اس حد تک تھے کہ میں تمہیں اپنے آئیڈیل میں ڈھلتا دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے تم سے کبھی بھی نفرت نہیں کی۔ صرف محبت کی۔ تب سے جب ہمارا نکاح ہوا تھا۔ اظہار کرنا میری شخصیت کا حصہ نہیں تھا۔ جو بھی کچھ ہوتا گیا دانستہ یا نادانستہ اس میں میرا قصور نہ تھا۔ مگر سزا ہم دونوں نے پائی ہے۔" اس کے محبت سے لبریز لہجے میں اس اقرار محبت پر اسوہ کی آنکھیں جلنے لگی تھیں۔

"ایم سوری، رئیلی سوری…… میں نے جان بوجھ کر کبھی بھی تمہیں تکلیف دینا نہیں چاہی۔ ساری والے معاملے پر بھی میں صرف یہی کہوں گا کہ جو بھی کچھ کیا محبت کی انتہا تھی میری نفرت کہیں بھی نہیں تھی۔ وہ تو حالات معاملے کو کچھ کا کچھ بنا گئے تھے۔" وہ یک تسلسل سے رونے لگی تھی۔ سالک نے اپنی انگلیوں سے اس کے تمام آنسو چن لیے۔

"کاش تم اپنے دل کی غلط فہمیوں کو پہلے بیان کر دیتی تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔" اس نے کہا تھا۔ وہ اپنے ہاتھ کھینچ کر ہاتھوں میں چہرہ چھپا گئی۔

"میں نے چچا جان اور چچی جانی سے بھی بات کر لی ہے۔ ہم سب ہی شرمندہ ہیں۔ کیا تم اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ نہیں کرو گی۔ ہمیں معاف نہیں کرو گی۔" وہ اسی طرح نارمل سے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ اسوہ نے اپنے ہاتھ ہٹائے، پھر نفی میں سر ہلایا۔

"میں کسی سے بھی ناراض نہیں ہوں۔ آپ سے بھی نہیں۔ امی اور بابا جانی سے بھی نہیں۔"

"تو پھر……"

"اگر آپ مجھے ناپسند کرتے تھے تو وہ لڑکی کون تھی جسے آپ پسند کرتے تھے۔" کچھ دیر بعد اس نے پوچھا تو حیران ہوا پھر

ہنس دیا۔ اسوہ سر جھکا گئی۔ وہ ایک دم ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔

"کوئی بھی نہیں تھی۔ جس لڑکی کے بارے میں تم مشکوک ہو وہ میری کلاس فیلو اور دوست کی سسٹر تھی اور کچھ بھی نہیں۔ یہ بہت پرانی بات ہے تمہیں ابھی تک یاد ہے۔" اب لہجہ نارمل نہیں تھا شگفتگی لئے ہوئے تھا۔ وہ چپ رہی۔

"ایک بات کہوں..... مجھ پر یہ نکاح کے بعد انکشاف ہوا تھا کہ میں در پردہ تمہیں ہی پسند کرتا تھا۔" اپنے مزاج کے برعکس آج وہ مسکراتے ہوئے اسے چھیڑ رہا تھا۔ اسوہ نے اپنا چہرہ صاف کیا۔

"تم بہت اچھی ہو اسوہ، میں نے کبھی بھی تمہیں چھوڑنے کا نہیں سوچا تب بھی نہیں جب میں تمہارے بارے میں مشکوک ہوا تھا اب بھی نہیں۔ میں تو صرف تمہاری وجہ سے......"

"اسوہ... ہم دونوں اتنا عرصہ ایک دوسرے سے بھاگتے رہے ہیں۔ اب مجھے لگتا ہے جیسے میں تھک گیا ہوں۔ میں اب رکنا چاہتا ہوں۔ ایک مرکز پر، یہیں ہمیشہ کے لئے، بی بی جان کی بھی خواہش ہے۔ اگر تم چاہو تو......" وہ جھجکتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ گیا تھا۔

"بارش کب ختم ہوگی.....؟" اس کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے بھی وہ نا سمجھی کا مظاہرہ کر رہی تھی جبکہ چہرہ کافی حد تک بلش ہو گیا تھا۔ وہ اس معنی خیز "تو" سے بچنا چاہتی تھی۔

"شاید آج بارش کا بھی برسنے کا موڈ ہے۔ پہلے سے تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔"

"مجھے بہت خوف آتا ہے ایسی طوفانی بارش سے۔" وہ اپنا ڈر بیان کر رہی تھی۔

"اور مجھے تو ایسی بارش میں بھیگنے میں لطف آتا ہے۔" سالک نے کھڑکی کے شیشے کے پار برستی موسلا دھار بارش کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"اسوہ... چلو بارش میں بھیگتے ہیں۔" اچانک اس نے کہا تو وہ ایک دم پیچھے ہٹی تھی۔

"نہیں... مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ کبھی نہیں۔ اتنی سردی ہے۔" وہ ابھی سے کپکپانے لگی تھی۔ سالک مسکرا دیا پھر اس کا بازو تھام کر اسے قریب کر لیا۔

"پاگل ہو تم بھی... میں مذاق کر رہا تھا۔ مگر میری موجودگی میں تمہیں ڈر نہیں لگے گا۔ بیوی....." گمبھیر لہجے میں کہتے اس نے اسے اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ اسوہ کا کپکپاتا وجود لرزا تھا مگر اب اس میں خوف کا عنصر نہیں بلکہ محافظت کا احساس غالب تھا۔

"ہم پچھلی سب باتوں کو بھلا کر ایک نئی زندگی شروع کریں گے۔ اس وعدے کے ساتھ کہ کوئی بھی بات کوئی بھی غلط فہمی دل میں نہیں رکھیں گے۔ ورنہ یہ چھوٹی موٹی باتیں بڑھ کر بہت بڑی ہو جائیں گی اور "Poison Tree" کا کردار ادا کریں گی۔" وہ اس کے کان میں سرگوشی کے سے انداز میں کہہ رہا تھا۔ اسوہ کی آنکھوں سے چند آنسو بہے تھے اور سالک کے گریبان میں جذب ہو گئے تھے۔

سالک نے جھک کر ایک استحقاق بھری مہر اس کی پیشانی پر ثبت کی تھی اسوہ اس کی پناہ میں مزید سمٹ گئی تھی۔ باہر بارش ابھی تیز تھی مگر اندر وہ پرانے دنوں کو بھلائے نئی زندگی کی شروعات کر رہے تھے۔ دونوں ہی پرسکون اور خوش تھے۔

اور زندگی بھی انہیں دیکھ کر مسکرائی تھی۔

"مسافر لوٹ آئے ہیں۔" ہوائیں کھڑکی کے شیشوں پر دستک دیتے گنگنا رہی تھیں۔ سالک اس کے کان میں سرگوشی کے سے انداز میں کچھ کہہ رہا تھا اور اسوہ سر ہلائے مسکرائے جا رہی تھی۔ کہ یہی زندگی تھی اور یہی محبت تھی۔

ہم دل سے ہارے ہیں

وہ سوئی ہوئی تھی... بہت گہری نیند میں تھی جب ایک دم کمرے کا دروازہ تھپتھپانے کی آواز پر وہ ہڑبڑا کر اٹھی تھی۔ ادھ کھلی آنکھوں سے پہلے اردگرد کا جائزہ لیا۔ دروازے پر دستک خواب میں نہیں حقیقت تھی۔

"کون...؟" کمرے کی مدہم روشنی میں دوپٹے کی تلاش میں ناکام ہو کر وہ دروازے کی طرف چلی آئی تھی، باہر سے نوران کے رونے کی آواز کانوں میں گونجی تو اس نے فوراً دروازہ کھول دیا۔

"آ... آ... آپ..." شہباز حیدر کو سامنے دیکھ کر وہ ایک لمحے کو پریشان ہوئی تھی۔ وہ نوران کو اٹھائے ہوئے تھے، جو مسلسل رو رہا تھا، شہباز حیدر نے لب بھینچے ہوئے تھے۔

"نوری میری جان..." وہ فوراً آگے بڑھی تھی۔

"کیا ہوا ہے... یہ رو کیوں رہا ہے؟" وہ شہباز حیدر کے تاثرات نظر انداز کیے پریشانی سے گویا تھی، شہباز حیدر نے سلگتی نظروں سے عیشہ واجد کو دیکھا۔

"ماما پاس جانا ہے..." اسے دیکھ کر وہ مزید بلکا۔

"سنبھالو اسے... دو گھنٹوں سے اس نے میرا سر کھایا ہوا ہے۔" اس کو مزید بلک کر عیشہ کی طرف بازو بڑھاتے دیکھ کر ان کا پارہ ایک دم ہائی ہوا تھا۔ عیشہ واجد نے بغور شہباز حیدر کو دیکھا، کمرے کی ہلکی روشنی سیدھی شہباز حیدر کے چہرے کے تاثرات کو آشکار کر رہی تھی۔ انتہائی بیزاری، کوفت، ناگواری کے تاثرات صاف پڑھے جا سکتے تھے۔ انہوں نے فوراً ان کو اس کی طرف بڑھایا تو اس نے بھی جلدی سے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

"میری جان، میرا نوری... میرے پاس آنا تھا..." اسے پچکارتے خاموش کرواتے اس نے نیچے کھڑا کیا تھا، پھر اس کا سر اپنے ساتھ لگا لیا تھا، اس کے پاس آتے ہی فوراً خاموش ہو گیا تھا۔

"یہ رو کیوں رہا تھا؟" شہباز حیدر واپس پلٹے تھے، جب اس نے پوچھا تو انہوں نے چہرا موڑ کر اسے دیکھا۔ ہلکی مدھم روشنی میں کھلے بالوں، بغیر دوپٹے کے ڈھیلے ڈھالے سراپے میں نمایاں ہوتا اس کا سفید دودھیا چہرہ بالوں کی لٹوں میں ایک لمحے کو انھیں، اس پر کسی گزرے لمحے کا گمان ہوا تھا، اس وقت وہ ان کو بالکل دریشہ کی طرح لگی تھی۔ وہی ہونٹوں کا کٹھیلا پن، لمبی پلکوں کی جھالر تلے چمکتی آنکھوں کی جھیل سی گہرائی میں موجزن طوفان، دودھیا رخساروں کی چمکتی چاندنی میں ہلکورے لیتا احساس، پشت پر بکھرا گئے بالوں کا آبشار، ایک لمحے کو انہیں بھی کسی طوفان سے آشنا کر گیا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ سنبھل کر نظریں چرا گئے تھے۔ وہ عیشہ واجد تھی دریشہ نہیں تھی۔

"تمہارے پاس آنے کی ضد کر رہا تھا..." ہونٹوں کو دانتوں تلے سختی سے دبا کر انہوں نے اپنے کسی احساس سے نظر چرا

کر کہا تو وہ تڑپ اٹھی۔۔ کتنا ظلم کر رہے تھے بچے کے ساتھ ساتھ اس پر بھی۔

"تو لے آتے۔۔ آپ اسے مجھ سے کیوں دور کر رہے ہیں۔۔ ایسی بھی کیا خطا ہو گئی ہے مجھ سے کہ آپ میرے ساتھ ایسا سلوک کر رہے ہیں۔" کئی دنوں کا شکوہ اس کے لبوں پر مچل گیا۔ کچھ خفگی، کچھ ناراضگی اور بے پناہ استحقاق لیے۔۔۔ وہ کھڑی تھی کہ شہباز حیدر نے چونک کر انتہائی تعجب سے اپنے سامنے کھڑی اس چھوٹی سی لڑکی کو دیکھا جو اس کی زندگی کو کسی نئے احساس سے آشنا کرنے کے درپے تھی۔ اس کی آنکھوں کی خفگی میں صاف دکھائی دیتا جذبہ اور لہجے کی خفگی میں ڈولتا ابھرتا "استحقاق" کا احساس انہیں ساکن کر گیا۔

"میرے کس عمل سے اس لڑکی کو اتنی ہمت ملی ہے کہ آج میرے سامنے کھڑی ہے۔۔" وہ حیران تھے۔ اسی لیے تو وہ اس سے پہلو تہی کی روش اختیار کر رہے تھے، مگر اب احساس ہو رہا تھا ان کی یہ روش اس لڑکی کو اور بھی شہ دے گئی ہے۔ یہ لڑکی ان کی راہ میں چٹان کی طرح ان کو شکست دینے کو کھڑی ہے اور پرے فوزان کی حد سے زیادہ اٹیچ منٹ۔ وہ اس وقت پر پچھتائے جب فوزان کی پیدائش کے بعد پہلے غم میں نڈھال انہوں نے سارے اختیارات عیشہ واجد کو دے دیے تھے اور پھر اس لڑکی کی کو اتنی ہمت ملی کہ آج وہ ان کے سامنے کھڑی یہ پوچھ رہی تھی۔ وہ بغیر جواب دیے پلٹنے تھے جب پیچھے سے وہ کہنے لگی۔

"مجھے آپ کے رویے کی سمجھ نہیں آ رہی کہ آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔۔ میرا کوئی قصور ہے تو مجھے بتائیں۔۔ مجھے فوزی کو اس طرح تکلیف دے کے آپ کیا باور کرانا چاہتے ہیں۔" وہ رکی تھی۔ فوزان کو بستر پر لیٹنے کا اشارہ کر کے کرسی پر پڑی چادر اوڑھ کر وہ اب کمرے سے نکل کر شہباز حیدر کے سامنے آ رکی تھی۔

"چلیں میں آپ کا یہ رویہ نظر انداز کرتی جا رہی ہوں۔۔ مگر کب تک۔۔ اب تو گھر والے بھی متوجہ ہونے لگے ہیں۔۔ دادی جان بھی کئی بار پوچھ چکی ہیں کہ فوزی میری بجائے اب آپ کے پاس کیوں ہوتا ہے۔۔ یا میں اکتا گئی ہوں اس کی ذمہ داری سے۔۔"

شہباز حیدر کا خیال تھا کہ اس کے اس ردعمل سے وہ خود ہی پیچھے ہٹ جائے گی مگر اس وقت وہ ان کے سامنے کھڑی جس انداز میں باز پرس کر رہی تھی ان کا جی چاہا کہ وہ کھینچ کر طمانچہ اس کے منہ پر رسید کر دیں۔ یعنی الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔۔ ان کے اندر رکا آتش فشاں ایک دم پھٹا تھا۔

"تم بچی نہیں ہو کہ میرے ان رویوں کو سمجھ نہ پاؤ۔۔ یہ سوال مجھ سے نہیں اپنے آپ سے کرو تو بہتر ہے۔" وہ پلٹے تھے پھر سے ہکا بکا دیکھ کر رک گئے۔

"دراصل اپنا موازنہ کرتے ہوئے یہ مت بھولنا کہ رشتے میں تم میری بھتیجی ہی نہیں میں تمہارا پھوپھا بھی لگتا ہوں۔۔ ہمارے درمیان تیرہ سالوں کا ایج ڈیفرنس ہے۔۔ پاگل احمق لڑکی۔۔" دانت پیستے، کھا جانے والی نظروں سے نوازتے اسے اپنی جگہ پر ساکن کر کے آگے بڑھ گئے تھے۔ وہ حیرت سے گنگ ان کی چوڑی پشت کو دیکھے گئی، ہاتھ پاؤں سن ہو گئے تھے۔

"تو۔۔" وہ لڑکھڑائی۔ تو اسی لیے یہ میرے ساتھ یہ سلوک کر رہے تھے۔ مگر میرے کس رویے سے انہیں یہ محسوس ہوا کہ میں۔۔ میں۔۔"

"ماما آجائیں۔۔ نیند آئی ہے۔۔" وہ نجانے کیا کیا سوچتی فوزان کی آواز اسے ہوش کی دنیا میں گھسیٹ لائی۔ عیشہ کو لگا پورا وجود کانپتا محسوس ہوا، وہ لرزتی ٹانگوں سمیت دروازہ بند کر کے بستر پر آئی تھی۔ فوزان بستر پر لیٹا ہوا تھا، وہ لیٹی تو اس کے ساتھ چپک کر لپٹ گیا۔ عیشہ واجد نے اک بے چارگی سے اسے دیکھا، اس بچے نے نجانے اس کو کن کن احساسات سے دوچار کیا تھا، اس کے اندر نجانے کیسے کیسے طوفان برپا کیے تھے۔ اس کے جذبوں کو کیسی ہوا دی تھی۔ کیسے پھول کھلائے تھے۔۔ عیشہ کی آنکھوں میں بھی

ٹھہری۔ اس کی پیشانی چومتے، بالوں میں انگلیاں پھیرتے اسے بغور دیکھا۔ اس اک نظر نے اس کے وجود میں اک طوفان برپا کر دیا۔ دل کی دھڑکن کا کوئی اندازہ نہ تھا، عیشہ واجد کو ایک پل کو یہ گمان گزرا کہ اس کے پہلو میں فوزان نہیں بلکہ شہباز حیدر ہے۔۔ اسی خیال نے اس کے انگ انگ میں کپکپی دوڑا دی تھی۔

"مجھے آپ کے بغیر نیند نہیں آتی۔۔ پاپا نے بہت ڈانٹا تھا۔۔ تھپڑ بھی مارا۔۔ کہتے تھے کہ میں ان پاس سویا کروں۔۔ آپ گندی ہیں۔۔" بچے تو معصوم ہوتے ہیں، جو سنتے ہیں بلاوجہ سوچے سمجھے کہہ دیتے ہیں، وہ منہ بسور کر بتا رہا تھا۔ وہ بغیر پلکیں جھپکائے حیرت و دکھ سے دیکھے گئی۔

"یہ پاپا نے کہا تھا؟" اس نے "گندی" کے لفظ پر بے یقینی سے پوچھا، اس نے سر اثبات سے ہلایا تو وہ بے بسی سے بہت مچل کر رو دی۔

"پاپا کہہ رہے تھے آپ میری ماما نہیں ہیں۔۔ آپی ہیں۔۔ میں آپ کو آپی کہا کروں۔۔" بچے تو کائنات کا سب سے پاکیزہ ہوتے ہیں۔ اپنی معصومیت سے وہ مزید بتا رہا تھا۔

"پاپا بھی کہتے ہیں مجھے آپ کے پاس آنے کی ضرورت نہیں۔۔ آپ سے دور رہا کروں۔۔ پاپا کے پاس سویا کروں، ان کے ہاتھ سے کھانا کھایا کروں۔۔ وہ مجھے ہوم ورک بھی کروایا کریں گے۔۔" وہ اور بھی بہت کچھ بتا رہا تھا، عیشہ واجد نے خاموشی سے اس کی پیشانی پر اپنی ٹھوڑی ٹکا کر اسے اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔

"اچھا نہیں کر رہے شہباز حیدر آپ۔۔ چھوٹے سے بچے کے ذہن میں آپ اس طرح کی نفرت بھر کے کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔۔ فوزان سے میری یہ محبت بے غرض اور بے لوث ہے۔ یہ تو اس وقت کا احساس ہے کہ آج میرے دل میں وہ سارے جذبے جنم لے رہے ہیں جو کبھی میرے اور شاید اب آپ کے نزدیک باعث گناہ ہیں۔۔" فوزان کے بالوں میں خاموشی سے انگلیاں پھیرتی رہی۔

"ماما۔۔" آنکھیں بند کرتے اس نے پکارا تو اس نے اس کو دیکھا۔

"ہوں۔۔"

"ماما۔۔ آپ پاپا کے پاس کمرے میں کیوں نہیں رہتیں۔۔ عدیل کی ماما چچو کے ساتھ رہتی ہیں، پھر آپ یہاں پیچھے کیوں رہتی ہیں۔۔ مجھے نہیں پتہ بس آپ اور پاپا اکٹھے رہا کریں۔۔" وہ تنہائی بھولپن سے اس کے وجود میں آگ لگا گیا تھا، وہ بے یقینی سے دیکھے گئی۔

"چپ۔۔" اس نے سختی سے اس کے منہ پر انگلی رکھ دی۔

"خبردار تم نے آئندہ ایسی بات کی تو۔۔ تمہارے بابا تو میری جان نکال دیں گے۔۔" ایک دم خوف سے ڈر کر اس نے فوزان کو ڈپٹ دیا، اس کی دھڑکن حد سے سوا تھی۔

"مگر آج میں نے پاپا سے کہا تھا وہ آپ کو اپنے کمرے میں لے کر آئیں۔۔ انہوں نے اتنی زور سے تھپڑ مارا تھا۔۔ بس مجھے نہیں پتا آپ پاپا کے ساتھ رہیں۔۔ پھر آپ دونوں کے ساتھ سویا کروں گا۔۔ پاپا کے ساتھ اکیلے سوتے ڈر لگتا ہے۔۔" وہ منہ بسورتے رہا تھا، عیشہ نے دہل کر اس کی معصوم صورت دیکھی۔ ہر نقش شہباز حیدر کا چرایا ہوا تھا۔

"تم نے اپنے پاپا سے یہ سب کہا تھا۔۔؟" اس نے بے یقینی سے دہرایا تو اس نے گردن زور سے ہلائی۔

"پاپا نے سختی سے ڈانٹ دیا تھا۔۔ وہ کہتے ہیں میری ماما "اللہ جی" کے پاس چلی گئی ہیں، آپ صرف میری آپی ہیں۔۔" وہ ساکت دیکھے گئی، بھلا چھوٹے بچے سے یہ باتیں کرنے والی تھیں۔ شہباز حیدر کو ذرا بھی احساس نہیں تھا کہ اس طرز عمل سے اگلے

بیٹے کی شخصیت میں کتنا بڑا خلا پیدا ہو سکتا ہے۔ ماں سے محرومی کا خلا۔۔۔ جو اس نے کبھی ہونے نہیں دیا۔

"ماما۔۔۔ پاپا سچ کہتے ہیں۔۔۔ واقعی آپ میری ماما نہیں ہیں۔۔۔؟" وہ پوچھ رہا تھا، عیشہ کا دل کانپ کر رہ گیا، اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ کتنی تلخ حقیقت تھی مگر سچ تھی۔ وہ جسے ماما کہتا ہے، وہ اس کی ماں نہ تھی، جبکہ وریشہ اس کی سگی ماں تھی، جو اس کو جنم دینے کا سبب بنی تھی مگر پالا تو اس نے تھا۔ پیدا ہوتے ہی وہ اس کی ذمہ داری بن گیا تھا، پھر اتنے سالوں تک اس کی گود اس کی ممتا کی تسکین بنتی رہی تھی، اس نے اسے کبھی ماں کی کمی محسوس ہی نہیں دی تھی اور وہی دور تھا، جب فوزان کی سنبھالتے اسے پروان چڑھاتے اسکے اندر کے اندر، کم عمر جذبوں کی ایک نام ملا تھا۔ شہباز حیدر کا نام۔۔۔ وہ خود ہی ڈرنے لگی تھی، اپنی انہونی خواہشوں سے منہ چھپانے لگی تھی، اور پھر جب فوزان نے بولنا شروع کیا تھا، تو اس کی زبان سے لفظ "ماما" نکلا تھا، اور نہال ہوگئی تھی، کم عمری کے جذبے، کم عمری کی محبت اور بھرپور محبت کا احساس نجانے کیوں اسے لگنے لگا کہ وہ واقعی فوزان کی ماما ہے۔ شروع میں سب ہی چونکے تھے فوزان کے منہ سے یہ نام کر مگر وہ بچہ تھا، نہ اسے کوئی سمجھ تھی نہ بوجھ۔۔۔ سب کا خیال تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ جب رشتوں کو جاننے اور سمجھنے لگا تو خود بخود وہ اس نام کو ترک کر دے گا۔ اور پھر وقت گزرتا چلا گیا، اور اس کی ماما کہنے کی عادت پختہ ہوتی چلی گئی۔ کسی کو بھی اسے ٹوکنے یا اصل حقیقت بتانے کا دھیان نہ رہا۔ وریشہ کے بعد شہباز حیدر نے اپنے آپ کو کاروباری جھمیلوں میں اس قدر گم کر لیا کہ بچے کی طرف سے بھی غافل ہوتا چلا گیا، نانی دادی، پھپھو اور سب سے بڑھ کر عیشہ اس کا خیال رکھنے والی تھیں، وہ مطمئن ولا پرواہ چلا گیا۔ کالج سے آنے کے بعد عیشہ کی زندگی کا محور فوزان ہوتا تھا۔ اسکے چھوٹے چھوٹے کام وہ بہت محبت سے کرتی تھی، وہ شروع سے ہی اس کے پاس سوتا تھا، اور پھر یہ عادت اتنی پختہ ہوئی کہ وہ کسی اور کے پاس ایک رات بھی نہیں سو پاتا تھا۔ یہ تو کچھ دنوں پہلے کی بات تھی یا شاید ایک دو سے یہ سب چل رہا تھا، غیر محسوس طریقے سے شہباز حیدر فوزان کو اس سے دور کرنے کی کوشش میں تھے، وہ جو رات گئے گھر لوٹتے، اب سرِ شام ہی گھر میں ہوتے تھے۔ فوزان کو ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے تھے، کبھی باہر گھومنے لے جاتے اور کبھی کسی کھانے کی چیز کا لالچ دے کر۔۔۔ وہ بچہ تھا، بہل بھی گیا تھا مگر چپ تھا۔۔۔ عیشہ خاموشی سے صرف دیکھ رہی تھی بلکہ اچھی طرح محسوس بھی کر رہی تھی، وہ شہباز حیدر سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی، ایک دو دفعہ اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی بھی تو شہباز حیدر کا رویہ اس کے ساتھ انتہائی ہتک آمیز، روکھا پھیکا اور سرد ہو جاتا۔ وہ اسے مسلسل اگنور کر رہے تھے عیشہ کچھ بھی نہیں کہہ سکتی تھی، صرف چپ تھی وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ اسے کچھ سمجھ آ رہی تھی، وہ سارا دن ترس جاتی تھی، فوزان کیلئے۔۔۔ اس کی پیاری پیاری باتوں، معصوم شرارتوں کیلئے وہ صرف رات کو اس کے پاس آتا تھا، وہ بھی صرف سونے کیلئے اور آج رات وہ اس کے پاس نہیں آیا تھا، آج شہباز حیدر فوزان کو پارک میں لے کر گئے تھے، رات گئے لوٹے تھے، وہ انتظار کرتی رہی تھی کہ گھر آنے کے بعد وہ فوزان کو اس کے پاس چھوڑ جائیں گے مگر آج یہ نہیں ہوا تھا۔ کتنی دکھی ہوئی تھی، فوزان کو اپنے ساتھ چمٹا کر سونے کی عادت اتنی پختہ ہو چکی تھی کہ اس کے بغیر سونے کا تصور ہی سوہانِ روح تھا مگر اب جب کہ وہ خود سونے پر مجبور کر چکی تھی بلکہ سو بھی چکی تھی تو شہباز حیدر فوزان کو اس کے پاس چھوڑ گئے تھے، مگر ان کا رویہ ان کی باتیں اور اب فوزان کی باتیں۔۔۔ وہ کٹ کر رہ گئی تھی۔ اس نے ہونٹ کاٹتے اسے دیکھا، وہ اس کے سینے پر سر رکھے گہری نیند میں تھا، وہ خاموشی سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی۔

"اچھا نہیں کر رہے آپ میرے ساتھ۔۔۔ میں نے تو آپ سے کچھ بھی نہیں مانگا اور نہ ہی مانگوں گی۔۔۔ صرف خاموشی محبت ہی تو آپ سے کر رہی تھی۔۔۔ اور اب آپ اس کا حق بھی مجھ سے چھین رہے ہیں۔۔۔ یہ فوزی۔۔۔" اس نے بھرائی آنکھوں سے معصوم صورت کو دیکھا۔

"اس کے بغیر مر جاؤں گی۔۔۔ میں نے بن ماں کے زندگی گزاری ہے۔۔۔ مجھے پتا ہے جب ماں کا سایہ میسر نہ آئے تو زندگی میں کیسا خلا بھر آتا ہے، میں نے تو اس خیال سے اس بن ماں کے بچے کو اپنا بنایا تھا لیکن کیا پتہ تھا کہ یہ دل ہی بغاوت کر جائے

گی یہی معصوم صورت نے میرے اندر کے خلا کو آپ کا عکس دیا تھا، اور اب جبکہ میں اس مقام پر آ چکی ہوں جہاں واپس پلٹنا میرے لیے موت ہے تو آپ کا طرزِ عمل میری جان نکالنے کو کافی ہے۔۔۔ آپ کے تیور دیکھتے ہوئے اتنے دن سے اپنے آپ کو میں سنبھال رہی ہوں۔۔۔ مگر اب نہیں۔۔۔ بات کھلی ہے تو ہو گئی سہی۔۔۔ اچھا ہے نا، بن کہے ہی آپ میرے جذبوں سے آگہی پا گئے ہیں۔۔۔ ورنہ میں شاید ساری عمر سلگتی رہتی، اور آپ کو خبر ہی نہ ہو پاتی۔" آنسو اس کے رخساروں پر تسبیح کے دانوں کی طرح ایک ایک کر کے گرتے جا رہے تھے، اور وہ گیلی لکڑی کی مانند اندر ہی اندر سلگنے لگی تھی۔

اس نے بھی اظہار کی شدت میں چپ سادھے رکھی
میں نے بھی کچھ کہنے کی خواہش میں بات چھپا دی
اس وحشت میں جیتے جیتے جیون دھول ہوئے ہیں
اس نے ایک دیوار اٹھا دی، میں نے ایک گرا دی

* * *

ڈوبی ہوئی خلوص میں جس کی نگاہ تھی
مجھ کو اس کی چاہ تھی اور بے پناہ تھی
فراز کس کو علم ہے اس چاند کے بغیر
جو چودھویں کی رات تھی کتنی سیاہ تھی

"اس کے گھر میں اور خاندان آباد تھے، ایک عبداللہ صاحب کا اور دوسرا حیدر صاحب کا۔ عبداللہ صاحب کے دو بچے تھے بیٹا واجد عبداللہ اور بیٹی وریشہ عبداللہ جو کہ واجد سے کئی سال بعد بڑی منتوں مرادوں سے پیدا ہوئی تھی، حیدر صاحب کے دو بیٹے شہباز حیدر، اور قیوم حیدر تھے۔ تین بیٹیاں فارحہ، مہوش، اور سونیا۔۔۔ تینوں بڑی تھیں، پھر شہباز تھے، شہباز اور وریشہ ہم عمر تھے، جبکہ قیوم سب سے چھوٹا تھا۔ واجد عبداللہ کی شادی سگی خالہ زاد سے ہوئی تھی مگر چند سالوں بعد گردوں کی تکلیف کی وجہ سے انتقال کر گئیں، اس وقت عیشہ چار سال کی تھی، اس دوران حیدر صاحب بڑی تینوں بیٹیوں کی شادی کر چکے تھے، اب کی بار عبداللہ صاحب نے چار سال بعد دوبارہ واجد کی صاحب کا گھر بسایا تھا، عینہ ان کے دوست کی بیٹی تھی، وہ جوائنٹ فیملی سسٹم کی عادی نہ تھیں، دو بچوں کی پیدائش تک صبر کر کے انہوں نے یہ سب برداشت کیا تھا، واجد صاحب اس پر راضی نہ تھے مگر بیوی اور باپ کے سامنے ایک نہ چل سکی عیشہ اس وقت کافی سمجھدار تھی، پھر ماں سے محرومی اور سوتیلی ماں کے ساتھ سے اسے وقت سے پہلے ہی کافی میچور کر دیا تھا، وہ باپ کے ساتھ علیحدہ گھر میں نہیں گئی تھی، یہیں رہ گئی تھی۔ عیشہ کو وریشہ سے بہت محبت تھی اور یہی حال وریشہ کا تھا عمروں کے فرق کے باوجود دونوں دوستوں کی طرح ہوتی تھیں، وریشہ اور شہباز دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے، خاندان کی بات تھی، سو دونوں کی بات بھی طے ہوگئی تھی، عیشہ آٹھویں کلاس میں تھی جب وریشہ کی شہباز سے شادی ہوئی تھی، مگر بدقسمتی سے وریشہ شادی کے تین سال بعد ہی فوزان کی پیدائش پر انتقال کر گئی تھیں، پورے خاندان پر ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا، وریشہ کی جواں مرگ کا صدمہ ہی ایسا جان لیوا تھا کہ کئی ماہ تک کوئی بھی اپنے آپ کو نہ سنبھال پایا تھا، شہباز حیدر تو ایک طرف باقی سب بھی نڈھال تھے۔ عیشہ جو وریشہ سے نہ صرف شکل و صورت میں مشابہت رکھتی تھی بلکہ زیادہ تر وریشہ کے زیرِ اثر رہتے ہوئے اس کے اندر اس جیسی عادات و اطوار پیدا ہو گئی تھیں۔۔۔ اس نے بہت خاموشی سے انتہائی خلوص و توجہ سے فوزان کو سنبھال لیا تھا۔ کالج سے آنے کے بعد وہ سارا وقت فوزان کے چھوٹے موٹے کاموں میں صرف کر دیتی تھی، وہ ماں سے محرومی کے احساس سے واقف تھی، جس طرح اس کی ماں کے انتقال کے بعد دادی، پھوپھی

نے سنبھال لیا تھا، اسی طرح فوزان کو سمیٹ لیا تھا، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سبھی سنبھل گئے تھے، فوزان عیشہ سے حد سے زیادہ اٹیچ ہو چکا تھا، کسی کو بھی احساس نہ تھا کہ آنے والے وقت میں یہ اٹیچمنٹ کوئی اور رنگ بھی اختیار کر سکتی تھی، شہباز حیدر فوزان کو عیشہ کی ذمہ داری سمجھ کر لاپرواہ ہوتے چلے گئے۔ اور وہی دور تھا جب اس کے اندر نئے جذبات انگڑائیاں لے کر بیدار ہوتے چلے گئے تھے۔ اس نے خود کو روکنے کی، باز رکھنے کی کوشش کی مگر دل ناداں کب تک سمجھتا ہے اور پھر اس نے دل کے سامنے ہار مان لی، ایف ایس سی کے بعد بی ایس سی اور اب وہ ایم ایس سی کے لئے یونیورسٹی ایڈمیشن لے چکی تھی، یونیورسٹی میں اس کا آخری سال تھا، وہ پڑھائی میں بڑی سنجیدہ بھی، وہ کسی کے سامنے دل کا درد آشکار نہیں ہونے دیتی تھی مگر گزشتہ ایک ماہ سے شہباز حیدر کو بھی نے کیسے اس کے جذبوں سے آگاہی ہو گئی تھی، اور پھر انہوں نے حفاظتی اقدامات بھی کرنے شروع کر دیئے تھے، رات سوچنے کے بعد اس نے شہباز حیدر سے آر پار کا فیصلہ کیا تھا۔ شہباز حیدر کا فوزان کے سلسلے میں یہ رویہ اس کے لیے برداشت کرنا ناممکن تھا۔ صبح اس نے یونیورسٹی سے آف کرنے کا سوچا تھا۔ قیوم چچا کی بیگم میوش کالج میں لیکچرر تھیں، ان کے دونوں بچے اور فوزان سب اکٹھے ہی صبح صبح ان کے ساتھ سکول کے لیے نکلتے تھے، واپسی پر عبداللہ صاحب بچوں کو لے کر آتے تھے، فوزان عدیل اور مشا ایک ہی سکول میں پڑھتے تھے۔ عبداللہ صاحب اور حیدر صاحب لکڑی کا کاروبار کرتے تھے، لکڑی خرید کر آگے فروخت کرنا ان کا کام تھا، جو رفتہ رفتہ اب کافی وسیع ہو گیا تھا، واجد کے علیحدہ ہوتے ہی انہوں نے اس کے حصے کا کاروبار بھی علیحدہ کر دیا تھا، اب حیدر صاحب اور عبداللہ صاحب کا سارا کام حیدر اور شہباز ہی چلا رہے تھے، وقت کے ساتھ ساتھ گھر میں خوشحالی آچکی تھی، قیوم انجینئر تھے، واحد صاحب کے اپنی دوسری بیوی سے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی، وہ بیرون ملک میں، دوسرے ہی ملنے آتے رہتے تھے۔ عیشہ اپنے کمرے کو سمیٹ کر کچن میں آئی تو چچی جان چیزیں سمیٹ رہی تھیں، اسے آج وہ خلاف معمول دیکھ کر رکیں۔

"تم یونیورسٹی نہیں گئیں آج؟" [illegible]

"نہیں۔۔" وہ کھانے پینے کو فریج کا جائزہ لینے لگ گئی۔

"ناشتہ میں بنا دیتی ہوں۔۔" اسے چولہا جلاتے دیکھ کر انہوں نے ٹوک دیا۔

"نہیں رہنے دیں۔۔ صرف سلائس لوں گی۔۔ دادا جان اور دادی جان نے ناشتہ کر لیا ہے۔۔؟"

"ہوں۔۔ سب نے ہی کر لیا ہے، صرف شہباز رہتا ہے، اس کیلئے یہ ٹرے تیار کی ہے۔۔" انہوں نے ٹیبل پر رکھی ٹرے کی طرف اشارہ کیا۔

"لائیں میں لے دیتی ہوں، تم شہباز کو یہ ٹرے دے آؤ۔۔" انہوں نے اسے پیچھے ہٹا دیا تھا، شہباز حیدر کے نام پر اس کا دل دھڑکا تھا، تاہم وہ خود کو سنبھالتی دوپٹہ درست کرتے ٹرے اٹھا کر اوپر چلی آئی۔ دروازہ نیم وا تھا، دونوں ہاتھوں سے ٹرے تھامے وہ بغیر دستک دیے اندر داخل ہو گئی تھی، وہ آئینے کے سامنے کھڑے بال سلجھا رہے تھے، گہرے کوٹ سوٹ میں اپنی ڈیسنٹ پرسنالٹی سمیت بہت بارعب اور پروقار لگ رہے تھے۔ ان کی شخصیت کی وجاہت دیکھنے کے قابل تھی شاید اسی لیے وہ اپنے جذبوں پر قابو نہ پا سکی تھی، آفس کی تیاری تھی، اسے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر ان کے ماتھے پر بل پڑ گئے رات کا واقعہ ذہن کی سطح پر ایک دم تازہ ہوا، غصے سے ٹیبل پر برش پٹخ دیا۔

"چھن چھن۔۔" پرفیوم کی شیشی نیچے گر کر ٹوٹی تھی، پورا کمرہ Posion کی تیز خوشبو سے نہا گیا تھا، عیشہ ان کے تیور دیکھ کر دہل گئی، رات وہ جو آر یا پار کرنے کا فیصلہ کیے تھی، ساری ہمت دم توڑ گئی، مرے قدموں سے آگے بڑھ کر ناشتے کی ٹرے ٹیبل پر رکھ دی۔ وہ ایک طرف کھڑی ہو کر انگلیاں چٹخانے لگی، سمجھ نہ آئی کہ اب کیا کرے۔۔ پلٹ جائے یا۔۔ شہباز حیدر نے خشمگیں نظروں سے گھورا۔ وہ باہر نکلنے کو پلٹی تھی۔

"سنو۔۔" اس پکار پر اس کے قدم ٹھٹکے تھے، وہ پلٹی تھی، شہباز حیدر کے تیور دیکھ کر وہ مزید پزل ہوئی۔

"آئندہ میرے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے دستک دے لیا کرنا۔۔ تم اچھی طرح جانتی ہو مجھے یہ بے تکلفی اچھی نہیں لگتی۔۔" اب بہت برہمی سے ٹوک دیا گیا تھا۔

"جی۔۔ اچھا۔۔" شکوہ کناں نظروں سے دیکھتے اس نے سعادت مندی سے سر جھکایا، وہ ان کی اس قدر پررعب باوقار پرسنالٹی کے سامنے خود کو خاصا بے بس محسوس کرتی تھی، ان کا رعب ہی ایسا تھا مگر دل کا کیا کرتی۔۔ وہ الٹے قدموں سے پلٹی تھی، ذرا سا سامنا ہوتے ہی ٹانگیں لرزنے لگ گئی تھیں، اگر ساری زندگی۔۔ اس کا دل اسے اس طرز عمل پر احتجاج کرنے کو، کسانے لگ گیا تھا دل و دماغ ان کے خوف کے سامنے ایک دم ڈٹ گئے تھے، نکلنے سے پہلے وہ پلٹی تھی۔

"وہ۔۔ وہ مجھے آپ سے۔۔ بہت ضروری بات کرنی ہے۔۔" وہ ہمت کر کے یہ الفاظ کہہ پائی تھی، سر اٹھا کر ان کو دیکھا مگر۔۔ اف اللہ۔۔ ان کی آنکھوں سے انگارے برس رہے تھے، اس نے بے اختیاری میں اپنے سینے پر ہاتھ رکھ لیا، دل کی دھڑکن کا پیمانہ دو گنا ہو رہا تھا۔

"مگر مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی۔۔" انتہائی کرختگی سے انکار ہوا تھا، وہ ڈبڈبائی آنکھوں سمیت انہیں دیکھے گئی۔ کبھی وہ اس کیلئے بڑے مہربان ہوا کرتے تھے مگر اب۔۔

"مجھے فوزان کے سلسلے میں بات کرنی ہے۔۔" اپنے [illegible] آنسوؤں کو بے دردی سے صاف کرتے اس نے خود کو مضبوط کیا، اس خیال سے کہ زیادہ سے زیادہ چیخ کر اپنا صبر [illegible] جان سے تو مارنے سے رہے۔

"فوزان میرا بیٹا ہے۔۔ اس کا اچھا برا میں تم سے بہتر سمجھتا ہوں۔۔ اس سلسلے میں تم کو جو رعایت مل چکی ہے، اسکو غنیمت جانو تو بہتر ہے۔۔ ورنہ۔۔" اپنا بریف کیس کھول کر بستر پر بکھرے کاغذات چیک کر کے وہ اس میں رکھ رہے تھے، شہباز حیدر کے "ورنہ" پر عیشہ کا دل رکنے لگا۔

"آپ کے اس طرز عمل سے اس کی شخصیت سنورنے کے بجائے بننے کے، صرف بگڑے گی، اس کا ذہن دو حصوں میں بٹ رہا ہے، آپ کی باتیں، ورنہ تو جواس کے اندر کئی سوال و جواب کے دروازے کھول رہے ہیں، مگر آپ کو کیا۔۔ آپ تو اسے صرف مجھ سے دور کرنا چاہتے ہیں اور بس۔۔"

"شٹ اپ۔۔" تمام خوف بالائے طاق رکھے اس نے کہا تو شہباز حیدر نے غصے سے ٹوک دیا۔ وہ ایک دم چپ کر گئی۔

"فوزان کا اچھا یا برا تم سے بہتر سمجھتا ہوں۔۔ سمجھیں۔۔" بریف کیس سختی سے بند کر کے انہوں نے گھورا۔ "اور تم کو کوئی حق نہیں کہ میرے ذاتی معاملات میں دخل اندازی کرو۔۔ فوزان کے حقوق ادا کرنے کو ابھی اس کا باپ زندہ ہے۔"

"غلط کہہ رہے ہیں آپ۔۔ فوزان کی پیدائش سے لے کر اب تک آپ نے کون سے حقوق نبھائے ہیں اس کے لیے۔۔ اور اب ایک ماہ سے آپ کو پتہ چل گیا ہے کہ فوزان آپ کا بیٹا ہے۔" تلخی نے عیشہ کی طرف سے بھی سر ابھارا تھا، بغیر کچھ سوچے سمجھے اس نے کہہ دیا۔

"عیشہ! تم حد سے بڑھ رہی ہو۔۔" عیشہ کی اس بدتمیزی پر انہوں نے سختی سے کہا تو اس نے سر جھٹکا۔

"ہرگز نہیں۔۔ آپ کی بھول ہے۔۔ اگر حد سے بڑھنا ہی ہوتا تو بہت پہلے میں آپ کے سامنے کھڑی ہوتی، آج بھی میں صرف اور صرف آپ کے رویے کی وجہ سے آپ کے سامنے ہوں۔۔ ورنہ حد سے بڑھنا کیا ہوتا ہے آپ کیا جانیں۔" ایک لمحے اس کو خود بھی حیرت ہوئی کہ وہ بغیر ہچکچائے یہ سب کہہ رہی تھی۔

"تم رشتوں کا ادب لحاظ بھول رہی ہو۔۔" وہ بے پناہ طیش سے اس کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔

"گستاخی معاف! مجھے رشتوں کا ادب لحاظ آپ سے زیادہ پتہ ہے، میں تو صرف آپ کو کہہ رہی ہوں کہ فوزان کے معاملے میں آپ کی کسی بھی پابندی کو خاطر میں نہیں لاؤں گی۔۔۔ آپ کو تو اس معصوم پر ذرا بھی ترس نہیں رہا، میں اتنے دنوں سے خود پر جبر کر رہی ہوں تو یہ رشتوں کا ادب و لحاظ ہی ہے۔۔۔ آپ کے اس رویّے سے وہ سارا دن مختلف سرگرمیوں میں الجھ کر بہل تو جاتا ہے مگر رات کو وہ جو سوال اٹھاتا ہے۔۔۔ کاش آپ اندازہ لگا سکیں کہ اس کی ذہنی سطح پر کس طرح اثر انداز ہو سکتے ہیں۔" شہباز حیدر نے بے پناہ غصے سے اپنے سامنے کھڑی اس چھوٹی سی لڑکی کو دیکھا۔

"اس کے حق میں یہی بہتر ہے کہ تمہیں اس کے متعلق الجھنے کی ضرورت نہیں۔۔۔" دل تو چاہ رہا تھا کہ ایک ہاتھ جڑ دے مگر ضبط کیے غصے سے کہا۔ عیشہ کا دل فوزان کے معاملے میں پھر دکھی ہو گیا۔

"میں آپ سے تو کچھ نہیں چاہ رہی۔۔۔ کبھی آپ نے میری زبان سے کوئی غلط لفظ سنا ہے۔۔۔ بے فکر رہیے، کبھی آپ کی پریشانی کا سبب نہیں ہوں گی، بس فوزان کو میرے پاس رہنے دیں۔۔۔ وہ پیدا ہونے کے بعد میرے پاس آیا تھا۔۔۔ اتنے سال میں مجھے اپنے جسم کا حصہ لگنے لگا ہے، ورنہ پھوپھو زندہ ہوتیں تو شاید وہ اسے اتنی محبت نہ دے پاتیں جتنی میں نے دینے کی کوشش کی ہے ایک ایک لمحہ، ایک ایک پل اس کے لیے، اپ آپ۔۔۔ بنا کسی غرض یا لالچ کے۔۔۔ اور اب آپ اسے مجھ سے جدا کر رہے ہیں۔۔۔ جان بوجھ کر۔۔۔ صرف اور صرف انتقاماً۔" وہ اس کے سامنے کھڑی رو رہی تھی، شہباز حیدر کے لیے خود پر ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔ اس وقت وہ ہو بہو اور یشہ کی طرح لگ رہی تھی، کتنی مماثلت تھی دونوں میں۔

"میں یہ سب کچھ جان بوجھ کر یا انتقاماً نہیں کر رہا۔۔۔ میرے اس رویّے کی وجہ مجھ سے بہتر تم جانتی ہو۔۔۔ انتقاماً۔" دانت پیستے انہوں نے یاد کروایا تو وہ کٹ سی گئی۔ اس نے نظریں چرا لیں، انہیں مزید غصہ آیا۔ عیشہ کا غیر معمولی سلوک وہ بہت عرصے سے محسوس ہونے لگا تھا کہ عیشہ کا نارمل رویّہ اب ان کے لیے نارمل نہیں رہا۔ ان کے سامنے آنے سے کترانا، ایک دم سامنا ہو جانے پر گھبرانا۔۔۔ الٹی سیدھی حرکتیں کرنا، بات کرتے پر شرمانا۔۔۔ خاص طور پر اس کی نگاہوں میں اپنے لیے ایک عجیب سی دلچسپی آگ محسوس کرنے لگے تھے، بہت غور کرنے پر انہیں احساس ہوا کہ وہ انہیں "چاچو" کہنا چھوڑ چکی ہے۔۔۔ آپ۔۔۔ جناب وغیرہ، یہ وہ کے الفاظ استعمال کرنے لگی تھی، انہیں خود سے مخاطب کرنا تو تقریباً چھوڑ چکی تھی، اگر کبھی بات کرنے کا موقع مل ہی جاتا تو وہ کوئی حوالہ دیتے ہوئے آپ، یہ کے الفاظ استعمال کرتی تھی۔ ان کی چھٹی حس انہیں ایک عرصے سے آگاہ کر رہی تھی مگر وہ اپنا وہم کہہ کر ٹال جاتے تھے۔ اور پھر ایک، دو پہلے ہی کی بات تھی، فوزان کو بخار تھا، رات وہ لیٹ آئے تھے، فوزان کو طبیعت کافی خراب تھی، سارا دن امی نے بتایا تو وہ عیشہ کے کمرے میں چلے آئے تھے۔ فوزان سویا ہوا تھا، عیشہ شاید باتھ روم میں تھی، وہ فوزان کی طبیعت جاننے کے لیے اس کے بستر پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگے تھے، وہ شاید باتھ لے رہی تھی، پانی گرنے کی آواز سے وہ یہی اندازہ لگا سکے۔ فوزان کا بخار چیک کرتے انہوں نے سرہانا اٹھا کر اس کے ساتھ کمر ٹکائی تھی، وہاں کتاب تھی، یونہی ورق گردانی کے خیال سے اٹھائی تھی، مگر وہ ششدر رہ گئے تھے۔ کتاب کھولتے ہی ان کی جھولی میں کئی تصویریں آ گری تھیں۔ سب تصویریں ان کی تھیں، صرف ایک تصویر میں ان کے ساتھ عیشہ اور فوزان تھے۔ یہ تصویر فوزان کی تیسری سالگرہ کے دن کھینچی گئی تھی، وہ حیران ہو کر تصویر دیکھ رہے تھے، یونہی تصویر کی پشت پر نظر پڑی تو دنگ رہ گئے۔

جب سے تیرے نام کر دی زندگی اچھی لگی
تیرا غم اچھا لگا تیری خوشی اچھی لگی
تیرا چہرہ، تیری خوشبو، تیرا لہجہ، تیری بات
دل کو تیری گفتگو کی سادگی اچھی لگی

وہ اشعار کا انتخاب نہیں تھا، بلکہ ان کے گرد خوبصورت انداز میں چاروں جانب عیشہ شہباز حیدر کے نام کی تکرار تھی خوبصورت پھولوں کی بیل کی صورت میں لکھے گئے نام کی تکرار ان کو کئی لمحوں تک سُن کر گئی تھی، وہ عیشہ کی لکھائی ہزاروں میں پہچان سکتے تھے، وہ حیرت کے سمندر میں غرق تھے، شک تو پہلے ہی تھا، اب یقین آنے پر وہ شاک میں تھے، یونہی کتاب وہیں رکھ کر اٹھ کر وہاں سے چلے آئے، ان کا دل چاہا کہ اس سے سختی سے باز پرس کریں، مگر پھر عیشہ کے انداز و اطوار گزشتہ رویوں کا اندازہ لگا کر وہ یہ سوچ کر چپ ہو گئے کہ اگر بات کھلنے کے بعد وہ ان کے سامنے دل کی حالت بیان کر گئی تو وہ کیا کریں گے، کیسے اپنا دامن بچا پائیں گے، جب جانے ان کا ردعمل کیا ہو۔۔۔ پھر انہوں نے خاموشی سے فوزان کو ان سے دور کرنا شروع کر دیا تھا، ان کا خیال تھا کہ اس طرح وہ اس لڑکی کو مزید کسی حماقت سے روک سکیں گے۔۔۔ مگر یہ ان کی خام خیالی تھی، پہلے تو شاید اسے بات کھلنے کا ڈر تھا، اور اب۔۔۔ کل رات انہوں نے کسی نہ کسی طرح بہلا پھسلا کر فوزان کو اپنے پاس سونے پر آمادہ کر ہی لیا تھا لیکن آدھی رات کو وہ رونا شروع ہو گیا تھا، وہ ہڑبڑا کر اٹھے تھے، اس شور کے عادی نہ تھے، کچھ پریشان بھی ہو گئے۔

"کیا ہوا فوزی۔۔۔؟"

"ماما کے پاس جانا ہے۔۔۔" روتے ہوئے فرمائش کی گئی تھی، ایک تو نیند ڈسٹرب ہو گئی تھی، دوسرا اس کی یہ انوکھی فرمائش۔۔۔ انہیں غصہ آ گیا۔

"کوئی نہیں ہے تمہاری ماما۔۔۔" ان کے ڈانٹنے کی دیر تھی، فوزان صاحب تو حلق پھاڑ کر رونا شروع ہو گئے تھے، وہ جھنجلا اٹھے، ہر طرح سے اسے سنبھالا، پچکاریاں، لالچ دیا، مگر اس کی تو ایک ہی ضد تھی۔

"ماما کے پاس جانا ہے۔۔۔" اب کی انہیں عیشہ پر غصہ آ گیا، جو ان کی زندگی میں حد سے زیادہ دخل اندازی کر چکی تھی۔

"سنو فوزی۔۔۔ وہ سو گئی۔۔۔ ہے۔ تم بھی سو جاؤ، میرا اچھا بیٹا۔۔۔ شاباش۔" انہوں نے غصہ ضبط کرتے پچکارا تھا، مگر وہ بھی ڈھیٹ تھا۔

"نہیں سوؤں گا۔۔۔ آپ انہیں لے کر آئیں۔۔۔ ان کے ساتھ سوؤں گا۔۔۔" وہ بیچارگی سے اس چھوٹے سے بچے کو دیکھتے رہ گئے تھے، وہ اس کی ضدی طبیعت کے عادی نہ تھے، پریشان ہو گئے۔

"وہ یہاں نہیں آ سکتیں۔۔۔ تمہیں میرے ساتھ ہی سونا ہے۔۔۔ سمجھے۔۔۔" اب کے انہوں نے سختی سے کہا تو مگر یوں بے اثر ہوا، اور وہ بوکھلا یا تھا۔

"کیوں نہیں آ سکتیں۔۔۔ عدیل کی ماما چاچو کے ساتھ سوتی ہیں۔۔۔ عدیل مجھے بتاتا ہے۔۔۔ بس آپ ماما کو لے کر آئیں۔۔۔" وہ ان ننھے سے بچے کی باتوں سے حق دق رہ گئے، اوپر سے اس کی فرمائش۔۔۔ انہیں ایک دم غصہ آیا تھا۔

"شٹ اپ۔۔۔ اس نے لاڈ اٹھا اٹھا کر تمہارا دماغ خراب کر دیا ہے۔۔۔ آرام سے سو جاؤ۔۔۔" غصہ تھا یا پھر فوزان کی بات کا اثر تھا، سختی سے ڈپٹتے انہوں نے اسے کھینچ کر تھپڑ مارا تھا، پھر کیا تھا۔۔۔ فوزان میاں کا فل والیم تھا، وہ زچ ہو اٹھے۔

"مجھے ماما کے پاس جانا ہے۔۔۔ ابھی جانا ہے ماما کے پاس۔۔۔ آپ گندے ہیں۔۔۔ ماما اچھی ہیں۔۔۔ میں ماما کو بتاؤں گا۔۔۔ آپ مارتے ہیں" وہ سرتاقدم کر فل والیم سے روتے اس چھوٹے سے بچے کو دیکھتے رہے مگر وہ نہیں سنبھلا تھا۔ غصے سے اٹھا کر اس کے پاس چھوڑ آئے تھے، اس وقت غصہ اس قدر تھا کہ سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں مفقود ہو کر رہ گئی تھیں، اسی غصے کی وجہ تھی کہ وہ جو "پہلا قدم ہے" یہ حجاب برقرار رہنے کے لیے سرگرداں تھے، عیشہ کو خود اپنے سامنے کھڑا ہونے کا موقع دے گئے تھے۔ ساری رات جیسے انگاروں پر جلتے سلگتے گزری تھی، اور اب وہ ان کے سامنے تھے۔

"دیکھو عیشہ! تم بچی نہیں ہو کہ یہ حماقتیں سرانجام دو۔۔۔ کل کو تمہاری شادی بھی ہونی ہے۔۔۔ فوزان سے تمہاری اس قدر

انجسٹ تم دونوں کے لیے ہی نقصان دہ ہے، بہتر ہے کہ تم اس سے دور رہو۔۔۔ وہ ابھی بچہ ہے، محبت سے پیار سے نکل جائے گا، گھر میں شاید یہ ناممکن ہو۔۔۔" شہباز حیدر نے اپنے آپ کو سنبھال کر جسے کو پس پشت ڈالتے قدرے رسانیت سے کہا تھا، وہ آنکھوں میں آنسو لیے شاکی نظروں سے دیکھے گئی، وہ رخ موڑ گئے۔

"مجھے نہیں کرنی کوئی شادی وادی۔۔۔ جب میں آپ سے کہہ رہی ہوں کہ میں آپ کے لیے کوئی مسئلہ نہیں بنوں گی تو پھر ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں۔۔۔ فوزان کو میں نے کبھی پھوپھو کا بیٹا نہیں سمجھا، بلکہ ہمیشہ اپنا بیٹا سمجھا ہے۔۔۔ اور کوئی بھی ماں اپنے بچے کو خود سے جدا نہیں کر سکتی۔۔۔" وہ ان کے سامنے کھڑی دو شگاف الفاظ میں آنسو بہاتے دل کی بات کہہ گئی تھی۔ اسی لیے سے تو وہ ڈرتے تھے، وہ تاسف سے اسے دیکھتے رہے۔

"کاش مجھے اندازہ ہوتا کہ تم اس حد تک بے باک ہو چکی ہو۔ تمہارے دماغ میں اس قدر خناس بھر چکا ہے تو میں یہاں بھی نہ آنے دیتا۔۔۔ بہت پہلے ہوش کے ناخن لیتا۔۔۔" انہوں نے تمسخر سے کہا تو عیشہ نے تڑپ کر دیکھا، کتنی نفرت و حقارت سے وہ اسے دیکھ رہے تھے، اس کا دل کانپ۔

"ہونہہ! تم میرے لیے مسئلہ ہو گی۔۔۔ عیشہ تم میری بات کان کھول کر سن لو۔۔۔ تم جو اوٹ پٹانگ خوابوں کے محل تعمیر کر رہی ہو، وہ کبھی ممکن نہیں۔۔۔ اگر مجھے شادی ہی کرنا ہوتی تو کب کا کر چکا ہوتا۔۔۔ اور تمہیں شرم تو نہ آئی یہ سب سوچتے ہوئے۔۔۔ میرے سامنے یوں اپنا آپ آشکار کرتے ہوئے۔۔۔"

"شرم آ رہی ہے مجھے اس سوچ سے بھی کہ جس لڑکی کو ابھی میں کم عمر لا اُبالی بچہ سمجھ رہا تھا، وہ میرے سامنے کھڑی میری آنکھوں میں دیکھتے" اظہار عشق کر رہی ہے۔۔۔"

وہ روڈلی بھیچوٹ ہ۔۔۔ کتنا غلط سمجھ رہے تھے وہ اسے۔۔۔ وہ اپنی ساری انا، خودداری، خوف کو پس پشت ڈالے صرف اور صرف فوزان کی خاطر ان کے سامنے آئی تھی اور وہ۔۔۔ عیشہ کا دل تڑپ اٹھا۔

"آپ جانتے ہیں کہ میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔۔۔ بغیر کسی لالچ اور غرض کے۔۔۔ کب میں نے اظہار کیا ہے۔ میں فوزان کی بات کر رہی ہوں اور آپ۔۔۔" وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو دی۔ شہباز حیدر نے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

"شٹ اپ۔۔۔" انہوں نے اپنی مٹھی زور سے دبائی ورنہ ان کا دل چاہ رہا تھا کہ اس لڑکی کا چہرہ تھپڑوں سے سرخ کر دیں۔

"بہت بڑی غلطی ہوئی مجھ۔۔۔ مجھے فوزان کے معاملے میں تم پر اتنا اعتبار نہیں کرنا چاہیے تھا، مجھے اپنی ذمہ داری خود نبھانی چاہیے تھی۔۔۔" ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کا گلا دبا دیں، کیسے بے شرموں کی طرح اقرار کیا تھا۔

"پلیز شہباز۔۔۔ میرے ساتھ یوں پیش نہ آئیں۔۔۔ مجھے اتنی نفرت سے مت دھتکاریں، میں کب آپ کو مجبور کر رہی ہوں کہ میری محبت قبول کریں۔۔۔ کم از کم فوزان کے لیے تو اپنی زندگی میں اتنی جگہ دے دیں۔۔۔ قسم سے ساری زندگی کچھ نہیں مانگوں گی۔۔۔ مگر آپ کی نفرت نہیں سہہ سکتی۔۔۔ پلیز شہباز۔۔۔" وہ بالکل ان کے سامنے کھڑی روندھے لہجے میں کہہ رہی تھی، ان کا نام لیتے ہی ان کی برداشت آزما گئی تھی، وہ خود پر بمشکل کنٹرول کر رہے تھے، ان کا ہاتھ ایک دم اُٹھا تھا۔

"شٹ اپ۔۔۔ جسٹ شٹ اپ۔۔۔ آئندہ میرے سامنے ایسی بکواس نہیں کرنا اور ہاں۔۔۔ میرا نام سے جو رشتہ ہے اسی حوالے سے پکارو گی۔۔۔ نام لیا تو حلق سے زبان کھینچ لوں گا۔۔۔" وہ منہ پر ہاتھ رکھے سسک رہی تھی، وہ تلملا کر اسے وارن کرتے اپنا بریف کیس اُٹھا کر راستے میں پڑی ہر چیز کو ٹھوکر مارتے کمرے سے نکل گئے تھے۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھے سسک سسک کر روتے ہوئے بیٹھتی چلی گئی تھی۔

* * *

تو نے نفرت سے جو دیکھا تو مجھے یاد آیا
کیسے رشتے تیری خاطر یونہی توڑ آیا ہوں
کیسے دھندلے ہیں یہ چہرے جنہیں اپنایا ہے
کتنی اجلی تھیں وہ آنکھیں جنہیں چھوڑ آیا ہوں

سارا دن وہ اپنے کم مائیگی کا ماتم کرتی رہی تھی، رات تک اسے بہت تیز بخار ہو گیا تھا، وہ اس کے قدموں میں اپنی انا، اپنی خودداری، اپنی نسوانیت سمیت سب کچھ لٹا آئی تھی، یہ ایسا دکھ تھا جو اسے اندر ہی اندر کاٹ رہا تھا، جب تک بات دل میں تھی، وہ مطمئن تھی، جو دکھ سہہ لیا تھا مگر اب زبان سے ادا ہو چکی تھی تو دل کا روگ بن گئی تھی، اسے یہ دکھ نہیں تھا کہ اس نے اسکی محبت کو قبول نہیں کیا، اسے یہ دکھ تھا کہ اس نے اجنبی نفرت و حقارت سے اسے دھتکار دیا تھا۔ وہ تو مکمل لٹ گئی تھی تن من دھن سے سب کچھ تو آن کی۔۔۔ دونوں ہاتھوں سے خالی تھی۔۔۔ دکھ تھا کہ کم ہی نہیں ہو رہا تھا، کم مائیگی سب کچھ کھو دینے کا احساس کاٹ کھا رہا تھا۔۔۔ وہ مضمحل سی تھی جب سے بجد وہ کمرے میں بند ہوئی تو ساری رات دہکتے انگاروں پر لوٹتی رہی۔۔۔ آگ بکھیرتے انگارے اسے سلگاتے رہے اور وہ سسکتی رہی، فوزان اس کے پاس بستر پر سویا ہوا تھا، مگر اسے کوئی چین، کوئی قرار نہ تھا، جوں جوں رات بیتتی جا رہی تھی، اسکے اعصاب جواب دیتے جا رہے تھے۔

صبح تک وہ بے حس سی ہو چکی تھی، فوزان کو اسکول جانا تھا، اس لیے وہ بستر سے اٹھی تھی، بمشکل اسے تیار کرا کر کمرے سے باہر بھیج کر وہ دوبارہ بستر پر لیٹ چکی تھی، بخار کی حدت، غم کی شدت سے سر چکرا رہا تھا۔ خاموشی سے کمبل سر تک تان لیا۔ شہباز حیدر تیار ہو کر نیچے آئے تو امی نے ٹرے تیار کر رکھی تھی، بابا جان نماز تلاوت کے بعد سو جاتے تھے، ان کا ناشتہ دس بجے ہوتا تھا، جبکہ حیدر صاحب اخبار دیکھ رہے تھے، وہ لیٹ آفس جاتے تھے، شہباز حیدر نے ان کے ساتھ والی کرسی سنبھالی۔ دوسری طرف تائی جان بیٹھی ہوئی تھیں۔

"آج عیشہ نے یونیورسٹی نہیں جانا۔۔۔" اچانک تائی جان کو خیال آیا تھا۔

"ہاں مجھے بھی خیال نہیں رہا۔۔۔ صبح سے وہ کمرے سے نہیں نکلی۔۔۔ رات کو بھی شام کو ہی کمرے میں گھس گئی تھی، صبح نماز پڑھتے نہیں دیکھا۔۔۔ اور تو اور صبح پودوں کو پانی تو ضرور دیتی ہے۔۔۔ آج وہ بھی نہیں دیا۔۔۔" شہباز حیدر نے ایک نظر ماں کو دیکھا، اور خاموشی سے ناشتہ کرتے رہے۔

"فوزان اسکول چلا گیا تھا۔۔۔؟" اچانک خیال آنے پر پوچھا۔

"ہاں! وہ تو چلا گیا تھا۔۔۔ تیار شیار ہو کر باہر آیا تھا۔۔۔ کہہ رہا تھا کہ ماما کو بخار ہے۔۔۔ رات بھی کی طبیعت خراب تھی۔۔۔ خدا خیر کرے۔۔۔"

"جاؤ زلیخا دیکھو۔۔۔ عیشہ کیا کر رہی ہے۔۔۔ تائی جان نے فکرمندی سے کام والی کو کہا تو وہ چلی گئی، ابھی دو منٹ ہی گزرے تھے جب وہ بھاگی آئی۔

"بیگم صاحب۔۔۔ بیگم صاحب۔۔۔ عیشہ بی بی تو بے ہوش پڑی ہوئی ہیں۔۔۔ بخار سے تپ رہی ہیں۔۔۔ میں نے دو تین دفعہ ہلایا بھی مگر ہوش نہیں آیا۔۔۔"

"یا اللہ۔۔۔ خدا خیر کرے۔۔۔ کیا کہہ رہی ہے تو زلیخا۔۔۔ اب اتنی خراب طبیعت بھی نہیں تھی بچی۔۔۔" تائی امی تو فوراً عیشہ کی کمرے کی طرف بھاگی تھیں، ان کے پیچھے امی اور حیدر صاحب بھی۔۔۔ شہباز حیدر جو نارمل ہی تھے۔۔۔ ان کے چہرے پر بھی پریشانی

چلی۔۔کل کے واقعے کے بعد انہوں نے اسے نہیں دیکھا تھا۔۔۔وہ بھی ذرے ایک طرف دھکیل کر اس کے کمرے کی طرف چلے گئے۔۔وہ بے سدھ بستر پر پڑی ہوئی تھی تائی.بی اس کے ہاتھ پیر سہلا رہی تھیں تو امی نے پانی لے کر اس کے منہ پر چھینٹے مار رہی تھیں۔

"بڑا تیز بخار ہے اسے۔۔۔یا اللہ رحم کر۔۔" تائی جان تو بس رو دینے کو تھیں۔۔وہ دروازے پر ہی رکے ہوئے تھے۔

"جاؤ زلیخا۔۔۔ساتھ والے حامد صاحب کو بلا لاؤ،وہ اس وقت گھر پر ہوں گے۔۔۔جلدی کرو۔۔" انہوں نے آگے بڑھ کر اس کی نبض چیک کی تھی،ڈوبتی ابھرتی حالت تھی،وہ ایک دم گھبرا گئے تھے،زلیخا فوراً باہر بھاگی۔

"حامد صاحب ڈاکٹر تھے۔۔۔اپنا بیگ لے کر فوراً آ گئے۔۔۔عیشہ کا بی پی چیک کرنے لگے۔۔۔

"بچی کا بی پی بڑی طرح لو ہے۔۔۔بچی کی کنڈیشن بہت خراب ہے۔۔اتنا لو بی پی۔۔۔کچھ بھی ہو سکتا ہے۔۔۔آپ اسے فوراً ہاسپٹل لے جائیں۔۔۔ورنہ نروس سسٹم بھی متاثر ہو سکتا ہے۔۔"

ایک اور انجکشن لگا کر اس کا بی پی نارمل کرنے کی کوشش کی تھی،مگر دیر بعد ناکام ہو کر انہوں نے کہا تو تائی امی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

"ہائے میری بچی۔۔"

"بھابی آپ پریشان نہ ہوں۔۔۔ہم اسے ہاسپٹل لے جائیں گے۔۔۔شہباز! گاڑی نکالو" ابو تائی جان کو تسلی دی تھی،شہباز نے گاڑی نکالی تو ابو نے بی کی مدد سے اسے گاڑی میں ڈالا۔عیشہ کو انتہائی نگہداشت والے روم میں لے جایا گیا تھا،وہ بالکل ہاتھ پیر چھوڑ چکی تھی،پانچ چھ گھنٹے بعد ڈاکٹر نے اسے خطرے سے باہر قرار دیا تھا۔۔۔پھر رفتہ رفتہ اس کی طبیعت سنبھلنے لگی تھی،رات گئے وہ ہوش میں آئی تھی،حواس میں آتے ہی رونے لگی تھی۔۔۔بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر،تائی جان،امی،مہوش بھابی اس کی دوسری والدہ ماجدہ بھی اسے سنبھالنے میں لگے ہوئے تھے۔

ڈاکٹر نے اس کے پاس زیادہ رش کرنے سے منع کیا تھا۔۔۔اگلے دن وہ کافی بہتر تھی،اسے روم میں منتقل کر دیا گیا تھا،رونے کے بعد وہ خاموش ہو گئی تھی۔سب نے اس کی خاموشی کو محسوس کیا تھا۔واجد صاحب اس کا بھرپور خیال رکھ رہے تھے،بخار بھی قدرے بہتر تھا۔فوزان جس نے پچھلا سارا دن عیشہ کے بغیر گزارا تھا،خاص طور پر رات کو اس نے شہباز حیدر کو بہت تنگ کیا تھا،وہ حقیقتاً پریشان ہو گئے تھے،ایک تو عیشہ کی اس قدر سیریس کنڈیشن ہو جانا۔۔۔اوپر سے رات کو فوزان کا رویہ وہ اچھے ڈسٹرب ہو گئے تھے،عیشہ سے انہیں کوئی ذاتی دشمنی نہ تھی،مگر وہ جس حماقت کا مظاہرہ کر رہی تھی،اس کے جواب میں ایسی ہی حماقت سر انجام دینا انہیں قابل قبول نہ تھا۔

اگلے دن فوزان بار بار عیشہ کے پاس جانے کی ضد کر رہا تھا،اس نے سکول سے چھٹی کی تھی،دس بجے کے قریب شہباز حیدر فوزان کو ہاسپٹل لے آئے تھے،اس وقت عیشہ کے پاس واجد صاحب کے علاوہ تائی امی تھیں،جس وقت وہ کمرے میں داخل ہوئے تھے،عیشہ آنکھوں پر بازو لپیٹے لیٹی ہوئی تھی،تائی جان کرسی پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں،اسے دیکھ کر مسکرائیں۔۔۔شہباز حیدر نے سلام کیا تو بھی عیشہ نے بازو نہ ہٹائے۔

"ماما۔۔۔ماما۔۔" فوزان نے آگے بڑھ کر عیشہ کا بازو جھنجھوڑا تو اس نے تڑپ کر بازو ہٹایا۔

"فوزی۔۔۔تم۔۔۔اوہ میری جان۔۔" وہ اگلے ہی لمحے اٹھ کر بستر پر بیٹھ گئی تھی،شہباز حیدر نے اس پر نگاہ ڈالی،زرد کمھلایا ہوا چہرہ تھا مگر بہت محبت سے وہ فوزان کو بازو کے گھیرے میں لے کر اس کے منہ پر پیار کر رہی تھی،ان کے دل میں کوئی چیز کھٹک ہوئی۔

"سکول نہیں گئے۔۔" وہ پوچھ رہی تھی۔

"میں نے آپ کے پاس آنا تھا۔۔"

"بری بات اچھے بچے سکول سے چھٹی نہیں کرتے۔۔۔آپ شام کو آ جاتے۔۔۔میں نے بھی اپنے فوزی کو بہت مس کیا تھا۔۔" وہ بہت لاڈ سے اسے کہہ رہی تھی۔فوزان اس کے بستر پر چڑھ کر بیٹھ گیا تھا،وہ اسے کل سارے دن کی روداد سنا رہا تھا،گزری رات سے متعلق بتا رہا تھا،تائی امی سے باتیں کرتے شہباز حیدر کا سارا دھیان اسی کی طرف تھا۔

"رات کو کس کے پاس سوئے تھے۔۔" عیشہ کی آواز پر شہباز نے دیکھا فوزان اس کے پہلو میں لیٹا ہوا تھا،وہ بہت محبت سے اس کے بال سنوار رہی تھی۔اسکا سارا دھیان فوزان کے چہرے کی طرف تھا۔

"پاپا کے پاس۔۔۔مجھے آپ کے بغیر نیند نہیں آئی تھی۔۔۔پھر پاپا دادو کے پاس لے کر گئے تھے،پھر انہوں نے کہانی سنائی تھی اور میں سو گیا۔۔"

"ہوں۔۔۔عیشہ نے سر اٹھا کر دیکھا،شہباز حیدر کی نظروں کا زاویہ بدلا۔

"اچھا تائی امی میں چلتا ہوں۔۔۔کسی سے ملنا ہے،واپسی میں فوزان کو لے جاؤں گا۔۔" عیشہ نے خاموشی سے شہباز حیدر کو دادی امی سے بات کرنے کے بعد باہر نکلتے دیکھا تھا۔پھر اس نے سرہانے پر سر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔

"آپ مجھ سے اتنی نفرت کیوں کر رہے ہیں شہباز۔۔۔میں مر جاؤں گی۔۔" وہ سسک پڑی۔سارا دن فوزان اس کے پاس رہا تھا شام کا کھانا قیوم چچا لے کر آئے تھے،کھانا کھانے کے بعد فوزان اس کے پاس ہی بستر پر بیٹ گیا تھا۔قیوم نے فوزان کو لے جانا چاہا تھا مگر وہ نہیں گیا تھا۔وہ اکیلے ہی واپس چلے گئے تھے،اس وقت وہ آنکھیں بند کیے لیٹی ہوئی تھی جبکہ دادی جان نماز پڑھ رہی تھیں،فوزان سو گیا تھا،شہباز حیدر کمرے میں داخل ہوئے تو رک گئے۔۔۔سارا دن وہ اپنے کام کے سلسلے میں مصروف رہے تھے،ان کا خیال تھا فوزان گھر چلا گیا ہو گا قیوم سے انہیں فون کر کے انہیں فوزان کو لے آنے کا کہا تھا،اسی لیے وہ یہاں آ گئے تھے،مگر اس وقت وہ عیشہ کے ساتھ بستر پر لیٹا سو رہا تھا۔

"فوزان۔۔" انہوں نے بستر کے قریب آ کر آواز دی تو عیشہ نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔نظریں سیدھی ان کی آنکھوں سے ٹکرائی تھیں،کتنی شاکی نگاہیں تھیں،شہباز نے لب بھینچ لیے،تبھی عیشہ نے بھی آنکھیں پھیر لیں۔

"یہ تو سو گیا ہے۔۔" فوزان کو دیکھ کر انہوں نے کہا تو وہ چپ رہی۔

"کیسی طبیعت ہے اب تمہاری۔۔؟" انہیں بھی شاید خیال آ ہی گیا تھا وہ تلخی سے دیکھ کر سر جھکا گئی۔

"بخار اترا۔۔" بے بسی سے اس نے گہرا سانس لیتے اس نے گردن ہلا دی۔وہ بہت چاہنے کے باوجود ان کے رویے پر بھی ان سے بے اعتنائی نہیں برت سکی تھی۔

"تائی امی تو نماز پڑھ رہی ہیں۔۔۔مجھے اب چلنا چاہیے۔۔کافی دیر ہو گئی ہے۔۔"

"فوزی اٹھو۔۔۔گھر چلیں۔۔" انہوں نے فوزی کو اٹھانا چاہا تو اس نے روک دیا۔

"پلیز اس کو سونے دیں۔۔۔اس کی نیند خراب ہو گی۔۔"

"مگر میں اسے یہاں بھی نہیں چھوڑ سکتا۔۔۔تم تو شاید کل ڈسچارج ہو گی۔۔"

"تو آپ اسے ایسے ہی اٹھا کر لے جائیں۔۔۔یہ اٹھنے کے بعد یہاں آنے کی ضد کرے گا۔۔" اس نے الجھے لہجے میں کہا تو وہ خاموشی سے اسے اٹھانے لگے،تبھی ان کا ہاتھ عیشہ کے دہکتے بازو سے چھوا تھا،یوں لگا جیسے دہکتے انگاروں کو چھو لیا ہو،انہوں نے یک دم رک کر اسے دیکھا۔

"تمہیں تو ابھی بھی بہت تیز بخار ہے۔۔" فوزان کو اٹھانے کے بجائے فکرمندی سے پوچھا،وہ ہنس دی۔

"کیا فرق پڑتا ہے۔۔۔ مرنے والی تو پھر بھی نہیں۔۔"

وہ خود اذیتی کی حد پر تھی، انہوں نے لب بھینچ لیے، ایک دم احساس ندامت نے آگھیرا۔ وہ ان کی وجہ سے اس حال کو پہنچی تھی، انہیں احساس تھا مگر۔۔۔

"حبیبہ پلیز۔۔" انہوں نے اس کی دکھتی کلائی پر ہاتھ رکھا تو اس نے سرعت سے ہاتھ کھینچ لیا۔

"پلیز اپنے بیٹے کو لے کر جائیں یہاں سے۔۔۔ مجھ پر یہ مہربانیاں نہ کیا کریں۔۔۔ میرا دل خوش فہمیوں میں مبتلا ہونے لگ جاتا ہے۔۔۔ بہت نفرت کرتے ہیں آپ مجھ سے۔۔۔ میں اسی قابل ہوں۔۔۔ جائیے یہاں سے۔۔۔ نہیں مرنے والی میں۔۔" دھیمی جلتی سلگتی آواز تھی، وہ بغیر آواز پیدا کیے ہاتھوں میں چہرہ چھپائے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگ گئی تھی، وہ اسے کچھ کہنا چاہتے تھے کوئی جملہ ان کے لبوں پر آتے آتے رہ گیا۔ تائی جان کی موجودگی کا خیال کرتے انہوں نے ایک تیز قاتل رحم نظر اس پر ڈال کر فوزان کو اٹھایا تھا۔ وہ کمرے سے باہر نکل گئے تھے مگر وہ مسلسل رو رہی تھی، تکیے میں منہ چھپائے شدت سے آنسو بہا رہی تھی۔

* * *

وہ ہاسپٹل سے آنے کے بعد دو دن ورڈ کی جان کے ہاں رہی، پھر بنا سوچے سمجھے کر داجد صاحب کے ہاں چلی آئی، اسی کے برعکس اس کے تینوں بہن بھائی اس سے بے پناہ محبت کرتے تھے، وہ اکثر ان کے بے حد اصرار پر ان کے ہاں آ کر رہتی تھی، اب بھی خود کو پرسکون کرنے کو چلی آئی کہ وہاں بہت کوشش کے باوجود شہباز حیدر سے سامنا ہو ہی جاتا تھا اور ہر بار وہ نئے سرے سے بکھر جاتی تھی، اس کے دل کو جو ٹھیس پہنچی تھی، وہ خود وہ ازالہ کرنا چاہ رہی تھی، اس لیے ادھر آ گئی۔ یونیورسٹی بھی یہاں سے چلی جاتی تھی، شہباز حیدر سے اسے بری طرح نفرت ہے دکھانا تھا، اندر کی یہ تکلیف کم ہی نہیں ہو پا رہی تھی، ادھر آ کر بہن بھائیوں میں الجھ کر وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش میں تھی۔

فوزان اس کے بغیر کیسے رہ رہا ہے، رات کو کس کے پاس سوتا ہے، وہ فی الحال یہ نہیں سوچنا چاہتی تھی، بس اپنے آپ کو سمیٹ رہی تھی کہ پھر سے پہلے جیسی ہو جائے، ابھی اسے یہاں آئے چوتھا دن ہی تھا کہ تو وہ تایا ابو اسے لینے چلے آئے۔

"گھر چلو سب تمہیں بہت مس کر رہے ہیں۔۔۔ خاص طور پر فوزان تمہارے بغیر کسی اور کے قابو میں نہیں آ رہا۔۔۔ بہت مشکل ہے اسے سنبھالنا۔" انہوں نے آنے کی وجہ بتائی۔

"کیوں۔۔۔؟ اس کے پاپا تو اس کے پاس ہی ہیں۔۔"

نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا لہجہ تلخ ہو گیا، وہ ہنس دیے۔ "وہ بڑے پاپا سے زیادہ تم سے اٹیچ ہے۔۔۔ سارا دن تو اسے بہلا لیتے ہیں مگر رات کو اسے سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔۔۔ نجانے تم اسے کیسے سلاتی ہو۔۔۔ رو رو کر سارا گھر سر پہ اٹھا لیتا ہے۔" انہوں نے بتایا تو جان بوجھ کر بے حس بن گئی۔

"اب ساری عمر تو میں اس کے ساتھ رہنے سے رہی۔۔" اس کے لبوں سے تلخی سے یہ نکلا، وہ مسکرا دیے۔

"وہ بعد کی بات ہے۔۔۔ جب تمہاری شادی ہو گی تو دیکھا جائے گا۔۔" وہ ان کا چہرہ دیکھے گئی، دماغ میں شہباز حیدر کے جملے سنسناتے رہے۔

"میں ابھی تو نہیں جاؤں گی۔۔۔ پہلی دفعہ کچھ عرصہ یہاں رہنے آئی ہوں، بلکہ پورا ہفتہ رکنے کا ارادہ ہے۔۔۔ فوزان کے پاپا کس مرض کی دوا ہیں۔۔۔ وہ اپنے بیٹے کو سنبھالیں۔۔" پھر اس کی دادی، چاچی بھی ہیں۔۔" اس نے مسکرا کر کہا تھا۔

"وہاں سب ہیں مگر تم تو نہیں۔۔"

"کیا فرق پڑتا ہے۔۔۔" ایک لمحے کو وہ آزردگی کا شکار ہوئی، پھر سنبھلی۔

"میں کچھ دن رہوں گی پھر گھر آ جاؤں گی۔۔۔ پلیز۔۔" فوزان کی حمایت میں وہ اس قدر گری تھی، اور اب اسے خود پر بند باندھنے تھے۔ وہ نہیں گئی تھی، مزید دو دن گزر رہے تھے، اس رات کھانے کے بعد وہ سب چائے پی رہے تھے، جب شہباز حیدر چلے آئے، چوبیس دنوں بعد سامنا ہو رہا تھا، یوں لگ رہا تھا کہ جیسے صدیوں بعد دیکھ رہی ہو۔۔۔ وہ اپنی اسی کیفیت پر کنفیوز ہو گئی، سلام دعا کے بعد وہ بالکل بت کی طرح بیٹھی رہی۔

"حبیبہ۔۔۔ تم اپنا سامان تیار کر لو۔۔۔ میں تمہیں لینے آیا ہوں۔۔" چائے کے بعد انہوں نے اس کی طرف رخ کر کے کہا تو وہ چونکی، حیران ہو کر ان کا سنجیدہ چہرہ دیکھا، وہ تو سمجھی تھی کہ وہ یونہی ابو سے ملنے آ گئے ہیں مگر۔۔۔

"جی۔۔۔؟"

"فوزان کی طبیعت بہت خراب ہے۔۔۔ دو دن سے بخار رہنے لگا ہے۔۔۔ سکول بھی نہیں جا رہا۔۔۔ ڈاکٹر کو روز دکھا رہا ہوں مگر وہ تمہیں بہت مس کر رہا ہے۔۔۔ تم اسی وقت چلو۔۔۔ پھر کبھی رہنے آ جانا۔" انہوں نے تفصیل بتائی تو وہ ہونٹ دانتوں تلے دبا گئی۔ فوزان سے دور رہنے کی خود ہی انہوں نے سزا تجویز کی تھی اور خود ہی اب۔۔۔ اندر ہی اندر فوزان کی طبیعت کا سن کر پریشان بھی ہوئی، کبھی بھی خود سے اس سے اتنے دن دور نہیں رہی تھی، نجانے کیسے، یہ دل کو مار رہی تھی، صرف اور صرف اس شخص کی وجہ سے مگر اب وہ فوزان کے پاس اڑ کر پہنچ جانے کو مچل اٹھا تھا۔

"بہت زیادہ طبیعت خراب ہے اس کی۔۔" فکر مندی اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی تھی۔

"ہوں۔۔۔ اسی لیے تو آیا ہوں۔۔" انہوں نے بچے کے انداز میں کہا تو وہ خاموشی سے اٹھ گئی۔

"میں فوزان کی وجہ سے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوا ہوں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تمہیں میں تمہاری حماقتوں سمیت نظر انداز کر رہا ہوں۔۔۔ تم فوزان کو سمجھو۔۔۔ آہستہ آہستہ وہ بہل جائے گا۔" راستے میں وہ کہہ رہے تھے، وہ جو خوش فہم ہو رہی تھی کہ شاید دل میں کہیں نرم گوشہ بیدار ہو گیا ہو، چھن سے اندر کچھ ٹوٹ گیا، آنکھیں بے وقعتی پر بھر آئیں۔

"روکیں گاڑی یہاں۔۔۔ مجھے نہیں جانا آپ کے ساتھ۔۔" اونچی اس ناقدری و تذلیل پر وہ مزید چپ نہ رہ سکی، بھرائی آواز میں کہا تو شہباز حیدر نے سے گھورا۔

"وہ آپ کا بیٹا ہے۔۔۔ سنبھالیں آپ خود اسے۔۔۔ میرے کندھے پر رکھ کر کیوں بندوق چلا رہے ہیں۔۔۔ آپ کو تو ذرا بھی خدا کا خوف نہیں، کوئی یوں بھی کسی کے جذبات سے کھیلتا ہے۔۔" وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔ شہباز حیدر خود کو خاصا بے بس محسوس کرنے لگے، سمجھ نہ آئی کہ وہ اس نالائق جذباتی دیوانی لڑکی کو کیسے سمجھائیں۔ اپنی تلخی کا نتیجہ دیکھ چکے تھے جبکہ نرمی۔۔" انہوں نے سر جھٹکا۔

"میں اسی لیے تو تم چاچا کے ساتھ نہیں آئی تھی اور اب آپ۔۔" اپنے آنسو صاف کرتے بے حس بنے شہباز حیدر کو دیکھا۔

"مجھے ایک دفعہ ہی جان سے مار دیں۔۔۔ یہ قسطوں سے مارنے کا مزہ کیوں لے رہے ہیں۔" وہ رو پڑی، شہباز حیدر نے شکست سے لب دانتوں تلے دبا لیے، ان کا کوئی بھی غیر متوقع جذباتی جملہ اس کم عقل لڑکی کو مزید بکھیر سکتا تھا۔

"میں نے جان بوجھ کر محبت نہیں کی تھی، یہ جذبے تو خود دل میں جگہ بناتے ہیں۔۔۔ مجھے اندازہ ہوتا کہ ان جذبوں کی سزا فوزان سے دوری ہے تو خود کو روک لیتی مگر۔۔۔ بہت روکا تھا۔۔۔ یہ دل کب مانا تھا۔۔" شہباز حیدر کو لگ رہا تھا کہ ان کا ضبط جواب دے رہا ہے۔

"میں آپ سے کبھی کچھ نہیں مانگوں گی۔۔ پلیز فوزان کو مجھ سے دور نہیں کریں۔۔" آنسو بھری آنکھوں سے وہ اس کے سامنے التجائیہ بیٹھی تھی، شہباز حیدر نے خاموشی سے ایک گہری سانس کھینچی، پھر اس کے بعد گھر آنے تک ایک طویل خاموشی تھی۔ جب گھر آئی تو فوزان کی حالت دیکھ کر مجرم سی بن گئی۔۔ اسے خود پر ندامت ہوئی۔۔ شکایتی نظروں سے شہباز حیدر کو دیکھا، جو خود نظریں چرا گئے تھے۔ وہ مزید تلخ ہوئی۔

"کیا ہوا تھا میرے فوزی کو۔۔" اسے ساتھ لگائے اس نے محبت سے پوچھا تو وہ رونے لگا۔

"ماما کہاں تھیں آپ۔۔ پاپا کہہ رہے تھے آپ چلی گئی ہیں۔۔ واجد انکل کے ہاں، اب نہیں آئیں گی۔۔ کیوں گئی تھیں آپ۔۔ آپ کو پتا ہے میں آپ کے بغیر نہیں رہتا۔۔" لاؤنج میں اس وقت سبھی موجود تھے، اس نے غصے سے شہباز حیدر کو دیکھا۔ وہ منہ پھیر گئے تو عیشہ واجد کا دل بجھ بجھ جلنے لگا۔

"اب آ گئی ہوں۔۔ اب نہیں جاؤں گی۔۔ آپ تو میری جان ہو، اپنی فوزی کو چھوڑ کر میں کہیں جا سکتی ہوں۔۔ بس آپ جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ۔" اس نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا تو وہ مسکرایا۔

"میرے پاس ہمیشہ رہیں گی نا۔۔ کہیں نہیں جائیں گی نا۔" معصومیت ہی معصومیت تھی۔ عیشہ نے والہانہ پن سے اس کی پیشانی چومتے اسے گلے لگا لیا تھا۔



"میری جاں۔۔ میرا فوزی۔۔" لاؤنج میں موجود سبھی افراد نے فوزان کے ساتھ لاڈ کرتے دیکھ کر مسکرا دیے تھے۔

* *

کس طرف جاؤں، یہ سوچتی نہیں رہی
اس کٹھن راستے اور اکیلی تھی میں
در یا آئے ایسے مراحل کہ جب
تم میرے ساتھ تھے اور اکیلی تھی میں

فوزاں کی بیماری نے اسے ایک نکتہ سمجھا دیا تھا کہ شہباز حیدر چاہے سے جتنا مرضی دھتکار لیں، جتنی مرضی نفرت کا اظہار کریں، اپنے بیٹے کی وجہ سے اسے برداشت کرنے پر مجبور ہیں، اسی مجبوری نے اس کے اندر تو توانائیاں بھر دی تھیں، شہباز حیدر کو یکسر نظر انداز کیے وہ ہر وقت فوزان کی ذات میں ہی رہتی تھی۔ شہباز حیدر تک پہنچنے کیلئے فوزان وہ سیڑھی تھی، جس کے ذریعے وہ با آسانی اپنی منزل پا سکتی تھی۔ انہی دنوں اس کے لیے ایک پرپوزل آیا تھا، دادا جان کے دوست کا بیٹا تھا۔ امریکہ سے ہائیکل کوالیفائیڈ تھا، پاکستان میں ہی اپنی کنسٹرکشن کمپنی میں اچھی خاصی پوسٹ پر کام کر رہا تھا، سب کو یہ پرپوزل بہت مناسب لگا تھا، وہ خاموشی سے سب دیکھتی رہی۔ ابھی تو وہ خود کو نئے سرے سے جوڑ رہی تھی، اور اب یہ نئی مشقت۔۔ دل کو بہت کچھ ہوا مگر وہ لب سے رہی۔ وہ لوگ آئے اور اسے دیکھ کر او کے کر گئے، انہیں عیشہ بہت پسند آئی تھی۔۔ وہ صورتحال اور اس قدر تیزی سے بدلتے دیکھ کر سن سی ہو گئی۔ وہ اس طوفان کو روکنا چاہتی تھی، مگر کچھ نہ کر پا رہی تھی، اس رات فوزاں کے سونے کے بعد وہ ساری رات پریشانی سے ٹہلتی رہی مگر کچھ فیصلہ نہ ہوا۔ اگلے دن ان لوگوں کی طرف سے بلاوہ بھی آ گیا کہ جب چاہیں رسما آ جائیں، وہ مزید پریشان ہو گئی۔ دو تین دن اسی پریشانی میں گزرے تھے، ادھر سے بھی چند لوگ جا کر دیکھ آئے تھے۔۔ لڑکا انہیں بھی بہت پسند آیا تھا، تقریباً دونوں کی جانب سے ہی معاملہ سیٹ ہی تھا۔۔ بس رسم ہونا باقی تھی، شادی عیشہ کے ایم ایس سی کے بعد فائنل تھی، وہ حالات کو اس قدر تیزی سے بدلتے دیکھ کر الجھ گئی۔ بہت سوچ سمجھ کر اس نے محسن جاوید (لڑکے) سے ملنے کا ارادہ کیا تھا، یونیورسٹی سے واپسی پر وہ سیدھی اس کے آفس پہنچی تھی،

آفس کا ایڈریس اس نے باتوں ہی باتوں میں معصوم بھابی سے لیا تھا۔ اچھی خاصی بڑی کمپنی کے چیف ایگزیکٹو کی پوسٹ پر وہ موصوف فائز تھے، وہ کنفیوز سی تھی، اس کی سیکرٹری سے اندر اطلاع بھجوا کر انتظار کرنے لگی۔ دو تین منٹ بعد اسے اندر بلا لیا گیا تھا۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ اس کے آفس میں داخل ہوئی۔

"السلام علیکم۔۔" اتنا بڑا قدم زندگی میں پہلی مرتبہ اٹھا رہی تھی، سو گھبراہٹ لازمی تھی۔

"وعلیکم السلام۔۔ پلیز آیئے۔۔ تشریف رکھیے" محسن جاوید نے اٹھ کر اسے ویلکم کیا تھا، وہ خاموشی سے ٹیبل کے سامنے پڑی کرسیوں میں سے ایک پر ٹک گئی۔

"میں عیشہ واجد ہوں۔۔" اس نے اپنے آپ کو سنبھال کر بتایا۔

"جی میں جانتا ہوں۔۔" عیشہ نے حیران ہو کر اسے دیکھا تو وہ فوراً بولا۔

"دراصل امی کے پاس آپ کی تصویر دیکھی تھی، آپ یہاں۔۔ خیریت۔۔" وہ سر جھکا گئی۔

"مجھے آپ سے ضروری بات کرنا تھی۔۔" اس نے ہمت کی۔

"جی کیوں نہیں۔۔ پہلے ٹھہریں۔۔ یہ بتائیں کیا پینا پسند کریں گی۔۔" انٹرکام کا ریسیور اٹھا کر اس سے پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔



"پلیز اس تکلیف کو رہنے دیں۔۔ میں یونیورسٹی سے سیدھی آئی ہوں، مجھے گھر بھی جانا ہے۔۔"

"مگر کچھ تو ہونا چاہیے نا۔۔" وہ مصر ہوا۔

"مجھے حاجت نہیں۔۔ ورنہ میں آپ کو منع نہ کرتی۔۔"

"او کے۔۔ ایز یو وش۔۔" اس نے ریسیور واپس رکھ دیا۔

"جی کہیے میں کیا خدمت کر سکتا ہوں آپ کی۔" عیشہ کا نارمل انداز دیکھ کر وہ بھی فوراً موضوع کی طرف آیا تھا۔ "آپ کو علم تو ہوگا آپ کو اور ہماری فیملی کس سلسلے میں سوچ رہی ہے۔۔ دیکھیں محسن صاحب! میں آپ کو کسی بھی قسم کے اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتی۔۔ میں آپ سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔"

"جی۔۔؟" عیشہ کے نارمل رویے پر وہ الجھا ضرور تھا، اندازہ تھا کہ یہ بات ہوگی۔

"اس کی وجہ پوچھ سکتا ہوں۔۔؟" اس نے سنجیدگی سے عیشہ کے چہرے کو دیکھا، وہ گردن ہلا گئی۔

"میں کسی اور کو پسند کرتی ہوں۔۔ مجھے نہیں پتا وہ شخص میرے مقدر میں ہے یا نہیں مگر میں کسی اور شخص کی بھی زندگی تباہ نہیں کرنا چاہتی۔۔ چاہے وہ آپ ہی کیوں نہ ہوں۔۔ میری محبت یکطرفہ ہے۔۔ اس کے باوجود میں آپ سے شادی نہیں کر سکتی۔۔" وہ سنگی سے سب کہہ گئی تھی، وہ خاموشی سے عیشہ واجد کو دیکھے گیا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میرے جذبات سے میری فیملی لاعلم ہے۔۔ میں اگر آپ کے پرپوزل سے انکار کرتی تو انہوں نے وجہ پوچھنی تھی، میرے پاس اپنی یکطرفہ محبت کا کوئی جواز نہ تھا، کہ جس کو بنیاد بنا کر میں انکار کرتی۔ اسی لیے آپ کو حقیقت کا بتانا ضروری سمجھا ہے۔ آپ میرے جذبوں سے باخبر ہونے کے باوجود اپنے والدین کی بات مانیں گے تو آپ کو مجھ سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ پلیز ٹھنڈے دل سے ضرور سوچئے گا، میں آپ کے جواب کی ضرور منتظر رہوں گی۔۔" نم آلود آنکھوں، بھرائی ہوئی آواز میں کہہ کر وہ وہاں رکی نہیں تھی، چلی آئی تھی۔ آنکھوں میں نمی رویے میں جذب کرتے وہ بلڈنگ سے باہر نکل کر سڑک کراس کرنے کا سوچ رہی تھی جب سیاہ گاڑی تیزی سے اس کے قریب رکی تھی۔ "عیشہ۔۔" شہباز حیدر کو دیکھ کر وہ ایک لمحے کو ساکت رہ گئی تھی، وہ بھی شاید حیران تھا اسے یہاں دیکھ کر۔۔ وہ یونیورسٹی کے علاوہ کہیں اور بغیر بتائے اکیلی جاتی بھی نہ تھی۔

"تم یہاں۔۔۔خیریت۔۔۔" وہ پوچھ رہے تھے۔ انداز سخت تھا۔۔۔ وہ بوکھلا گئی۔ کبھی جھوٹ بولنے کی نوبت ہی نہ آئی تھی مگر اب۔۔۔

"وہ میری ایک دوست کی بہن اس بلڈنگ میں جاب کرتی ہے۔ اسی کے ساتھ آئی تھی۔۔۔" اس نے فوراً خود کو سنبھال لیا۔ شہباز حیدر نے چند ثانیے اسے بغور دیکھا، تو وہ مزید کنفیوز ہو گئی۔

"بیٹھو۔۔۔" انہوں نے فرنٹ ڈور کھول دیا تھا، وہ خاموشی سے بیٹھ گئی۔

"آپ۔۔۔ یہاں کیا کر رہے تھے۔" گاڑی میں خاموشی تھی، اس نے گھبرا کر پوچھا۔

"کام تھا ایک۔۔۔ ملنا تھا کسی سے مگر۔۔۔" اس کا 'مگر' اتنا معنی خیز تھا کہ پھر وہ چپ رہی اور یہ چپ باقی سارا راستہ برقرار رہی تھی۔ گھر آ کر وہ کاموں میں مصروف ہو گئی۔ اگلے دو دن تک اس کی جان سولی پر لٹکی رہی، وہ محسن جاوید کے جواب کی منتظر تھی، پھر اسے زیادہ انتظار بھی نہ کرنا پڑا۔۔۔ رات کا وقت تھا، فوزان کو سلا کر وہ دودھ کا خالی گلاس کچن میں رکھنے کمرے سے نکلی تھی، جب راہداری سے گزرتے فون کی بیل بجی، اس نے آگے بڑھ کر اسے اٹھا لیا۔

"ہیلو۔"

"عیشہ ہیں۔۔۔؟" دوسری طرف سے کوئی پوچھ رہا تھا۔ "جی بول رہی ہوں مگر آپ کون۔۔۔؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"تھینک گاڈ آپ نے کال ریسیو کی۔۔۔ میں کل سے کئی بار آپ کا نمبر ملا چکا ہوں مگر ہر بار کسی اور کی آواز سننا پڑتی تھی۔۔۔ میں محسن جاوید بات کر رہا ہوں۔۔۔ کیسی ہیں؟" اس نے بے تکلفی سے کہا جا رہا تھا۔ عیشہ نے ایک گہری سانس کھینچی۔

"ٹھیک ہوں۔۔۔ آپ سنائیں۔۔۔"

"الحمدللہ۔ عیشہ آپ نے مجھے فیصلہ کرنے میں مدد دی ہے۔۔۔ آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔" وہ کہہ رہا تھا، وہ چونکی، حیرت بھی ہوئی۔

"مگر کیوں۔۔۔؟"

"میں بھی آپ سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔۔۔ دراصل میری کسی اور سے کمٹمنٹ ہے، گھریلو چپقلش کی وجہ سے امی ابو نہیں مان رہے تھے، پھر آپ کی طرف سلسلہ چل نکلا، میں نے ہر ممکن کوشش کی۔۔۔ بعد میں ہتھیار ڈال دیے تھے، اس دن آپ کی باتوں نے مجھے حوصلہ دیا، غیرت دلائی کہ آپ لڑکی ہو کر اپنے لیے کوشش کر رہی ہیں اور میں مرد ہو کر والدین کو نہیں منا سکتا۔۔۔ بس گھر جا کر میں نے ہر وہ حربہ استعمال کیا جس سے امی ابو مان سکتے تھے۔۔۔ کل وہ لوگ آپ کے ہاں انکار کرنے آئیں گے۔۔۔"

"تھینک یو سو مچ محسن صاحب۔۔۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

"کوئی بات نہیں۔۔۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ وہ خوش نصیب جس کے لیے آپ اسٹینڈ لے رہی ہیں کون ہے؟"

"کیا کریں گے آپ جان کر۔۔۔" وہ خود اذیتی سے مسکرائی۔ "یکطرفہ جذبات ہیں جن کا فریق ثانی پر کوئی اثر نہیں ہے اور شاید ساری زندگی بھی نہ ہو۔۔۔ بس میں اپنے ساتھ مخلص رہنا چاہتی ہوں تاکہ مجھے کوئی ملال نہ رہے کہ ڈوبنے سے پہلے میں نے ہاتھ پاؤں نہیں مارے تھے۔" اس کا لہجہ خود بخود آزردہ ہو گیا۔

"او، اوہ ویری سیڈ۔۔۔ میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔۔۔ کسی بھی قسم کی مدد کی صورت میں آپ مجھے کہہ سکتی ہیں۔۔۔" وہ پورے خلوص سے کہہ رہا تھا، وہ ہنس دی۔

"شکریہ۔۔۔" وہ مسکرائی پھر دو تین باتیں مزید کیں، پھر فون بند کر کے وہ کچن میں گلاس رکھ کر واپس لوٹی تو کاریڈور سے

گزرتے اس کی لاؤنج میں بیٹھے شہباز حیدر پر نگاہ پڑی۔ وہ ٹی وی دیکھ رہے تھے، انہوں نے بھی پلٹ کر دیکھا، تو وہ تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔۔۔ نجانے کس خیال سے دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔

* * *

اک پاکیزہ محبت کے طلبگار تھے ہم
آزما کے دیکھتے بہت وفادار تھے ہم
ہم نے بھی دامن میں خوشیوں کو سمیٹنا چاہا
شاید اسی خواہش کے گنہگار تھے ہم

محسن جاوید کے والدین نے فون کر کے اس رشتے سے معذرت کر لی تھی، بات ہی ایسی تھی کہ کتنے دن تک گھر والے افسردہ رہے تھے، چند دن زور و شور سے اس موضوع پر تبصرے بھی ہوئے مگر پھر رفتہ رفتہ سب بھول گئے، کچھ دن مزید سر کے تو تائی جان کو اٹھتے بیٹھتے عیشہ کے رشتے کی فکر ستانے لگی۔۔۔ وہ کوئی کم عقل، کم صورت جاہل لڑکی نہ تھی کہ رشتے میں پریشانی ہوتی، مگر محسن جاوید کی فیملی کے انکار کے بعد وہ خواہ مخواہ ہی اتنا سیدھا سوچنے لگی تھیں، انہوں نے کئی لوگوں سے عیشہ کے رشتے کا کہہ رکھا تھا۔ عیشہ سب دیکھ رہی تھی مگر خاموش تھی، اس نے سوچ لیا تھا کہ کچھ بھی ہو وہ شہباز حیدر کے علاوہ کسی اور کی زندگی میں داخل نہیں ہو گی، اس کے پاس انکار کا بہت اچھا جواز فوزان کی صورت میں موجود تھا، سو وہ مطمئن تھی۔ اس دن بھی وہ یونیورسٹی سے واپس ہوئی تو مہوش نے اسے اچھی طرح ڈریس اپ ہو کر ڈرائنگ روم میں چلنے کا کہا تھا، وہ تھکی ہاری کوئی کئی دن سے اس نئے رشتے کے متعلق سن رہی تھی، اب سامنے یہ مصیبت دیکھ کر اس کے اعصاب پر جھنجھلاہٹ سوار ہونے لگی۔

"مہوش بجی۔۔۔ ضروری ہے کیا۔۔۔؟؟" اس کے منہ بنانے پر وہ ہنسیں۔

"ہاں، بہت زیادہ۔۔۔ دو گھنٹے سے وہ لوگ آئے بیٹھے ہیں، چائے وغیرہ سے فارغ ہو چکے ہیں۔۔۔ بس تم چینج کر کے فوراً اندر آؤ۔۔۔" اس کے رخسار پر چٹکی بھر کر مسکراتی وہ چلی گئیں، تو وہ بھی لب بھینچے کھڑی رہی۔ پھر بجانے کپڑے بدلنے کے وہ اندر چلی آئی۔ سامنے تھا، سو اسی انداز میں سلام کیا۔ دو عورتیں ایک لڑکی اور دو مرد تھے۔ لڑکی اس سے مختلف سوال کرتی رہی، جنہیں وہ آف موڈ کے ساتھ جواب دیتی رہی۔ پھر جیسے ہی اس کی جان چھوٹی وہ اپنے کمرے میں بھاگ گئی۔ واجد صاحب نے اپنی ساری ذمہ داری اپنے بیٹوں پر چھوڑ رکھی تھی، عیشہ کے ہمدرد ابو کے سامنے انکار کرنے کی ہمت نہیں تھی، اوپر سے شہباز حیدر کے رویے۔۔۔ جب وہ اسے بری طرح نظر انداز کرتے تو اس کا دل لہولہان ہونے لگتا تھا، کوئی رازداں نہ تھا، جس سے وہ کہہ سن کر دل کا بوجھ ہلکا کر سکے۔۔۔ اور جو باخبر تھا وہ ایک نظر ڈالنا بھی گوارا نہ کرتا تھا۔ ادھر سے یہ لوگ بھی جا کر لڑکا دکھا آئے تھے، لڑکا بینک منیجر تھا۔۔۔ خاندان بھی بہت پسند آیا۔۔۔ چونکہ بالکل انجان اور غیر لوگ تھے، سو عبداللہ صاحب کوئی بھی حتمی فیصلہ کرنے سے پہلے خوب چھان پھٹک کروا لینے کے حق میں تھے، انہوں نے جانچ پڑتال کی ذمہ داری شہباز حیدر کے سپرد کی تھی، عیشہ کو علم ہوا تو کلس کر رہ گئی۔

محسن جاوید کو اس نے کسی طرح انکار پر آمادہ کر لیا تھا مگر اب کیا کرے۔۔۔ اسے کوئی راہ سجھائی نہ دے رہی تھی۔ رات فوزان شہباز حیدر کے پاس تھا، کھانے کے بعد وہ اسے اوپر لے گئے تھے، عیشہ کا خیال تھا کہ وہ خود ہی چھوڑ جائیں گے، اب وہ اسے رات کو اپنے پاس سلانے کی غلطی نہیں کرتے تھے مگر آج رات گیارہ بجے تک وہ اسے چھوڑنے نہ آئے تو وہ الجھ گئی۔ نیچے بھی ایک ایک کر کے سب سو گئے تھے، اوپر والے پورشن میں بھی بالکل اندھیرا اور خاموشی تھی، عیشہ نے فوزان کے انتظار سے اکتا کر سو جانا چاہا تو نیند کوسوں دور تھی، اسے رہ رہ کر شہباز حیدر پر غصہ آنے لگا، نجانے وہ کیا چاہتے تھے۔ ایک دم کسی خیال سے چونک کر کچھ دیر سوچنے کے

بعد وہ کمرے سے نکل گئی۔

•

سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلی آئی۔ شہباز حیدر کے کمرے کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے وہ کچھ خوفزدہ تھی دروازہ کھلا تھا، اس کے ہاتھ لگانے سے کھلتا چلا گیا۔

"کون۔۔؟" وہ سائیڈ پر تھی، ورنہ شہباز حیدر کی نگاہ ضرور پڑتی۔ عیشہ کی طرف سے بالکل خاموشی تھی شہباز حیدر اٹھ کر دروازے کے قریب چلے آئے اسے دیکھ کر چونکے، پھر حیران ہوئے۔

"تم۔۔ اس وقت۔۔؟" نہ چاہتے ہوئے بھی ان کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

"وہ فوزی۔۔" ملگجے اندھیرے میں اپنے سامنے شہباز حیدر کے توانا وجود کو دیکھ کر وہ پھر ہمت ہار گئی۔ "وہ سو گیا۔" سخت لہجے پر عیشہ نے نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا۔ کھا جانے والی نظروں سے گھور رہے تھے وہ فوراً سر جھکا گئی۔

"وہ۔ وہ مجھے آپ سے۔۔" انگلیاں چٹخنے سے آ تو گئی تھی مگر ساری ہمت پانی کا بلبلہ ثابت ہو رہی تھی۔

"آپ دادو جان کو منع کر دیں، مجھے شادی نہیں کرنی۔۔ مجھے یہ رشتہ پسند نہیں۔۔" ہمت کر کے کہہ دیا، شہباز حیدر کا دماغ گھوما تھا۔

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔۔ رات کے اس پہر تم مجھے یہ بتانے آئی ہو۔۔" انہوں نے اپنے غصے کو بمشکل کنٹرول کرتے چبا چبا کر کہا تھا، وہ سر جھکا گئی۔

"آپ۔"

"بکواس بند کرو۔۔ جاؤ جا کر سو جاؤ۔ فوزان سویا ہوا ہے۔۔ اگر رات کو تنگ کیا تو تمہارے پاس چھوڑ آؤں گا۔۔" اپنے غصے پر بمشکل کنٹرول کرتے انہوں نے کہا، "اور جہاں تک اس رشتے کی بات ہے میں انکار نہیں کروں گا تم اگر خود کرنا چاہتی ہو تو تایا ابو سے بات کرو، میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا۔۔" تلخی سے بول کر انہوں نے دروازہ بند کرنا چاہا تو عیشہ نے تیزی سے اپنا ہاتھ دروازے کے ہینڈل پر رکھ کر ان کی کوشش ناکام بنا دی تھی۔

"آپ پلیز میری بات تو سن لیں۔۔" عیشہ کا جی چاہا کہ پھوٹ پھوٹ کر رو دے، یوں دھتکارے جانے پر دل مچل اٹھا۔ انجام کی پروا کیے بغیر تیزی سے کہا۔

"عیشہ۔۔" شہباز حیدر دھیمی آواز میں پھنکارے۔ ساتھ والا کمرہ قیوم اور مہوش کا تھا، اگر رات کے اس پہر ان میں سے کوئی باہر نکل آتا تو انہیں کتنی سبکی کا سامنا کرنا پڑتا، مگر یہ لڑکی ان باتوں کو نہیں سمجھ پا رہی تھی، کسی چیز کی پروا ہی نہ تھی۔

"آپ یوں چیخ کر میری زبان روک نہیں سکتے، یوں دھتکار کر میرے اندر موجزن جذبوں کو نوچ نہیں سکتے۔۔ کیا مانگ رہی ہوں میں آپ سے۔۔ آپ کا عمر بھر کا ساتھ تو نہیں مانگ رہی اور نہ آپ کو شادی کی آفر کر رہی ہوں۔۔ جو اس طرح طیش سے مجھے دروازے سے ہی دھتکار رہے ہیں۔۔" شہباز حیدر جتنی دھیمی آواز میں پھنکار رہے تھے، وہ اتنی ہی تیزی سے چیخی تھی۔ شہباز کا دماغ گھوما تھا، ایک دم اس کا بازو دبوچ کر اندر گھسیٹ لیا۔

"تم میں شرم نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اتنی گھٹیا حرکت پر اتر آؤ گی۔۔" اسے دیوار کے ساتھ دھکا دے کر وہ کمرے میں سخت اضطراب سے ٹہلنے لگے تھے، عیشہ نے دیوار کا سہارا لے کر خود کو گرنے سے بچایا۔

"یہ میری زندگی کا معاملہ ہے۔۔ آپ کون ہوتے ہیں مجھے مجبور کرنے والے۔۔ نہیں کرنی مجھے کسی بھی ایکس وائی زیڈ سے شادی۔۔" وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپائے بری طرح رو رہی تھی۔ ان کا دماغ الٹنے لگا۔

"تو ٹھیک ہے۔۔ تم یہ انکار اپنے باپ اور دادا کو کرو۔۔ یہاں کیوں آئی ہو۔۔" وہ پھر پھنکارے تھے، وہ غلطی کر

ت کے مالک نہ تھے مگر یہ لڑکی ہر بار انہیں اسی طرح مجبور کر رہی تھی کہ وہ بلبلا اٹھتے تھے۔ اب بھی پھنکارے تھے۔ زیرو پاور کے بلب کی روشنی میں سبز ہلکی روشنی میں کمرہ عجیب منظر پیش کر رہا تھا۔

"آپ اس رشتے کی جانچ پڑتال کر رہے ہیں۔۔" روتے ہوئے اس نے وجہ بتائی، تو شہباز حیدر کا جی چاہا کہ اس سرپھری کم عقل لڑکی کا سر پھاڑ دے۔ "تو کیا فرق پڑتا ہے۔۔" "پہلے بھی تو اچھی دیدہ دلیری کے ساتھ جا کر محسن جاوید کو انکار کر آئی تھی، اب بھی کوئی نیا ڈرامہ رچا لینا۔" عیشہ رونا بھول کر بری طرح حیران نظروں سے انہیں دیکھے گئی۔ جو صرف گھور رہے تھے۔ "آپ۔۔ جانتے ہیں۔۔" اس کی حیرت کا سکتہ ٹوٹا۔

"محسن جاوید سے میری اچھی خاصی علیک سلیک ہے۔۔ اس دن میں اس سے ملنے گیا تھا، مگر اس کے آفس سے آتی تمہاری آواز سن کر پلٹ آیا تھا، اور اسی رات جب اس نے کال کی تھی تم سے پہلے نالج میں رکھ لوں میں اٹھ چکا تھا۔ محسن کو میں اچھی طرح جانتا ہوں، اس کی کسی سے کمٹمنٹ نہیں تھی، وہ صرف تمہاری وجہ سے انکار کر رہا تھا، اس کے والدین اس سے جس قدر ناراض ہیں، کاش تم اپنی حماقت کا اندازہ لگا سکو۔۔ اور اب۔۔" مٹھیاں بھینچ کر غصے سے اسے دیکھتے وہ چپ ہو گئے تو وہ پھر ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو دی۔

"میں مر جاؤں گی۔۔ آپ کیوں نہیں سمجھتے آپ کے بغیر میں مر جاؤں گی۔۔" وہ جذباتیت کی انتہا پر تھی، شہباز حیدر کا جی چاہا چند لمحوں میں اس لڑکی کو غائب کر دیں۔

"دماغ خراب تمہارا۔۔ اور کچھ نہیں۔۔ خناس بھر چکا ہے اس میں۔۔" اس کی جذباتیت پر وہ پھر آؤٹ ہوئے۔

"یہ صرف میری ڈھیل ہے، تم میری نرمی کا ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہو۔۔ شرم آنی چاہیے تمہیں یہ سب بکواس کرتے ہوئے۔۔ کم از کم اپنی عمروں کا ہی خیال کر لیا ہوتا۔۔ کم از کم اتنا ہی جان لیا ہوتا کہ ہمارا آپس میں کیا رشتہ ہے۔۔ اور تم اس رشتے کے حوالے سے میرے لیے کتنی محترم ہو۔۔" وہ تاسف سے کہہ رہے تھے۔

"بات کرتا ہوں میں تایا جان سے۔۔ اب پانی سر سے گزر چکا ہے۔۔ تمہارے ماسٹرز کا انتظار کرنے کے بجائے تمہیں کل ہی رخصت کریں۔۔ یہ رشتہ ہر لحاظ سے معقول ہے۔۔" انتہائی سفاکی سے کہتے شہباز حیدر نے گویا اسے آگ میں دھکیل دیا تھا، وہ ایک ٹک سے دیکھے گئی، پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

"آپ ایسا کچھ نہیں کریں گے۔۔ مجھے یہ شادی نہیں کرنی۔۔" سختی سے کہا۔

"میں ایسا ہی کروں گا۔۔" اس سے زیادہ سختی سے جواب ملا تھا۔

"میں کچھ کھا لوں گی۔۔" بلا سوچے سمجھے اس نے دھمکی دی تھی، وہ کتنے پل حیران نظروں سے اسے دیکھے گئے، پھر ایک دم غصے سے برا حال ہوا تھا۔ "تو پھر جو کچھ بھی کھانا ہے ابھی جا کر کھا لو۔۔ کیونکہ میں موقع ملتے ہی تایا ابو سے بات کروں گا۔۔" اس کا بازو پکڑ کر باہر دھکیل کر سختی سے کہہ کر انہوں نے دروازہ بھی بند کر لیا تھا۔

"نہیں۔۔ شہباز پلیز میری بات سنیں۔۔ آپ ایسا نہیں کریں گے۔۔ مر جاؤں گی میں۔۔" ہتھیلیوں سے دروازہ پیٹتے اسے کسی کی بات کا بھی ہوش نہ رہا تھا۔

"مر جاؤں گی میں۔۔ خدا کے لیے شہباز۔۔" اس کی حالت اس وقت دیکھنے کے لائق تھی۔

"عیشہ۔۔" کسی نے عقب سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا، وہ ایک دم ساکن ہو گئی۔ فوراً ہوش میں آئی تو لمحوں میں احساس ہوا کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔

"عیشہ۔۔" دوبارہ پکارا گیا تھا، آواز پہچان کر وہ فوراً پلٹی تھی۔ اپنے سامنے کھڑے وجود کو دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی تھی۔

• • •

مہوش اور قیوم دونوں نے کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر عیشہ کو۔۔۔ وہ اب بھی قالین پر بیٹھی گھٹنوں میں منہ دیے بڑی طرح رو رہی تھی۔

"عیشہ۔۔۔" مہوش نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو وہ مزید بلکی۔

"اب بس بھی کرو بہت رو لیا تم نے۔۔۔" قیوم بھی پچکارا مگر اس نے آنسو تھے کہ تھمنے میں ہی نہیں آ رہے تھے، بلکہ ان میں شدت آ گئی تھی۔۔۔ بے بسی کا احساس تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا، اب کی بار تو کچھ بھی نہیں بچا تھا، رہی سہی انا عزت نفس سب کچھ لٹا چکی تھی، کچھ بھی تو باقی نہیں بچا تھا، روتی نہ تو پھر کیا کرتی۔۔۔

"دیکھنا ہم شہباز بھائی کا کیا حشر کرتے ہیں۔۔۔ بڑا رویا تم نے۔۔۔ ساری کسر نکالیں گے ہم ان کی۔۔۔ فکر کیوں کرتی ہو۔۔۔ جب دل کا سارا بوجھ ہلکا کیا ہے تو اعتماد بھی کرو۔۔۔ شہباز بھائی اب ہمارا مسئلہ ہیں۔۔۔ تم بے فکر ہو جاؤ۔۔۔" مہوش چچی نے اسے بہلایا تھا، اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔

"وہ نہیں، نہیں گے۔۔۔ وہ مجھ سے سخت نفرت کرتے ہیں۔۔۔"

"کیوں نہیں مانیں گے۔۔۔ ان کے تو بڑے بھی مانیں گے۔۔۔ دیکھنا میں کیا کرتی ہوں۔۔۔" مہوش نے چٹکی بجائی تھی، ان کے اعتماد پر عیشہ کو کچھ حوصلہ ہوا۔

"چلو اب جاؤ۔۔۔ جا کر آرام سے سو جاؤ۔۔۔ کل میں دیکھوں گی کیا کرنا ہے۔۔۔ تم فکر نہیں کرو۔۔۔ سب نارمل ہو جائے گا۔۔۔" ان کے اس تعاون پر اس کا دل پرسکون ہوا۔ ان کے کمرے سے نکل کر وہ نیچے چلی آئی، اپنے کمرے میں آ کر بیڈ پر لیٹ کر گزشتہ لمحے ایک ایک کر کے یاد آنے لگے۔ عجیب رشیدگی کے کمرے سے نکلنے کے بعد وہ جب بھی دروازہ پیٹتے رو رہی تھی، تو عقب سے قیوم چچا نے آواز دی تھی، وہ تو انہیں سامنے دیکھ کر ڈر گئی تھی۔

"چاچو۔۔۔" کہہ کر کے وہ ان کے کندھے سے لپٹ کر دھواں دھار روئی تھی، وہ تو اس نئی افتاد پر بوکھلا گئے تھے، خاموشی سے سہارا دے کر اپنے کمرے میں لے گئے تھے مہوش کو جگا کر صورتحال بتائی، وہ فوراً اس کی طرف متوجہ ہوئی تھیں، وہ تو پہلے ہی ہمدرد بنی کھڑی تھی، تھوڑی سی ساجت سے پچکارنے کی دیر تھی، وہ ایک ایک کر کے سب بتاتی گئی۔ دونوں کئی لمحے بے یقین رہے، پھر مہوش نے ہی خود کو سنبھالا تھا۔

"ارے یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔۔۔ عیشہ سے بڑھ کر فوزان کے لیے بھلا کوئی اور ماں ہو سکتی ہے۔۔۔ ہم بھی ادھر ادھر رشتے دیکھ رہے تھے۔۔۔ کتنے پاگل ہیں۔۔۔ عیشہ کے لیے شہباز بھائی کا خیال ہی نہیں آیا۔۔۔ بھائی صاحب نے بھی کہیں نہ کہیں شادی کرنی ہی ہے نا۔۔۔ ابھی انکار کر رہے ہیں، بعد میں خود ضرورت محسوس کریں گے تو پھر ابھی کیوں نہیں۔۔۔ تم فکر نہیں کرو عیشہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔۔۔" وہ فوراً پُرجوش ہو گئی تھیں، اور پھر مسلسل تسلیاں دلاسے دیتی رہی تھیں۔ اب وہ کچھ پرسکون تھی، اسے یقین تھا کہ مہوش چچی نے وعدہ کیا ہے تو وہ سب حالات کو سنبھال لیں گی، اطمینان سے آنکھیں بند کیں تو دیر بعد نیند سے اس کی پلکیں بوجھل ہونا شروع ہو گئی تھیں۔

* * *

اگلے دن مہوش بھابی نے کالج سے چھٹی کی تھی، عیشہ کے یونیورسٹی جانے کے بعد شہباز حیدر نیچے اترے تھے، مہوش نے بغور دیکھا، نارمل انداز میں ناشتے سے انصاف کرتے گزری رات کے کسی بھی واقعے کا عکس ان کے چہرے سے ڈھونڈنے سے بھی

نہیں مل رہا تھا، عیشہ نے جو بتایا تھا ان کا خیال تھا کہ شہباز تائی امی سے ضرور رشتے کے متعلق ذکر چھیڑیں گے مگر خیریت رہی۔۔۔ شہباز کے چلے جانے کے بعد تائی امی، چچی دونوں ناشتہ کر رہی تھیں، مہوش بھی اپنا ناشتہ لے کر ان کے پاس ٹیبل پر آ بیٹھیں۔ یونہی ادھر اُدھر کی باتوں کے دوران انہوں نے وہ بات شروع کر دی۔

"امی میں سوچ رہی ہوں کہ اب شہباز بھائی کی بھی شادی کر دینی چاہیے۔۔۔ جوگ لیے کو اتنا عرصہ بہت ہوتا ہے۔۔۔ فوزان کو تو عیشہ نے سنبھال رکھا ہے، وہ اب بڑا ہو رہا ہے، شہباز بھائی کو بھی کچھ عرصہ بعد بیوی کی ضرورت محسوس ہو گی۔ اسی لیے بہتر ہے کہ ہم ابھی سے سوچیں۔" مہوش نے بڑے سلیقے سے بات کی تھی، دونوں خواتین نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"بات تو ٹھیک ہے مگر شہباز نہیں مانتا۔۔۔" امی نے نفی میں سر ہلایا۔

"کیوں نہیں مانتے۔۔۔ ابھی تو اک عمر پڑی ہے امی۔۔۔ یوں بغیر گھر والی کے زندگی گزرنے سے تو رہی۔۔۔" مہوش نے کچھ تیزی سے کہا۔ "آپ تو ماں ہیں، پیار سے سختی سے راضی کریں۔۔۔ ورنہ شہباز کی زندگی اتنی ہی تھی، فوزان کو ہم سب سنبھالنے والے ہیں، خاص طور پر عیشہ۔۔۔ کل کو اس کی شادی کر دیں گے، پھر بھی تو فوزان تنہا ہو گا ہی نا۔۔۔ شہباز بھائی کو بھی اب عقلمندی کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔۔۔"

"ہاں! بہو صحیح کہتی ہے۔۔۔ تم ہی کچھ زور دو، میں کئی بار کہہ چکی ہوں۔۔۔" تائی امی نے بھی مہوش کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"کئی بار اس موضوع پر بات کر چکی ہوں۔۔۔ مگر ہر بار کہہ دیتا ہے کہ مجھے بیوی دے کر آپ کو بہو تو مل جائے گی، اگر آنے والی نے فوزان کو قبول نہ کیا تو۔۔۔ عفیفہ بھابی کو بھی ہم لوگ لائے تھے، انہوں نے عیشہ کو کب اپنایا۔۔۔ میں اپنے بیٹے کو ساری عمر کسی محرومی میں نہیں رکھنا چاہتا۔۔۔" امی نے دکھی لہجے میں بتایا تو مہوش نے ایک گہری سانس لی۔

"ہاں! یہ بھی سچ ہے۔۔۔ فوزان کو عیشہ نے جس طرح سنبھالا شاید وہ رشتہ کی نبھاتی ہے۔۔۔" انہوں نے جان بوجھ کر عیشہ کا ذکر کر دیا تھا۔

"ہاں اللہ اجر دے بچی کو۔۔۔ جب اس کی شادی کر دیں گے تو بڑا مسئلہ ہو گا۔۔۔ فوزان تو اس کے بغیر رہ ہی نہیں سکتا، اس نے بھی اس کے لاڈ اٹھا کر ضدی بنا ڈالا ہے اسے۔۔۔ صرف وہی اسے سنبھال سکتی ہے۔ میں سوچتی ہوں جب وہ چلی گئی تو ہم کیسے سنبھالیں گے۔۔۔" امی کو اب نئی فکر ستا رہی تھی۔

"امی میرے ذہن میں جب سے عیشہ کے رشتے کا چکر چلا ہے اک خیال آ رہا ہے۔۔۔ اگر برا نہ لگے تو۔۔۔" وہ رک گئیں، دونوں خواتین نے دیکھا۔

"کیوں نہ ہم شہباز بھائی اور عیشہ کی۔۔۔" وہ جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ چکی تھیں، دونوں خواتین نے بے حد حیران ہو کر ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر مہوش کو جو کہہ رہی تھی۔

"چھوٹا منہ مگر بڑی بات والی بات ہے لیکن یہ بھی سچ ہے۔۔۔ جس طرح فوزان عیشہ کے ساتھ اٹیچ ہے، اگر عیشہ ہمیشہ کے لیے شہباز بھائی کی زندگی میں آ جائے تو سوتیلی کے ڈر سے شہباز بھائی شادی کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے، وہ بھی کر لیں گے۔۔۔ پھر ہم نے باہر بھی تو اس کی کہیں نہ کہیں شادی کرنی ہی ہے نا۔۔۔ اور شہباز بھائی کی بھی تو دونوں کی ایک دوسرے کے ساتھ کیوں نہیں ہو سکتی۔۔۔" مہوش نے جو کہنا تھا وہ کہہ دیا تھا۔

"ہے تو ٹھیک بات مگر۔۔۔" تائی امی رک گئیں۔

"لوگ کیا کہیں گے کہ دونوں میں تیرہ چودہ سال کا فرق ہے۔۔۔ پھر وہ رشتہ بھی نازک سا ہے۔۔۔ لوگ باتیں نہ بنا لیں۔۔۔" امی کو بھی مہوش کی بات بھائی تھی مگر خدشے بول اٹھے۔

"رشتے میں دونوں چچا بھتیجی لگتے ہیں۔۔۔ سگے تو نہیں ہیں نا۔۔۔ پھر حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کا بھی یہی رشتہ تھا۔ رہی بات عمر کی تو اتنا زیادہ فرق بھی نہیں ہے۔۔۔ آپ باہر سے بھی کوئی لڑکی لائیں گے تو اس کی بھی عمر اتنی ہی ہوگی یا ایک دو سال زیادہ ہوگی۔۔۔ لوگوں کی تو بات ہی نہیں کریں، عیشہ کی ماں کے بعد یا وریشہ کے بعد دونوں کو لوگوں نے تو نہیں سنبھالا تھا۔ گھر کی بات ہے۔۔۔ جب گھر والے راضی تو کیا کریں گے لوگ۔۔۔" اس نے آرام سے کہا تھا۔ دونوں خواتین کے دل کو بات لگی تھی۔

"مہوش ٹھیک کہہ رہی ہے آپا۔۔۔ آپ بتائیں آپ کیا کہتی ہیں۔۔۔؟" امی نے تائی امی کو دیکھا، وہ ہنس دیں۔

"میرے لیے تو یہ بڑی خوشی کی بات ہے۔۔۔ شہباز اور عیشہ اپنے بچے ہیں۔۔۔ اپنے گھر میں آنکھوں کے سامنے رہیں گے۔۔۔ وریشہ کے بعد اب عیشہ۔۔۔ حیرت ہے۔۔۔ مجھے پہلے یہ خیال کیوں نہیں آیا۔۔۔" وہ خوش ہو کر کہہ رہی تھیں۔

"پھر آپ بھائی صاحب اور واجد سے بات کریں، میں شہباز اور اس کے ابا سے بات کرتی ہوں۔۔۔ گھر کی بات ہے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔۔۔" مہوش نے جو ذمہ داری لی تھی، وہ با احسن نبھائی تھی، اب جو کرنا تھا ان خواتین نے کرنا تھا، وہ مسکراتے ہوئے خالی برتن اٹھا کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

* * *

یہ بات جب عبداللہ صاحب کے کانوں تک پہنچی تو ان کا یہ مشورہ بہت پسند آیا۔ اسی شام انہوں نے واجد کو بلا کر بات کی تو وہ کتنی دیر تک چپ رہے پھر کہنے لگے۔

"اماں جی ویسے تو سب ٹھیک ہے مگر۔۔۔ عیشہ اور شہباز کی عمر میں بڑا فرق ہے۔۔۔ شہباز ایک بچے کا باپ ہے، نجانے عیشہ راضی بھی ہو کہ نہیں۔" وہ متذبذب ہوتے لگے۔

"عمر کی کوئی بات نہیں۔۔۔ باہر بھی کریں گے تو پتہ نہیں کوئی کتنی عمر والا شخص ہو۔۔۔ رہ گئی عیشہ کی بات تو اس سے میں خود ہی پوچھ لوں گی۔۔۔ تم اپنی مرضی بتاؤ۔" ماں کی بات پر وہ مسکرا دیے۔

"حرج تو کوئی نہیں ہے۔۔۔ عیشہ کی رضامندی لے لیں، بھر جی چاہے کریں۔۔۔ شہباز سے بڑھ کر ہمیں اور کیا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے، میں عیشہ سے پوچھ کر رضامندی دے دیتی ہوں، آگے بچوں کی قسمت۔" انہوں نے خوش ہو کر کہا۔ تائی امی نے عیشہ سے پوچھنے کی ذمہ داری مہوش کے ذمہ لگائی تھی، مہوش ہنس دی۔

شام کے کھانے کی تیاری کے دوران مہوش نے عیشہ کو اپنی سارے دن کی کارگزاری بتائی تو کتنی دیر تک ہکا بکا رہ گئی۔

"کیا واقعی۔۔۔ یہ سچ ہے۔۔۔؟" وہ بے یقین تھی۔

"ہوں۔۔۔" مہوش نے اس کے رخسار پر چٹکی بھری تو وہ جھینپ گئی۔

"اتنی جلدی کیسے ہو گیا یہ سب۔۔۔" خوشی ہی ایسی تھی کہ وہ سرخ گلنار ہوگئی۔

"بس دعا دو ہمیں۔۔۔ کہا تھا نا کہ ہم پر چھوڑ دو۔۔۔ بس میں نے تائی امی اور امی کو رام ہی ایسے کیا ہے کہ خود بخود انہوں نے سارا معاملہ طے کر لیا۔۔۔ اب بات بڑوں میں ہے۔۔۔" وہ مزے سے بتا رہی تھی، وہ ابھی بھی بے یقین تھی۔

"اور شہباز۔۔۔" اس نے کہا۔

"آج رات امی کا ان سے بات کرنے کا ارادہ ہے، دیکھتے ہیں کیا جواب ملتا ہے۔۔۔"

"اگر انہوں نے انکار کر دیا تو۔۔۔" ایک دم وہ خدشوں میں گھر گئی تھی، مہوش ہنسی۔

"فکر کیوں کرتی ہو۔۔۔ ہم ہیں نا۔۔۔"

"خوش تو میں بھی بہت ہوں۔۔۔ ہو تو تم مجھ سے چھوٹی مگر رشتے میں جیٹھانی ہوگی۔۔۔" وہ چھیڑ رہی تھیں، وہ سرخ پڑ گئی۔

"تائی امی نے تم سے پوچھنے کی ذمہ داری مجھ پر لگائی ہے۔۔۔ مگر انہیں کیا پتا ان کی بھتیجی تو شہباز صاحب کے عشق میں پور پور ڈوب چکی ہے۔۔۔" ان کی اس چھیڑ چھاڑ پر وہ بلش ہوگئی۔

"چچی پلیز۔۔۔" اس نے ٹوکا، وہ کھلکھلا کر ہنسیں۔

"رشتے میں تمہاری دیورانی ہوں گی۔۔۔ ابھی سے سوچ لو۔۔۔ چچی کہو گی یا۔۔۔" عیشہ کی بھی ہنسی نکل گئی۔

"آپ میری چچی ہیں بس۔۔۔"

"اور شہباز صاحب چچا۔۔۔ ویسے بائی داوے۔۔۔ چچا سے وہ کیسے بن گئے۔۔۔" وہ کتنی بے باک ہو رہی تھیں۔

"مہوش چچی پلیز۔۔۔" اس کا شرم سے برا حال تھا۔

* * *

رات شہباز گھر لیٹ آئے تھے، تقریباً سبھی سو چکے تھے، امی ان سے بات کرنے کی نیت سے جاگ رہی تھیں، کھانا انہوں نے کمرے میں ہی کھایا تھا۔ کھانے کے بعد امی نے وہ بات چھیڑ دی، جس کیلئے وہ اب تک جاگ رہی تھیں۔۔۔ اور پھر جب انہوں نے عیشہ کا نام لیا تو شہباز حیدر گنگ رہ گئے۔

"کیا۔۔۔ عیشہ۔۔۔؟" وہ حیرت زدہ تھے۔

"ہوں۔۔۔ وریشہ کے بعد جس طرح اس نے نوران کو پالا ہے، مانو تو اس نے دل جیت لیا ہے۔۔۔ آپ لوگ باہر اس کا رشتہ دیکھ رہے ہیں۔۔۔ نوران جس طرح اس کے ساتھ ہل گیا ہے، میں ڈرتی ہے کہ چونکہ اس کے بعد وہ سنبھل پائے کہ نہیں۔۔۔ پھر تمہاری طرف سے بھی دل دکھتا ہے، تم نوران کو سوتیلی ماں کے حوالے نہیں کرنا چاہتے، پھر عیشہ کیلئے تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے، اتنی سلجھی ہوئی بچی ہے وہ۔۔۔ یوں کہوں کہ میری تو دل کی مراد بر آئی ہے۔۔۔" وہ خوش تھیں، بہت خوش۔۔۔ وہ برہم ہوئے۔

"آپ ہوش میں تو ہیں۔۔۔ عیشہ۔۔۔ مائی گاڈ۔۔۔ جسے میں آج تک چھوٹی بچی سمجھتا آ رہا تھا، آپ اس کی بات کر رہے ہیں۔۔۔ سچ سچ بتائیں کہ یہ کس کی سازش ہے۔۔۔" غصے سے جو جی میں آیا کہہ دیا۔

"ہیں۔۔۔ ہیں۔۔۔ یہ سازش کی خوب کہی تم نے۔۔۔ دل میں خیال تھا، آپا اور بھائی صاحب سے بات کی، انہوں نے واجد اور عیشہ کی رضامندی لے کر ہاں کہہ دی۔۔۔ اب تم سے پوچھ رہی ہوں اور تم مجھے ہوش کا سبق دے رہے ہو۔۔۔" شہباز حیدر کے انداز پر وہ بھی برہم ہوئیں۔

"یعنی کہ مجھ سے پوچھے بغیر ہی بڑوں تک بات پہنچ چکی ہے۔۔۔ یا اللہ" وہ بے چارگی سے ماں کو دیکھتے رہ گئے۔

"منع کر دیں۔۔۔ مجھے نہیں کرنی عیشہ سے شادی، شہباز حیدر نے فوراً منع کر دیا۔

"ارے کیوں منع کر دوں۔۔۔ عیشہ جیسی لڑکی چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملنے والی۔۔۔ گھر کی بات ہے تقریباً سب طے ہے۔۔۔ بھائی صاحب نے ہاں کہہ دی ہے۔۔۔ اب میں شادی کی ڈیٹ طے کرنے میں دیر نہیں لگاؤں گی۔۔۔" شہباز کے ایک دم انکار نے انہیں کر دیا تو انہوں نے بھی دوٹوک بات کی۔

"امی پلیز۔۔۔ آپ سمجھ کیوں نہیں رہیں۔۔۔ وہ بچی سی ہے۔۔۔ پھر میری اور اس کی عمر میں بہت فرق ہے۔۔۔" ماں کے دو ٹوک انداز پر وہ کچھ دھیمے ہوئے تاہم بے چارگی نمایاں تھی۔

"کوئی بچی وچی نہیں ہے۔۔۔ پورے تئیس سال کی ہو چکی ہے۔۔۔ رہی عمر کی بات تو میاں بیوی میں عمر کا یہ فرق عام

ہے۔۔۔سب چلتا ہے۔۔۔"انہوں نے یہ اعتراض فورا رد کیا۔

"وہ غیر شادی شدہ ہے۔۔۔ بھلا شادی شدہ کے ساتھ کیسے ایڈجسٹ کرے گی، پھر مجھے بھی وہ بطور لائف پارٹنر پسند نہیں۔۔۔" بے چارگی سے دوسرا اعتراض کیا۔ "اس کی رائے لے چکے ہیں۔۔۔اسے کوئی اعتراض نہیں۔۔۔یوزان کو وہ پہلے ہی سنبھال رہی ہے۔۔۔رہ گئی پسند کی بات تو شادی کے بعد خود بخود پسند کرنے لگے گی۔۔۔" ادھر سے جواب تیار تھا۔

"وہ بہت امیچور ہے۔۔۔اس کے لئے ای جیسا لڑکا چاہیے تھا۔۔۔" بلکس کر پھر کہا تھا۔

"خیر سے شادی کے بعد تمہارے عادات و اطوار دیکھ کر خود ہی سنجیدہ ہو جائے گی۔۔۔" وہ تو جیسے پوری تیاری کر کے آئی تھیں، کسی اعتراض کو چنداں اہمیت نہ دی تھی، انہوں نے لب بھینچ لیے۔

کوئی اور بھی اعتراض ہے تو وہ بھی کر لو۔۔۔میں انکار نہیں سننے والی۔۔۔" شہباز حیدر نے انتہائی غصے سے انہیں دیکھا آج وہ انہیں ذرا سی محبت جتانے والی ماں نہ لگیں۔

"آپ بھلا کون سا میرے کسی اعتراض کو خاطر میں لا رہی ہیں جو میں مزید بحث کروں" شاکی انداز میں ماں کو دیکھ وہ ہنس دیں۔

"جب تم اعتراض ہی اوٹ پٹانگ کرو گے تو میں بھلا کیا خاطر میں لاؤں۔ خیر سے، اپنے گھر کی بچی ہے۔۔۔بھلا عیب سے پاک ورنہ تم لگے کیڑے نکالنے۔۔۔" انہوں نے گہرا سانس لیا۔

"پھر میں تمہارے تایا جان کو ہاں کہہ دوں۔۔۔" برتنوں کی ٹرے اٹھا کر وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔۔۔ماں کے ڈیلیسی انداز پر کوفت کا شکار ہوئے۔

"مجھے نہیں چاہیے۔ مگر ایک بات طے ہے، مجھے اس سے شادی نہیں کرنی۔۔۔" اندر کا ابال ایک دم امڈ آیا، امی نے غصے سے بیٹے کو دیکھا۔

"شہباز! والدین کے دل سے اس طرح نہیں کھیلتے۔۔۔وریشہ کا غم اب اتنا تازہ بھی نہیں کہ تم ہمیں نامراد لوٹا دو۔ کئے سال بہت گئے اب تو میرا خیال ہے کہ اعتراض کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ عیشہ اور وریشہ میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے۔ خالہ مر جائے تو بھانجی، پھوپھی کی جگہ بھتیجی۔ دنیا میں ہوتا آیا ہے۔۔۔کئی مثالیں ہیں۔۔۔تم دنیا کے اکیلے نرالے تو نہیں ہو۔۔۔میں انکار نہیں سننے والی، جا کر بھائی صاحب کو ہاں کہہ دیتی ہوں۔" وہ غصے سے بھنا کر کمرے سے چلی گئیں۔ شہباز حیدر نے غصے سے سرہانہ اٹھا کر دیوار پر دے مارا۔ جی چاہا ابھی جا کر عیشہ واجد کو جھنجھوڑ کر رکھ دیں، مگر وہ ضبط کر گئے، رات کے اس پہر وہ تو سو چکی ہوگی مگر شہباز حیدر انگاروں پر لوٹنے لگے۔

* * *

شہباز حیدر کی ساری رات آنکھوں میں کٹی تھی، ایک چھوٹی سی لڑکی نے انہیں اذیت سے دوچار کر رکھا تھا، صبح پو پھٹی ہوئی تو وہ بھی کمرے سے نکل آئے، نیچے آئے تو ابھی سبھی اپنے کمروں میں تھے۔ وہ عیشہ کے کمرے کی طرف چلے آئے۔ دروازہ لاک نہیں تھا۔ ہینڈل گھمانے سے کھلتا چلا گیا تھا، وہ اندر داخل ہوئے تو یوزان بستر پر کمبل پر لیٹا سو رہا تھا، اور وہ واش روم سے وضو کر کے نکل رہی تھی۔ اتنی صبح صبح شہباز حیدر کو اپنے کمرے میں دیکھ کر چونکی۔

"آپ۔۔۔؟" وہ دوپٹہ وضو کے اسٹائل میں لپٹا ہوا تھا۔

"تم۔۔۔" عیشہ کو دیکھ کر گزری رات کی اذیت نئے سرے سے تازہ ہو گئی۔ ایک دم طیش میں قدم بڑھائے۔ عیشہ شہباز حیدر کے تیور دیکھ کر پیچھے ہٹی تھی۔

"تم خود کو سمجھتی کیا ہو۔ کہاں عذاب کی طرح مسلسل میرے پیچھے پڑ گئی ہو۔۔۔" عیشہ کا گداز آستین چڑھا بازو ان کی فولادی گرفت میں جکڑا گیا تھا، عیشہ ان کے تیور دیکھ کر خوفزدہ ہو گئی۔

"آپ کیا کر رہے۔۔۔چھوڑیں مجھے۔۔۔پلیز۔۔۔" گرفت اتنی سخت تھی کہ تکلیف سے بس چیخ نکلنے کی کسر تھی۔ اپنا بازو چھڑانا چاہا تو شہباز نے مزید طیش میں آ کر جھٹکا دیا تھا، وہ بری طرح دیوار کے ساتھ جا لگی۔ "جان سے مار دوں گا تمہیں۔۔۔پاگل لڑکی، تم نے امی اور تائی امی تک بات پہنچا دی۔۔۔جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔۔۔یہ ساری تمہاری سازش ہے۔۔۔تمہارا کیا خیال ہے اس طرح کرنے سے تم مجھ سے شادی کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گی۔۔۔لعنت بھیجتا ہوں میں تم پر۔۔۔" اس قدر غصے طیش بھرے لہجے میں، یہ جواب کی نفرت تھی۔ حیران پھٹی پھٹی نگاہوں سے بازو کی ساری تکلیف بھولے پتھر بن گئی۔ اتنی نفرت۔۔۔؟ اس قدر ناپسندیدگی کا اظہار۔۔۔؟ وہ بے یقینی سے دیکھے گئی۔

"میرا خیال تھا کہ تم تشکر کا مظاہرہ کرو گی۔۔۔کل رات جو بھی ہوا، میں تمہاری نادانی سمجھ کر نظر انداز کر گیا مگر اب۔۔۔تم نے پر پرزے نکالنے شروع کر دیئے ہیں۔۔۔بہت برا کروں گا میں تمہارے ساتھ۔۔۔" شہباز کے اندر کا دکھ کسی بھی طرح کم نہیں ہو رہا تھا، عیشہ کو خوف سے برا حال ہو۔ شہباز حیدر کا یہ روپ پہلی دفعہ دیکھ رہی تھی۔

"میں نے کیا کہا ہے۔۔۔؟" وہ رو دی۔ بازو کی تکلیف اور شہباز کا خوف، آنسو ایک ایک کر کے چہرے پر گرنے لگے۔ کچھ دیر پہلے اس نے وضو کیا تھا، چہرہ دھو گیا تھا، ٹھوڑی سے گردن تک سارے چہرے پر پانی کے قطرے چمک رہے تھے، سرخ و سپید چہرہ۔۔۔جا بجا چپکی کالے بالوں کی لٹیں۔۔۔ایک لمحے کو اس کے رونے نے ان کی بھوری آنکھوں میں موجود پانی دیکھ کر ساکت ہوا تھا مگر اگلے ہی لمحے پانی ان کے اندر کی آگ کو بھڑکا گئی تھی۔

"ابھی بے حیائی میں کوئی کسر باقی ہے۔۔۔مائی گاڈ۔۔۔جو بات میں سوچتے ہوئے بھی لرز جاتا تھا وہ بات تم نے کتنی آسانی سے بڑوں تک پہنچائی۔ نہ صرف پہنچائی بلکہ میری کسی مرضی کو خاطر میں لائے بغیر سب کچھ طے بھی پا گیا۔۔۔صرف ایک دن میں۔۔۔" ایک سکون کی کیفیت تھی، اگلے ہی لمحے اندرونی خلفشار نے پھر غصہ بنا کر اس کی رو اوڑھا دی۔

"پلیز چپ کریں۔۔۔میں نے کسی سے بات نہیں کی۔۔۔قسم لے لیں۔۔۔آپ مجھے بے حیائی کے طعنے مت دیں۔۔۔میں نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی۔۔۔میرا جرم صرف اتنا ہے کہ آپ سے محبت کرنے کی گنہگار ہوں۔۔۔میرے جرم کو میری سر تو مت لگائیں۔۔۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"کتنا شرمسار تھا یہ شخص اسے۔۔۔اور اس شخص کو اپنے برے رویے کا احساس نہ تھا۔۔۔" شہباز حیدر نے بھینچے ہوئے چہرے کے ساتھ اس کے بازو سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔

"تو پھر بات اتنی آگے کیسے بڑھ گئی کہ امی میری رائے کو اہمیت دیے بغیر تم سے شادی کا فیصلہ سنا گئیں۔۔۔" غصہ کسی طرح بھی کم نہیں ہو پا رہا تھا۔

"مجھے کیا پتہ۔۔۔اپنی امی سے جا کر پوچھیں۔۔۔میں نے اگر ان سے ہی بات کرنا ہوتی تو اتنا عرصہ آپ کا یہ رویہ برداشت نہ کرتی۔۔۔" وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر شدت سے رو دی۔ اس کی ہچکی پر شہباز حیدر اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورے گیا۔

"تم کوئی بھی ڈرامے بازی کر لو۔۔۔جو مرضی کر لو۔۔۔میں متاثر ہونے والا نہیں ہوں۔۔۔جیت لوں گا تم سے اچھی طرح۔۔۔" شہباز حیدر نے اسے اچھی طرح دھمکیوں سے ڈرا دھمکا کر باہر کی راہ لی تو عیشہ نے ہاتھوں سے چہرہ اٹھا کر جلتے دروازے کو دیکھا، آنسو ایک دفعہ پھر اس کے رخساروں پر بہہ نکلے تھے۔

* * *

وہ اک شخص جو کم کم میسر ہے ہم کو
آرزو ہے کہ کسی روز وہ سارا مل جائے
اسے کہنا کہ ملاقات ادھوری تھی وہ
اسے کہنا کہ کبھی آ کے دوبارہ مل جائے

حیدر صاحب کو اپنی بیگم صاحبہ سے شہباز حیدر کے عیشہ کے لیے اعتراضات کا علم ہوا تو انہوں نے شہباز سے خود بات کی۔ شہباز حیدر جنہوں نے امی کے سامنے صاف انکار کر دیا تھا، باپ کے سامنے کچھ بھی نہ کہہ سکے۔ حیدر صاحب شہباز کے سامنے دنیا کی اونچ نیچ سمجھاتے رہے، رشتوں کی نزاکت و اہمیت باور کراتے رہے، شہباز نے لب بھینچے باپ کی سب باتیں سنیں۔

''تو پھر میں بھائی صاحب کو ہاں کہہ دوں۔۔'' ایک طویل لیکچر کے بعد انہوں نے بیٹے کے چہرے کا جائزہ لیا۔ شہباز نے گہری سانس لی۔

''اگر آپ کو لگتا ہے کہ آپ کا یہ فیصلہ درست ہے تو جو جی چاہے کریں۔۔'' ان کے اس انداز میں بھی ان کے دلی جذبات آشکار ہو گئے تھے۔ حیدر صاحب مسکرا دیے۔

''تمہیں فی الحال یہ مناسب نہیں لگ رہا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تم خود ہمارے اس فیصلے کو سراہو گے۔'' وہ اس کا کندھا تھپک کر چلے گئے تھے۔ شہباز حیدر نے لب بھینچ لیے۔

''عیشہ واحد۔۔'' کچھ سوچتے سوچتے انہوں نے سر جھٹکا۔ باپ کے سامنے وہ بہت کچھ کہہ سکتے تھے مگر عیشہ واحد کی پیش قدمیوں کو روکنے کیلئے انہیں صرف یہی حل سجھائی دیا تھا کہ فی الحال خاموشی اختیار کریں۔۔۔ جو ہو رہا ہے ہونے دیں۔ عیشہ واحد سے انہیں کوئی ذاتی پرخاش نہیں تھی مگر۔۔۔

اگلے دن دونوں کی باقاعدہ بات طے ہو جانے کی خبر پورے گھر میں پھیل چکی تھی۔ اوپر نیچے سب کو پتہ چل چکا تھا۔ عیشہ یونیورسٹی سے واپس لوٹی تو چچی نے پاس بٹھا کر خوب پیار کیا۔ عیشہ تو کتنی دیر تک ورطۂ حیرت میں غرق رہی۔ کل صبح کا شہباز حیدر کا رویہ اتنا آتش فشاں اور غضبناک تھا کہ وہ دہل گئی تھی، اور اب یہ ''ہاں'' وہ بے یقین تھی۔ پتھر اس کے لیے واقعی موم ہوا تھا یا پھر۔۔۔ خوب اس نے کھلی آنکھوں سے دیکھا تھا کیا وہ واقعی سچ ہو رہا تھا۔ مہوش کے کمرے میں پہنچی تو بھی بے یقین سی رہی۔

''مہوش چچی! یہ رشتے طے ہو گیا ہے۔۔ کیا واقعی۔۔۔ میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہی۔۔''

''یہ بالکل خواب نہیں ہے۔۔۔ رات ابو نے خود شہباز بھائی سے بات کی تھی، پھر نیچے آ کر تایا ابو وغیرہ سے بھی بات طے ہو گئی۔۔۔ اب تو باقاعدہ ہاں ہوئی ہے۔۔''

''مگر وہ شہباز۔۔۔ انہوں نے اعتراض تو کیا ہو گا۔۔''

''ہوں۔۔۔ بہت سے امی بتا رہی تھیں، مگر ابو کوں سا ان کے اعتراض ختم کرنے گئے تھے۔ انہیں بٹھا کر سمجھایا تھا۔۔۔ بس۔۔'' مہوش چچی کے اس جواب پر اس کے دل کے اندر خوف پیدا ہونے لگا۔

''اس کا مطلب ہے چھوٹے دادا جان نے انہیں مجبور کیا ہے۔''

''یہ تو مجھے نہیں پتا۔۔۔ البتہ صبح ناشتے پر منہ بڑا سنجیدہ بنایا ہوا تھا۔۔۔ میں نے چھیڑنا چاہا تو جھڑک دیا۔۔۔ پھر چائے پی کر چل گئے تھے۔۔۔ مگر تم کیوں فکر کرتی ہو۔۔ تھوڑا بہت غصہ تو وہ دکھائیں گے ہی۔۔۔ ابو وغیرہ کہہ رہے تھے کہ شہباز کو کوئی مجبوری نہیں شادی نہیں تو نکاح کی تقریب تو ضرور کریں گے۔۔۔ یوں سمجھو تم دونوں کو پکی بیڑیاں ڈالنے کا ارادہ ہے۔۔'' مہوش نے آنکھ ماری۔

مسکرا بھی نہ سکی۔ شہباز راضی نہ تھے، صرف والدین کی وجہ سے چپ تھے، اسے یقین ہو گیا تھا۔

* * *

رشتہ طے کیا ہوا، باقی سب کچھ آناً فاناً طے ہوتا چلا گیا۔ عبداللہ صاحب اور حیدر صاحب کی مشترکہ رائے کے مطابق منگنی کی جائے ڈائریکٹ نکاح کی تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ شہباز حیدر نے امی کو کافی روکا تھا، کہ بات طے ہو گئی ہے، کافی ہے، اس نکاح کی بھلا کیا ضرورت ہے۔ مگر وہ بھی سب پکے کام کرنے پر بضد تھے۔۔۔ کیا پتہ کب شہباز مکر جائے، بات طے ہونے کے بعد شہباز کا ایسا ہی رویہ تھا کہ سب کو ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ خوش نہیں ہیں۔ خاص طور پر عیشہ تو ہر وقت ہولتی رہتی تھی۔ اسے کھونا محال تھا اور پانا اس سے بھی زیادہ۔

نکاح کی تقریب خاصی پر رونق تھی، قیوم کی شادی کے بعد اس گھر میں کوئی پہلی خوشی دیکھنے کو مل رہی تھی، سو سبھی خوش تھے۔ شہباز حیدر کا انداز روکھا تھا۔ خاموش سنجیدہ اور کچھ ناراض سا۔۔۔ وہ اس سارے شور شرابے پر خوش نہ تھے۔ مہوش عیشہ کو پارلر لے گئی تھی، جب وہ لوٹیں تو سبھی مہمان آ چکے تھے۔ تقریب کا اہتمام تھا، سارا گھر سجا ہوا تھا۔ عیشہ نکاح کے گولڈن عیروں شرارے میں بھاری جیولری کے ساتھ عام حلیے کے برعکس کوئی اور ہی چیز لگ رہی تھی۔ امی اور مہوش نے خصوصی بنائے گئے اسٹیج پر بٹھایا تھا۔ عیشہ سادے حلیے میں دکھائی دینے والی عیشہ واحد آج پورے ہی برقی نگاہ کو خیرہ کر رہی تھی۔ وہ بہت کنفیوز ہو رہی تھی، دل کی دھڑکن کا تو کوئی جواب ہی نہ تھا، اس نے اپنی بہن شہلا کو مسلسل اپنے پاس بٹھائے رکھا۔ شہلا واحد کی دوسری بیوی کی اولاد تھی، اور ابھی اسکول اسٹوڈنٹ تھی۔ نکاح کی تقریب کے بعد کھانے پینے کا سلسلہ چل رہا تھا۔ نکاح سے پہلے تک وہ مسلسل خوفزدہ تھی، نکاح کے بعد ایک دم پرسکون و مطمئن ہو گئی۔ شہباز حیدر اب اس کا تھا، مکمل طور پر اس کا۔ یہ ایسی خوشی تھی کہ جس کی اس نے راتوں کو جاگ جاگ کر اپنے رب سے پوری ہونے کی دعا مانگی تھی، اور آج رب نے اس کی دعا سن لی تھی۔ شہباز حیدر کو کھو دینے کا احساس بہت پیچھے رہ گیا تھا۔

''اسلام علیکم! کیسی ہیں عیشہ۔۔'' وہ اسٹیج پر بیٹھی اپنی سوچوں میں گم تھی جب اس آواز پر ایک دم چونک کر دیکھا، اس کے سامنے محسن جاوید کھڑا تھا۔

''آپ۔۔'' وہ حیران ہوئی۔

''جی۔۔'' وہ مسکرایا۔ ''بہت بہت مبارک ہو، یہ یقیناً شہباز بھائی ہی تھے جن کے لیے آپ نے انکار کیا تھا۔'' وہ مسکرا کر کہہ رہا تھا۔ عیشہ نے گھبرا کر اپنے ساتھ بیٹھی شہلا کو دیکھا، جو محسن جاوید کو دیکھ رہی تھی دلچسپی سے۔۔۔ محسن جاوید کی پوری فیملی اس تقریب میں انوائیٹڈ تھی، دادا جان کے جاوید صاحب سے تعلقات جوں کے توں تھے، اس تقریب میں محسن جاوید کو دیکھ کر حیران ضرور ہوئی تھی مگر شہلا کیوں گھبرا گئی تھی۔

''بہت لکی ہیں شہباز بھائی۔۔'' وہ مزید کہہ رہا تھا۔

''ویسے آپ کی تعریف۔۔۔؟'' وہ اب شہلا کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

''شہلا واحد۔۔'' اس نے مسکرا کر اپنا نام بتایا تھا۔

''اوہ۔۔ یعنی کہ واحد بھائی کی بیٹی۔۔'' اس نے عیشہ کو دیکھا تو اس نے سر ہلایا۔

''میں ذرا امی کے پاس چکر لگا لوں، پھر آتی ہوں۔۔'' اگلے ہی لمحے وہ اٹھ کر چلی گئی تھی۔

''آپ نے مجھ سے انکار کرتے ہوئے جھوٹ بولا تھا، آپ کی کسی سے کمٹمنٹ نہیں تھی۔۔'' محسن جاوید کی نظریں شہلا کے

تعاقب میں تھیں جب عیشہ کی اس دھیمی آواز پر متوجہ ہوا۔

''آپ کو کس نے کہا۔۔۔؟'' دھیان سے پوچھا۔

''فوران کے پاپا نے۔۔۔''

''مائی گاڈ۔۔۔ کتنا نیچرل انداز ہے۔۔۔''

''سچ سچ بتائیں عیشہ' آپ تو کہہ رہی تھیں کہ یکطرفہ محبت ہے مگر شہباز بھائی نے میرے انکار سے متعلق درست خبر آپ کو کیسے دے دی۔۔۔'' وہ جھینپ گئی تھی۔

''یہ اب بھی یکطرفہ محبت ہے۔۔۔ بس گھر والوں کا تعاون تھا کہ آج یہ تقریب رونما ہو گئی ہے ورنہ ''ان'' سے تو کوئی امید نہیں۔''

شہباز، مہوش اور قیوم کے بعد یہ چوتھا شخص تھا جو اس کے دل کا راز پا گیا تھا۔ اس کا بے تکلف انداز عیشہ کو اچھا لگا تھا اور دوستانہ انداز میں اس نے بھی بتا دیا۔

''ویسے شہباز بھائی چاہتے تو ہیں۔۔۔'' وہ پوچھ رہا تھا، اس نے گردن ہلا دی۔

''مگر ابھی کہہ نہیں پائے۔۔۔'' اس کی آواز بکھر گئی، وہ ہنس دیا۔

''تو فکر کیوں کرتی ہیں جو اتنا مضبوط تعلق بن گیا ہے دونوں میں۔۔۔ وقت کے ساتھ ساتھ مان جائیں گے۔'' اس نے اسے دلاسا دیا تو وہ مسکرا دی۔

''ویسے عیشہ! آپ کی بہن بھی آپ کی طرح بہت ہی پیاری ہیں۔۔۔ کیا خیال ہے۔۔۔؟'' اس کی اس بات پر اس نے چونک کر اسے دیکھا۔

''کیا مطلب۔۔۔؟''

''آپ کیسے انکار پر ابھی تک مجھ سے ناراض ہیں۔۔۔ شہلا کو دیکھنے کے بعد سوچ رہا ہوں کہ کیوں نہ اسی لڑکی کو منتخب کروں۔۔۔ آخر کو رشتے گر والدین ہی کرتے ہیں۔۔۔'' عیشہ نے بے حد انبساط و حیرت سے دیکھا۔

''واقعی۔'' اس نے پوچھا تو اس نے فوراً سر ہلا دیا تھا۔ وہ پھر دو تین باتیں کر کے نیچے اتر گیا تھا، کھانے کے بعد فوٹو گرافی کا سلسلہ چل نکلا تھا، شہباز حیدر کو قیوم حیدر نے زبردستی عیشہ کے ساتھ لا بٹھایا تھا۔ وہ جد صاحب کا بیٹا دونوں کے مختلف پوز لینے لگا تھا۔

''چاچو پلیز! چہرے پر اسمائل لائیں۔۔۔ یوں لگ رہا ہے جیسے آپ کو زبردستی بٹھایا گیا ہے مار کر۔۔۔'' وہ چھیڑ رہا تھا شہباز حیدر کے چہرے کے سنجیدہ زاویوں میں مطلق فرق نہیں آیا تھا۔

''جیٹھ صاحب! اب ایسی بھی کیا سنجیدگی، اتنی چاند سی پیاری دلہن آپ کو دے رہے ہیں مگر مجال ہے چہرے کے تاثرات بدل جائیں۔۔۔'' مہوش بھی سنجیدہ شکل پر تبصرہ کرنے سے باز نہیں آئی تھی، عیشہ کا دل تو شہباز کی قربت پر تمام دیواریں توڑ کر باہر آنے کو تھا۔ فوٹو گرافی کے بعد سلامی اور تحائف کا سلسلہ چل تھا، رات کے بارہ بجے کے نزدیک تقریب اختتام کو پہنچی تھی، عیشہ کا ایک ہی زاویے سے بیٹھ کر برا حال ہو رہا تھا، کمر تختہ بن چکی تھی، مہوش اسے سہارا دے کر کمرے میں لے آئی۔

''سنو اب کچھ نہیں اتارنا، میں آتی ہوں، شہباز بھائی بلا رہے تھے، ان کی بات سن لوں۔۔۔'' وہ اسے بٹھا کر چلی گئی تھی۔ شہباز کے نام پر دل کی دھڑکن بڑی نرالی تھی، وہ خود ہی محجوب سی ہنس دی۔

''اور کتنی نفرت کریں گے مجھ سے آپ۔۔۔ میرے بن چکے ہیں۔۔۔ ایک دفعہ آپ کی زندگی میں آ جاؤں پھر ساری نفرت دور کر دوں گی۔۔۔ صرف ایک دفعہ۔۔۔'' اپنے خیال پر وہ خود ہی شرما گئی۔۔۔ بیڈ کی پشت سے سر ٹکا کر اس نے کمر بھی تکیوں سے ٹکا کر پاؤں سیدھے کیے۔ مہوش اسے بٹھا کر خود پتہ نہیں کہاں گم ہو گئی تھی، اس نے خاموشی سے آنکھیں موند لیں۔ تھوڑی دیر بعد دروازے کے کھٹکے کی آواز پر وہ متوجہ ہوئی۔

''مہوش چچی کہاں رہ گئی تھیں آپ۔۔۔ مجھے کپڑے بدلنے تھے۔۔۔ تھکن سے برا حال ہو رہا ہے میرا۔۔۔'' آنکھیں کھولے بغیر وہ کہہ رہی تھی، مگر دوسری طرف سے کوئی جواب نہ ملنے پر اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دی تھیں۔

''آپ۔۔۔؟'' شہباز حیدر کو اپنے سامنے کھڑے خاموشی سے دیکھتے پا کر وہ فوراً سیدھی ہوئی تھی۔

''مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔۔۔'' اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے وہ اندر چلے آئے تھے۔ عیشہ کے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا، حیرت سے شہباز حیدر کے تیاگی سنجیدہ چہرے کو دیکھے گئی۔ وہ بستر پر بیٹھے تو اس نے تیزی سے ٹانگیں سمیٹیں، پھر چہرہ بھی حیا و شرم ایک دم درمیان میں آ ٹھہری۔

''میں اب تک سمجھ رہا تھا کہ تمہاری دیوانگی ایک وقتی جذباتیت ہے، اسی لیے میرا خیال تھا کہ میرے تلخ رویے، ذلت پھٹکارے تمہیں عقل آ جائے گی مگر۔۔۔'' ان کی بات عیشہ کو کچھ بے ربط سی لگی تھی، وہی سپاٹ سنجیدہ لہجہ۔

''یہ رشتہ بظاہر جتنا مضبوط ہے اتنا ہی کمزور ہے۔۔۔ میں تمہیں واضح طور پر بتا دوں کہ تم اس قدر سنجیدگی سے اس معاملے میں انوالو ہو تے۔ ہمارا نکاح میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتا، یہی بات میں تمہیں باور کروانا چاہتا ہوں، مجھ سے تم کسی بھی قسم کی توقعات وابستہ مت کرنا۔۔۔ فوزان کے لیے تم میری زندگی میں داخل ہونا چاہتی تھیں، میرے گھر والوں کا بھی یہی موقف ہے، اسی لیے تم آج سے فوزان کے لیے ہی مخصوص ہو۔۔۔ رہ گئی بات رخصتی کی تو مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔۔۔ تم نے جس طرح قیوم اور مہوش کو اپنے ساتھ ملا کر یہ سارا ڈرامہ اسٹیج کیا ہے، میرے دل میں تمہارے لیے جو تھوڑی بہت عزت احترام تھا وہ بھی ختم ہو گئی ہے۔ تمہارے نزدیک رخصتی کی بات کوئی اہمیت رکھتی ہو مگر میرے لیے تم کل بھی کچھ نہیں تھی، آج بھی کچھ نہیں ہو، نہ ہی کل کچھ ہو گی۔'' تلخی سے کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ عیشہ جیسے پتھر ہو گئی تھی، کیا محبت کرنا واقعی جرم ہے۔۔۔ کیا اس نے شہباز حیدر سے محبت کر کے واقعی کوئی جرم کیا تھا۔ وہ بالکل ساکت تھی۔

''میں اب تک سمجھ رہا تھا کہ تم بچی ہو۔۔۔ اس عمر میں دل کے تقاضے انسان کو بری طرح خوار کرتے ہیں۔۔۔ میں شاید تمہاری کم عمری کا ایڈوانٹیج دے کر تمہاری طرف مائل ہو ہی جاتا اگر مجھے یہ سب علم نہ ہوتا کہ یہ سب کیا دھرا مہوش اور قیوم کا ہے، جو تمہارے لیے کر رہے ہیں۔۔۔'' اپنے کمرے میں بیٹھے وہ دونوں خود سے باتیں کر رہے تھے لیکن جس طرح وہ میرا ذکر کر رہے تھے تمہارے معاملے میں مجھے انوالو کر رہے تھے تو میرا دل چاہ رہا تھا کہ اسی وقت تمہیں شوٹ کرا دوں۔۔۔'' اپنے کردار کے معاملے میں وہ انتہائی جذباتی تھے، اب بھی ایک دم غصے سے کہا تو عیشہ جیسے ہوش میں آئی۔ لرز کر رہ گئی، ان کی آنکھیں۔۔۔ وہ تو دیکھ بھی نہ پائی۔

''دریشہ کے بعد تو میں نے کبھی کسی اور جانب نگاہ ہی نہ کی تھی، پھر بھلا تم جیسی کم عمر امیچور لاابالی سی لڑکی کو کیسے اپنی طرف انوالو کر لیتا۔۔۔ میں نے تو ہر ممکن کوشش کی تھی کہ تم جو حماقت سرانجام دینا چاہتی ہو باز آ جاؤ مگر۔۔۔'' وہ سخت اضطراب کا شکار تھے، کمرے میں ٹہلنے لگے۔

''مہوش اور قیوم کے سامنے تم نے میرے متعلق کیا کہا تھا جو دونوں کہہ رہے تھے کہ شہباز بھائی آخر کب تک انکار کر سکتے ہیں۔۔۔ عیشہ جیسی لڑکی تو بڑے بڑوں کی سدھ بدھ کھو دیتی ہے، اگر وہ انوالو نہ ہوتے تو اتنی جلدی ہتھیار کیسے ڈال دیتے۔۔۔ مجھے تو لگتا ہے کہ شہباز بھائی کا ہی کوئی طرز عمل عیشہ کو اس حد تک لے جانے کا سبب بنا ہے۔۔۔ بولو۔۔۔ کیوں انہوں نے یہ بات کی۔۔۔ بولو جواب دو۔۔۔'' وہ تو خود گنگ تھی، وہ کیا جواب دیتی، شہباز کا یہ سب الفاظ دہراتے غصے سے برا حال ہو رہا تھا، انہوں نے ہمیشہ ایسی

زندگی گزاری تھی جو ہر طرح کے الزام سے پاک تھی، مگر عیشہ کے معاملے میں مہوش کی زبانی گفتگو سن کر اس کو سخت دھچکا لگا تھا۔

"مجھے نہیں پتا انہوں نے ایسا کیوں کہا۔۔۔ یقین کریں۔۔۔ میں نہیں جانتی۔۔۔" شہباز سے تو وہ پہلے ہی خائف رہتی تھی، اب اس کا غصہ دیکھ کر مزید ڈر گئی، شہباز نے شعلہ بار نگاہوں سے اسے دیکھا۔ گولڈن مہرون شرارے میں وہ جیولری پہنے لائٹ میک اپ میں ایک ایسی جیتی جاگتی قیامت لگ رہی تھی، شہباز حیدر نے سختی سے اپنے خیال کو جھٹک دیا۔ ایک نفرت کی نگاہ اس پر ڈالی۔

"انہیں تمہارے متعلق یہ سب کیسے علم ہوا۔۔۔؟" سختی سے بازپرس کی گئی تھی، وہ ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔

"اس رات جب۔۔۔" وہ آہستگی سے سب بتاتی گئی، وہ خشمگیں نظروں سے سب سنتے رہے۔

"میں نے جان بوجھ کر کچھ نہیں بتایا تھا، اس کے بعد جو بھی ہوا مہوش چچی نے ہی کیا تھا۔۔۔ دادی جان اور چچی جان سے بھی شاید انہوں نے ہی بات کی تھی۔۔۔" سر جھکائے وہ اعتراف جرم کر رہی تھی۔

"دیکھ لیا اپنی کم عقلی کا نتیجہ۔۔۔ تمہاری ذرا سی لرزش لوگوں کو بجائے کس انداز میں سوچنے کا موقع دے رہی ہے۔ تمہیں شاید کوئی فرق نہ پڑے گا مگر مجھے اپنے کردار کی بڑی پروا ہے۔۔۔ جو ہو گیا وہ تو ایک طرف۔۔۔ آئندہ تمہاری طرف سے مجھے کچھ بھی الٹا سیدھا سننے کو ملا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔۔۔" وہ غصے سے کہہ کر دروازہ دھڑاک سے بند کر کے چلے گئے تھے۔ ان کے جانے کے بعد عیشہ کا کب کا رکا ہوا سانس بحال ہوا۔ "مہوش چچی نے ایسی بات کیوں کی۔۔۔ کیا وہ نہیں جانتیں کہ یہ میرے یکطرفہ جذبات تھے، شہباز کا تو اس سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔۔۔ مگر ان کے لیے اس نے کتنی راتیں جاگ کر دعائیں مانگی تھیں اور آج یہ رات نصیب میں آئی بھی تھی، تو دسمبر کے لمحوں میں ہی شہباز کے چہرے پر نفرت کے سائے ڈال دیے گئے تھے۔۔۔ ابھی سے تنا غصے والا انداز ہے۔۔۔ بعد میں پتہ نہیں کیا ہوگا۔۔۔" اب وہ مستقبل کے خوف سے ہلکان ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔

اگلے دن صبح ہوتے ہی وہ مہوش کے پاس جا پہنچی تھی، ان سے شہباز کا رویہ بتا کر اس طرح گفتگو کا سبب پوچھا تو وہ ہنستی چلی گئیں۔

"احمق ہو تم بھی اور تمہارے وہ صاحب بھی۔۔۔ کل صبح اچانک وہ ہمارے کمرے کے پاس سے گزرے تو مجھے شرارت سوجھی تھی، میں نے فوراً بات پلٹ کر ایسا کہنا شروع کر دیا تھا۔ مجھے پتہ تھا کہ وہ سن رہے ہیں جان بوجھ کر ایسی باتیں کی تھیں، صرف ان کو یہ باور کروانے کے لیے کہ اگر وہ اس طرح چپ رہ کر اپنی ناپسندیدگی اور ناراضگی کا اظہار کر رہے ہیں تو ہم بھی بے خبر نہیں اور انہوں نے اس مذاق کو اپنے انداز میں لے لیا۔۔۔ اوہ مائی گاڈ۔۔۔" وہ ہنس دی تھیں، عیشہ خاموشی سے دیکھے گئی۔

"مجھے پتہ نہیں تھا وہ اتنے احمق بلکہ بیوقوف ثابت ہوں گے، بجائے ہمارے اس تعاون پر ہمارا شکریہ ادا کرنے کے وہ نئی جنگ چھیڑ کر بیٹھ چکے ہیں۔۔۔ کردار پر جب بات آتی ہے تو سب کو ہی غصہ لگتا ہے۔۔۔ یہی بات میں تمہارے حوالے سے انہیں بتانا چاہتی تھی مگر الٹی پڑ گئی ہے۔"

"پھر بھی آپ کو یہ نہیں کہنا چاہیے تھا۔۔۔ وہ اتنے غصے ہو رہے تھے مجھ پر کہ حد نہیں۔۔۔ نجانے کیا کچھ سخت سست کہتے رہے۔۔۔" رات کی باتیں یاد آتے پھر سے آنکھیں بھر گئیں۔

"اوہو۔۔۔ رونا نہیں۔۔۔ میں خود بھائی صاحب سے بات کر کے معاملہ جکڑ لوں گی۔۔۔ تھوڑی بہت ان کی بھی برین واشنگ ہونے کی ضرورت ہے۔۔۔ دیکھو کیا کرتی ہوں، تم اب آرام سے رہو۔۔۔ نکاح ہو چکا ہے دونوں کا، کچھ نہیں کہیں گے وہ۔۔۔" انہوں نے اسے پھر سے بہلا لیا تھا۔ مہوش نے شہباز سے بھی بات کی تھی، اس کا کیا ردعمل تھا، عیشہ کو کچھ پتہ نہیں تھا۔ دو دن بعد وہ

یونیورسٹی جانے کو تیار ہو کر کمرے سے نکلی تو شہباز ٹیبل پر بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے، نکاح کے بعد پہلا تصادم تھا، اس رات کے بعد تو وہ ان کے سامنے آنے سے بھی ڈرنے لگی تھی، انہوں نے سرسری نظر ڈالی تھی۔ چچی امی نے اس کی بلائیں لیں، پھر ناشتہ اس کے سامنے رکھ دیا۔ شہباز کے سامنے والی کرسی پر بیٹھے وہ خاموشی سے ناشتہ کر رہی تھی، جب شہباز ٹشو پیپر سے ہاتھ صاف کرتے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"شہباز بیٹا! آج سے عیشہ کو تم یونیورسٹی چھوڑ کر آیا کرو گے۔۔۔ خیر سے یہ تمہاری ذمہ داری ہے، یہ اکیلی کیوں آیا جایا کرے۔۔۔" عیشہ نے حیران ہو کر چچی امی کو دیکھا، شہباز نے اس حکم پر ناگواری سے اسے دیکھا تھا، وہ فوراً سر جھکا گئی۔ وہ ہمیشہ اکیلی یونیورسٹی کی بس میں ہی آتی جاتی تھی مگر آج۔۔۔

"مجھے دیر ہو رہی ہے۔۔۔" اس وقت کچن میں ان تینوں کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا، اسی لیے شہباز حیدر نے اپنی ناگواری نہیں چھپائی تھی۔

"شہباز۔۔۔" انہوں نے سختی سے ٹوکا تو عیشہ نے گھبرا کر دیکھا۔

"رہنے دیں چچی۔۔۔ میں چلی جاؤں گی۔۔۔ اور خود ہی تو جاتی ہوں، میری یونیورسٹی روٹ کی بس ہمارے روٹ سے ہی گزرتی ہے۔۔۔" شہباز حیدر کے تیوروں سے خائف ہو کر اس نے فوراً مداخلت کی تھی۔

"پہلے کی بات اور تھی۔۔۔ جب گھر میں شوہر کی گاڑی کی سہولت موجود ہے تو پھر تم کیوں بسوں، ویگنوں میں خوار ہو۔۔۔ ویسے بھی اب تم شہباز کی ذمہ داری ہو۔۔۔" اس نے کن انکھیوں سے شہباز کے چہرے سے تاثرات کی ناگواری جانچی۔

"میں گاڑی نکال رہا ہوں۔۔۔" ماں کی بات کے جواب میں غصے سے کہتے وہ باہر نکل گئے تھے، عیشہ نے بے چارگی سے چچی کو دیکھا۔

"انہیں کوئی کام ہوگا۔۔۔ رہنے دیں۔۔۔" وہ خود بھی شہباز کے ساتھ نہیں جانا چاہتی تھی مگر کہتی کسے۔۔۔

"کچھ نہیں ہوگا۔۔۔ اپنے کام پر جاتے تمہیں بھی چھوڑ دے گا۔۔۔ تو قیامت نہیں آ جائے گی۔۔۔" شہباز حیدر کے تیور وہ بھی اچھی طرح سمجھ رہی تھیں، اسی لیے تو انہوں نے یہ نیا حکم نامہ نافذ کیا تھا۔ ڈرتے ڈرتے قدموں سے باہر آئی تو وہ منتظر تھے گاڑی میں بیٹھتے ہی انہوں نے تیزی سے گاڑی اسٹارٹ کی تھی، عیشہ ان کے بگڑے تیور دیکھ کر ہولتی رہی۔

"آج کے امی کے اس نئے حکم نامے کا میں کیا مطلب سمجھوں۔۔۔؟" سرخ سگنل پر گاڑی رکی تھی، جب نہایت تلخ آواز میں پوچھا گیا تھا۔

"جی۔۔۔" وہ کچھ نہیں سمجھی تھی۔

"دیکھو عیشہ۔۔۔ میں تمہاری اپنی زندگی میں اس حد تک بے جا مداخلت قطعی برداشت نہیں کروں گا۔۔۔ انسان کی برداشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔۔۔ میں تمہیں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میرے ساتھ یہ سب نہیں چلے گا۔۔۔ گھر والوں کی وجہ سے تمہیں فی الحال برداشت کرنے پر مجبور ہوں، تو میری اس مجبوری کو میری زندگی کا امتحان مت بناؤ۔۔۔ ورنہ پچھتاؤ گی۔۔۔" انتہائی سخت لہجے میں دنیا بھر کی بیزاری لیے انہوں نے اندر کی ساری تلخی اس پر انڈیلی تھی۔

"میں نے چچی جان کو منع کیا تھا۔۔۔" اپنی اس قدر عزت افزائی پر پہلے تو وہ ہکا بکا رہ گئی، پھر بمشکل کہا بھی تو آنسو پہلے امڈ آئے۔ ہر بار یہ شخص اسے رلا دیتا تھا۔ سگنل کھلنے پر شہباز نے گاڑی آگے بڑھا دی تھی، عیشہ کو تسلسل سے آنسو بہاتے دیکھ کر وہ الجھے۔

"کیا لوگی چپ ہونے کا۔۔۔" سرد آواز پر اس کے آنسو بھی ٹھہر گئے۔

"کیا مصیبت ہے۔۔۔ زندگی عذاب ہو کر رہ گئی ہے۔۔۔" وہ اب خود سے بڑبڑا رہا تھا، عیشہ کا دل پھر بھر آیا، پھر ہاتھوں

میں چہرہ چھپا کر رو دی۔ یہ بھی زندگی کا کیسا ساتھی تھا، پتھر۔۔۔ سنگدل۔۔۔ کٹھور۔۔۔

"عیشہ۔۔۔" بے چارگی سے ایک طرف گاڑی روک کر اس کی طرف رخ کیا، انداز ایسا تھا کہ جیسے ایک پل میں اسے کہیں غائب کر دیں گے۔۔۔ یا پھر۔۔۔" وہ اس وقت ضبط کی انتہا پر تھے۔

"مجھے نہیں جانا آپ کے ساتھ کہیں۔۔۔ بس اتار دیں یہیں۔۔۔ چلی جاؤں گی میں خود ہی۔۔۔" اگلے ہی پل دوپٹے سے چہرہ صاف کرتے اس نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھولا تھا، اس سے پہلے کہ وہ نیچے اترتی، شہباز حیدر نے بھنا کر غصے سے اس کا ہاتھ جھٹک کر دوبارہ سے دروازہ بند کر کے لاک کیا تھا۔

"بکواس نہیں کرو۔۔۔ آرام سے بیٹھی رہو۔۔۔" غصے سے گھورتے وارن کیا گیا تھا۔

"کیوں۔۔۔ جب آپ کو میرا وجود اتنا ہی ناگوار گزر رہا ہے تو جانے دیں۔۔۔ آپ کون ہوتے ہیں مجھے روکنے والے نہیں جاؤں گی میں آپ کے ساتھ کہیں۔۔۔ دروازہ کھولیں۔۔۔" اپنی اس درجہ ہتک آمیزی و عزت افزائی پر وہ بھی چیخ اٹھی تھی، غصے سے روتے ہوئے شہباز حیدر کو دیکھا، جو لب بھینچے سڑک کے اوپر نظریں جمائے ہوئے تھے۔

"اس رات کتنی بری طرح بے عزت کر دیا تھا کہ میرا کوئی قصور بھی نہ تھا۔ مہوش چچی کا مذاق میرے گلے پڑا اور اب آپ کی ممی نے آپ کو کہا تھا میں نے نہیں... میں آپ کے پاؤں نہیں پڑی تھی کہ مجھے بھی ساتھ لے کر جائیں۔۔۔ آپ نے فوزان کی وجہ سے یا کسی کے کہنے پر مجھے برداشت کیا ہے تو ہر بار جتانے کی ضرورت نہیں۔۔۔ میں یہ بھی طرح جانتی ہوں، پتھر ہیں آپ۔۔۔ سمجھتی تھی کہ پتھر کے سینے میں بھی دل ہوتا ہے مگر آپ تو۔۔۔" وہ بری طرح شدت سے رو دی۔

"دروازہ کھولیں۔۔۔ میں چلی جاؤں گی، روپے پیسے کے علاوہ تو میری ہر ذمہ داری میرے باپ نے نہیں سنبھالی آپ کیا سنبھالیں گے۔۔۔ پلیز دروازہ کھولیں۔۔۔ یہ احسان نہیں کریں مجھ پہ۔" غصے، بے بسی، جذباتیت کا بہاؤ ذرا تو بالکل چپ ہو گئی، مگر آنسو نہ رکے۔ اس کی عزت نفس پر یہ گہری چوٹ لگی تھی، جو تکلیف بھی شدید تھی۔ شہباز حیدر نے خاموشی سے دوبارہ گاڑی اسٹارٹ کی وہ دوپٹے سے چہرہ صاف کرتے، کبھی کبھی رو رہی تھی، اور پھر مسلسل روتی رہی۔ حتیٰ کہ شہباز نے اس کی یونیورسٹی کیمپس کے سامنے گاڑی روک دی تھی۔ وہ اترنے لگی، مگر دروازہ لاک تھا، رخ موڑ کر شہباز کو دیکھا۔

"چہرہ صاف کر لو اپنا۔۔۔" اسی سخت، بے لچک انداز میں کہا گیا تھا، اور ساتھ ہی آگے بڑھ کر دروازہ ان لاک کیا تھا۔

"بے فکر رہیں، میرے رونے سے آپ کے کردار پر کوئی بات نہیں آئے گی۔۔۔" اسی تلخی سے اس نے جواب دیا۔

"عیشہ۔۔۔" شہباز نے بری طرح ٹوک دیا۔ عیشہ جواباً پرواہ کیے بغیر سر جھٹک کر گاڑی سے اتر گئی تھی۔

* * *

شہباز حیدر کے لیے عیشہ کی موجودگی ناقابل برداشت تھی تو عیشہ نے بھی خود کو اتنا مضبوط کر لیا کہ شہباز حیدر کا ہونا یا نہ ہونا اس کے لیے ایک برابر رہ گیا۔ وہ اس سے محبت ضرور کرتی تھی، دونوں کے درمیان ایک مضبوط تعلق تھا، سو وہ مطمئن تھی، اور یہی اطمینان اس دن کے بعد جب شہباز کی گاڑی میں تھی کے بعد اس کے ہر انداز سے چھلکنے لگا تھا، اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اب شہباز حیدر کو بھی اس درجہ تذلیل کرنے کا موقع نہیں دے گی۔ اس نے بھی خود کو جان بوجھ کر بے حسی کی چادر اوڑھا دی تھی، فوزان کی ذمہ داری وہ اب بھی پوری خوش اسلوبی سے نبھاتی تھی، مگر شہباز حیدر کے سلسلے میں اس نے مکمل لاتعلقی اختیار کر لی تھی، ایک گھر میں رہتے ہوئے سب کی موجودگی میں یہ ممکن تو نہ تھا مگر شہباز حیدر کے سلسلے میں اس نے یہ ممکن کر لیا تھا۔

محسن جاوید کا رشتہ شہلا واجد کے لیے آیا تھا، ویسے تو یہ سب کے لیے حیرت کی بات تھی مگر عیشہ کو شاید اس رشتے کی امید تھی

تو پھر بڑوں میں یہ رشتہ فائنل ہو گیا تھا۔ دونوں طرف سے باقاعدہ منگنی کا ارادہ تھا، منگنی کے دنوں میں وہ فوزان سمیت واجد صاحب کے ہاں چلی آئی تھی، یونیورسٹی سے ادھر چلی جاتی تھی، فوزان بھی پابندی سے اسکول جا رہا تھا، منگنی کی تقریب تین دن بعد تھی، ہفتہ ہو گیا تھا سے یہاں آئے ہوئے۔ آج کل اس کے بہت ضروری پریکٹیکل ہو رہے تھے، اس لیے روز یونیورسٹی آنا پڑ رہا تھا۔ آج بھی اسی سلسلے میں وہ آئی تھی، سارا دن مصروف گزرا تھا، تین بجے کے قریب وہ فارغ ہوئی تھی۔ شہلا کو آج شاپنگ کے لیے جانا تھا، اس نے جلدی آنے کو کہا تھا، وہ تیز تیز قدم اٹھاتے گیٹ سے باہر نکلی تھی، مگر اپنے سامنے کھڑی سیاہ گاڑی کو دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی۔ بڑے ریلیکس موڈ میں گاڑی سے ٹیک لگائے، سن گلاسز لگائے شہباز حیدر منتظر تھے، جبکہ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر نظر آتے شہلا اور فوزان کے چہرے۔۔۔

"آپ۔۔۔" پورے ایک ہفتے بعد دیکھ رہی تھی، سو وہ بھی یہاں۔۔۔ حیرت بجا تھی۔

"اسلام علیکم۔۔۔" اسے ایک اور جھٹکا لگا، خود دیکھا یہ شخص اس پر سلامتی بھیجتا تو دور کی بات نفرت کی نظر ڈالتے ہوئے بھی ہزار بار سوچتا تھا، وہ خاموشی سے سر ہلا گئی۔ شہلا نے بھی اسے دیکھ کر گاڑی کا شیشہ نیچے کیا۔

"آپ کے انتظار سے گھبرا کر میں آپ کو لینے آ گئی ہوں۔۔۔ شہباز بھائی یونہی آئے تھے، میں نے چلنے کو کہا تو چلے آئے۔ اب فٹافٹ بیٹھیں، پہلے ہی بڑی دیر ہو چکی ہے۔۔۔" شہلا کی بات پر اس نے ایک گہری سانس لی، ورنہ شہباز حیدر کی غیر متوقع آمد پر سہانے دل خوش فہمیوں کے کن سمندروں میں ڈوبنے لگا تھا، وہ مسکرا کر وہ آگے بڑھی، فرنٹ ڈور کھلا ہوا تھا، وہ خاموشی سے بیٹھ گئی۔

"فوزان۔۔۔ آپ اسکول سے کب آئے۔۔۔ [illegible]۔۔۔" پچھلی طرف رخ کر کے اس نے فوزان سے پوچھا تھا۔

"یہ ایک بجے ہی آ گیا تھا، دادا جان عدیل وغیرہ کو لینے گئے تو ان کے ساتھ چلا گیا تھا، دو بجے کے قریب شہباز بھائی اسے ہی چھوڑنے آئے تھے، کہہ رہے تھے کہ آپ کے پاس آنے کی ضد کر رہا تھا۔" شہلا نے جواب دیا تھا۔

"کھانا کھایا تھا۔۔۔؟"

"دادا نے کھلا دیا تھا۔۔۔ پھر پاپا نے آئس کریم کھلائی تھی۔۔۔ ماما میں آگے آ جاؤں۔۔۔؟" اس کے مسکرا کر سر ہلانے پر وہ سیٹ کی بیک سے جگہ بنا کر، پھسل کر آگے آ گیا تھا، اس کی جھولی میں بیٹھ کر بتانے لگا۔

"ماما۔۔۔ پاپا نے پرامس کیا ہے کہ وہ آج مجھے شاپنگ سے اچھے اچھے کپڑے لے کر دیں گے۔۔۔ کھلونے بھی اور بڑا سا جہاز بھی۔۔۔" فوزان کے چہرے کی خوشی دیکھنے کے قابل تھی، وہ مسکرا دی۔

"پاپا، ماما کے بھی اچھے اچھے کپڑے لیں گے اور آپ کے بھی۔۔۔" اس کے مسکرانے پر وہ فوراً گاڑی ڈرائیو کرتے شہباز کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ عیشہ نے فوراً رخ بدل لیا، باہر دیکھنے لگی، اس دن کے بعد اس نے اس شخص سے بات کرنا چھوڑ دیا تھا۔

"ہوں۔۔۔" شہباز نے بیٹے کے جواب میں کہا تھا۔

"ماما۔۔۔ آپ کیسے کپڑے لیں گی۔۔۔؟ بالکل ویسے لیجئے گا جیسے آپ نے اس دن پہنے تھے جب آپ دلہن بنی تھی نا۔۔۔ پاپا ہم ماما کے دلہن والے کپڑے لیں گے۔۔۔ ہیں نا۔۔۔؟" وہ شہباز کے ساتھ ساتھ اس کا بھی سر کھا رہا تھا۔ عیشہ ایک دم خفت سے دوچار ہوئی۔

"فوزی چپ کر کے بیٹھو۔۔۔" اس نے ٹوک دیا۔ "بڑی باتیں کرنی آ گئی ہیں تمہیں۔۔۔" شہباز حیدر نے رخ موڑ کر اسے دیکھا، سرخ خفت سے دوچار چہرے پر بے بسی کے آثار تھے۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھی شہلا، عیشہ کے فوزان کو ڈانٹنے پر ہنس دی۔

''بھلا بچے بچارے کو کیوں ڈانٹ رہی ہو۔۔اس میں اس کا کیا قصور۔۔؟''

''بڑا تیز ہوتا جا رہا ہے یہ۔۔'' منہ بسورتے فوزان کو دیکھ کر اس نے اپنی خفت مٹائی تھی، ہلکی سی چپت لگائی تھی، اس کا منہ پھول گیا۔

''مجھے نہیں بیٹھنا آپ کے پاس۔۔گندی ہیں۔۔ڈانٹتی ہیں، پاپا! ماما گندی ہیں۔۔'' فوزان کو ڈانٹ کا بڑا رنج تھا، فوراً واک آؤٹ کر جاتا تھا، اب بھی عیشہ کے ڈانٹنے پر برے برے منہ بناتا اس کی گود سے نکل کر شہباز کی گود میں جا بیٹھا تھا۔ شہباز نے گاڑی ڈرائیو کرتے اس کے گرد بازو لپیٹ کر سیدھا کیا تھا، پھر مسکرا کر دیکھا۔ عیشہ چپ کر کے باہر دیکھنے لگی۔ شہلا نے اپنی ضروری شاپنگ کر لی تھی، اس نے وہ کی تھی۔ شہباز حیدر نے فوزان کے لیے کچھ کپڑے کھلونے اور ضروری چیزیں لی تھیں، پھر سردیوں کا موسم تھا، اسی مناسبت سے کپڑے خریدے تھے، شہلا کے بار بار کہنے پر بھی عیشہ نے کچھ نہیں لیا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ اس کے پاس پیسے نہیں تھے اور جہاں زاحد صاحب، دادی جی سب ہی اسے اکثر پیسے دیتے رہتے تھے، اس وقت بھی اچھے خاصے پیسے تھے مگر دل جب بیمار ہو تو کوئی چیز بھی اچھی نہیں لگتی، شہباز حیدر ہوتے تو شاید کچھ لے لیتی مگر اب دل میں کوئی حسرت نہ تھی، پھر اس کے پاس اچھے خاصے کپڑے موجود تھے۔ نکاح کے بعد پانچ چھ اچھے خاصے قیمتی کیسی ڈریس چچی جان نے بنوائے تھے، وہ بغیر چھوئے پڑے ہوئے تھے، وہ مطمئن تھی کہ ان میں سے کوئی پہن لے گی۔ وہ دونوں جیولری کی دکان میں تھیں، جب شہباز فوزان کو ان کے پاس چھوڑ کر خود چلا گیا تھا، ایک گھنٹے کے بعد اس کی آمد ہوئی تھی، ان کے ہاتھ میں کئی شاپرز تھے، شاید انہوں نے اپنے لیے شاپنگ کی تھی، شہلا کی شاپنگ مکمل تھی، صرف شہباز کا انتظار تھا۔ شہلا ہو رہی تھی، عیشہ کا بھوک سے برا حال ہو رہا تھا، صبح سے پیٹ میں سلائس اور ایک چائے کے کپ کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا، اوپر سے یہ بازار کی خواری۔۔ سارا دن بازار گزار کر اب اس کا جسم درد سے چور چور ہو رہا تھا۔

واپسی میں شہباز ان کو ایک ریسٹورنٹ میں لے آئے تھے، عیشہ سیدھا گھر جانا چاہتی تھی، اسے ہوٹلوں کی یہ عیاشی کبھی اچھی نہ لگی تھی مگر اب کیا کہہ سکتی تھی، اس نے شہباز حیدر سے کبھی نہ بولنے کی قسم کھائی تھی، بھوک سے برا حال ہونے کے باوجود عیشہ وجدان نے ایک لقمہ بھی نہیں لیا تھا۔ فوزان شہلا نے اس سے کئی مرتبہ کچھ نہ کچھ کھا لینے کا اصرار کیا تھا، مگر پانی کے ایک گلاس کے علاوہ اس نے حلق سے کچھ بھی نہ اتارا تھا۔ شہباز حیدر سے فوزان کی وجہ سے اپنی زندگی میں شامل کرنے پر مجبور ہوا تھا، وہ جان گئی تھی سو اس نے خود کو فوزان کی حد تک محدود کر لیا تھا، وہ اس شخص کا کوئی احسان نہیں لینا چاہتی تھی، واپسی کا سفر وہ شام کے گہرے اندھیرے میں کچھ سوچتی رہی تھی۔ فوزان اس کی گود میں تھا، وہ سارے دن کی تھکن کی وجہ سے سو چکا تھا، شہلا اور شہباز کوئی نہ کوئی بات کرتے رہے تھے، جبکہ وہ بالکل گم صم تھی۔ آج شہباز حیدر جب تک ان کے ساتھ تھا قدم قدم پر اس کی موجودگی عیشہ کو ڈسٹرب کرتی رہی تھی مگر اس موجودگی میں بھی لاتعلق تھی، وہ بے رخی، وہ لاتعلقی نے عیشہ وجدان، مدد کی رہی سہی طاقت بھی سلب کر لی تھی گھر آ کر اس نے سوئے ہوئے فوزان کو اٹھا کر سنبھال کر گاڑی سے قدم باہر رکھے تھے۔ جب شہباز نے دوسری طرف آ کر اس کے بازوؤں سے فوزان کو لے لیا تھا، وہ لب بھینچ کر اپنا بیگ کتابیں اور فائل لے کر سیدھی اپنے کمرے کی طرف آئی تھی، جو اس گھر میں اس کے لیے مخصوص تھا۔ شہباز حیدر فوزان کو اٹھائے دوسرے ہاتھ میں مختلف شاپنگ بیگز بھی بستر پر ڈھیر کیے۔ ان سب میں فوزان کی شاپنگ تھی مگر سبز رنگ کا وہ شاپنگ بیگ اٹھا کر شہباز نے اس کی طرف بڑھایا تھا، وہ حیران ہو کر دیکھنے لگی۔ ''یہ میں نے تمہارے لیے خریدا تھا۔۔'' عیشہ کے ہونٹوں پر گہری سنجیدگی ٹھہری۔

''کیوں۔۔''

شہباز نے بغور دیکھا، اس دن کی روتی بسورتی عیشہ کے برعکس کچھ مختلف سی لگی۔

''فوزان کے لیے کی تھی تو ظاہر ہے تمہارے لیے بھی کی ہے۔۔کیوں کا کیا سوال۔۔؟'' انہوں نے رعب سے کہا تھا مگر وہ ان کے رعب میں اب نہیں آنے والی تھی۔

''پلیز مجھ پر یہ احسان کرنے کی ضرورت نہیں۔۔اپنا یہ شاپنگ بیگ اٹھائیں اور لے جائیں۔۔مجھے آپ کی یہ خیرات نہیں چاہیے۔۔'' اگلے ہی لمحے وہ غصے سے پھنکاری تو شہباز نے حیرانگی سے اسے دیکھا۔

''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔۔'' اگلے ہی لمحے ان کا ازلی غصہ عود کر آیا۔ خاص طور پر خیرات کے لفظ پر۔

''جی الحمدللہ۔۔مکمل ہوش و حواس میں ہوں اور مجھے اپنی اوقات بھی اچھی طرح یاد ہے۔۔میں نے اپنی سی پوری کوشش کی تھی کہ ہو سکے تو بھی آپ کے منہ لگنے کی کوشش نہ کروں مگر آپ مجبور کرتے ہیں۔۔میرے لیے میرے باپ کا پیسہ کافی ہے۔ آپ اپنی یہ 'خیرات' کسی اور کی جھولی میں جا کر ڈالیں۔۔'' وہ تو دو دھاری تلوار بنی ہوئی تھی۔ شہباز حیدر غم و غصے سے دیکھے گئے۔

''عیشہ۔۔'' خیرات کے لفظ پر وہ بری طرح دھاڑے تھے، وہ سر جھٹک گئی۔

''مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ آپ نے ہی تو کہا تھا کہ آپ مجھے اپنے گھر والوں کی وجہ سے فوزان کی وجہ سے اپنانے پر مجبور ہوئے ہیں اور میں صرف فوزان کے لیے مخصوص ہوں۔۔آپ کے نزدیک میری ذات کی کوئی اہمیت نہیں۔۔تو اب یہ عنایت کیوں۔ اس لیے کہ آپ اپنے بیٹے کے حصے کی بچی کچی خیرات میری جھولی میں ڈال کر احسان کرنا چاہتے ہیں۔۔میں نے تو اس دن کے بعد آپ کی راہ میں آنا، آپ کی طرف دیکھنا تو دور کی بات، اس راہ پر آنا تک چھوڑ دیا ہے۔۔جہاں مجھے گمان گزرتا ہے کہ آپ کی موجودگی ممکن ہے۔۔تو پھر یہ عنایت کیوں۔۔؟''

شہباز حیدر غصے سے اسے دیکھے گئے۔

''بس تمہارا دماغ خراب ہے، خناس بھرا ہوا ہے اس میں، اور کچھ نہیں۔۔'' غصے سے شاپنگ بیگ بستر پر پٹختے وہ باہر نکل گئے تھے۔ عیشہ نے تیزی سے آگے بڑھ کر وہ شاپر اٹھایا تھا، ان کے پیچھے لپکی تھی، وہ بغیر رکے اپنی گاڑی کی طرف چل رہے تھے۔

''کیا ہوا۔۔؟'' وہ بھی تیزی سے ان کے پیچھے بھاگی تو پیچھے سے شہلا نے آواز دی مگر وہ چلتے بغیر ان تک پہنچی تھی، وہ گاڑی سٹارٹ کر چکے تھے۔

''مجھے اس خیرات کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔۔میرے پاس اللہ کا دیا ہوا بہت کچھ ہے۔۔نہ ہی مجھے آپ کی اس نام نہاد قربت کی ضرورت ہے، جس کا روگ آپ لگائے رہتے ہیں، اتنی ہی بری لگتی ہوں تو مجھے میری ذات کو تسلیم کرتے ہوئے میری خوشیوں کا ذکر کریں۔۔میں نے کر لی تو کیسے گا۔۔مگر اس بے وجہ کا ٹھکرائے جانا برداشت نہیں کروں گی۔۔اپنے جذبوں سے ہار کر آپ کا نام مقدر میں لکھوایا ہے تو اس خیرات سے بڑھ کر حق طلب کرنے کا حق رکھتی ہوں۔۔اگر دینی ہی ہے تو مجھے میری وہ عزت دیجیے، جو بیوی ہونے کے ناطے آپ پر فرض ہے، یہ خیرات نہیں۔۔'' ان کی طرف آ کر کھڑکی میں جھک کر سب کہہ کر شاپنگ بیگ اندر پھینک کر وہ رکی نہیں تھی، تیز رفتاری سے پلٹ بھی گئی تھی۔ وہ گم صم، حواس باختہ حیرت زدہ دیکھتے رہ گئے تھے۔

* * *

اقرار گئے، انکار گئے، ہم ہار گئے
جینے کے سب آثار گئے، ہم ہار گئے
کچھ یادیں اس کی بیچ سمندر ڈوب گئیں
کچھ سپنے اپنے وہ اس پار گئے ہم ہار گئے
اک عمر رہے ہیں جیت سے بے پروا لیکن

وہ ابھی تک حیرت زدہ پریشان اور گم صم تھے۔ وہ جس لڑکی کو کبھی کسی خاطر میں نہیں لائے تھے، جسے ہمیشہ انہوں نے کم عقل نادان لڑکی سمجھتے رہے تھے، وہی ان کی شکست کا باعث بنتی جارہی تھی، اور وہ ابھی بری طرح حیرت زدہ تھے۔ ابھی تک گم صم تھے کہ کیسے ہار رہے تھے، جو حفاظتی بند باندھتے آ رہے تھے، وہ ایک دم کیوں ٹوٹتے جا رہے ہیں۔۔۔ ان دیکھی خواہشیں، جذبوں کا منہ زور ریلا ان حفاظتی بندھوں اور تختوں کی پروا کیے بغیر اب سب کچھ بہا لے جانا چاہ رہا تھا۔ کیوں۔۔۔ وہ ایک دم اچانک کمزور پڑتے جا رہے ہیں۔۔۔ جذبے اس قدر منہ زور تھے، یا حفاظتی اقدامات بے حیثیت تھے، وہ ابھی تک حیرت زدہ تھے۔ وہ بچ ہار رہے تھے یا ابھی کوئی موقع باقی تھا۔ گزرے لمحوں کا حساب کرتے وہ خود سے بھی بے پروا ہو رہے تھے۔

کل شہلا کی رسم منگنی تھی، اس وقت سب ادھر گئے تھے مگر وہ بہت چاہنے کے باوجود ادھر نہیں جا سکے تھے، ادھر وہ تھی ان کی شکست کا سامان۔۔ جسے انہوں نے ہر بار زیر کیا تھا، اور خوب رلایا تھا، جسے اپنے لفظوں، حملوں، طنز کے نشتروں سے پارہ پارہ کیا تھا، جو ہر بار ان کے ہاتھوں بری طرح تختہ مشق بنتی تھی، جنگ کے ساتھ ذلت کا احساس اٹھاتی تھی۔ اپنے اندر کے کسی ہار جانے والے خدشے کے سر ابھارنے سے پہلے ہی وہ اسے بے عزت کر کے رکھ دیتے تھے، اور پھر بھی دل مطمئن نہ ہو پاتا تھا، ہار تو جیسے نصیب میں لکھی جا چکی تھی، وہ اس کے حصے میں لکھی جا چکی تھی، وہ ان کی بن چکی تھی، وہ ان کی زندگی میں اپنا نام منوا چکی تھی، پھر بھی وہ اسے دھتکار دیتے تھے۔ ہر بار دھتکار دیتے تھے، اور ہر بار دھتکار دینے کے بعد خود بھی تکلیف سے دوچار ہو جاتے تھے کہ ان کی طبیعت کا رنگ نہ تھا۔

دوریشہ عبداللہ ان کی زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی تھی، جو صرف ان کی تایا زاد ہی نہیں، محبت بھی تھی، اور پھر وہ ان کی زندگی میں ایک خاص رشتے سے داخل بھی ہوئی۔ لیکن اس کی زندگی نے وفا نہ کی، تینوں سب کے مختصر وقفے میں ان کی زندگی میں گل و گلزار کے باغات آباد کرنے کے بعد بے آباد بھی کر گئی۔ دوریشہ کے بعد وہ ٹوٹ کر بکھرے تھے، وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔ فوزان کو عیشہ نے سنبھال لیا اور وہ اپنی وحشت میں گم ہوتے چلے گئے۔ گھر والوں نے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شادی کا اصرار بڑھا تو انہوں نے چپ اوڑھ لی۔ دوریشہ کے بعد ان کا دل مردہ سا ہو گیا تھا، پھر اصرار بڑھا تو انہوں نے فوزان کا بہانہ کر کے ٹالنا شروع کر دیا۔ وقت رکنے کا نام تو نہیں۔۔۔ ہر زخم کا علاج ممکن ہے اور قدرت نے ان کے سامنے عیشہ واجد کو لا کھڑا کیا، جو ہو بہو دوریشہ کی کاپی تھی۔ شکل و صورت سے لے کر عادات و اطوار میں بھی اس جیسی، وہ سارے خاندان کی ہر دلعزیز اور محبوب لڑکی تھی۔ مگر باپ کی طرف سے بے اعتنائی کا شکار۔۔۔ واجد صاحب اس کا ظاہری لحاظ سے خیال رکھتے تھے مگر اولاد کو جو خصوصی توجہ والدین سے ملتی ہے، وہ دینے سے قاصر تھے۔ اس بات کا احساس سب کو تھا، اور سبھی اس کا خاص خیال رکھتے تھے، وہ پڑھنے کی شوقین تھی، سو ہر کسی نے اس کی پڑھائی کا خاص خیال رکھا تھا، وہ فوزان کے معاملے میں حد سے زیادہ حساس اور جذباتی تھی تو سب نے اسے فوزان کی ذات میں گم ہونے سے نہیں روکا تھا۔ اور شاید یہیں سے غلطی کی ابتداء ہوئی تھی، اور جب شہباز حیدر کو غلطی کی سنگینی کا احساس ہوا، وقت بہت گزر چکا تھا، عیشہ واجد کے دل و دماغ میں ایک واضح شبیہ اتر آئی تھی، اور جب انہیں اپنے شک کے یقین ہونے پر مہر ثبت ہوئی تو انہوں نے حفاظتی اقدامات کرنے شروع کر دیے تھے۔ وہ اس ننھی سی لڑکی سے ڈر گئے تھے، جس کی گہری آنکھوں کے سمندر میں ان کی شکست کا سامان کرنے کے لیے کافی ہو سکتے تھے۔ انہیں لگتا تھا کہ جیسے وہ ان کی ذات کے گرد کھڑی بلند و بالا فصیلوں کو ڈھانے کے چکر میں ہے اور ہر بار اس سے سامنے کے بعد وہ اپنے گرد موجود فصیلوں کو مزید بلند کر لیتے تھے، وہ پتھر نہیں تھے مگر خود کو پتھر بنانے پر مجبور تھے۔ وہ بے حس نہیں تھے، مگر اپنی بے حسی کا مظاہرہ کرنے میں ہی انہیں عیشہ واجد کی بھلائی دکھائی دے رہی تھی، ایسے میں فوزان کا اس سے حد سے زیادہ لگاؤ، وہ جتنی بھی کوشش کرتے کہ فوزان کی توجہ اس کی ذات سے ہٹ کر اپنی طرف مبذول کروا لیں، انہیں اس قدر ناکامی کا سامنا کرنا

پڑتا تھا۔ اور وہ ایک ماہ جو انہوں نے انکشاف کے بعد فوزان کو اپنی طرف ملتفت کرنے میں گزارا تھا، وہ ایک ماہ بھی بیکار گیا، انہیں اس رات اپنی حماقت کا شدید احساس ہوا جب انہوں نے بہلا پھسلا کر فوزان کو اپنے پاس سلانے پر راضی کر لیا تھا، مگر آدھی رات کو اٹھنے کے بعد فوزان کا رونا دھونا، وہ سخت اذیت سے دوچار ہو گئے تھے۔ وہ ایک ماہ کا عرصہ جو انہوں نے فوزان کے لیے ہر کام کو پس پشت ڈال کر گزارا تھا، عیشہ کے ساتھ گزارے چھ سالوں کی تربیت و عادت کو بدلنے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ وہ لڑکی فوزان کی صورت میں ان کی سب سے بڑی شکست بن کر سامنے آئی تھی، وہ تلملا کر رہ گئے تھے، اس تصور سے ہی ان کا بیٹا ہی ان کے قابو میں نہیں آ رہا ہے۔ اور اسی رات اس کے کمرے تک جاتے ہوئے فوزان کو اس کے بازوؤں میں دیتے ہوئے، اسے تلخی سے دیکھتے ہوئے غصے سے اس پر اپنے باخبر ہونے کا اظہار کرتے ہوئے انہیں ہر لمحے اپنے ہار جانے کا دھڑکا لگا تھا، اور اس دھڑکے نے انہیں مزید تلخ کر دیا تھا، وہ اگلی صبح جب وہ ان کے سامنے کھانے کی ٹرے لے کر آئی تھی، وہ پھر اس خوف سے جکڑتے چلے گئے تھے کہ یہ لڑکی باقاعدہ ان کی شکست کا اہتمام کرنے سامنے آ چکی ہے، تب انہوں نے اندر کی تلملاہٹ، خوف، ہار جانے کے ڈر کو اپنے غصے، اپنی تند مزاجی میں لپیٹ کر اس لڑکی کو بری طرح نفرت کا اظہار کرتے دھتکار دیا تھا، پھر عیشہ واجد کے بھرپور صاف اظہار نے اس کے اندر آتش فشاں کو گویا ہوا دے دی تھی، وہ خود بھی نہیں جانتے تھے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں مگر خود کو کچھ بھی تلخ نفرت انگیز کہنے سے باز بھی نہیں رکھ سکتے تھے۔ اور تب تو حد ہی ہو گئی تھی جب انہوں نے عیشہ کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے روکا تھا۔

"پلیز شہباز۔۔ میرے ساتھ یوں پیش نہ آئیں۔۔۔ مجھے اتنی نفرت سے مت دھتکاریں، میں آپ کو کب مجبور کر رہی ہوں کہ میری محبت قبول کریں، کم از کم فوزان کے لیے تو اپنی زندگی میں اتنی جگہ رہنے دیں۔۔۔ تم سے سارے زندگی کچھ نہیں مانگوں گی۔ مگر آپ کی نفرت نہیں سہہ سکتی۔۔۔ پلیز شہباز۔۔" وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر انہیں پکار رہی تھی، جس لڑکی کو انہوں نے ہمیشہ اپنی بھتیجی کے روپ میں دیکھا تھا، اس کے منہ سے یہ اظہار، یہ التجا کیسے برداشت کر لیتے۔ وہ بری طرح رو رہی تھی، سسک رہی تھی، وہ کمرے سے نکل گئے تھے اور پھر وہ سارا دن انہوں نے بہت اذیت میں گزارا تھا، اس لڑکی کے آنسو ان کے پاؤں کی زنجیر بنے ہوئے تھے، بے تاب تھے، اس کی سسکیاں ان کے دل سے گرد بلند و بالا فصیلوں کو ڈھانے کے درپے تھیں اور اس کا ہر آنسو ان کو گھائل کرنے کو کافی تھا۔ وہ سارا دن بہت مضطرب رہے تھے، رات کو لیٹ آئے تھے، اگلے دن جب اس کو ہوش و حواس سے بیگانہ بخار میں پھنکتا دیکھا تو وہ سب کچھ بھول بھال گئے تھے۔ ہاسپٹل میں اپنے باپ کے ساتھ خوار ہوئے، ڈاکٹروں کے پیچھے بھاگتے انہیں ایک دم احساس ہوا تھا کہ یہ لڑکی اتنی کمزور نہیں جتنی وہ سمجھ رہے ہیں، وہ لڑکی تو ان کی شکست کا پورا اہتمام کیے ہوئے تھی، بخار سے وہ نچڑ کر رہ گئی تھی، ہوش میں آنے کے بعد وہ ان کی طرف دیکھنے سے اجتناب کر رہی تھی، تو وہ خود بھی اس کا سامنا کرنے سے بچ رہے تھے، وہ رات انہوں نے گھر اپنے کمرے میں فوزان کے ساتھ گزاری تھی۔ اور پھر اس لڑکی کا ہر رویہ، ہر انداز یاد کرتے انہیں ندامت کا احساس ہوتا جا رہا تھا، کم از کم انہیں اس کے ساتھ اس قدر تلخی سے پیش نہیں آنا چاہیے تھا، گویا ان کے اندر کا انسان موم ہو رہا تھا۔

عیشہ ہاسپٹل سے آنے کے بعد اپنے باپ کے پاس چلی گئی تھی، وہ کبھی واجد صاحب کے ہاں ایک دن سے زیادہ نہیں رہی تھی، اسے چار دن ہو گئے تھے وہاں گئے ہوئے، فوزان اس کے بغیر بڑا تنگ کر رہا تھا، انہوں نے قیوم کو اسے لینے کو بھیجا تھا، مگر وہ نہیں آئی تھی، انہیں خوش ہونا چاہیے تھا کہ وہ ان کے کہنے کے مطابق ان کے بیٹے کی زندگی میں معاملات سے دور ہو رہی ہے، مگر متفکر ہو گئے تھے۔ دو دن تک فوزان کی طبیعت خراب ہو گئی تھی مجبوراً انہیں خود جانا پڑا تھا، وہ آ گئی تھی، انہوں نے اسے سختی کے ساتھ باور کروا دیا تھا کہ وہ اسے صرف اور صرف فوزان کی وجہ سے اہمیت دینے پر مجبور ہے۔ وہ رو دی تھی، اور گھر آ کر اس نے فوزان کو سمیٹ لیا تھا۔ اگلے ہی دن وہ بھلا چنگا ہو گیا تھا، ان کے اندر آندھیاں سی چلنا شروع ہو گئی تھیں۔ اور انہی دنوں اس کے اندر عیشہ واجد کو پس منظر سے غائب کر دینے کی تحریک ایسی ابھری کہ وہ جاوید صاحب کے ہاں چلے گئے، وہ ان کے والد اور تایا ابا کے دیرینہ دوست تھے، انہوں

سے انہیں اپنے بیٹے محسن جاوید کے لیے کوئی اچھا سا رشتہ دکھانے کی بات کی تھی، وہاں جا کر عیشہ سے بدحال ہو چکے تھے، بہت پریشان ہوئے اور پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔۔۔ ان کا مقصد عیشہ کو جلد از جلد اپنی اور فوزان کی زندگی سے دور کرنا تھا، وہ اس میں بہت حد تک کامیاب بھی تھے، اگر عیشہ واجد خود جا کر محسن جاوید کو انکار نہ کر دیتی، انہوں نے محسن جاوید کے آفس کے باہر کھڑے ہو کر عیشہ واجد کے انکار کو سنا تھا، جی چاہ رہا تھا کہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس لڑکی کا چہرہ سرخ کر دیں، وہ کون ہوتی تھی ان کے ہر عمل کو ناکام بنانے والی۔۔۔ وہ بہت مشکل سے خود پر قابو کر پائے تھے، اس نے صرف محسن جاوید کے رشتے سے ہی انکار نہیں کیا تھا بلکہ اگلا آنے والا رشتہ بھی اس کے لیے پریشانی کا باعث بن چکا تھا۔ اور اس رات وہ پھر ان کے سامنے کھڑی تھی، جس طرح وہ انکار کر رہی تھی، جس طرح وہ اپنی محبت کو چیش کر رہی تھی، وہ ہکا بکا رہ گئے تھے، ان کا خیال تھا کہ ان کے رونے سے دہر داشتہ ہو کر وہ کچھ نہ کچھ عقل کا دامن تھامے گی مگر الٹا ہو رہا تھا، ان کے ہر عمل کا ردعمل انتہائی شدید تھا، وہ ایک دفعہ پھر خود پر قابو نہ کر پائے تھے۔ غصے سے اس کی بکواس پر اسے گھر سے نکال دینے کی دھمکی پر اشتعال میں آ کر گھر سے نکال دیا تھا۔ وہ روتے ہوئے دروازہ پیٹ رہی تھی، انہیں پکار رہی تھی، میں مر جاؤں گی۔ اس کی آواز اب بھی لگ رہا تھا مگر انہوں نے خود کو پتھر بنا لیا، ان کی ذرا سی نرمی بھی ان کے اپنے بے نقصان دہ تھی۔

اگلے دن ان کا خیال تھا کہ وہ ان کا جواب سے اس رشتے کو فائنل کر لینے کی بات کریں گے، جانچ پڑتال وہ کر چکے تھے، رشتہ ہر لحاظ سے مناسب تھا، مگر وہ وقت سے پہلے بات نہ کر سکے، رات لیٹ آئے تھے، سب سو چکے تھے، امی نے ہی کھانا لا کر دیا تھا، بھی کھانا کھا کر فارغ ہی ہوئے تھے کہ امی نے وہ بات شروع کر دی تھی جس نے ان کو بدحواس کر دیا تھا۔ ایک لمحے کو یوں محسوس ہوا کہ قدموں تلے سے زمین سرک چکی ہے۔ لو وہ امی کی تجویز پر برہم ہوئے تھے، ہزار ہا اعتراضات کیے تھے، ہر ممکن بچنے کی کوشش کی تھی مگر اس بار امی بھی لگتا تھا کہ پوری تیاری سے آئی تھیں، وہ اپنا فیصلہ سنا کر جا چکی تھیں اور ان کا غصے سے برا حال ہو رہا تھا، اگلی صبح انہوں نے عیشہ کے کمرے میں جا کر بچا کھچا غصہ نکالا تھا، وہ پھر رو رہی تھی، وہ ہر بار اسے بری طرح رلا دیتے تھے۔ اور پھر اس کے بلکتے سسکتے رونے پر مزید غصہ آنے لگتا تھا۔

وہ وضو کر کے فارغ ہوئی تھی، صبح کے وقت اپنے گیلے چہرے سمیت وہ اوس سے ڈھکا کوئی گیلا گلاب ہی محسوس ہو رہی تھی، ایک دفعہ پھر ان کا دل اس کے سامنے ڈٹ گیا تھا مگر انہوں نے دل کو ڈانٹ کر عقل کا دامن نہیں چھوڑا تھا، اسے سخت سست سنا کر آ گئے تھے۔ اور پھر ان کے بے پناہ اختلاف کے باوجود یہ رشتہ طے پا گیا تھا، بوڑھی ان سے اتنے سجے ہوئے انداز میں بات کی تھی کہ وہ بہت خواہش کے باوجود انکار نہ کر پائے تھے اور پھر خاموش ہو گئے تھے۔

ان کے والدین تو جیسے منتظر ہی تھے فوراً نکاح کی تقریب منعقد کر کے یہ رشتہ ہمیشہ کے لیے مضبوط کر لیا تھا، اسٹیج پر بیٹھی عیشہ واجد جو کہ اب عیشہ شہباز حیدر بن چکی تھی، عروسی جوڑے میں بے پناہ حسین لگ رہی تھی، ادھر ادھر بھٹکتے ان کی نگاہ بار بار اس کے چہرے پر چپک گئی تھی، وہ اپنے آپ کو ہر بار ڈانٹ دیتے تھے، مگر اسے دیکھنے سے باز نہیں آتے تھے۔ وہ اتنی حسین لگ رہی تھی کہ انہیں اپنے اوپر بے اختیار غصہ محسوس ہوا تھا۔ اس وقت عیشہ انہیں بالکل دریشہ کی طرح ہی لگی، وہی رخسار، وہی تیکھے نقش، وہی قد و قامت۔۔۔ وہ جو صبح مہوش تھوڑے کمرے سے گزرتے ہوئے ان کی باتیں سن کر خفا تھے، بس موقع کی تلاش میں تھے کہ وہ عیشہ کو اس سلسلے میں بار پرس کریں۔۔۔ انہوں نے مہوش سے عیشہ سے کوئی بات کرنے کو کہا تھا، مہوش نے انہیں تنگ کرنا چاہا تھا مگر انہوں نے سختی سے ڈپٹ دیا تو وہ بھی سنجیدہ ہو گئی اور عیشہ سے ملنے کا اہتمام کر دیا تھا، وہ اس کے کمرے میں آئے تو وہ آنکھیں بند کیے نیم دراز تھی، اس کو دیکھ کر ان کے اندر وہی کیفیت ابھری تھی، جو کچھ دیر پہلے ان کے اندر تلاطم برپا کر چکی تھی۔ وہ ان لمحوں میں بڑی مشکل سے خود پر قابو کر پائے تھے، انہوں نے فوراً مہوش کی بات والا کھاتا کھول لیا تھا، اور تبھی انہیں علم ہوا کہ یہ ساری سازش مہوش کی ہے، وہ کچھ نہیں کر سکے تھے، ایک دفعہ پھر اسے غصے سے بری طرح سنا کر وہ چلے گئے تھے۔ اور پھر ان کی زندگی کا اک نیا باب کھلا تھا۔

ہر بات، ہر معاملے میں عیشہ واجد ان کے سامنے ہوتی تھی، اس دن اس کو یونیورسٹی میں ڈراپ کرتے ہوئے انہیں بظاہر ای کا طریقہ ناراضگی تھی، انہوں نے جس طرح اس کے اعتراضات کو خاطر میں لائے بغیر یکطرفہ فیصلہ کر کے نکاح کروایا تھا وہ ان سے ناراض ہی تھے، وہ ان کی ناراضگی سے اچھی طرح باخبر تھیں، اسی لیے انہوں نے عیشہ کو ان کے ساتھ لے جانے پر کہا تھا۔

انہیں امی کی بات پر ایک دم غصہ آیا تھا، وہ اس طرح کیا ثابت کروانا چاہتی ہیں، یعنی کہ وہ اتنا کمزور ہے کہ جس بات کو وہ اب تک "انکاری" ہے، عیشہ کے چند پل کے ساتھ سے وہ "ہاں" ہو جائے گیا انہیں امی کی سوچ پر غصہ تھا، اور یہ غصہ انہوں نے سارا عیشہ پر اتارا تھا، وہ ایک دفعہ پھر اسے رونے پر مجبور کر گئے تھے، وہ رو رہی تھی، انہیں تکلیف پہنچ رہی تھی، وہ نجانے اتنے کمزور ہوتے چلے گئے تھے کہ اب یہ لڑکی انہیں اپنے وجود کا احساس بری طرح دلا رہی تھی، اور جس طرح گاڑی سے نکلنے کے بعد ان کے پاس گئی تھی بے حد حیرت زدہ رہ گئے تھے۔ وہ کتنے دنوں تک خود کو اپنے اس برے رویے پر ملال کا شکار ہونے سے نہیں روک پا رہے تھے، پھر وہ شہلا بھابی کی بیٹی کے ساتھ ایک ڈیڑھ ہفتہ پہلے ہی واحد صاحب کے ہاں جا بیٹھی تھی، فوزان بھی اس کے ساتھ ہی گیا تھا۔ اس دوران انہیں بڑی شدت سے دونوں کی کمی محسوس ہوئی تھی، اس نے انہیں چھ کیا تھا، اور چڑ چکی رہتا تھا، وہ خود بھی حیرت زدہ تھے، جس شکست سے دوچار تھے، وہ اس کا مقدر بنے کوئی چند قدم کے فاصلے پر تھی۔ وہ ہار رہے تھے، انہیں اندازہ ہو رہا تھا۔ جس انا کے سامنے وہ گھٹنے ٹیکنے پر مجبور نہ تھے، وہ انہیں مجبور کر رہی تھی۔ وہ فوزان کو چھوڑنے واحد صاحب کے ہاں گئے تھے۔ وہ اتفاق سے اس دن جلدی گھر آ گئے تھے شہلا نے انہیں بازار لے جانے کا کہہ رکھا تھا، وہ فارغ ہی تھے، فوزان گھر آئے تو شہلا نے عیشہ کو بھی یونیورسٹی سے پک کرنے کا کہا تھا۔ وہ حیران تو ہوئے تھے مگر اظہار نہ کیا۔۔۔ لیکن وہ دل ہی دل میں انکار کر پا رہے تھے، وہ پھر وہ آ گئی تھی، شہباز حیدر کو دیکھ کر وہ حیرت زدہ تھی، وہ اچھی طرح اس کی حیرت پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے سلام کیا تو وہ صرف حیرت سے سر ہلا کر رہ گئی تھی۔ وہ ان کے پہلو میں تھی، لاتعلقی کا اظہار کرتی ہوئی مگر یہ تعلق نہیں تھی، وہ سائیڈ مرر سے اس کے چہرے کی تاثرات وہ صرف پڑھ سکتے تھے، فوزان اس کے پاس آگے آ گیا تھا، اس سے باتیں کر رہا تھا، مگر اس کی بات پر اس نے ڈانٹ دیا تو انہوں نے بغور دیکھا تو وہ فوزان کی بات پر خفت کا شکار تھی۔ ان کے اندر ایک عجیب سی کیفیت نے سر ابھارا تھا۔ بڑی خوبصورت لگ رہی تھی، وہ خود بھی حیران تھے۔

شاپنگ کے دوران اس نے کچھ بھی نہیں لیا تھا، فوزان کی شاپنگ میں بھی اس نے اس کی مدد کی تھی، شہلا اور فوزان اسے کچھ دلوانے کو کہہ رہے تھے مگر وہ انکار کر گئی تھی اور تبھی وہ ان کو جیولری کی دکان پر چھوڑ کر چلے گئے تھے، کچھ اپنے لیے اور کچھ اس کے لیے شاپنگ کی تھی۔ اور پہلی بار وہ مطمئن تھے، پہلی بار ان کا رویہ مثبت تھا، وہ پہلی بار اپنی شکست کے خوف سے ان کے اندر غصے کے طوفان نے سر نہیں ابھارا تھا، اور پہلی بار ان کو اپنی یہ کیفیت اچھی نہیں لگ رہی تھی، انہیں عیشہ اچھی لگ رہی تھی، فوزان کا عیشہ کے لیے پیار اچھا لگ رہا تھا۔ وہ تھک گئی تھی، وہ محسوس کر رہے تھے، وہ خود بھی تھکن محسوس کر رہے تھے، وہ بھوکی تھی، انہیں احساس ہو رہا تھا، اسی لیے وہ ان تینوں کو اس ریسٹورنٹ میں لے آئے تھے۔ اس نے ان کے ساتھ آنے پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ وہ خوش ہو رہے تھے، جس طرح اس عیشہ کا لاتعلقی کا رویہ تھا، وہ اس کی طرف سے کچھ خوفزدہ تھے مگر ان کی خوشی اس وقت ملیامیٹ ہوئی تھی جب ٹیبل پر کھانے کی موجودگی کے باوجود اس نے صرف پانی کا گلاس لیا تھا، وہ کن انکھیوں سے اسے دیکھتے رہے تھے، شہلا اور فوزان اسے بار بار کچھ لینے چکھنے کا اصرار کر رہے تھے، مگر وہ ہر بار سہولت سے انکار کر رہی تھی۔

"پلیز نہیں۔۔۔ اس وقت بالکل بھی گنجائش نہیں۔۔۔ صبح معمولی سا ناشتہ کیا تھا، تو کینٹین سے جی بھر کر کھا لیا تھا۔۔۔ ایک برگر دوست اور چائے پی تھی۔۔۔" اس کے چہرے سے بھوکا ہونے کے آثار صاف پڑھے جا سکتے تھے، شہباز خاموش ہو گئے تھے، ان کا دل بجھ گیا تھا۔

یونیورسٹی ڈراپ کر دینے والے دن سے لے کر اب تک اس کا رویہ ایسا ہی تھا، وہ جان کو دیکھ کر صرف رو دیتی تھی، ذرا سی

تھی پر فوراً آنکھیں بھر آتی تھیں، ان کے خوف سے وہ ہر وقت خائف رہتی تھی، یکسر بدل رہی تھی، وہ ان سے لاتعلقی کا اظہار کر رہی تھی، ان کی طرف دیکھ نہیں رہی تھی، اور سب سے بڑھ کر ان کا منگوایا گیا کھانا نہیں کھا رہی تھی، انہیں اذیت ہو رہی تھی، مگر چپ تھے۔ کچھ نہیں کہہ سکتے تھے کہ یہ سب ان کا اپنا بویا سامنے آ رہا تھا۔ واپسی پر جب فوزان کو اس کے کمرے میں لٹانے کے بعد انہوں نے فوزان کے سامان کے ساتھ اس کے لیے خریدی گئی چیزوں کا شاپر اس کے سامنے کیا تھا، وہ کتنی حیران ہوئی تھی، علاوہ ازیں گلے شکوے پر اتر آئی تھی، انہوں نے پہلی دفعہ اس کے لیے بہت خلوص سے کوئی چیز خریدی تھی اور اس نے اسے خیرات کا نام دیا تھا۔ وہ اس کے لفظ پر ایک دم طیش میں آ گئے تھے، وہ اور بھی نجانے کیا کیا بکواس کر رہی تھی، غصے سے وہ شاپر وہیں بستر پر پھینک کر آ گئے تھے، وہ بھی پیچھے چلی آئی تھی، وہ گاڑی اسٹارٹ کر رہے تھے جب وہ کھڑکی میں جھک کر کہنے لگی تھی۔

''مجھے اس خیرات کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔۔۔ میرے پاس اللہ کا دیا ہوا، بہت کچھ ہے۔۔۔ نہ ہی مجھے آپ کی اس نفرت کی ضرورت ہے، جس کا آپ ہر گھڑی الاپتے رہتے ہیں۔۔۔ اگر میں آپ کو اتنی ہی بری، ناقابل قبول لگتی ہوں تو مجھے میری ذات تسلیم کرتے ہوئے میری برائیوں کا ذکر کریں۔۔۔ میں اف بھی کر گئی تو کہیے گا۔۔۔ مگر اس بے وجہ کا ٹھکرائے جانا برداشت نہیں کروں گی۔۔۔ پچے جذبوں سے ہو کر آپ کا نام اپنے مقدر میں لکھوایا ہے تو اس خیرات سے بڑھ کر حق طلب کرنے کا حق رکھتی ہوں، اگر کچھ دینا ہی ہے تو مجھے میری وہ عزت دیجئے جو بیوی ہونے کے ناطے آپ پر فرض ہے۔۔۔ یہ خیرات نہیں۔۔۔'' وہ حیرت سے تکتے رہ گئے تھے، بالکل حواس باختہ، ہم آہنگ اور یہ سکتہ ابھی تک برقرار تھا۔ اس وقت گھر میں صرف ان کے علاوہ کوئی بھی نہ تھا، سب ان کے ہاں گئے ہوئے تھے اور انہیں رہ رہ کر وہ یاد آ رہی تھی، جنہیں ہار جانے کے خوف سے انہوں نے کبھی انسان ہی نہ سمجھا تھا، جسے ذلیل کرنے کا کوئی لمحہ ہاتھ سے نہیں جانے دیا تھا۔ جسے ہر موڑ ہر پل اپنی نفرت سے ستاتے رہے تھے اور آج اگر وہ ان کے سامنے بجائے رونے دھونے کے پوری عزت و وقار کے سامنے کھڑی ہوئی تھی تو وہ حیران رہ گئے تھے، اس کا یہ روپ ان کو چاروں شانے چت کر دینے کو کافی تھا۔

قرار گئے، انکار گئے، ہم ہار گئے
اک عمر رہے ہیں جیت سے بے پروا لیکن
جب جیتنا چاہا جیون وار گئے ہم ہار گئے

وہ سب بھینچ کر رہ گئے انہیں آج پہلی یہ مکمل ہار بری نہیں لگ رہی تھی، نہ ہی اس ہار کے اعتراف نے ان کے اندر ملال پیدا کیا تھا، وہ اک میٹھی سی کسک محسوس کر رہے تھے، ایک دھیمی سلگتی آگ جو انہیں حیات بخش ذائقے سے متعارف کروا رہی تھی۔ انہوں نے اپنے بستر کی سائیڈ ٹیبل سے البم نکال لیا۔ یہ نکاح کے دن کی تصویریں تھیں جو مہوش بھابی نے ان کو تھمائی تھیں، انہوں نے غصے سے بغیر دیکھے اندر ڈال دی تھیں مگر اب ان تصویروں کو دیکھنے کو دل مچل رہا تھا۔ ہر تصویر میں اس کا روپ نرالا تھا، عروسی میک اپ میں بھاری جیولری سمیت وہ اچھی خاصی دلربا سی لگ رہی تھی۔ ہر تصویر کو بغور دیکھنے کے بعد ان کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہوتی جا رہی تھی۔

''اگر کچھ دینا ہی ہے تو مجھے میری وہ عزت دیجئے جو بیوی ہونے کے ناطے آپ پر فرض ہے۔۔۔ یہ خیرات نہیں۔۔۔'' تمام تر لاتعلقی کے باوجود وہ اپنے دل کی بات کہنے سے باز نہیں آئی تھی۔ ان کے اندر اک نشہ سا اترنے لگا۔ کم عمر لڑکی کی محبت کا واحد حقدار ہونا جو پوری کی جان سے ان پر مرتی ہو۔ اس کا نشہ بھی عجیب ہوتا ہے، انہیں احساس ہو رہا تھا۔ تصویروں کو سائیڈ پر رکھتے وہ ہنس دیے تھے، آج بہت عرصے بعد وہ دل سے کھلکھلا کر ہنسے تھے، ورنہ خود کو تو قبول بھی کب کے نہ نفرت کی زد میں رکھ کر بھول گئے تھے۔

''میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں۔۔۔ میں آپ کے بغیر مر جاؤں گی۔۔۔ پلیز مجھے یوں بری طرح نفرت سے مت دھتکاریں۔۔۔'' کبھی کا کہا روتی بلکتی سسکتی آواز میں یہ جملہ ان کے اندر اک آگ لگا گیا تھا۔ انہیں احساس ہوا، کہ وہ اس کم عمر دیوانی لڑکی سے کتنی زیادتیاں کر چکے ہیں۔ کسی خیال سے چونک کر انہوں نے واجد صاحب کے گھر کے نمبر ملائے، کال ریسیو کرنے والی واجد صاحب کی بیگم تھیں، سلام دعا کے بعد انہوں نے فوزان سے بات کروانے کو کہا تھا۔

''اسلام علیکم بابا۔۔۔'' وہ فوراً بات کر رہا تھا، وہ مسکرا دیے۔

''وعلیکم السلام۔۔۔ کیسے ہو۔۔۔ ماما کیسی ہیں۔۔۔؟''

''ٹھیک ہوں۔۔۔ ماما شہلا آپی کو مہندی لگا رہی ہیں۔۔۔''

''تم سوئے نہیں۔۔۔ اتنی رات ہو گئی ہے۔۔۔'' انہوں نے ٹائم دیکھا، گیارہ بج رہے تھے۔

''میں سو گیا تھا، یہاں اتنا شور ہے۔۔۔ آنکھ کھل گئی تھی۔۔۔ پاپا آپ کیوں نہیں آئے۔ یہاں سب ہیں۔۔۔ بہت مزہ آ رہا ہے۔۔۔''

''میں کل آؤں گا۔۔۔ آپ اپنی ماما سے بات کروائیں۔۔۔''



''اچھا پاپا۔۔۔''

تھوڑی دیر بعد عیشہ کی آواز سنائی دی۔

''ہیلو۔۔۔''

''عیشہ۔۔۔'' وہ رک گئے، ذہن بالکل خالی ہو گیا۔

''جی فرمائیے۔۔۔ کیسے زحمت کی۔۔۔'' اتنے عرصے میں وہ ان پر طنز تو ضرور سیکھ چکی تھی، انہوں نے ایک گہرا سانس لیا۔

''تمہارا ایم ایس سی مکمل ہونے میں کتنے ماہ باقی ہیں۔۔۔'' سنجیدگی سے پوچھنے پر دوسری طرف موجود عیشہ حیران ہوئی۔ یہاں بھلا، ایم ایس سی کا کیا ذکر۔۔۔ وہ بھی اس وقت۔۔۔

''جی۔۔۔؟''

''جی ہاں۔۔۔ کتنے ماہ باقی ہیں۔۔۔؟'' انہوں نے دوبارہ دہرایا۔

''تین ماہ بعد پیپرز ہو رہے ہیں۔۔۔ کیوں خیریت۔۔۔؟'' عیشہ حیران تھی کہ رات کے اس پہر سے اس کے ایم ایس سی سے کیا دلچسپی ہونے لگی کہ یوں کال کر کے پوچھا جا رہا تھا۔

''میں بھی حساب لگا رہا تھا کہ تین چار ماہ مجھے تمہیں بیوی کے ناطے عزت دینے میں کتنا تکلیف دہ انتظار کرنا ہوگا کہ تمہیں بھی دی گئی عزت خیرات نہ لگے۔''

''جی۔۔۔؟'' اب تو عیشہ کے حقیقتاً طوطے اڑے تھے، کچھ بھی سمجھ نہ پائی تھی۔ یہ شخص اس پر ایسا مہربان ہی کب تھا کہ وہ اعتبار کرتی۔

''ویسے تمہیں مجھ تک پہنچنے کے لیے فوزان کو قابو کرنے میں مشکل تو بڑی ہوئی ہوگی۔۔۔'' وہ مزید کہہ رہے تھے، دوسری طرف عیشہ کو تو گویا پتنگے لگ گئے تھے۔

''دماغ ٹھیک ہے آپ کا۔۔۔ فوزان کے سلسلے میں آپ میرے جذبات کی توہین کر رہے ہیں۔۔۔'' وہ کلس کر رہ گئی، شہباز نے اپنی مسکراہٹ دبائی۔

''تم نے بھی تو میری دی گئی شاپنگ کی چیزیں قبول نہ کر کے کی ہے۔۔۔ وہ کس زمرے میں آتی ہے'' وہ اسے صرف ستانے

کے موڈ میں تھے، دوسری طرف عیشہ واقعی برہم ہو گئی۔

"اور جو آپ میرے ساتھ ایک عرصے سے کرتے آرہے ہیں، وہ کس کھاتے میں ڈالیں گے۔۔" وہ چیخ ہی تو گئی تھی، وہ ہنس دیے۔

"میں تو ایسا ہی ہوں۔۔ منع کیا تھا تمہیں۔۔۔ اب بھگتو بھی۔۔ اپنے سے بڑی عمر کے شخص سے دل لگاؤ گی تو یہی حال ہو گا۔۔"

"آپ کو میرے احساسات کا پتہ ہے، اسی لیے آپ مجھے دل لگانے کی سزا دے رہے ہیں۔۔ میری قسمت۔۔۔ میرے پھوڑنے کو بھی مجھے آپ جیسا پتھر دل ملا تھا۔۔ مگر کب تک۔۔۔ کسی نہ کسی دن آپ کو اپنی غلطی کا احساس تو ہوگا۔۔" اگلے ہی لمحے حساسیت کا شکار ہوتے اس کی آواز رندھ گئی۔

"میں آپ سے جتنا بھی برا سلوک کروں، آپ کے برعکس نہیں ہو سکتی۔۔ آپ تو۔۔" وہ واقعی رو دی۔ شہباز کا ایسا کوئی ارادہ نہ تھا، کم از کم، اب تو رلانے کے موڈ میں نہ تھے، صرف ستانا مقصود تھا۔

"مجھے میری باتوں کے طعنے دے رہے ہیں۔۔ تنگ کرتے آپ بھی۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی، ایک دم فون بند کر دیا تھا۔

شہباز حیدر کو تاسف نے گھیرا، کچھ لمحے ہی گزرے تھے پھر کچھ سوچ کر مطمئن ہو گئے۔

* * *

اگلے دن اس نے بلیک خوبصورت ایمبرائیڈری سے مرصع شیشوں کے کام والا سوٹ پہنا تھا، یہ اس کے نکاح کے جوڑوں میں سے ایک تھا، خوبصورت جیولری میک اپ سمیت وہ بے حد خوبصورت سراپے کے ساتھ بہت پیاری لگ رہی تھی، کہنیوں تک مہندی کی بیل بوٹوں سے سجے اس کے سیدھے ہاتھ پاؤں بہت بھلے لگ رہے تھے، چوڑیوں گجروں کی دلکشی نے اس کے حسن کی جگمگاہٹ کو چار چاند لگا دیے تھے، رات کی تقریب تھی، گھر کے اندر ہی سارا انتظام کیا گیا تھا، مہمانوں کی آمد کے بعد خوب گہما گہمی ہو گئی تھی، محسن جاوید نہیں آیا تھا نہ ہی ان کے خاندان میں کسی لڑکے لڑکی کو ایک جگہ بٹھا کر تقریب کرنے کا رواج تھا۔ وہ کافی متحرک تھی، ادھر سے ادھر آتے جاتے عیشہ کی رات شہباز حیدر آئے تھے، مردوں میں ہی مصروف رہے تھے، چونکہ مردوں کے لیے بیٹھنے کا انتظام صحن میں کیا گیا تھا تو کم ہی سامنا ہو رہا تھا۔ عیشہ نے بھی شکر ادا کیا کہ جو نے کب کیا وہ شخص کہہ دے۔ رات دس کے قریب مہمان واپسی کے لیے ہو لیے تھے، ان کے جانے کے بعد اچانک عیشہ کو یاد آیا کہ کافی دیر سے اس نے فوزان کو نہیں دیکھا، شاید گھنٹہ ڈیڑھ سے۔۔ لاسٹ ٹائم اس نے شہباز حیدر کو فوزان کو اٹھائے مردوں والے حصے میں جاتے دیکھا تھا، اس کے بعد فوزان اسے نظر نہیں آیا تھا، اس نے جس سے بھی پوچھا اس نے لاعلمی کا اظہار کیا تو وہ حقیقتاً پریشان ہو گئی، دیگر لوگ بھی پریشان ہوئے۔

"کہاں جا سکتا ہے بچہ۔۔"

"کہاں نکل گیا بچہ۔۔" چچی جان بھی پریشان تھیں۔

"وہ مجھ سے آئس کریم کھانے کی ضد کر رہا تھا، میں اسے ٹال رہی تھی، پتہ نہیں کہیں خود سے ہی باہر نہ نکل گیا ہو۔۔۔ اسے تو یہاں کے راستوں کا بھی پتہ نہیں۔۔" عیشہ کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا، بس رونے کی کسر باقی تھی۔

"فکر نہیں کرو۔۔ پتہ کرواتے ہیں۔۔" حیدر صاحب اسے تسلی دے کر باہر نکل گئے تھے، عیشہ کی آنکھوں سے باقاعدہ آنسو بہنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد یاسر بھاگتا آیا۔۔ کچھ دیر پہلے وہ فوزان کو ڈھونڈنے نکلا تھا۔

"وہ فوزان۔۔"

"کہاں ہے وہ۔۔؟" وہ فوراً بے تاب ہوئی۔

"شہباز چاچو کی گاڑی میں۔۔۔ وہ اسے آئس کریم کھلانے لے کر گئے ہوئے تھے۔۔ ابھی آئے ہیں، باہر ہی گاڑی میں ہے۔۔" وہ بتا رہا تھا، عیشہ کو ایک گونہ سکون ہوا تو دوسرے ہی لمحے شہباز کا خیال آتے ہی وہ بھنا اٹھی۔

"وہ باہر آپ کو بلا رہے ہیں۔۔" وہ الجھی تھی، یاسر کے اس پیغام پر باقی سب نے بھی سکون کا سانس لیا تھا، اسے شہباز حیدر سے اس قدر غیر ذمہ داری کی امید نہ تھی، کم از کم بتا کر تو جاتے۔ سب کے سامنے پیغام ملا تھا، اکیلے میں تو شاید غصے سے انکار کر دیتی، چپ کر کے وہ باہر چلی آئی۔ مہمانوں کے جانے کے بعد گیٹ ابھی تک کھلا ہوا تھا۔ گاڑی سامنے ہی کھڑی تھی، اسے آتے دیکھ کر شہباز نے فرنٹ ڈور کھول دیا تھا، دوسری طرف واجد صاحب کھڑے تھے۔

"بیٹھو۔"

"جی۔۔؟" وہ جو فوزان کی وجہ سے چلی آئی تھی، رک گئی، باپ کو دیکھا، وہ مسکرائے۔

"جلدی چھوڑ جانا یار۔۔۔ پہلے ہی فوزان کی وجہ سے تم نے سب کو پریشان کر دیا تھا۔۔" اس کے دیکھتے ہی واجد صاحب شہباز حیدر کو کہہ کر اندر چلے گئے تھے۔

"یہیں بیٹھو۔۔" دوبارہ کہا گیا تو وہ غائب دماغی سے بیٹھی۔

"آپ کے پاس تھا تو کم از کم کہیں لے جانے سے پہلے بتا دیا ہوتا۔۔۔ سب پریشان ہو کر رہ گئے تھے۔۔ فوزان کی گمشدگی سے۔۔" وہ الجھ گئی تھی۔ فوزان سو چکا تھا، شہباز کے پاس پچھلی سیٹ پر تھا، سر اس کی جھولی میں تھا، شہباز نے مسکرا کر دیکھا۔

"میں تمہارے سامنے ہی لے کر گیا تھا۔۔ پتہ تو ہے تمہیں۔۔"

"مگر بتا کر نہیں گئے تھے، میں سمجھی تھی کہ آپ شاید باہر مردوں میں ہی بیٹھے ہیں۔۔" فوزان کا سر اپنی جھولی میں رکھ کر اس کی ٹانگیں اس نے سیدھی کیں۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں۔۔ اور مجھے کیوں لے کر آئے ہیں۔۔؟" تھوڑی دیر بعد عیشہ کے حواس کام کرنا شروع ہو گئے تھے، باہر ہر سو پھیلے گہرے تاریک اندھیرے کو دیکھا اور اندر شہباز حیدر کو۔

"رات تم نے فون کیوں بند کر دیا تھا۔۔" اس کے سوال کو نظر انداز کر کے پوچھا تھا، وہ چونکی۔

"تو آپ مجھے رات فون بند کرنے کی سزا دینے یہاں لے کر آئے ہیں۔۔" وہ بے یقینی سے دیکھ رہی تھی۔ شہباز حیدر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ مچل گئی۔

"میں آپ کو اتنا برا نہیں سمجھتی تھی۔۔۔ میرا خیال تھا کہ آپ کے نزدیک میری تھوڑی بہت تو عزت ہو گی مگر آپ تو۔۔" وہ شہباز حیدر کی مسکراہٹ سے کچھ اور ہی سمجھی تھی۔ ایک دم روہانسی ہوئی۔ شہباز کا قہقہہ بے ساختہ تھا، وہ مزید خائف ہو گئی۔

"یہ ہنس کیوں رہے ہیں۔۔؟" وہ ہونق ہو گئی۔ شہباز نے غور سے دیکھا، شرارتی مچلتی مسکراہٹ ہونٹوں پر رقصاں تھی۔ سیاہ خوبصورت لباس میں مٹے مٹے میک اپ میں آنکھوں میں نمی تھی، وہ ابھی بھی بے حد دلنشین لگ رہی تھی۔

"رات فون بند کرنے کے بجائے میری بات سن لیتی تو اس وقت اتنی بدگمان نہ ہوتیں۔" گاڑی سائیڈ پر کھڑی کر کے اس کی طرف رخ کیا تھا، عیشہ کا دماغ سنسنا اٹھا۔ شہباز حیدر کا لہجہ کیا آنکھیں تک بدلی ہوئی تھیں۔

"آپ۔۔" وہ کچھ کہنے کی کوشش میں سختی سے لب سی گئی۔

"نہیں، فوزان کی آئس کریم کھلانے کی ضد پر اسے لے کر گیا تھا، مگر راستے میں کچھ جاننے والے مل گئے تو دیر ہو گئی۔۔ مجھے بالکل بھی اندازہ نہ تھا کہ تم لوگ پریشان ہوں گے۔۔ تم لوگوں کا بھی میری طرف دھیان نہیں گیا تھا ورنہ کال کر کے پوچھ لیتے تو

پتہ چل جاتا۔۔۔ بہر حال واپسی پر واجد بھائی مل گئے تھے، وہ فوزان کو ہی ڈھونڈنے نکلے تھے، میرے ساتھ ہی گھر آئے ہیں، اس لیے پوچھ کر ان کی اجازت سے ہی تمہیں لے کر آیا ہوں۔۔۔"

"کیوں۔۔۔؟" ایک دم وہی لاتعلقی لہجے میں اُتر آئی۔

"بھئی بیوی ہو میری اور آج اس لباس میں لگ بھی بہت خوبصورت رہی ہو۔۔۔" شہباز کا بظاہر انداز نارمل تھا مگر لہجے میں شرارت رچی ہوئی تھی، عیشہ ایک دم کنفیوز ہو گئی، وہ اس لہجے کی عادی کب تھی۔ انہوں نے اس کے شرماتے روپ کو مسکرا کر دیکھتے اس کی چوڑیوں سے بھرا مہندی بھرے گجرے سے مہکتا ہاتھ تھاما، وہ لرز گئی۔۔۔ گھبرا کر چہرہ دیکھا۔

"مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ تم آج زیادہ پیاری لگ رہی ہو یا نکاح کے دن زیادہ خوبصورت تھیں، یا عام گھریلو سادہ حلیے میں دل کے زیادہ پاس لگتی ہو۔" عیشہ عام اعصاب کی مالک نہ بھی ہوتی تو بھی ان جھٹکوں سے بے جان ہو جاتی۔ خوف سے اسے دیکھا۔ یہ شخص تو مسکرا کر بات کرنا تو دور کی بات، کبھی ایک نظر کے بھی روادار نہ تھے اور اب ان کا یہ روپ۔۔۔

"ویسے بے یقینی سے کیا دیکھ رہی ہو۔۔۔ بھئی میں شہباز ہی ہوں۔۔۔" شرارت سے بھرپور انداز تھا، وہ الجھ سی گئی، پھر [illegible] مختصر جواب دے دیا۔

"پلیز ختم کریں اپنا ڈرامہ۔۔۔ آپ کو کوئی حق نہیں کہ آپ میرے جذبوں سے اس طرح کھیلیں۔۔۔ میں نے آپ کی نفرت قبول کی ہے وہ روپ ہی میرے لیے کم تکلیف دہ تھا جو آپ یہ نیا انداز۔۔۔ یہ نیا ڈرامہ رچا بیٹھے ہیں۔۔۔ محض مجھے اذیت دینے کو۔۔۔" اگلے ہی پل وہ رو دی۔ شہباز نے حیرت سے دیکھا پھر ایک دم بازو سے اپنی طرف کھینچا، گود میں فوزان تھا، وہ صرف ان کی طرف لڑھکی تھی۔ انہوں نے اس کی کمر کے گرد بازو حمائل کیے۔

"شٹ اپ۔۔۔ کوئی ڈرامہ نہیں کر رہا تھا۔۔۔ میں تو تمہیں یہ سب رات کو ہی کہنا چاہتا تھا۔۔۔ تمہیں میں نے اتنا ستایا۔۔۔ اتنی تکلیف دی، تمہاری ذرا سی لاتعلقی نے وہ کام کر دکھایا جو تمہاری اتنے عرصے کی محبت نہ کر دکھائی۔۔۔ میں تمہارے سامنے ہارنا نہیں چاہتا تھا، میں تم سے عمر میں بڑا تھا، میں نہیں چاہتا تھا کہ تمہارے ساتھ کوئی ناانصافی ہو۔۔۔ میرا خیال تھا کہ میاں بیوی ہم عمر ہوں تو انڈر اسٹینڈنگ اچھی رہتی ہے، زندگی پرسکون اور خوشگوار گزرتی ہے۔۔۔ ابھی تم نادانی کا مظاہرہ کر رہی ہو۔۔۔ ہو سکتا ہے بعد میں جذبات کا زور کم ہو اور تمہیں احساس ہو کہ تم غلطی پر تھیں، تو بعد میں پچھتانے سے بہتر تھا کہ تم ابھی سے کچھ سوچتیں۔۔۔ زندگی جذبات کے سہارے گزرنے والی نہیں ہے۔۔۔ تم مجھے بہت عزیز ہو، تمہارے ساتھ کوئی ناانصافی ہو، کم از کم میرے نزدیک تو یہ ممکن نہیں تھا۔۔۔ اس لیے میں نے تمہارے لیے خود کو سخت کر لیا، میں جتنی سختی کا مظاہرہ کر رہا تھا، تمہاری محبت اتنی ہی منہ زور طوفان کی طرح آگے بڑھتی جا رہی تھی، میں ڈر گیا تھا، تم سے نہیں خود سے خوفزدہ ہو گیا تھا۔ مجھے اپنے اندر توڑ پھوڑ ہوتی محسوس ہو رہی تھی، تمہارے معاملے میں کمزور پڑ رہا تھا، میرے دل و دماغ میں اک جنگ سی چھڑ چکی تھی، جس کی وجہ سے تمہیں بارہا میں نے سخت رنج، تکلیف اور اذیت سے دوچار کیا تھا، میرے اندر کا اشتعال دن بدن بڑھتا جا رہا تھا، اور ہر بار میرا غصہ تم پر نکلتا تھا، میں ہارنا نہیں چاہتا تھا مگر ہار رہا تھا اور تمہاری ذرا سی لاتعلقی میری رہی سہی انا کو بھی توڑ پھوڑ گئی۔ ایسے میں تم مجھے یہ کہو کہ میں ڈرامہ کر رہا ہوں تو بڑے شرم کی بات ہے میرے لیے۔۔۔" وہ ہکا بکا، پتھر کی طرح ساکن، بغیر پلکیں جھپکائے سن رہی تھی، شہباز حیدر کا چہرہ جس پر جذبے اپنا عکس دکھا رہے تھے، وہ دیکھ رہی تھی، مگر بے یقین تھی، کیا یہ شخص واقعی سچ کہہ رہا ہے، یہ میرا کوئی خواب ہے۔ میری یہ محبت، میرا یہ بدلا انداز، میری توجہ، خیرات نہیں ہے۔۔۔ یہ وہ حق ہے جو میرے نکاح میں ہونے کی حیثیت سے تم ڈیزرو کرتی ہو۔۔۔ کیا اب بھی نہیں مانو گی میں ہارا ہوں تمہاری دیوانگی، محبت کے سامنے۔۔۔ میں نے گھٹنے ٹیک دیے ہیں۔۔۔ اب بولو میری حقیر سی محبت قبول کرو گی۔۔۔ مجھے میری تمام غلطیوں سمیت اپنی محبت کے وسیع دامن میں سمیٹ کر مجھے مالا مال کرو گی۔۔۔ بولو کرو گی۔۔۔" اس نے دونوں ہاتھ تھامے شہباز حیدر یہ بھی بھول گئے

کہ وہ اس وقت کہاں ہیں، عیشہ کی آنکھوں سے آنسو بہتے چلے گئے تھے، وہ سر جھکا گئی۔

"بس اب نہیں رونا۔۔۔ بہت رلایا ہے میں نے تمہیں۔۔۔ تمہاری محبت نے میرے مردہ احساسات کو اک نئی زندگی دی ہے ورنہ بھابی کی وفات کے بعد میں نے اپنے تمام جذبوں امنگوں خواہشوں کو بھی ان کے ساتھ دفن کر دیا تھا کہ اب یہ دل کوئی اور گھر آباد نہیں کرنا چاہتا، طلب خواہش ہر چیز مٹ گئی تھی، تمہارے وجود نے میرے اندر پھر وہ پرانی امنگ پیدا کی ہے تمہارے نام سے۔۔۔ تمہارے وجود سے۔۔۔ میں نے ابا جی اور واجد بھائی سے بات کر لی ہے۔۔۔ تمہارے ایگزام کے انتظار میں مزید صبر نہیں کر سکتا بعد میں بے شک ایگزیم دیتی رہنا، بس اگلے ماہ تک رخصتی ہو جانی چاہیے۔۔۔ بولو خوش ہو نا۔۔۔؟"

عیشہ کا بھی برا حال تھا، وہ تو سب کچھ سمجھ کر بھی نا سمجھ تھی، اس کی بے یقینی دیکھ کر شہباز حیدر کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہوئی، اس کے آنسو اپنی پوروں سے صاف کرتے ہوئے انہوں نے اسے اپنے بازو کے گھیرے میں لیا تو وہ چونکی، جیسے ایک دم خواب سے بیدار ہو گئی ہو۔۔۔ یہ خواب نہیں حقیقت تھی۔۔۔ سچ حقیقت۔۔۔ زخم دینے والا مہربان ہو گیا تھا۔۔۔ اس سے لاتعلقی کا مظاہرہ کرنے والا تعلق داری کا اظہار کر رہا تھا۔ دھتکارنے والا نو رشتوں پر آمادہ تھا، وہ شہباز حیدر کی اس قربت پر جھینپ گئی، دل دھک دھک کرنے لگا، اس نے بے اختیار شہباز کا بازو جھٹکا، ساری صورتحال سمجھ میں آئی تو چہرہ گلنار ہوتا چلا گیا۔ شہباز نے دلچسپی سے اس کا یہ روپ دیکھا۔ یہ روپ بھی پاگل کر دینے والا تھا۔

"افسوس، تمہیں شاید خوشی نہیں ہوئی۔۔۔" انداز سراسر چھیڑنے والا تھا، وہ بے بس ہو گئی، پھر فوراً نفی میں سر ہلا دیا۔

"وہ رخصتی۔۔۔ اتنی جلدی۔۔۔ ابھی تو میں نے پیپرز۔۔۔" شہباز حیدر کی وارفتہ نگاہوں کی زد میں الجھ کر وہ جملہ بھی نامکمل چھوڑ گئی۔

"خدا کو مانو بیوی۔۔۔ ایک ماہ نہیں صبر کرنے والا میں۔۔۔ پہلے سوچا تھا کہ تمہیں اس روپ میں سیدھا اپنے بیڈ روم میں لے جاؤں مگر۔۔۔ تم ہو کہ۔۔۔" وہ شہباز حیدر کے اس قدر کھلے ڈلے انداز پر حواس باختہ ہوئی۔ خوف و شرم سے رنگ سرخ ہوا، چہرہ تپنے لگا۔ اس نے محبت کی بازیابی کی دعا مانگی تھی، اللہ نے اس کی سن لی تھی، اتنی شدت تھی شہباز کی محبت میں، وہ سرتاپا گم ہوتے ہوئے کانپ رہا تھا۔

"تم تو یوں خوفزدہ ہو رہی ہو جیسے میں۔۔۔" اس کی گھبراہٹ سے لطف لیتے ہوئے شہباز حیدر نے اس کا کندھا تھاما، تو وہ کانپ اٹھی۔

"پلیز گھر چلیں۔۔۔ وہ انتظار کر رہے ہوں گے۔" کانپتی لرزتی آواز میں کہتے اس نے چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا تھا۔ شہباز کھل کر ہنسے۔

"واجد بھائی جانتے ہیں اس وقت میرے جذبات کیا ہو رہے ہیں۔۔۔ کوئی نہیں انتظار کر رہے ہوں گے۔۔۔ تم اپنے شوہر کے ساتھ ہو اعتبار کرو یار۔۔۔ ہم دل ہارے ہیں۔۔۔ اور بے ایمانی تو اپنی عادت ہے ہی نہیں۔۔۔ اب یہ لرزنا کانپنا بند کرو۔۔۔ یقین نہیں آتا کہ میری محبت میں پاگل دیوانی ہر چیز کی پروا کیے بغیر میرے سامنے اظہار کرنے والی اس قدر شرم کی پوٹلی بھی ہو سکتی ہے۔۔۔" شہباز حیدر نے ہلکے پھلکے انداز میں اس کا اعتبار اسے لوٹانا چاہا تھا۔ وہ سختی سے لب بھینچ گئی، ہاتھ ہٹا کر دیکھا، وہ مسکرا دیے۔ اس شخص کی قربت میں روح تھی، تو یہ قربت۔۔۔ اور یہ محبت۔۔۔ یہ مسکراہٹ۔۔۔ "اپنائیت و محبت سے چھیڑنا، وہ مسکرا رہے تھے، کھلکھلا رہے تھے، اسے ساتھ ہی ہنسنے پر مجبور کر رہے تھے، اور عیشہ جو ان کی نگاہوں کی وارفتگی، جملوں کی معنی خیزی، آنچل کی قربت سے پزل ہو رہی تھی، نے ایک دم پرسکون ہو کر سیٹ کی بیک سے سر ٹکایا۔ اس کے دل میں یقین بھرتا چلا گیا کہ

اب یہ شخص اس کا ہے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کا ہے

وہ اس کی محبت کی بلا شرکت غیرے تنہا مالک ہے
وہ اس کا دل جیتنے میں کامیاب ہو گئی تھی
کام مشکل تھا مگر وہ فاتح تھی
یہ دل بھی اس کا تھا اور شہباز حیدر بھی
زمانے کو چلنے دو چلو ایک ساتھ چلتے ہیں
نئی دنیا بسانے کو چلو ایک ساتھ چلتے ہیں
ہمیں جیون کا ہر لمحہ تمہارے نام کرنا ہے
یہی وعدہ نبھانے کو چلو ایک ساتھ چلتے ہیں

ختم

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا

تیرے رنگ، رنگ، تیرے رنگ رنگ
میں جہاں بھی جاؤں سنگ میں
تیرے جلوے ہیں میرے سنگ سنگ
تیرے جلوے ہیں میرے سنگ سنگ

"پلیز میڈم کہکشاں! آپ ان بچوں کی بڑی ہینگ بھی تو درست کروا دیں۔" بچوں کی ریہرسل دیکھتے ہوئے وہ کہکشاں کی طرف متوجہ ہوئی۔

"روبا! آپ رائٹ اس طرف چلیں گی۔ ادھر بیٹا!"
اس نے روبا کو کندھوں سے تھام کر صحیح پوزیشن میں کھڑا کیا۔

تو نے عطا کیا، نہ شکر کیا
تو نے اور دیا اور دیتا ہی گیا
دیتا ہی گیا، دیتا ہی گیا

میوزک پورے کمرے میں اپنا اثر قائم رکھے ہوئے تھا۔ طلبہ سمیت وہ بھی اس کے زیر اثر تھی۔

"ارسلان بیٹے! آپ بازو کو ٹھیک نہیں گھما رہے۔ دائیں سے بائیں طرف لے کر سر سے اوپر گزار کر پھر گول چکر بنانا ہے یوں کہ سب بچوں کے بازوؤں کا ایک گول دائرہ بن جائے جب کہ دوسرا یہ دایاں ہاتھ اس طرح سینے پر رہے کہ عاجزی کا اظہار ہو۔ رائٹ؟"

ارسلان کو غلط ریہرسل کرتے دیکھ کر اس نے سمجھایا تو وہ فوراً الرٹ کھڑا ہو گیا۔

تو نے عطا کیا، نہ شکر کیا
تو نے اور دیا اور دیتا ہی گیا
رخ موڑ دیئے دریاؤں کے
میں نے ہواؤں میں اڑنا سیکھ لیا
میں نے ہواؤں میں اڑنا سیکھ لیا
میری اگلی نظر ستاروں پہ، پھر بھی تیرے سہاروں پہ
میں پھر بھی تیرے سہاروں پہ

آواز کی لے کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی نہ ملا رہی تھی ساتھ ساتھ بچوں کو ریہرسل کرتے دیکھتی جا رہی تھی۔

"اوکے ...... ڈن او یری ویل...... کہکشاں! آپ نے تو کمال کر دیا۔ بہت اچھا ٹیبلو ہوگا۔ بس خیال رہے کہ بچے کہیں بھی قدم پر لڑکھڑائیں نہیں اور ان کی باڈی لینگویج بالکل درست ہوں۔ جب تک فنکشن نہیں ہو جاتا مزید ریہرسل کرواتی رہیں۔"

"یس میڈم۔" اس کی ہدایت پر کہکشاں نے فوراً سر ہلایا۔ وہ کمرے سے نکل آئی۔ ابھی وہ کوریڈور سے گزر رہی تھی کہ گیٹ سے پولیس جیپ اندر آتے دیکھ کر رک گئی۔ عبدالباری کو باہر نکلتے دیکھ کر اس کی بھنویں تن گئیں۔

"ہیلو گڈ آفٹرنون ڈیئر۔" وہ رائمل کو دیکھ کر تیزی سے ڈگ بھرتا اس کے مقابل آ کھڑا ہوا تھا۔

"ہیلو۔" رائمل نے بھی لٹھ مار انداز میں اس کے سلام کا جواب دیا تھا۔

"بابا اور امی کہاں ہیں؟" رائمل کے چہرے پر ناگواری کے واضح تاثرات رقم تھے۔ وہ سب دیکھ چکا تھا پھر بھی پوچھے سے باز نہیں آیا تھا۔ رائمل نے اس سوال پر عجیب نظروں سے دیکھا تھا۔

"امی گھر جا چکی ہیں اور بابا آفس میں ہیں۔" وہ اسے ہرگز جواب نہیں دینا چاہتی تھی مگر جواب دیئے بنا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ وہ کسی بھی لمحے کسی بھی حرکت پر اتر سکتا تھا اپنی عزت اسی میں تھی سو مجبور تھی۔

"یہ ہر وقت مجھے دیکھتے ہی تمہارے چہرہ شریف کے بارہ کیوں بج جاتے ہیں۔ اتنی بری شکل تو نہیں ہے میری۔" وہ اس کا مزید ضبط آزمانے کو اس کے سامنے ڈٹ گیا تھا۔ بظاہر بہ لطیف۔

رائمل نے زہر بھری نظروں سے گھورا اور بغیر جواب دیئے آگے بڑھنے لگی تھی لیکن بازو اس کی مضبوط گرفت میں آ گیا تھا۔

"یہ کیا حرکت ہے، چھوڑو مجھے!" وہ بلند غصے سے چیخی تھی۔ اس کی رنگت مزید آتش فشانی بن گئی تھی۔ عبدالباری نے بغور چہرہ جانچا تھا۔

"تم سے میں نے کچھ پوچھا ہے۔" روئی کی طرح نازم بازو میں اپنی انگلیاں پیوست کرتے ہوئے اس نے رائمل کو جھٹکا دیا تھا اور وہ یوں سر عام اس توہین و تذلیل پر ششدر رہ گئی۔ ارد گرد کلاس رومز تھے تقریباً سبھی دروازے وا تھے۔ کھڑکیاں اوپن تھیں۔ وہ لنک وسط میں تھے، چند ایک ٹیچر تو یا ہر دروازے کے پاس آ کر یہ سین ملاحظہ کرنے لگی تھیں اس کے لئے ڈوب مرنے کا مقام تھا۔

"میں تمہارے ملازم اپ میں بند کوئی مجرم یا ملزم نہیں ہوں کہ جس کے ساتھ تم جس طرح مرضی سلوک کرو اور میں خاموش رہوں۔ ظلم کی بھی کوئی حد ہوتی ہے اور تم اپنی حدود سے تجاوز کر رہے ہو۔ بہتر ہے یہاں تماشا دکھانے کے بجائے میرا بازو چھوڑ دو۔" اس نے اس کے پولیس وردی میں ملبوس بھرپور سراپے پر ایک طنزیہ کاٹ دار نظر ڈال کر کہا تھا۔

"چلو، ملزم نہیں ہو تو بنا لوں گا مگر خیال رکھو، بہت چلنے لگی ہے تمہاری یہ زبان۔ اسے کنٹرول میں رکھو، ایسی زبانیں مجھے کاٹنا بھی آتی ہیں۔" جواباً وہ اس سے زیادہ درشتی سے بولا تھا۔

"اپنی زبان کو لگام دو۔" ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑوا کر وہ سرعت سے بھاگی تھی۔ جتنی تذلیل وہ یوں سر عام کر چکا تھا کم تھی کیا۔

وہ ایک دم آفس میں داخل ہوئی اور صوفے پر گر گئی تھی۔ بابا جو اس کے اچانک داخل ہونے پر اسے صرف دیکھ رہے تھے اس کے دھواں دھار رونے پر فوراً چونکے۔ ایک دم اپنی سیٹ چھوڑ کر اس کی طرف آئے تھے۔

"کیا ہوا رائمل؟" اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی، ایک دم دروازہ کھول کر عبدالباری بھی اندر داخل ہوا تھا۔ وہ چپ کا چپ رہ گئی۔

"تم اس وقت یہاں؟" بابا کا رائمل کی طرف سے دھیان ہٹ گیا تھا۔ عبدالباری کی نظریں آنسو بہاتی رائمل پر تھیں جس نے اسے دیکھتے ہی نفرت سے منہ موڑ لیا تھا۔

"ہاں ایک کام تھا، اسی لئے یہاں آنا پڑا۔" عبدالباری رائمل کے ساتھ ہی صوفے پر ٹک گیا تھا۔ رائمل فوراً اٹھ کر دوسرے صوفے پر بیٹھی تھی جب کہ بابا نے کچھ ناپسندیدگی سے اسے دیکھا۔

"کیسا کام؟" بابا برداشت کر گئے تھے تحمل سے پوچھا تھا۔

"میری میر الدین سے ملاقات ہوئی ہے۔ نوراس کا بیٹا میرے لاک اپ میں ہیں، بس یہی خبر سنانے آیا تھا۔" کتنا بڑا دھماکا تھا، وہ حیران رہ گئے۔

"کیا؟" بابا اور رائمل دونوں اسے دیکھتے رہ گئے جو مزے سے انکشاف کر کے دونوں کے چہروں کا بغور جائزہ لیتے ہوئے ٹانگ پر ٹانگ جمائے پاؤں ہلا رہا تھا۔

"آپ کا کیا خیال تھا میں اتنی جلدی اپنے حق سے دستبردار ہو جاؤں گا۔ اس نواز کو اس قابل نہیں چھوڑوں گا کہ وہ کہیں منہ بھی دکھائے اور آپ رائمل کے لئے زمین سے آسمان تک چاہے خاک بھی چھان لیں کسی اور کے نام کا اسے کبھی نہیں ہونے دوں گا۔" وہ تمسخر اڑاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ بابا صوفے پر گر سے گئے۔ رائمل ایک دم اٹھی اور بھاگتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

"یہ کیا کر دیا تم نے۔ نواز بہت اچھا لڑکا تھا۔" اس کے بابا (سجاد علی صاحب) کو اپنی آواز بھی قطعی اجنبی لگی تھی۔

"یہ سب کرنے کے لئے تو آپ نے مجھے مجبور کیا ہے۔ سیدھی طرح بات کی تھی جو آپ کی سمجھ میں نہیں آئی، ہوٹل میں اس وقت اس موضوع کو ڈسکس کرنے نہیں آیا، صرف اطلاع دینا تھی۔ فون پر بھی دے سکتا تھا مگر جب آپ کے تاثرات نہ دیکھ پاتا شاید۔ امی کو بھی بتا دیجئے گا اور یہ بھی خاطر جمع رکھیے کہ اس دفعہ اتنی ڈھیل دی کہ منگنی ہو گئی تھی، اگلی دفعہ اتنی ڈھیل بھی نہیں دوں گا۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"تو پھر تم کیا کرو گے؟ جان سے مار دو گے ہمیں۔ تو پھر مار دو مگر کان کھول کر سن لو تم رائمل کے قابل ہی نہیں۔ اس قابل ہوتے تو پھر رونا کس بات کا تھا۔ اس کا نام لینے سے پہلے خود کو اس کے قابل تو بناتے۔" بابا اپنے جوان، طاقت ور، بہادر اور اکھڑ، تند مزاج اور بگڑے ہوئے بیٹے کو گھور رہے تھے۔ "بہت غلط کھیل کھیل رہے ہو تم۔ کیوں آہیں لینا چاہتے ہو اس یتیم کی۔ اگر وہ تم سے شادی کرنا چاہتی تو سختی تو نہیں کر سکتا اس پر۔ عاقل ہے، بالغ ہے، پھر بھی اس پر ظلم کا یہ پہاڑ توڑوں بھی تو کس بنیاد پر؟ کیا ہو تم؟ دنیا بھر کے آوارہ، رشوت خور اور بھی نہ جانے کون کون سی اخلاقی برائیاں ہیں تم میں۔"

"آپ آپ" وہ اپنی مٹھیاں بھینچ گیا تھا۔ "ابھی تو نواز پر صرف چوری کا مقدمہ ڈالا ہے، اگر آپ نے یا ان میں سے کسی نے بھی یہ رشتہ ختم نہ کیا تو پھر قتل عمد کے کیس میں تمرد آؤٹ پھانسی کے پھندے پر لٹکوا دوں گا۔ پھر نہ کہیے گا کہ عبدالباری نے بتایا نہیں۔ رائمل اگر میری نہ ہوئی تو کسی کی بھی نہیں بننے دوں گا ...... آئندہ خیال رکھیے گا۔" جس طرح وہ دندناتا ہوا آیا تھا اسی طرح چلا بھی گیا تھا، یوں جیسے دنیا اس کی ٹھوکروں کی زد میں ہو۔ سجاد علی صاحب بے دم ہو کر خالی دروازے کو تکتے رہ گئے۔

٭ ٭ ٭

وہ اپنے کمرے میں زاہدہ بیگم کی گود میں سر رکھے مسلسل رو رہی تھی۔

"بس صبر کرو رائنل بیٹی۔" انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔ "تم ہی بتاؤ کیا کروں میں۔ وہ میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ میرے بیچ شکم میں اس کے یہ ہاتھ ڈھلے ہیں جو آج کم زوروں پر ظلم وستم روا رکھے ہوئے ہیں۔ کتنی مظلوم اور بے بس ہوں میں، اسے کوئی بددعا بھی نہیں دے سکتی۔ آخر کو میرے خون سے سینچا ہوا پودا ہے جو آج اس قابل ہوگیا ہے کہ لوگوں کو ٹھوکروں کی زد میں رکھے ہوئے ہے۔"

"بس بڑی امی! میں نے کبھی انہیں کچھ نہیں کہا، آج تو حد ہوگئی۔ سرِعام سب کے سامنے میرا بازو پکڑا تھا، ذلت سے مر جانے کو جی چاہ رہا ہے میرا۔" اسے ابھی تک یہ غم ہی نہیں بھول رہا تھا، دوسرا غم کیا خاک ستاتی۔ انہوں نے چہرہ صاف کیا، بھابی بھی موجود تھیں۔

"کیا پتہ تھا کہ جس بیٹے کو بڑے ناز ونعم سے دودھ مکھن کھلا کر اپنا خون پلا کر پال رہی ہوں وہ ایسا ہوگا۔" انہوں نے اسے بازوؤں میں لے کر چہرہ چوما تھا۔

"بس چپ ہو جاؤ ... آنے دو اس نامراد کو، پوچھوں گی کس گناہ کی سزا دے رہا ہے۔ کیا جرم کیا ہے میں نے.... آخر جان کیوں نہیں چھوڑ دیتا ہماری۔ پہلے ہی ہم اس کی یہ حرکتیں دیکھ کر مر گئے ہیں ... عزت، آبرو، شرافت سب مٹی میں رل گئی ہے۔ برسوں کی کمائی نیک نامی خاک ہوگئی ہے۔ اور کیا چاہتا ہے، کیوں نہیں ہمیں ہمارے حالوں پر چھوڑ دیتا۔" رائنل ان سے ہٹ کر گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹ کر بیٹھی رہی۔

"ایک ہمارا گھرانہ تھا، لوگ مثالیں دیتے تھے اور اب یہی ہمارا گھرانہ ہے کہ رہی سہی عزت بھی مٹی میں مل گئی ہے۔ اور نہ جانے عبدالباری کیا کرے گا ..." کمزور سی تھیں، بھابی نے آگے بڑھ کر انہیں کندھوں سے تھام لیا۔

"یہ تو نور آ گئی تھی۔ بڑے ابو بیٹے ہی منہ ماری کرتے رہے ہیں۔ جب دوبارہ آفس میں گئی تو بڑے ابو سخت تکلیف میں تھے۔"

"بس بیٹی! اپنے ہی نصیب خراب تھے کس سے شکوہ کریں۔ بری صحبت انسان کو کیا بنا دیتی ہے.... سب دیکھ رہے ہیں اپنی طرف سے تو پوری کوشش کی تھی۔" انہوں نے ایک سرد آہ کھینچی تو رائنل چپ ہوگئی۔ اب کہنے سننے کو بچا بھی کیا تھا۔

"آپ یہ انگوٹھی واپس کر دیں ... میں نہیں چاہتی کوئی بے گناہ میری وجہ سے مارا جائے۔ زیادہ سے زیادہ لوگ یہی کہیں گے ناں کہ یہ منگنی بھی ٹوٹ گئی۔ مجھے قطعی پروا نہیں، بس اب اس قصے کو ختم کریں۔ دنیا میں ہزاروں ایسی لڑکیاں ہیں جن کی شادیاں نہیں ہوتیں، ان کی بھی زندگی گزر جاتی ہے، میری بھی گزر جائے گی۔ آپ پر بوجھ نہیں ہوں گی، اگر زیادہ بات بگڑی تو دانش بھائی کے پاس سعودیہ چلی جاؤں گی۔ کتنی مرتبہ وہ بلا چکے ہیں۔" اس نے اپنے ہاتھ سے انگوٹھی اتار کر امی کی گود میں رکھ دی۔ وہ انگوٹھی دیکھ کر مزید رونے لگیں اور رائنل مزید کچھ کہے بغیر باہر نکل گئی۔

سوائے عبدالباری کے، رات کو اس وقت سب ہی گھر پر تھے۔ بابا کمرے میں تھے، بلڈ پریشر ابھی بھی نارمل نہیں تھا۔ فرقان بھائی ان کے پاس ہی تھے۔ رمشا اور فہد دونوں سو چکے تھے۔ مسلسل رونے سے سر بھاری ہو رہا تھا، وہ کچن میں آ گئی۔ سخت بھوک لگ رہی تھی، پیٹ سے کیسی دشمنی۔ چاول ڈال کر کھانے لگی، کھاتے ہوئے بھی مسلسل ذہنی رو بھٹکی ہوئی تھی۔ کسی بھی خیال پر گرفت نہیں رہی تھی۔ چائے بنا رہی تھی جب عبدالباری کی جیپ کا ہارن سنائی دیا۔ آج پھر وہ تین راتیں باہر گزار کر گھر آیا تھا۔ وہ گھونٹ گھونٹ بھرتی چائے کی طرف متوجہ رہی۔

عبدالباری ایک دم دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تھا۔ ابھی بھی فل یونی فارم میں تھا۔ عبدالباری کو دیکھتے ہی بڑی امی نے چہرہ موڑ لیا تھا۔ بھابی سر جھکا گئی تھیں اور وہ اس کے یوں دندناتے انداز میں کمرے میں داخل ہونے پر گھورنے لگی تھیں۔

"اسلام علیکم۔" احسان کرنے والا انداز تھا۔ "آپ دونوں یہاں بیٹھی ہوئی ہیں اور میں سارے گھر میں ڈھونڈ رہا ہوں۔" وہ کمرے میں آ گیا تھا۔ رائنل نے بمشکل ضبط کیا تھا۔ دن بدن اس کے انداز واطوار ناقابل برداشت ہوتے جا رہے تھے۔

"کیوں کوئی کام تھا ہم سے؟" بڑی امی ابھی بھی خاموش تھیں۔ بھابی نے ہی پوچھا تھا۔ وہ جو بغور رائنل کے تیور جانچ رہا تھا، سے لگا تھا۔

"کیوں بھابی جان! بغیر خیریت کے آپ کو یاد نہیں کیا جا سکتا۔ ویسے اطلاعاً عرض ہے آج تین، چار دنوں بعد گھر آیا ہوں تو سب سے کوئی نظر نہیں آیا، سو تجسس فطری امر ہے۔" وہ کافی لاپروائی سے کندھے اچکاتے کہہ رہا تھا۔ رائنل مہر بہ لب رہی۔ امی نے ایک بھرپور شاکی نظر اپنے بیٹے پر ڈالی جس پر ان کی تربیت کا ذرا بھی اثر نہیں ہوا تھا، صرف باپ دادا کا نام ڈبو رہا تھا۔

"بھابی! میں بابا کے پاس جا رہی ہوں، جب کمرہ خالی ہو جائے تو بتا دیجئے گا۔" رائنل کے لئے اس سے زیادہ اس کی موجودگی برداشت کرنا ناممکن تھا۔ چائے کا بھرا کپ ایک طرف رکھ کر بستر سے اتری تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی پیش قدمی کرتی عبدالباری نے ایک دم سامنے آ کر اس کا راستہ روک لیا تھا۔

"عبدالباری! یہ کیا حرکت ہے ... راستہ دو رائنل کو۔" امی کو یقیناً گوارا نہ گزرا تھا جو اتنی دیر سے خاموش ناراض بیٹھی تھیں، ایک دم کہہ اٹھیں۔

"ضرور راستہ دوں گا، پہلے ایک دو حساب ہیں وہ تو کلیئر کر لوں۔" عبدالباری کو تو جیسے اس کی بھی پروا نہیں رہی تھی۔ بھابی اور امی نے بے بسی سے ایک دوسرے کو دیکھا جب کہ رائنل ضبط کے آخری مرحلے پر تھی۔

"تو کیا فیصلہ کیا ہے تم نے؟ نواز کا کیس ختم ہو سکتا ہے اگر تم ہاں کر دو۔" وہ بات ادھوری چھوڑ کر رائنل کا چہرہ تکنے لگا جو بری طرح خود پر جبر کرتی اپنے ہونٹ کاٹ رہی تھی۔

"اس سے کیا پوچھتے ہو، مجھ سے پوچھو....." امی ایک دم بستر سے اتر کر رائنل کو پیچھے کر کے سامنے آ کھڑی ہوئیں۔ "کیا سودے بازی کرنا چاہتے ہو تم ... مجھ سے کرو۔" انہوں نے بری طرح گھورا تھا۔

"آپ میں کون سا انصاف ہے جو آپ سے سودے بازی کروں گا۔" اس نے بھی تلخی سے کہا تھا۔ "اگر ذرا بھی میری پروا ہوتی تو اس سودے بازی پر نہ اترتا۔" اس کا لہجہ زہر خند تھا۔ امی جو نہ جانے کب سے بھری بیٹھی تھیں، انہوں نے ایک دم عبدالباری کا گریبان پکڑ لیا تھا۔

"کون سے انصاف کی بات کرتے ہو تم ... تم اس قابل ہی کہاں ہو کہ تم سے کوئی انصاف کرے۔ پہلے اپنے کرتوت دیکھو، اپنے گریبان میں جھانکو، سوچو کن لوگوں میں اٹھتے بیٹھتے ہو۔ کوئی شریف النفس تمہیں اپنی بیٹی دے گا، تم پر تو تھوکے گا بھی نہیں اور چلے ہو تم رائنل کا نام لینے۔ زبان کھینچ لوں گی میں تمہاری، اگر ظلم کے لئے اٹھنے والے یہ ہاتھ میرے شکم میں ڈھل سکتے ہیں تو میں انہیں توڑ بھی سکتی ہوں۔ سنا تم نے۔" انہوں نے جھنجوڑ ڈالا تھا۔

"امی جان پلیز چھوڑیں ... کس سے سر کھپا رہی ہیں۔ ان تلوں میں تیل نہیں ہے۔ اگر اسے اتنی سمجھ ہوتی تو یہ سب کرتے ہی کیوں۔ رائنل غیر تو نہیں، اپنی عزت ہے۔ یوں سرِعام چوراہے پر تو نہ لائے۔" بھابی آگے بڑھ آئی تھیں۔ رائنل ہاتھوں میں چہرہ چھپا گئی۔ آج پہلی دفعہ ایسا ہوا تھا کہ بڑی امی عبدالباری پر اس طرح برہم ہو رہی تھیں ورنہ ہمیشہ صبر کے گھونٹ پی کر رہ جاتی تھیں، وہ بھی صرف رائنل کی خاطر۔

"نہیں چھوڑوں گی کمینے کو ... کس گناہ کی سزا ہے یہ ... لے لے یہ انگوٹھی۔ خوش ہو جا، توڑ دی ہے رائنل نے منگنی بھی ... اب کیا چاہتا ہے یہ۔" انہوں نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی انگوٹھی عبدالباری کے منہ پر دے ماری تھی جو چہرے پر

لگنے کے بعد زمین پر جا گری تھی۔ بڑی امی اس کا گریبان چھوڑ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

"کیا ہوا ......؟" فرقان بھیا جو شور کی آواز سن کر گھبرا گئے تھے فوراً بھاگے آئے تھے۔

"ہونا کیا ہے...... ؟ اپنے نصیبوں کو رو رہی ہوں کہ مجھ نصیبوں جلی نے ایسے بیٹے کو جنم دیا۔" رائبل نے بڑی امی کو سہارا لیا۔ فرقان بھائی بھی عبدالباری کو دیکھ کر سب سمجھ گئے تھے۔

"کیوں آئے ہو اب تم یہاں ...... یہ تماشا دیکھنے کہ اس ذلت کے بعد ہم کیسے زندہ ہیں۔ اگر ہمارا تماشا دیکھنے کا شوق تمہیں یہاں تین، چار دن بعد کھینچ لایا ہے تو جاؤ جا کر ابو کا تماشا دیکھو، تمہارے دیئے گئے زخموں سے کس طرح تڑپ رہے ہیں۔" فرقان بھیا نے کہا تھا۔ رائبل پھوٹ پھوٹ کر روتی بڑی امی کو کندھوں سے تھام کر باہر لے گئی تھی۔ عبدالباری نے جھک کر زمین پر گری انگوٹھی اٹھائی۔ فرقان بھائی کو لگا کہ جیسے وہ صرف بکواس کر رہے ہیں۔ اس پتھر کو تو جیسے پروا ہی نہ تھی۔ بے پناہ صبر آیا۔ عبدالباری سے مزید سر پھوڑنا فضول تھا۔ وہ ایک غصیلی نگاہ ڈال کر دروازے کی طرف بڑھے۔

"کنزی! تم بھی اپنے روم میں چلو ...... کوئی ضرورت نہیں ایسے شخص کے منہ لگنے کی۔" انہوں نے بھائی کو حکم دیا تھا۔ دونوں چلے گئے تو وہ غصے سے کمرے میں انگوٹھی کو گھورتا رہا۔

"آئی ڈیم شیور...... بے چارہ بچہ۔" اس نے ہاتھ کا مکا دیوار پر مارا تھا۔



* * *

رائبل کے والد عبدالودود صاحب اور سجاد علی دونوں سگے بھائی تھے۔ شروع ہی سے دونوں خاندان ایک گھر میں رہ رہے تھے۔ سجاد علی صاحب کے صرف چار بچے تھے، دو بڑی بیٹیاں عصمہ اور حفظہ دونوں شادی شدہ تھیں، پھر فرقان تھے، ان کی بھی شادی ہو چکی تھی پھر عبدالباری تھا۔ عبدالودود صاحب کے صرف دو ہی بچے تھے دانش جو شادی کے بعد سعودیہ چلے گئے تو وہیں کے ہو کر رہ گئے تھے جب کہ وہ امی ابو کی وفات کے بعد پاکستان میں ہی رہنا چاہتی تھی۔ دوسرے وہ شروع سے ہی اس گھر میں رہی تھی۔ ایک دفعہ بھائی کے ساتھ سعودیہ گئی تو صرف چند ماہ ہی رہ سکی، اسکی بیمار ہوئی کر فوراً لوٹ آئی۔ دوبارہ جانے کو دل ہی نہیں چاہا تھا۔

عبدالباری اور اس کی عمروں، مزاجوں بلکہ نقطہ نظر اور عادات وغیرہ میں بھی بہت فرق تھا۔ عبدالباری اس سے عمر میں کافی بڑا تھا جب وہ چھٹی میں تھی تو عبدالباری نے ایف اے کا امتحان کلیئر کیا تھا۔ وہ شروع سے ہی لائق تھا، پوزیشن ہولڈر رہا تھا۔ اس کے والد عبدالودود سرکاری ملازم تھے، اور سجاد علی آرمی میں تھے۔ پاکستانی فوج کے لئے ان کی بہت اعلیٰ و نمایاں خدمات تھیں۔ ان کے وہ نہ صرف جذبہ حب الوطنی سے لبریز تھے بلکہ انہوں نے اپنی اولاد کی تربیت بھی ان ہی خطوط پر کی تھی۔ جب تک عبدالباری ان کے زیر سایہ رہا تھا، بہت فرماں بردار، مؤدب اور شریف لڑکا تھا۔ اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد سجاد علی صاحب نے اپنا ذاتی سکول کھول لیا تھا جہاں ان کا اچھا وقت گزرنے لگا تھا، جب تک انہوں نے عبدالباری پر توجہ دی تھی وہ ٹھیک رہا تھا مگر جیسے ہی انہوں نے اپنا ہاتھ کھینچا وہ بھی قابو سے باہر ہو گیا۔

عبدالباری کا شمار کبھی بھی نارمل بچوں میں نہیں رہا تھا۔ اس کے اندر شروع سے ہی ایک اضطرابی کیفیت پائی جاتی تھی۔ جنونی و شدت پسندانہ سوچ کا حامل فرد تھا۔ وائل عمری میں اس کی تربیت پر خصوصی توجہ دی گئی تھی، کیڈٹ اسکولز اور ہاسٹلز وغیرہ میں رہنے سے وہ کافی سدھر رہا تھا مگر جب تعلیم کے بعد اس نے یہ سول سروس جوائن کی تو وہ بگڑنا شروع ہو گیا تھا۔ ایس پی کے عہدے پر فائز ہوتے ہی اس کی سرگرمیاں مشکوک ہو گئی تھیں۔ بابا، جنہوں نے اپنی ساری زندگی محبت، شرافت، دیانت داری، ایمان داری، حب الوطنی، وفاداری جیسے اصولوں کا پرچار کرتے گزار دی تھی ان کے لئے یہ سرگرمیاں بہت تکلیف دہ تھیں۔ سب نے اپنی طرف سے بہت

کوشش کی تھی کہ وہ سدھر جائے مگر اب جو کچھ وہ کر رہا تھا وہ سب پر حاوی تھا۔ رشوت خوری، غنڈہ گردی اور ظلم و جبر کا جو بازار وہ گرم کیے ہوئے تھا تب سے ان کا دل اب اچاٹ ہونے لگا تھا۔ رہی سہی کسر اب اس کی اس ضد نے پوری کر دی تھی۔

برسوں پہلے سجاد صاحب نے جب عبدالباری نے انٹر میں پوزیشن لی تھی تو سرسری لہجے میں عبدالودود سے رائبل کے لئے بات کی تھی، جب عبدالودود وقت آنے گا تو دیکھا جائے گا کہہ کر ٹال گئے تھے۔ نہ جانے عبدالباری کو اس بات کی کیسے بھنک پڑ گئی تھی کہ پہلے ہی، رائبل نے بی اے کا امتحان دیا تھا اس نے اپنا مدعا بیان کر دیا تھا۔ ایک سال پہلے ہی رائبل کے والدین کا انتقال ہوا تھا، اب ساری ذمہ داری سجاد علی یا پھر دانش کے کندھوں پر تھی۔ سجاد علی اور امی نے رائبل سے بات کی تو اس نے انکار کر دیا اور پھر کیا تھا رائبل، عبدالباری کی ضد بن گئی تھی۔ وہ اسے ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا تھا چاہے اسے اس کے لئے کچھ بھی کرنا پڑے۔

رائبل کی پہلی منگنی کنزی کی بھابی کے کسی کزن فیصل سے ہوئی تھی، بظاہر کوئی بات نہیں ہوئی تھی مگر نہ جانے عبدالباری نے فیصل کو کیسے اور کیوں راضی کر لیا تھا کہ اس نے والدین کی پروا کیے بغیر رائبل سے منگنی توڑ دی تھی پھر اب دو ماہ پہلے ہی اس کا رشتہ سجاد علی صاحب کے دوست امیر الدین کے صاحبزادے نواز سے طے ہوا تھا، رشتہ طے کرتے وقت انہوں نے مختصراً امیر الدین کو اپنے بیٹے کی ضد سے متعلق بتا دیا تھا سو دو ماہ گزرنے کے باوجود منگنی برقرار رہی تھی عبدالباری کا ہر حربہ استعمال کرنے کے باوجود۔ لیکن اب اس نے جو طریقہ اختیار کیا تھا اس سے رائبل مجبور ہو گئی تھی کہ وہ یہ رشتہ ختم کر دے۔



* * *

وہ کمرے کی کھڑکی کھولے مسلسل کسی غیر مرئی نقطے کو گھور رہی تھی۔ دل کی حالت عجب سی تھی۔ نہ ہی کوئی خوب تھا اور نہ ہی کوئی تصور۔

اس کی آنکھیں بس ساکت سی تھیں۔ اپنی کم نصیبی کا ایک درد اندر ہی اندر بہہ رہا تھا۔ اب شاید تا عمر اس درد سے چھٹکارا ممکن تھا۔ عبدالباری کا خوف اس کی وحشت، اس کے کچھ بھی کر گزرنے کا انداز اب ہی جاں گسل تھا کہ بہت مجبور ہو کر اس نے اتنا بڑا قدم اٹھایا۔ اب ایک دفعہ پھر اس کی ذات اشتہار بننے والی تھی مگر اب اس نے سوچ لیا تھا مزید کوئی ذلت، کوئی رسوائی، کوئی جبر نہیں سہنا۔ خاموشی سے یہاں سے دانش بھیا کے پاس چلے جانا ہے۔

وہ کھڑکی بند کر کے باہر نکل آئی تھی۔ ابھی اس کا ارادہ بڑی امی کے کمرے میں جانے کا تھا جب اپنے کمرے سے عبدالباری کو نکلتے دیکھ کر رک گئی۔ وہ اس وقت شاید ڈیوٹی کے لئے نکل رہا تھا۔ فل یونیفارم میں تھا، اپنے دھیان میں تھا، رائبل کو نہیں دیکھا تھا۔ رائبل تیز تیز قدم اٹھاتی آگے بڑھ آئی تو وہ اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر چونکا۔

"مجھے تم سے بات کرنی ہے۔" وہ آج پہلی دفعہ بہت عرصے بعد بغیر کوئی حوالہ دیئے کہہ رہی تھی۔ عبدالباری کے لئے یہ امر بہت حیران کن تھا۔ اس نے بغور رائبل کو دیکھا۔ نہ جانے ضد تھی کہ کیا تھا؟ طلب اسی چہرے پر آ کر ختم محسوس ہوتی تھی۔ حسین خدوخال سے بھرپور حسن لئے دلکش و دلفریب، سرخ و سفید ہوتا چہرہ، گہری سوئی سوئی آنکھوں پر سایہ فگن لانبی پلکیں اور ان کے سوجے سرخ ہوتے ڈورے۔ ایک بھرپور کشش تھی اس چہرے میں۔ نہ جانے عبدالباری کی نظر کی وسعت اتنی محدود تھی یا پھر اس چہرے کا تاثر ہی اتنا بھرپور تھا کہ ساری دنیا کا حسن اس چہرے پر آ کر ختم ہوتا محسوس ہوتا تھا۔ عبدالباری کی نظروں کی تپش سے یہ ساحرانہ نقش و نگار سے بھرپور شکن وجود نا قابل برداشت لہر کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ رائبل کا جی چاہ رہا تھا کہ اس کی آنکھیں پھوڑ دے۔ جب سے اس نے اپنا نام اس کے منہ سے سنا تھا ایک نفرت سی ہونے لگی تھی۔ عبدالباری کی نگاہوں میں سوائے بے خیالی کے کچھ اور نظر آتا ہی نہیں تھا۔ کچھ تھا اور کچھ عبدالباری کی نظروں کی گرفت سے وہ مزید سرخ سی ہو گئی تھی۔ عبدالباری نے بھرپور توجہ سے دیکھا۔ چہرے سے صاف

لگ رہا تھا کہ وہ ساری رات ایک پل کو بھی نہیں سو سکی۔ آنکھیں علیحدہ مسلسل گریہ وزاری کی کہانی سنا رہی تھیں۔ عبدالباری سے تحریر انداز میں اس کا یہ روپ نظروں میں بسا یا تھا۔ رائنل بمشکل برداشت کر پا رہی تھی ورنہ دل تو چاہ رہا تھا کہ خود پر اس قدر بے باکی سے بے غیرتی سے اٹھنے والی آنکھوں کو نوچ ڈالے۔ وہ ایسا کر بھی دیتی اگر سامنے عبدالباری نہ ہوتا۔

"خیریت؟" اس کے صبر کا امتحان بہت تھا۔ بہت باریک بینی سے اس کے تاثرات نوٹ کرتے ہوئے مسکرا کر عبدالباری نے پوچھا تھا۔

رائنل نے کاٹ دار نظر ڈالی۔ "بھلا تمہاری موجودگی میں کوئی خیریت ہوسکتی ہے۔" دل ہی دل میں سوچا۔

"تم یہ نوازو والا قصہ ختم کرو، جو تم چاہتے ہو وہ ہو گیا ہے۔ اصولاً تو تمہیں اسے رات کو ہی چھوڑ دینا چاہئے تھا کیوں کہ تمہاری ڈیمانڈ کل ہی پوری ہوگئی تھی مگر اس کے والد کا فون آیا ہے وہ اب بھی تمہارے لاک اپ میں بند ہے..... آخر چاہتے کیا ہو تم؟" وہ چیخ گئی تھی۔ کافی تلخی سے پوچھا تھا۔ جواباً رائنل کی پریشانی و فکر کی پروا کئے بغیر وہ مسکرایا۔ وہ مزید سلگ گئی۔

"میں کیا چاہتا ہوں؟" پرسوچ انداز میں دہرایا۔ "کاش رائنل بیگم! تم یہ سوال اس وقت پوچھتیں جب تم نے میرے لئے انکار کیا تھا۔ میری ڈیمانڈ کیا ہے تم بخوبی جانتی ہو میں کیا چاہتا ہوں تم بے خبر نہیں ہو۔" وہ اس کی طرف بڑھ آیا تھا۔ رائنل لب بھینچے کھڑی رہی۔

"نواز کا انتا درد ہے تمہارے سینے میں..... اس کے لئے، تنا تڑپ رہی ہو اور جو میں چاہ رہا ہوں اس کے لئے کبھی غور کر دیکھا نہیں۔" وہ اس سے ہر قسم کی توقع کر سکتی تھی، اس وقت تو حد تھی۔ وہ اس کی کیفیت محسوس کر کے مسکرایا تو وہ انگاروں پر لوٹنے لگی۔

"تم نواز کو کب چھوڑ رہے ہو؟" وہ صرف اتنا ہی پوچھ سکی۔

"اتنی جلدی بھی کیا ہے تمہیں؟ تمہارے حوالے سے رشتے داری تو نکلی ہی، کچھ عرصہ نوازی بھی نبھانا چاہتا ہوں تاکہ تم رشتے داری کی نوعیت پر غور تو کر سکو.... تنا تو جان لے کر کس سے الجھا ہے..... اسے اندازہ تو ہونا چاہئے ناں کہ عبدالباری کی منظور نظر تمہاری سستی تو نہیں۔" وہ اس کے انداز گفتگو، لہجہ اور لب و لہجے پر آنکھیں پھاڑے اسے دیکھے گئی۔ کتنا غلط تھا یہ شخص، کتنا کر پٹ، دھوکے باز وہ دکھ سے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ گئی۔

"کتنا ظلم کرو گے، ڈرو؟ مت بھولو کسی مظلوم کی جس عہدے پر تمہیں اتنا گھمنڈ ہے وہ کبھی بھی ہمیشہ تمہارا ساتھ نہیں دے گا۔ اللہ بھی ہے، اس کو مت بھولو تم جیسے لوگوں کا انجام بہت عبرت ناک ہوتا ہے۔ ایسے درندے ہو تم کہ جس میں انسانیت نام کو نہیں۔" وہ غصے سے خود پر قابو نہیں رکھ پائی تھی۔ سب سوچتے ہوئے پھٹ گئی تھی جب کہ وہ صرف مسکرایا تھا۔

"ویل ڈن۔ بہت اچھا بول لیتی ہو تم تو۔ یہ جوہر بھی چھپا رکھے ہیں تم نے اپنے اندر، علم ہی نہیں تھا مجھے۔ دل تو چاہ رہا ہے کہ اچھا سا سرپرائز دوں۔" وہ ہونٹوں میں مسکراہٹ دبائے خاموش ہوا تھا، وہ بھونچکا ہو کر دیکھتی رہ گئی یعنی کچھ اثر نہیں تھا۔

"مگر کیا کروں اگر انعام دینے لگا تو تم انعام دیکھ کر ناراض ہو جاؤ گی۔ چلو پھر کبھی سہی، ساری عمر تمہیں ہی سننا ہے۔ ویسے لو، دیکھو تمہارے چکر میں میرا کتنا وقت نکل گیا ہے۔ میرے پاس اس وقت بالکل بھی وقت نہیں ہے مائی ڈیئر! پھر کبھی بات کروں گا۔ اوکے ٹیک کیئر، اللہ حافظ!"

اس کے بت بنے وجود پر ایک گہری نظر ڈال کر گہری مسکراتی نگاہوں سے دیکھتے انگلیوں سے رخسار کو چھوتے اس کو اپنے راستے سے ہٹا کر وہ آگے بڑھا تو وہ بھی جیسے چونکی۔

"دیکھو.... باری! پلیز میری بات سنو.... تم اسے چھوڑ دو.... اس کا باپ ہارٹ پیشنٹ ہے، ماں بھی بیمار ہے۔ وہ لوگ

مر جائیں گے۔ وہ ان کا اکلوتا بیٹا ہے۔ اسے چھوڑ دو پلیز۔" اس نے کبھی بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ کبھی اس پتھر دل احساس و رحم سے عاری شخص کے سامنے گڑگڑائے گی بھی۔ اس کا راستہ روکے کھڑی ہوگئی تھی، آنسو الگ بہنے لگے تھے۔

"کتنا ہے وہ رقیب روسیاہ بہت اہم ہو گیا ہے تمہارے لئے۔ یہ آنسو، یہ انداز۔ ہیں ناں؟" وہ اس کو ہراسانی پر کچھ کہہ بھی نہ سکی۔

"دیکھو..... ابھی سے سوچ لو..... محبت و چاہت کے چکر میں مت پڑنا ورنہ زندہ نہیں چھوڑوں گا اسے....." بے رحم، سنگ دل لہجہ ہو گیا تھا۔

"بکواس مت کرو تم۔ انسانیت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔"

"واقعی۔" عبدالباری نے رائنل کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔ وہ بے بسی سے ہونٹ کچلنے لگی۔ "چلو جاؤ کیا یاد کرو گی۔ پہلی دفعہ اپنی زبان سے کچھ مانگ رہی ہو، مجھے وہ ہمارا رقیب ہی سہی۔ ان آنسوؤں کا کچھ تو پاس رکھنا ہے۔ مگر خیال رہے میری جان۔ پھر آئندہ بھی صورت حال پیش نہ آئے۔ یہ تو زندہ بچ رہا ہے، کسی اور کو سانس لینے کی مہلت بھی نہیں دوں گا۔ عقل مند ہو، اشارہ ہی کافی ہے۔ سمجھیں تم!"

رائنل کو ایک طرف ہٹا کر وہ نکل گیا تھا۔ اس نے بمشکل اپنی رکی سانسیں صرف کیں اور عبدالباری کے غرور، گھمنڈ سے اٹھے قدم دیکھتی رہ گئی۔



*

"یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟" بڑی امی نے پوچھا تھا تو وہ سر ہلا گئی۔

"ٹھیک ہے۔ میں فرقان سے کہتا ہوں وہ تمہارے جانے کے انتظامات کر دے۔" اس وقت سب ہی سوائے عبدالباری کے لاؤنج میں بیٹھے ہوئے تھے جب اس نے دانش بھائی کے پاس جانے کا فیصلہ سنایا تھا۔ کچھ دیر تو سب پر ایک سکتہ سا طاری ہو گیا تھا مگر پھر اس خاموشی کو بابا نے توڑا تھا۔ فرقان بھائی نے صرف اسے دیکھا تھا، بابا اسی خاموشی سے اٹھ کر لاؤنج سے نکل گئے۔

"تم عبدالباری کے لئے مان جاؤ، شاید اسی طرح میرا بیٹا سدھر جائے۔" اگلے دن بڑی امی نے اس سے کہا تو وہ حیران ہو کر دیکھنے لگی۔ "میں کیا کروں میرا دکھ کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ اتنا بڑا کیا، پالا پوسا، اچھی تربیت کی، کیا صرف اس لئے کہ اس طرح وہ بگڑ جائے۔ وہ تمہاری طلب کر رہا ہے، ہوسکتا ہے تمہارے ذریعے اللہ اسے ہدایت دے دے۔ وہ راہ راست پر آ جائے اور محبت سے نکل آئے۔" وہ کتنی خوش فہم تھیں۔ رائنل نظریں چرا گئی۔ وہ صرف ایک خوش فہمی کی خاطر ساری زندگی داؤ پر لگا سکتی تھی۔

"رائنل۔" انہوں نے پکارا تو وہ چہرہ پھیر گئی۔

"مجھ سے وہ چیز طلب مت کریں بڑی امی، جو میں دے نہ سکوں۔ ہوسکتا ہے اب آپ کی خاطر میں مان جاؤں مگر ساری زندگی آپ کے بیٹے کے ساتھ گزارنا بہت مشکل ہے۔ مجھ میں نہ ہی اتنا حوصلہ ہے اور نہ ہی دم خم۔ اگر میں ان کی ضد نہ ہوتی تو شاید یہ سوچتی بھی، جب انسان ضد پر اتر آئے تو رشتوں کا تقدس اور احترام باقی نہیں رہتا۔ آپ نہ جانے کون سا رشتہ نبھانا چاہتی ہیں۔" وہ خاموش ہو گئی تھی۔ ایک طرح سے رائنل نے صاف انکار کر دیا تھا۔

"ٹھیک ہے بیٹی! زبردستی نہیں۔ ماں ہوں ناں، خوش فہم ہوں۔ صرف اپنے بیٹے کا سوچ رہی ہوں، تمہاری پروا نہیں کی، معاف کرنا۔ اللہ تعالیٰ تمہارا نصیب اچھا کرے۔" وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اس کے کمرے سے باہر نکل گئی تھیں۔

رات کو عبدالباری کچھ جلدی آ گیا تھا۔ رائنل کچن سمیٹ کر باہر نکلی تو وہ لاؤنج میں بابا اور بڑی امی کے ساتھ کسی بحث میں الجھا ہوا تھا۔ وہ جب بھی گھر لوٹتا تھا ایک ہنگامہ ضرور برپا ہو جاتا تھا۔ اس وقت بھی نہ جانے موضوع بحث کون تھا۔

"تو پھر آپ نے طے کر رکھا ہے کہ میری بات نہیں مانیں گے۔" وہ غصے سے بڑے بابا سے کہہ رہا تھا۔ رائنل جو اندر داخل ہو رہی تھی یہ سن کر وہیں رک گئی۔

"تم غلط ضد پر اڑے ہوئے ہو۔ رائنل سے تمہاری شادی کبھی نہیں کروں گا۔ مجھے یہ گوارا ہے کہ وہ ساری عمر یوں ہی رہے مگر یہ گوارا نہیں کہ وہ تم جیسے ناہنجار اور آوارہ صفت انسان کی بیوی بنے۔ وہ ہیرا صفت لڑکی تمہارے قابل ہی کہاں ہے۔"

"ہونہہ... یہ اگر آپ کی ضد ہے تو پھر میری بھی ضد ہے۔ اگر اس کی شادی مجھ سے نہ ہوئی تو پھر میں اسے اس قابل بھی نہیں چھوڑوں گا کہ وہ کسی اور کی بن سکے۔" یہ الفاظ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں دنیا جہاں کا غرور و تکبر سمٹ آیا تھا۔ رائنل اور بڑی امی اپنی جگہ کانپ سی گئیں۔

"خدا کو کچھو عدل... کیا بگاڑا ہے اس بے چاری نے تمہارا۔ کیوں ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئے ہو اس کے۔" اس کے الفاظ سن کر بڑے بابا غصے سے گھورنے لگے تھے تو بڑی امی رونے لگیں۔

"میں یہاں سے کہہ رہا ہوں مجھے ہر حال میں رائنل سے شادی کرنا ہے۔ وہ کہیں نہیں جائے گی اور نہ ہی میں اسے کہیں جانے دوں گا۔ میں صرف ایک ہفتے کے لیے ایک ضروری کام سے کراچی جا رہا ہوں... واپس آؤں تو کوئی فیصلہ کر لیجیے گا ورنہ..." وہ رک گیا تھا۔ رائنل کو لگا اس کا ورنہ اس کے بدن سے روح کھینچ لے گا۔

"بابا جان! اگر دیکھو آپ نے ڈھیل دی ہے تو آنکھیں میں نے بھی بند نہیں کی ہوئیں۔ رائنل کم عمر یا کوئی بچی نہیں ہے کہ میری ضد نہ سمجھ سکے... وہ سمجھ گئی ہے جو چیز ایک دفعہ میری نظر میں آ جائے تو پھر وہ صرف اور صرف میری ہوتی ہے۔ بس ان دانش کی ضرورت ہے اسے ورنہ ساری عمر پچھتائے گی... بتا دیں اسے کہ باعزت طریقے سے اس سے نکاح پڑھوانا چاہتا ہوں..." وہ بابا کے سامنے کوئی لحاظ و مروت رکھے شرم و حیا کے بغیر کہہ رہا تھا۔ انہیں بے پناہ غصہ آ گیا۔

"بکواس بند کرو تم... بے شرم، بے حیا... ذرا بھی خیال نہیں تمہیں کہ کس کے بارے میں یہ الفاظ کہہ رہے ہو۔ لوگ عزت کی خاطر جانیں تک دے دیتے ہیں اور تم ہو کہ گھر کی عزت کو ہی داغ دار کرنے پر تلے ہوئے ہو... نہیں کروں گا میں تم سے اس کی شادی... بھیج رہا ہوں میں اسے اس کے بھائی کے پاس۔"

"میں نہیں جانتا ہوا آپ تلے ہوئے ہیں... وہ کہیں نہیں جائے گی۔ میں اسے کہیں نہیں جانے دوں گا۔" وہ بڑے بابا سے زیادہ غصے میں بول رہا تھا۔

"بکواس نہیں کرو... دفعہ ہو جاؤ یہاں سے... کس رشتے اور کس ناتے تم اسے روکو گے، جب میں اسے بھیجوں گا اور اس کا بھائی اسے اپنے پاس بلوائے گا تو تم کون ہوتے ہو روکنے والے... چلے جاؤ یہاں سے... بہت برداشت کر لیا میں نے تمہیں۔ آئندہ میرے گھر میں قدم رکھنے کی بھی ضرورت نہیں۔ مجھے زمانے بھر کی آوارہ، ایسی بے شرم و حیا اولاد کی قطعی ضرورت نہیں۔ کوئی تعلق نہیں میرا تم سے..." بڑے بابا سب کہہ گئے تھے۔ امی رونے لگیں۔

"تعلق اس طرح توڑنے سے کبھی ٹوٹا نہیں کرتے... ابھی تو میں جا رہا ہوں مگر اب انشاءاللہ کوئی انتظام کر کے ہی آؤں گا۔ دیکھتا ہوں کون بھجواتا ہے اسے یہاں سے۔" رائنل خاموشی سے دروازے سے ہٹ گئی۔ کمرے میں آ کر بستر پر یوں گری جیسے اس میں جان تک نہ ہو۔

دو ہفتے لگے تھے، اس کے جانے کی سب ہی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ عبدالباری کراچی سے واپس لوٹا تو کافی پرسکون

تھا۔ جاتے ہوئے جو دھمکی دے کر گیا تھا ابھی تک کوئی عمل درآمد نہیں ہوا تھا اس کی طرف سے۔ فکر مند تو سب ہی تھے مگر عبدالباری کی طرف سے سکون رہا تو سب مطمئن سے ہو گئے۔

آج اس کی فلائٹ تھی، فرقان بھائی اسے ایئرپورٹ چھوڑنے جا رہے تھے۔ عبدالباری کے سوا سب ہی گھر پر تھے۔ اس کی جدائی کے خیال سے سب ہی اشک بار تھے۔ خود اس کی اپنی حالت بھی رو رو کر بری ہو رہی تھی۔

"اپنا خیال رکھنا، سب کو سلام کہنا۔" بڑی امی نے خاص تاکید کی تھی۔ وہ سر ہلا کر رہ گئی۔

"چلو رائنل! بہت کم وقت رہ گیا ہے۔" فرقان بھائی نے کہا تو سب سے مل کر وہ باہر آ گئی۔

سارا راستہ وہ خاموش رہی تھی۔ مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے بھی وہ چپ سی تھی۔ اپنا پاسپورٹ اور ٹکٹ چیک کروانے کے مرحلے میں وہ بری طرح چونکی تھی جب وہاں موجود لڑکی نے اس کی سیٹ کینسل ہو جانے کا کہا تھا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے... میری سیٹ کیسے کینسل ہو سکتی ہے؟" وہ بے پناہ متفکر ہو چکی تھی۔ وہ لڑکی دوسری طرف متوجہ ہو گئی تو اس نے پیچھے پلٹ کر فرقان بھائی کو دیکھا۔ پریشانی سے برا حال تھا۔ مزید کچھ پوچھے بغیر وہ ان کی طرف بڑھ آئی۔ ساری بات بتائی تو وہ بھی فکر مند ہو گئے۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے... بھلا یہ سیٹ کیسے کینسل ہو گئی؟" وہ بھی حیران تھے۔

"تم یہاں بیٹھو، میں معلوم کرتا ہوں۔" وہ اسے بٹھا کر کاؤنٹر کی طرف چلے گئے تھے۔ وہ ہراساں سی بیٹھی انگلیاں چٹخاتی رہی۔ کچھ دیر بعد لوٹے تو کھنچے ہوئے تھے۔

"کیا ہوا؟" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کچھ نہیں... تم آؤ میرے ساتھ۔" وہ اسے لے کر وہاں سے نکل آئے تھے۔ واپسی کے راستے پر گاڑی ڈرائیو کرتے وہ انہیں دیکھے گئی۔

"کیا بات ہے بھائی... کیا ہوا؟" وہ مزید صبر نہیں کر سکی تھی۔

"بہت اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آیا ہے عبدالباری... زندہ نہیں چھوڑوں گا میں اسے۔" ان کی آنکھیں خون رنگ ہو رہی تھیں۔ وہ کچھ سمجھی اور نہ سمجھی کی کیفیت میں انہیں دیکھے گئی۔ مزید کچھ پوچھنے کی ہمت ہی نہ ہو سکی تھی کہ دونوں گھر آ گئے۔

گھر میں قدم رکھتے ہی دونوں کا پہلا سامنا عبدالباری سے ہی ہو گیا تھا۔ وہ سامنے صوفے پر بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ سامنے ہی بڑی امی اور کنزی بھابی تھیں۔ سب کے چہروں پر ایک عجیب سی بے بسی رقم تھی شاید وہ بھی باخبر ہو چکے تھے۔

"کچھ جلدی نہیں آ گئے آپ لوگ... میرا تو خیال ہے آج رائنل کی فلائٹ ہے۔ کیوں رائنل؟" وہ مسکراتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ کیسی فاتحانہ مسکراہٹ تھی اس کے ہونٹوں پر اور رائنل خالی نظروں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

"تم... تم..." فرقان بھائی طیش میں آگے بڑھے تھے۔ "بہت اوچھا وار کیا ہے تم نے... بہت کمینگی پر اتر آئے ہو تم۔" اپنی جیب سے کچھ کاغذات نکال کر انہوں نے عبدالباری کے چہرے پر دے مارے تھے، باقی سب ساکت تھے۔ شاید ان پر یہ اذیت پہلے ہی گزر چکی تھی۔ رائنل کچھ نہ سمجھ پا رہی تھی۔ اس کا ذہن بالکل خالی ہو رہا تھا۔

"مجھے الزام دینے کا آپ لوگ حق نہیں رکھتے، میں نے پہلے ہی باخبر کیا تھا آپ کو۔"

"باخبر کیا تھا تو پھر یہ کیا ہے؟ کیوں ہمیں بے عزت کرنے پر تلے ہوئے ہو..." بھائی نے کاغذات اٹھا کر دوبارہ اس کی آنکھوں کے سامنے لہرائے تھے۔ رائنل بے دم سی آگے بڑھی۔

"کچھ نہیں... صرف اتنا بتانا چاہتا تھا کہ اگر صحیح طریقے سے مجھے میری چاہت حاصل نہ ہو تو میں غلط طریقے بھی استعمال کر سکتا ہوں۔ یہ تو صرف جھوٹے کاغذات ہیں، میں اصلی بھی تیار کروا سکتا ہوں۔ گر آپ لوگ اور رائبل مان جائیں تو ٹھیک ورنہ یہی کاغذات اصلی ثابت ہو سکتے ہیں۔" وہ نہ جانے کیا کہہ رہا تھا۔ رائبل کے کچھ پلے نہیں پڑ رہا تھا۔ وہ امی کے پاس گری گئی تھی۔

"فرقان! اسے کہو یہ یہاں سے دفع ہو جائے۔ جو کرنا تھا یہ کر چکا ہے۔ اب میں اسے اپنے گھر میں مزید برداشت نہیں کر سکتا... آج یہ نکاح کے جھوٹے کاغذات لے آیا ہے، کل یہ گواہ لے آئے گا۔" بابا مزید برداشت نہیں کر سکتے تھے، اندر کھڑی ہوئی رائبل بری طرح چونکی... تو... وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی کچھ کچھ سمجھ رہی تھی۔

"یہ جھوٹے سہی مگر اتنی طاقت رکھتے ہیں کہ کسی کو روک سکتے ہیں۔" ایک چبھتی ہوئی نظر اس نے رائبل پر ڈالی تھی۔

"میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ انتظام کر لیں... اب بھی کہہ رہا ہوں، یہ کاغذات جھوٹے سہی مگر رائبل کہیں نہیں جائے گی۔ آج یہ رک گئی ہے، کل میں انتظار نہیں کروں گا۔" کتنا سفاک اور ظالم تھا وہ۔ ذرا بھی ماں باپ کی پروا نہیں تھی۔ وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر سسک گئی تھی۔

"قانونی طور پر تو میری بیوی کو کہیں بھیجنے کا کیا، اپنے گھر رکھنے کا بھی حق نہیں رکھتے... آپ... یہ صرف ایک قدم اٹھایا ہے میں نے... اگر چاہتے ہیں آپ کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے تو بھیج دیجئے اسے ورنہ خود لے لوں گا۔ اب میں کچھ بھی نہیں دیکھوں گا۔ یہ کاغذات اسے میری بیوی ثابت کرتے ہیں وہاں اس جھوٹ کو آپ بھی ثابت نہیں کر پائیں گے۔"

"دفع ہو جاؤ یہاں سے... جاؤ جو کرنا ہے کر لو۔" بابا نے آگے بڑھ کر گریبان سے پکڑ کر اسے باہر دھکیلا تھا۔

"آپ غلط کر رہے ہیں... بہت پچھتائیں گے..." وہ یہ ذلت برداشت نہیں کر سکا تھا۔

"جاؤ... دفع ہو جاؤ یہاں سے... پھر کبھی اپنی یہ منحوس صورت... جو بھی کرنا ہے کر لینا۔" بابا بے پناہ طیش میں تھے۔ فرقان بھائی کی بھی کچھ یہی کیفیت تھی۔

"تو ٹھیک ہے... یوں تو پھر یوں ہی سہی۔" وہ کاغذات جیب میں ڈالے باہر نکل گیا تھا۔ اتنی دیر سے خود پر ضبط کرتی رائبل بڑی بی کے سینے میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ بابا اور فرقان بھائی نے بے بسی سے دیکھا۔

عبدالباری اس قدر گر سکتا تھا وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس سفاک نے اس کے راستے میں ہر طرف کانٹے ہی کانٹے بو دیئے تھے۔ وہ جدھر بھی قدم رکھتی تھی پاؤں چھلنی چھلنی ہوتے جاتے تھے۔ بابا نے بہت کوشش کی تھی اپنے تعلقات استعمال کر کے اسے کسی نہ کسی طرح یہاں سے بھجوا دیں، سب کے عبدالباری نے جو قدم اٹھایا تھا وہ سب پر حاوی تھا۔ اب انہیں اس کی طرف سے کسی اچھائی کی امید نہیں تھی مگر رائبل جیسی اعلیٰ لڑکی کو اپنے ہاتھوں سے کنویں میں بھی نہیں دھکیل سکتے تھے۔ ان کا ہر حربہ بے سود رہا تھا۔ رائبل کے لئے تو جیسے زندگی عذاب سی بن کر رہ گئی تھی۔

آج کتنے دنوں بعد وہ اسکول آئی تھی۔ چند گھنٹے گزرے تو طبیعت اچاٹ ہونے لگی۔ اسکول سے گھر تک کا فاصلہ بس منٹ کی واک پر مشتمل تھا۔ وہ ہمیشہ پیدل ہی عبور کر لیتی تھی۔ وہ بابا کو بتا کر خاموشی سے نکل آئی۔ ابھی اس نے صرف اسکول کی چار دیواری ہی کراس کی تھی جب عقب سے آتی گاڑی نے اس کے بالکل قریب بریک لگائی تھی۔ وہ جو اپنے ہی خیالوں میں چل رہی تھی اچھل کر پیچھے ہٹی۔ دہل کر پلٹ کر دیکھا، عبدالباری گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل رہا تھا۔

"ہیلو مائی ڈیئر... کیسی ہو... میں تمہیں ہی لینے اسکول جا رہا تھا۔ آؤ بیٹھو۔" اس کے قریب آ کر اس نے اسے گاڑی میں بیٹھنے کی آفر کی تھی۔

"نہیں... شکریہ..." عبدالباری کو تو دیکھ کر ویسے بھی اس کی آنکھوں میں خون اتر آتا تھا۔ کوئی اعتماد، بھروسہ کچھ بھی تو باقی نہیں بچا تھا۔ ہر حد تو وہ پار کر چکا تھا۔ عزت تک تار تار کرنے پر تلا ہوا تھا پھر وہ اس کی پروا کیوں کرتی۔

"مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے... گھر آیا تھا علم ہوا محترمہ اسکول میں ہیں... سوچا تمہیں پک بھی کروں گا اور بات بھی ہو جائے گی... آؤ نا..." وہ یوں لگاوٹ کا مظاہرہ کر رہا تھا جیسے دونوں کے درمیان تعلقات بہت خوش گوار ہوں۔

"نہیں... جب میں نے کہہ دیا شکریہ تو پھر شکریہ... جاؤ یہاں سے۔ راستہ چھوڑو میرا... مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی..." وہ غصے سے کہہ کر جانے لگی تھی جب عبدالباری نے اس کی کلائی پکڑی۔ وہ سرعت سے پلٹی۔

"کیا بدتمیزی ہے..." اپنا ہاتھ ایک جھٹکے سے آزاد کرایا۔ چہرہ اس جرأت پر لال انگارہ ہو گیا تھا۔

"بدتمیزی نہیں میڈم رائبل صاحبہ! حق رکھتا ہوں... آخر آپ نکاح کے کاغذات تمہیں میری بیوی شو کرتے ہیں... خواہ وہ جھوٹے ہی..."

"چٹاخ..." اس سے پہلے کہ وہ جملہ مکمل کرتا، رائبل کا ہاتھ اس پر اٹھ گیا تھا۔

"انتہائی رذیل، کمینی فطرت کے حامل گھٹیا انسان ہو تم..." وہ غصے سے سرخ انگارہ ہو رہی تھی۔ برداشت کا مادہ بھی تو چھلک رہا تھا۔

عبدالباری حیرت سے اس دھان پان سی لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی جرأت کتنی بڑی تھی اور حوصلہ کتنا بلند تھا کہ کسی کو بھی خاطر میں نہ لانے والے عبدالباری کے گال پر اس کے ہاتھ کا نشان ثبت ہو چکا تھا۔

"میرا ارادہ پہلے تم سے صرف بات کرنے کا تھا مگر تم تو تماشا ہی چاہتی ہو۔ اب صبر نہیں کروں گا... بہت تماشا بنا لیا، اب عمل کروں گا۔ آؤ..." عبدالباری نے اس کا بازو تھاما تھا، وہ ہراساں ہو گئی۔ جرأت تو اس نے واقعی بہت بڑی کی تھی، اب وہ نہ جانے کیا کرے۔

"پلیز باری... چھوڑو میرا ہاتھ... مجھے تمہارے ساتھ کہیں نہیں جانا۔"

مگر وہ تو جیسے کچھ سن ہی نہیں رہا تھا۔ اسی طرح بازو دبوچے گاڑی کی طرف بڑھا تھا۔ فرنٹ ڈور کھول کر اسے اندر دھکیل کر لاک کر کے خود بھی دوسری طرف آ بیٹھا۔

"باری پلیز... یہ سب کیا ہے...؟ کچھ تو خیال کرو... کیوں کر رہے ہو تم ایسا...؟" اس کی طرف دیکھتے وہ رو رہی تھی جب کہ دوسری طرف کوئی پروا ہی نہ تھی۔ پتھر تاثرات لئے اس نے گاڑی ڈرائیو کی۔

"باری... گاڑی روکو... اگر بات ہی کرنا چاہتے ہو تو گھر چلو... پلیز کہیں اور نہیں..." عبدالباری کو مخالف سمت میں گاڑی ریورس کر کے فل اسپیڈ کرتے دیکھ کر وہ کہے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ مجال ہے اسے ذرہ برابر فرق پڑا ہو۔ رائبل کا دل کانپ رہا تھا کسی انہونی کے خیال سے ہی۔

"باری..." تھوڑی دیر بعد بالکل نامانوس راستے دیکھ کر اس نے اس کا کندھا بری طرح جھنجوڑا مگر وہ بے مہر بنا ایک نظر ڈال کر سامنے دیکھنے لگا تھا۔ چہرے کے تاثرات ناقابل فہم تھے۔

"بہت بدنیت ہو تم..." وہ روتے ہوئے صرف یہی کہہ سکی تھی۔

عبدالباری اسے جہاں لے کر آیا تھا وہ جگہ اس کے لئے بالکل اجنبی تھی۔ وہ گاڑی سے اتر کر دوسری طرف سے آ کر گاڑی کا لاک کھول کر دروازہ وا کئے اسے دیکھنے لگا تھا جس کا رونا کسی بھی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔ نہ جانے اتنے آنسو اس کی آنکھوں میں کہاں سے آ سمائے تھے۔

"چلو آؤ... اترو..." اس نے اس کا بازو تھاما جو رائبل نے بری طرح جھٹک دیا۔

"مجھے کہیں نہیں جانا۔ اپنے گھر جانا ہے۔"

"تو میری جان تمہیں اپنے گھر ہی تو لایا ہوں۔ یہ دیکھو، یہ واقعی تمہارا گھر ہے۔" اس کے مسلسل بہنے والے آنسوؤں کو دیکھتے ہوئے وہ کچھ ڈھیلا پڑ گیا تھا۔

"نہیں۔ مجھے صرف اپنے گھر جانا ہے۔ امی کے پاس۔" وہ اب بچوں کی طرح ہچکیوں میں رو رہی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ مرضی ہے تمہاری۔ جب رونا بند کر لو اور عقل ٹھکانے آ جائے تو اندر آ جانا۔ ...اب یہی تمہارا سب کچھ ہے۔ اس گھر کے علاوہ اب تمہیں کہیں، دو پناہ نہیں ملے گی۔ مائنڈ اٹ ڈیئر!" ایک جاندار نظر اس پر ڈال کر اندر کی جانب بڑھ گیا۔ وہ ہکا بکا رہ گئی۔ کتنے پل آہستگی سے گزر گئے تھے۔ گاڑی سے اتر کر وہ اندر بڑھنے کے بجائے گیٹ کی طرف بڑھی۔ وہاں گارڈ میں موجود تھا اس کے باوجود گیٹ کھولنے لگی تھی۔

"آپ بی بی اندر چلی جائیں۔۔۔۔ ہمیں دروازہ کھولنے کا حکم نہیں۔" اس کے ہاتھ رک گئے۔

"تم کون ہوتے ہو مجھے روکنے والے۔ میں جاؤں گی۔ گیٹ کھولو۔" وہ چیخی تھی۔

"معاف کریں بی بی! ہم صاحب کے حکم کے بغیر گیٹ نہیں کھول سکتا۔" وہ بے بسی سے دیکھنے لگی۔

"دیکھو۔ جانے دو مجھے۔ تمہاری بڑی مہربانی ہوگی۔ مجھے جانے دو۔ خدا تمہارا بھلا کرے گا۔" وہ اس کی منت پر اتر آئی تھی۔ ہاتھ جوڑے کھڑی تھی جب گارڈ کا انٹرکام بج اٹھا تھا۔ وہ فوراً سننے لگا تھا۔

"آپ اندر چلی جائیں۔ صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔" انٹرکام رکھ کر وہ اس سے کہہ رہا تھا۔ وہ ہارے ہوئے انداز میں اسے دیکھے گئی۔ وہ نظریں پھیر گیا۔

"یہ کس کا گھر ہے؟" اپنے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

"صاحب لوگ کا۔" وہ حیران رہ گئی۔ یہ بلند و بالا، عالی شان عمارت عبدالباری کی ملکیت تھی۔ کیا رشوت کی کمائی اتنی زیادہ ہوتی ہے؟ وہ کو حیرت تھی۔ یہ گھر، گاڑی اور بھی نہ جانے کیا کیا عیاشیاں تھیں۔

"یہاں کون کون ہے؟" حفظ ماتقدم کے طور پر پوچھا۔

"صرف صاحب ہوتے ہیں۔ کبھی کبھار ان کے دوست آ جاتے ہیں۔ اب وہ اکیلے ہیں۔"

"یا اللہ! یا مالک! کیا کروں؟"

وہ جانتی تھی عبدالباری کو اس پر کبھی بھی رحم نہیں آ سکتا تھا۔ اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر کے وہ اندر بڑھی تھی۔ اندر ایک خادم سے مل گیا تھا جو اس کی باری کے کمرے تک رہنمائی کر گیا تھا۔

"صاحب اندر ہیں۔ آپ چلی جائیں۔" وہ چلا گیا تھا۔ وہ کچھ دیر ساکن سی کھڑی رہی، آہستگی سے دروازہ دھکیل کر دہلیز پر قدم رکھا تو وہ سامنے ہی بستر پر منہ کے بل لیٹا ہوا نظر آیا۔

"آ گئیں تم... مجھے پتہ تھا تم ضرور آؤ گی۔"

لائٹس آف تھیں، بیڈ کے دونوں سائیڈز کے لیمپ روشن تھے۔ عجب ماحول ہو رہا تھا کمرے کا۔ وہ چند پل کے لیے خالی ذہن اور خالی نظریں لئے اسے دیکھے گئی جو کروٹ بدل کر تکیے کے سہارے نیم دراز ہوا تھا۔

"عجیب لڑکی ہو تم۔ لڑکیاں مرتی ہیں میری ایک نظر کے اشارے کے لئے اور تم ہو کہ۔" وہ ہنس رہا تھا۔ "نہ جانے کیسی پتھر ہو تم، ایک عرصے سے تم پر وقت ضائع کر رہا ہوں، تمہاری جگہ کوئی اور ہوتی تو اتنی پتھر نہ ہوتی۔" کتنا توہین آمیز نخوت بھرا انداز تھا۔ وہ کٹ کر رہ گئی۔

"نعوذ باللہ۔" اس کا سچا قلب کانپ کر رہ گیا۔ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، وہ جو کچھ چاہتا تھا، وہ وہ جو کچھ نظر آ رہا تھا۔ یہ اس کی بڑی امی کی یا بابا کی تربیت تو نہیں تھی۔ اگر ان کی یہ تربیت ہوتی تو وہ کچھ اور ہوتا۔ نگاہ میں اتنی شرم و حیا ہوتی تو سوچ تک پاکیزہ ہوتی۔ ...کے دل میں اس کے لئے صرف نفرت ہی نفرت تھی۔

"کیوں لے کر آئے ہو تم مجھے یہاں۔ کیا چاہتے ہو اب تم۔ تماشا تو مجھے بنا دیا ہے، اچھی طرح بدنام کر رہے ہو۔ جیسے ذرا کمی نہیں چھوڑی تم نے اب کون سا تیر تمہارے ترکش میں باقی رہ گیا ہے جو آزمانا چاہتے ہو۔"

"صرف ایک تیر، اپنے ترکش کا آخری تیر۔ تمہیں اپنے نام کرنا ہے۔ یہی ضد ہے میری۔ بس یہی چاہتا ہوں میں تم..." وہ بستر سے اتر آیا تھا۔

"ہونہہ۔" وہ نفرت سے اسے دیکھتی رہی جب کہ دہلیز سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھی رہی۔ وہ آنکھوں میں بے پناہ نفرت لیے ہوئے تھی۔ "ماں باپ کی عزت کا جنازہ نکال کر تم صرف اپنی ضد پوری کرنا چاہتے ہو۔ حیرت ہے، کیسی بے رحم اولاد ہو تم... ماں باپ ہر دو تمہارے لئے مر رہے ہیں۔ راتوں کو بھی اٹھ اٹھ کر صرف اور صرف تمہاری ہدایت کے لئے گڑگڑاتے ہیں، تمہاری خیر و سلامتی کی دعائیں مانگتے ہیں اور تم ہو کہ انہیں صرف مارنے پر تلے ہوئے ہو۔ کتنے ظالم ہو تم۔ ذرا بھی تمہیں ان پر رحم نہیں آتا۔"

"...تا ہے اسی لئے تو سیدھے راستے سے تمہیں اپنانا چاہتا تھا۔ آج بھی میرا مقصد... سے تم سے بات کرنے کا تھا۔ بہرحال، بہر طریقہ تو یہ بھی نہیں۔ بس اب یہ ضد چھوڑ دو۔ آج ہر حال میں وہی ہوگا جو میں چاہوں گا۔" وہ اس کے مقابل آ کھڑا ہوا تھا۔ وہ ایک دم پیچھے ہٹی تھی۔ اضطراری اس بے اعتباری پر تھی نہیں... اس وقت وہ کھڑی بھی کہ اسی کی دہلیز پر تھی اس کے رحم و کرم پر تھی، کوئی بھی لمحہ اسے شیطان کا بہروپ دے سکتا تھا۔

"جو چاہتے ہو، وہ گھر جا کر کر لینا۔ مجھے ابھی صرف گھر جانا ہے۔" اس کی باتوں کو نظر انداز کرتے وہ گویا تھی۔

"نا۔ اب گھر جانے والی بات نہیں کرنا۔ ہاں جانے ضرور دوں گا مگر میری خواہش پوری ہونے کے بعد۔ تاکہ نہ کوئی تمہیں پچھتاوا رہے اور نہ ہی کوئی ملال مجھے رہے۔۔۔۔ ورنہ یہیں رہو، ہر چیز ملے گی۔۔۔۔ میری توجہ و مہربانی و محبت۔" وہ دلکشی سے مسکرا رہا تھا۔ ...کا جی چاہا مردانہ خوب صورتی سے سجا اس کا چہرہ نوچ ڈالے۔ بظاہر کتنا خوب صورت اور متاثر کن تھا مگر باطن کتنا گھٹیا اور قابل عبرت تھا۔ اس کا جی متلانے لگا۔

"تم غلط کر رہے ہو۔ سب غلط کر رہے ہو۔ پچھتاؤ گے ساری عمر۔" بچاؤ کا کوئی راستہ نہ دیکھ کر وہ رو پڑی تھی۔ سارا وجود پتے کی مانند لرزنے لگا تھا۔ عبدالباری چند ثانیے اس کے وجود کو دیکھتا رہا تھا پھر اس نے آگے بڑھ کر اسے کندھوں سے تھام لیا تھا۔ وہ کرنٹ کھا کر پیچھے ہٹی تھی۔

"میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ اللہ تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی، یوں جیسے بچاؤ کا ہر رستہ مفقود ہو گیا ہو۔ "انتہائی بدنیت ہو تم۔ اللہ کرے مر جاؤ تم۔..." خلوص دل سے بددعا دی تھی۔

"جب اللہ کے پاس جائیں گے میری جان تو دیکھ لیں گے۔ اس وقت تو صرف تمہیں حاصل کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے اسے دوبارہ کندھوں سے تھام لیا تھا۔ اس دفعہ وہ کوئی مزاحمت بھی نہ کر سکی تھی۔ "خواہش تھی کہ اسی طرح تمہیں اپناؤں جس طرح لوگوں کی شادی ہوتی ہے مگر تم سب لوگ یہی چاہتے تھے۔ سوری میری جان! تمہارے ان آنسوؤں کا میں کوئی سدباب نہیں کر سکتا، بس صرف اتنا کر سکتا ہوں کہ تھوڑی دیر میں نکاح خواں اور گواہان وغیرہ کا بندوبست ہو جائے گا۔ خود کو ذہنی طور پر تیار کر لو۔ اگر تم میری بات یہاں آنے سے پہلے سن لیتیں تو اس افراتفری کے بجائے نکاح کی ساری کارروائی اپنے گھر میں کرواتا۔ خیر بری جگہ تو یہ

بھی نہیں ... مائنڈ میک اپ کرو ... جو ہو گیا سو ہو گیا ''وہ کہہ رہا تھا۔ وہ اذیت بھری نظروں سے دیکھتی رہی۔

''جب تم نے اللہ کی نافرمانی کرنے کی ٹھان ہی لی ہے، صوت تمہارے نزدیک ایک کھیل ہے تو پھر ان معاملات میں تمہیں نکاح کی کیا ضرورت پڑ جاتی ہے ... بڑے خودمختار ہو تم تو پھر یہ ڈرامہ بھی کیوں رچا رہے ہو ... نعوذ باللہ بڑے طاقت ور اور زبردست ہونا ...''اس کے ہاتھوں کو نفرت سے جھٹکتے وہ طنز کرنے سے باز نہیں آئی تھی اور وہ ہنس دیا تھا۔

''بقول تمہارے میں نام کا مسلمان ہوں مگر ہوں تو سہی نا ... یہ نکاح کا ڈرامہ بھی صرف اور صرف تمہارے لیے رچانا چاہتا ہوں ... ورنہ تم کبھی بھی اختیار سے باہر نہیں رہی ہو۔ یہ زبردستی بہت پہلے کر چکا ہوتا ...''رائنل کا جی چاہا کہ وہ ڈوب مرے ... کوئی ایسی سبیل نکل آئے کہ یا تو وہ اس سامنے نظر آنے والے شخص کو شوٹ کر دے یا پھر اپنے وجود کو مٹا ڈالے ... مجبوری پروہ ماتی نہیں بچا تھا لیکن وہ ماتی ہے بس وہ مجبور تھی کہ انتہائی خواہش کے باوجود کچھ بھی نہ کر سکی سوائے رونے کے۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

''جب سب کچھ طے کر ہی چکے ہو تو پھر ایک کام کرو۔ فرقان بھائی ابا کو شامل کرو ... ورنہ میں ساری عمران کے سامنے نظر نہیں اٹھا سکوں گی ... پتی ہی نظروں میں گر جاؤں گی۔''ہاتھوں میں چہرہ چھپا کے وہ کہہ رہی تھی۔ وہ بغور دیکھتا رہا تھا پھر اس کا موبائل بجا تو وہ باہر نکل گیا۔



* * *

جانے کے بعد وہ وضو کرنے کے باہر نکلی تو عبدالباری منہ کے بل سرہانے میں سر دیے ابھی بھی گہری نیند میں مدہوش تھا۔ اسے دیکھ کر رائنل کے چہرے کے اعصاب کشیدہ ہو گئے تھے۔ سارے جسم میں نفرت کا زہر پھیلنے لگا تھا۔ وہ سر جھٹکتے ہوئے جائے نماز بچھا کر کھڑی ہوگئی۔ نماز و دعا کرکے ابھی جائے نماز لپیٹ ہی رہی تھی کہ عبدالباری کا موبائل بج اٹھا تھا۔ وہ نظر انداز کیے کچھ دیر کمرے میں ادھر سے ادھر چکر لگاتی رہی۔ بیل ایک دفعہ مکمل ہو کر دوسری دفعہ پھر شروع ہو گئی تھی۔ عبدالباری نے مسلسل ہونے والی ٹون پر بھی سر نہ اٹھایا تو وہ آگے بڑھی۔ اسکرین پر روشن نمبر دیکھتے ہی وہ خوش ہو گئی۔ فوراً یس کا بٹن پش کر دیا تھا۔

''اسلام علیکم ...''اس نے کہا۔

''وعلیکم اسلام ... جیتی رہو، کیسی ہو ...؟''دوسری طرف سے بڑی ای تھیں۔ رائنل کی آنکھوں میں آنسو آ سمائے۔ کتنا فاصلہ آ گیا تھا درمیان میں۔

''جی رہی ہوں ... ابھی تک زندہ ہوں ... آپ کیسی ہیں؟''ابھی تو صرف ایک رات گزری تھی مگر لگ رہا تھا کہ جیسے برسوں گزر گئے ہوں ان کو دیکھے ہوئے۔

''جی رہی ہوں میں بھی ... ساری رات ایک پل کو بھی آنکھ نہ لگی۔ یہی غم کھاتا رہا کہ میرے بیٹے نے تم پر کیا پہاڑ توڑا ہے ... کیا گزر رہی ہوگی تم پر ... میں نے تمہیں ہمیشہ بیٹی سے بڑھ کر چاہا ہے ... مجھے معاف کر دینا ... جو بھی ہوا اچھا نہیں ہوا۔'' وہ مسلسل رو رہی تھیں۔ رائنل نے ایک نظر کروٹ بدلتے عبدالباری کو دیکھا پھر ہاتھ کی پشت سے اپنے آنسو صاف کیے۔

''آپ کا کیا دوش ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں، کیا کرے گا اب، ضد تو اس کی پوری ہو گئی ہے۔ مارنے سے تو رہا ... بابا کو بھی حوصلہ دیجیے گا۔ کل تو بہت تکلیف میں تھے وہ۔ اب بی پی کی کیا کنڈیشن ہے؟''اب جیسی بھی زندگی تھی گزرنی تو تھی نا۔ روتے ہوئے بھی اور ہنستے ہوئے بھی۔ کچھ حوصلہ کرتے ہوئے پوچھا تھا۔ دوسری طرف سے گہری سانس سنائی دی تھی۔

''کل سے بہتر ہے مگر ابھی بھی بستر پر ہی ہیں ... ورنہ عبدل نے تو مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔'' وہ خاموش رہا

عبدالباری کو دیکھتی رہی جو گہری نیند میں تھا۔

''تم آؤ گی نا ... ضرور آنا ... ہم سب ناشتے پر تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ ذرا عبدل سے بھی بات کرواؤ پوچھوں تو سہی کس گناہ کی سزا دے رہا ہے وہ مجھے۔''اپنا چہرہ صاف کرتے ہوئے وہ عبدل کو نفرت سے دیکھ کر منہ پھیر گئی۔ بمشکل اپنے دل پر ضبط کر سکی۔ بستر کے قریب جھک کر اس کو آواز دی۔

''عبدالباری ... باری ...''اب تو اس کا نام لینے کو بھی جی نہیں چاہتا تھا۔ پہلے ہی نفرت کیا کم تھی، اب مزید بڑھ گئی تھی۔ ایک رات ہی سارے راز کھول گئی تھی۔ مزید سہنے، سننے یا دیکھنے کی ہمت ہی نہیں تھی۔ سارے بدن پر ایک ناگواری سی چھائی ہوئی تھی۔ جھک کر اس کا بازو سختی سے جھنجوڑ ڈالا۔

''ہوں ... کون ... کیا ہے؟''نیند شاید بہت گہری تھی۔ ادھ کھلی آنکھوں سے اسے دیکھتے گردن بلاتے پوچھا تھا۔ پتہ نہیں وہ یہ بے حس کیوں ہو گیا تھا ورنہ بڑے بابا، بڑی امی ایسے تو نہیں تھے۔ اس کا دل دکھ سے بھر گیا۔

''امی کا فون ہے ... بات کرنا چاہتی ہیں وہ ...''ادھر باپ ماں مر رہے تھے اور ادھر وہ اپنی فتح مندی کا جشن منانے میں غرق، اپنی ہی خوشی میں مست تھا۔ اسے رہ رہ کر اس کی بے حسی پر دکھ ہو رہا تھا۔

''ہوں ... اتنی صبح صبح ... لاؤ ... دو ...''وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اب تیزی سے پیچھے ہٹی، موبائل پکڑ کر پلٹنے لگی تھی جب اس نے بازو تھام لیا تھا۔

''کہاں چلی ہو ... ادھر بیٹھو ...''اپنے قریب گرا لیا تھا۔ وہ کوئی احتجاج بھی نہ کر سکی۔ بھلا اب احتجاج کرنے کو رہ بھی کیا گیا تھا۔

''ہیلو ...''

''عبدل ...''امی نے پوچھا تھا۔

''جی بول رہا ہوں ...''بے زاری سے کہا تھا۔

''سو رہے تھے کیا؟''انہوں نے بیزاری نوٹ کر کے پوچھا تھا۔

''ظاہر ہے سو ہی رہا تھا، اب اتنی صبح صبح بیل ہو جائے تو پھر ...''وہ جھنجلا گیا تھا اس بے معنی سوال پر۔ رائنل صرف دیکھ رہ گئی جب کہ بازو ابھی بھی اس کی گرفت میں تھا۔

''میں ناشتے پر تم دونوں کا انتظار کر رہی ہوں ... ناشتا گھر آ کر کرنا۔''امی نے دعوت دی تھی۔ وہ حیران ہوا۔

''اتنی صبح ... حیرت ہے، کیا بابا نے آپ کو اجازت دے دی ہے مجھے گھر بلوانے کی ...''وہ طنز پر اتر آیا تھا۔

''تم نے جو کیا ہے ساری عمر گھاؤ رستے رہیں گے ... تمہارے دیے زخم بھلائے نہیں جا سکتے۔ ہمیں پروا ہے تو صرف رائنل کی ... کیا کیا ارمان نہیں تھے اس کے لیے ہمارے دل میں اور تم نے کیا کر دیا ہے۔ تم نے اسے زندہ رہنے کے قابل چھوڑا ہے اور نہ ہمیں۔ جیتے جی مار ڈالا ہے تم نے ہمیں۔ ایک داغ ساری عمر سفید براق سر پر رہے گا۔ بڑی خواہش تھی کہ اسے اپنے ہاتھوں سے تمہاری دلہن بناؤں سب ملیامیٹ ہو گئے ہیں ... اب اسے لے کر آ جانا۔ یہ نہ ہو وہ ترستی رہے ہمارے لیے اور ہے ہی کون ہمارے علاوہ اس کا۔ اپنے ہاتھوں سے سب کچھ خوشی خوشی کیا ہوتا تو کوئی دکھ نہ ہوتا ... یہ دن بھی دیکھنے تھے ہمیں ...''وہ مسلسل کہتے رو بھی رہی تھیں۔ عبدالباری اس جذباتی بلیک میلنگ سے جھنجلا گیا۔

''حد ہوتی ہے۔ کیا محبت ہے آپ کی بھی ... ساری ہمدردیاں اسی کے ساتھ ہیں۔ میں تو جیسے کچھ لگتا ہی نہیں ہوں آپ کا۔ کیا کوڑے کے ڈھیر سے اٹھایا تھا مجھے ... اب کیوں رو رہی ہیں۔ یہ سب آپ کا ہی کیا دھرا ہے، مجھے الزام نہ دیں۔ جتنا انتظار

میں نے کیا ہے وہ میری ہی شرافت ہے۔ میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا، اگر ماں لیتے تو کبھی اتنا بڑا قدم نہ اٹھاتا۔ اگر آپ کی خواہش تھی تو میری بھی خواہش تھی کہ سب عزت کے ساتھ ہو جائے۔ آپ لوگوں کو ہی عزت کا سودا گوارا نہیں تھا۔ اب جو ہوا ہے بھگتیے.....!

رائنل پر ایک تیز سی نظر ڈال کر وہ فون پر امی سے مخاطب ہو رہا تھا۔ رائنل اس کی ایک تو چوری اوپر سے سینہ زوری والی عادت پر تلملانے لگی۔ عبدل کو تو ماں باپ کے حساسات کی بھی ذرا پروا نہ تھی۔ کوئی شرمندگی نہ تھی۔ معافی تلافی کا کوئی لفظ نہ تھا۔ کیسی بے حسی تھی

یہ۔

"شاباش بیٹے شاباش... تم یہ کہہ سکتے ہو۔ اولاد ہو نا، خوب آزماؤ ماں باپ کا دل کیا ہوتا ہے، جب اپنی اولاد پیدا کرو گے تو پوچھوں گی" وہ پھر رونے لگی تھیں۔ "خوش رہو... ماں باپ کے دل میں اولاد کے لئے صرف دعائیں ہی دعائیں ہوتی ہیں چاہے وہ کچھ بھی کر لیں مگر تم نے تو دعا دینے کے بھی قابل نہیں چھوڑا۔ اس بدنصیب کا دکھ رلاتا ہے۔ پھر کہہ رہی ہوں اس کو لے کر ضرور آ جانا... بیٹھ ہو میں بوڑھی انتظار کرتی رہ جاؤں۔" انہوں نے خاص تاکید کر کے فون بند کر دیا تھا۔ اس نے موبائل آف کر کے بستر پر پھینکا۔

"ہونہہ..." چہرے کے تاثرات سخت کبیدہ خاطر ہو چکے تھے۔ "یعنی حد ہوتی ہے... مجھے ہی الزام..." وہ با آواز بلند بڑبڑایا تھا۔ "تم نے میرا موبائل کیوں ریسیو کیا تھا؟" وہ اپنا سارا غصہ رائنل پر نکالنا چاہتا تھا۔ وہ اندر ہی اندر سہمنے لگی۔ اپنا بازو اس کے ہاتھ کی گرفت سے نکالا۔

"مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے تمہارا موبائل ریسیو کرنے کا۔ مسلسل بیل ہو رہی تھی جب تم سوئے پڑے تھے، مجھے تو پکڑنا ہی تھا نا..." جب یہ طے ہو چکا تھا کہ زندگی اب اسی شخص کی معیت میں گزارنی ہے تو پھر کیوں دب کر رہے۔ اسی سوچ نے اسے لب کشائی پر مجبور کر دیا تھا۔ عبدل کے چند ازو اطوار اور جو حربے تھیں ان کی موجودگی میں وہ اب لب سی کر زندگی نہیں گزار سکتی تھی۔

"تم..." عبدل نے اس کے یوں دو ٹوک انداز پر گھورا تھا۔

سر پر دوپٹہ نماز کے اسٹائل میں ابھی بھی لپٹا ہوا تھا۔ بلیک دوپٹے کے اندر چھپا چہرہ نور کا ہالہ لگ رہا تھا۔ چہرہ کل کی نسبت اب قدرے بہتر تھا۔ آنکھیں مسلسل گریہ وزاری سے اب بھی سوجھی ہوئی تھیں۔ سرخ رنگ ہو رہی تھیں مگر آنکھوں کے برعکس چہرے پر ایک عجب سا نور تھا۔ وہ چند ثانیے یک ٹک دیکھتا رہا... یہ لڑکی اس کی سب سے بڑی ضد تھی، اب بیوی بن چکی تھی۔ اس لڑکی کی خاطر اس نے کسی بھی جائز ناجائز کی پروا نہیں کی تھی، اب وہ اس کی دسترس میں تھی اس کے باوجود بیگانی سی تھی۔

"آئندہ میرا موبائل ریسیو کرنے کی قطعی ضرورت نہیں۔" وہ اسے تنبیہ کر کے بستر سے اتر گیا تھا۔ رائنل اس کی پشت کو گھورتی رہی۔

"مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے۔" لہجہ اب بھی زہر خند تھا۔ اس نے پلٹ کر گھورا۔ ایک دن کے وقفے سے کیا کچھ بدل گیا تھا۔ کل اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ آج اس انداز میں یہاں ہوگی۔ کل جب وہ اسے زبردستی لے کر یہاں آیا تھا تو اس کے ارادے دیکھ کر وہ جان گئی تھی کہ وہ کچھ بھی کر لے وہ اب اسے جانے نہیں دے گا۔ وہ ہر حال میں عزت کی زندگی چاہتی تھی، جہاں تک ہو سکا تھا اس نے اپنا بھرم رکھنے کی کوشش کی تھی مگر اب عبدالباری کے ارادے اس کے حوصلے پست کئے دے رہے تھے سو وہ مجبور ہوگئی تھی۔

عبدالباری نے اس کی بات کا بھرم رکھا تھا۔ امی بابا اور فرقان بھائی کو بلوا لیا تھا۔ وہ اصل صورت حال سے قطعی بے خبر تھے۔ اصل معاملے کی خبر تو انہیں یہیں آ کر ہوئی تھی۔ نہ جانے کیا کہہ کر وہ انہیں ساتھ لایا تھا۔ سب نے اسے سمجھانے کی پوری کوشش کی تھی مگر وہ اسے کسی بھی قیمت پر چھوڑنے پر راضی نہیں تھا صرف ایک ہی رٹ تھی کہ نکاح ہوگا تو بھی ہوگا ورنہ وہ یہیں رہے گی۔ مجبوراً

سب ہار گئے تھے۔ بابا کو کتنی تکلیف ہو رہی تھی، ایک دم ان کا بلڈ پریشر ہائی ہوا تھا۔ نکاح کے بعد وہ سب چلے گئے تھے۔ امی اسے بھی ساتھ لے جانا چاہتی تھیں، اس کا خیال تھا کہ جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا کم از کم رخصتی ہی عزت کے ساتھ ہو جائے مگر وہ اس پر بھی راضی نہیں ہوا تھا۔ بہت مایوس ہو کر وہ لوگ گئے تھے۔ وہ کل سے یہیں تھی۔ وہ اس پر اپنے سارے شوق پورے کر چکا تھا مگر دکھ تھا کہ کم بختے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ احساس زیاں تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

"تیار ہو جاؤ... گھر چلنا ہے۔" باتھ روم سے نکلنے کے بعد عبدالباری نے اسے سوچوں سے باہر لا پھینکا۔ وہ غسل لے چکا تھا، وہ اسے دیکھتی رہی۔

"میں کچھ بکواس کر رہا ہوں رائنل بی بی!" اسے اپنی طرف یوں گھورتے دیکھ کر اس نے ٹوکا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں تیار ہوں..." جوتا پہن کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ عبدالباری نے اسے سر سے پاؤں تک جانچا۔

"کپڑے تو چینج کر لو... اسی حلیے میں جانے کا ارادہ ہے کیا؟" اس کے بلیک سلوٹوں والے لباس کو ناقدانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے ٹوکا۔

"میں جب کل گھر سے نکلی تھی تو یہی پہنا تھا، مجھے نہیں علم تھا کہ واپسی پر کسی عقوبت خانے میں جانا پڑ جائے گا۔ فی الحال مجبوری ہے، میرے پاس بھی ایک لباس ہے۔" تلخی سے جواب دیا تھا۔ عبدالباری کی پیشانی پر سلوٹوں کا جال بن گیا۔

"بہت چلتی ہے تمہاری زبان... اب بیگم صاحبہ اور اپنے سینے پر پتھر دل رکھا کرو۔ میں عادی نہیں ہوں اس لہجے کا، اس قسم کی گفتگو مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ بہت برداشت کیا ہے تمہارا یہ زہر خند لہجہ اب بالکل نہیں کروں گا... میں رعایت دینے والوں میں سے نہیں ہوں۔" اس کے سامنے آ کر شہادت کی انگلی اٹھا کر اسے وارننگ دی تھی۔ وہ بے خوفی سے سر جھٹک گئی۔

"برداشت نہیں تھی تو پھر یہ رشتہ ہی کیوں باندھا ہے تم نے... عادی نہیں ہو تو ہو جائیں ایس پی صاحب! اگر پہلے یہ سب جاننے سے تو کیا فرق پڑتا ہے... اب بس میں، مجھے تو عادت ہے اسی زہر خند لہجے میں بات کرنے کی اور ساری عمر کروں گی۔"

"تو پھر کان کھول کر سن لو تم بھی... مجھے یہ زبان کاٹنا بھی آتی ہے... سمجھیں تم؟" اس کے بازو کو جھنجھوڑ کر اس نے بستر پر دھکیلا تھا۔

"تو انتظار کس بات کا ہے... دیر کیوں کر رہے ہو... میں تو منتظر ہوں، کاٹو زبان میری... میں بھی تو دیکھوں تم کس حد تک وحشی پن کا مظاہرہ کر سکتے ہو۔ کس حد تک گر سکتے ہو..." آنسو بے اختیار چھلک آئے تھے۔

رائنل..." وہ لب بھینچ گیا۔ عبدالباری جو ساری رات اس کے آنسوؤں سے نہیں پگھلا تھا، اب رک گیا۔ نہ جانے کیا ہوا تھا

"تم... تم..." عجب مجنونانہ انداز میں آگے بڑھ کر اس نے اسے کندھوں سے تھام کر خود میں بھینچ لیا تھا۔

"یوں بولو گی تو کسی دن واقعی میرے ہاتھوں سے ضائع ہو جاؤ گی۔" رائنل کے آنسوؤں کی روانی میں اضافہ ہونے لگا تھا۔ وہ مکمل طور پر اب توجہ پر آمادہ تھا۔ زخم دے کر عبدالباری کی اب یہ مرہم لگانے والی ادا وہ قطعی نہ سمجھ سکی تھی۔

گھر آئے تو سب آ کے نارمل انداز میں ہی ملے تھے۔ بابا سوئے ہوئے تھے، بھابی وغیرہ سے مل کر کھانے کے بعد وہ لاؤنج میں آ بیٹھی تو امی اور بھابی بھی وہیں آ گئیں۔ فرقان بھائی البتہ ناشتے کے بعد آفس کے لئے نکل گئے تھے۔

"تم ساتھ چلو گی یا ابھی ٹھہرنا ہے۔" کچھ دیر بعد عبدالباری جانے کو اٹھ کھڑا ہوا۔

"نہیں... یہ کہیں نہیں جائے گی، یہ اب یہیں رہے گی۔ تم نے جہاں بھی جانا ہے جاؤ..... مگر اب خیال رکھنا یہ اب اسی گھر میں رہے گی سب کے ساتھ۔" اس کی بجائے جواب امی نے دیا تھا۔

"کیوں؟" وہ حیران ہوا۔ "ہرگز نہیں۔ میرے لئے جب آپ کے گھر میں جگہ نہیں تو پھر اس کے لئے بھی نہیں۔ تم اٹھو رانیل، چلو۔" وہ ہمیشہ کی طرح حکم چلاتا تھا۔

"کب تم نے ہمیں اپنا سمجھا ہے۔ اپنا سمجھا ہوتا تو یوں نہ کرتے۔ اب تمہارا تو مجھے کوئی بھروسہ نہیں ہے اور اس کو تمہارے رحم و کرم پر چھوڑ دوں۔ خدا جانے کیا کرتے پھرتے ہو تم اور کیا سلوک کرو گے اس کے ساتھ بھی۔ تم جیسے لوگوں کا نہ کوئی دین ہوتا ہے، ورنہ ہی ایمان، جس کے نزدیک ماں کی کوئی عزت نہیں وہ کیا جانے بیوی کی عزت کیا ہوتی ہے۔" امی نے گویا اس کے دل کی بات کہہ دی تھی۔ وہ غصے سے دیکھتا رہا۔

"یہ کہیں نہیں رہے گی بلکہ تم بھی اب اپنے آپ کو سنوارو۔ اکیلے نہیں رہ رہے ہو، اب یہی تم لوگوں کا گھر ہے... تم بھی یہاں رہو گے۔" امی نے فیصلہ سنایا تھا۔

"اچھا۔ حیرت ہے۔ بابا نے اجازت دے دی ہے مجھے بھی اس گھر میں رہنے کی۔" وہ طنزیہ انداز میں بولا۔

"وہ باپ ہیں تمہارے، دشمن نہیں۔ ویسے بھی جیسی تمہاری سرگرمیاں ہیں رانیل کو اس گھر میں اکیلا تو نہیں چھوڑ سکتے ہم۔ جیسے تم ہو ویسا ہی تمہارا حلقۂ احباب بھی ہوگا۔ تم سے اچھائی کی کوئی امید نہیں اور دوں سے خاک ہوگی۔" امی نے غصے سے اسے اس کا اصل چہرہ دکھایا تھا۔

"حد ہوتی ہے۔ زبردستی ہے کیا... یعنی اب میں آپ کے اشاروں پر چلوں۔" وہ تلملایا تھا۔

"ایک تم نے اپنی کی ہے، اب ہماری بات ہو... غلط نہیں کہہ رہی ہیں۔ ٹھنڈے دل سے سوچو تو تمہیں ہمارا فیصلہ معقول ہی لگے گا۔ تم تو سارا دن نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھانتے پھرتے ہو، کبھی تو راتوں کو بھی غائب ہوتے ہو۔ یہ وہاں کس کے سہارے ہوگی۔ چاہے تمہارے پیچھے کوئی چور آئے یا ڈاکو، تمہیں کیا پرواہ ہوگی۔ اپنی سرگرمیاں ختم ہوں گی تو تمہیں کچھ اور دکھائی دے گا۔"

اب کہ وہ چپ ہو گیا تھا۔ رانیل نے اس کا چہرہ دیکھا، کیسی بے بسی رقم تھی اس کے چہرے پر۔ یعنی اتنا کچھ کرنے کے باوجود وہ کسی نہ کسی طرح بے بس ہو گیا تھا۔

"ٹھیک ہے مگر مجھ پر کوئی پابندی لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میری اپنی زندگی ہے، اپنی ذاتیات ہیں میں کسی کی دخل اندازی برداشت نہیں کروں گا۔"

وہ کمرے سے نکل گیا تھا۔

عبدالباری نے اپنی ضد پوری کر لی تھی، سب بابا وغیرہ کا مشترکہ فیصلہ تھا کہ ولیمہ بھی ہو جائے ان کا، فرقان بھائی کا وسیع حلقہ احباب تھا۔ پھر رشتے داری بھی تھی۔ وہ کس کس سے چھپاتے۔ رانیل کی خاطر وہ مجبور تھے۔ کچھ بھرم بھی رکھنا تھا نکاح جیسے بھی ہوا تھا، وہ لوگ ٹال مٹول کر گئے تھے مگر اب آئندہ کے متعلق راہ ہموار کرنے کو وہ سب سوچ رہے تھے۔ دانش بھیا کو اصل صورت حال سے لاعلم ہی رکھا گیا تھا۔ صرف دونوں کے نکاح کی اطلاع دی تھی، باقی تفصیل حذف کر دی گئی تھی۔ اب ان کا ولیمہ تھا جو اچھے خاصے پیمانے پر ہوا تھا۔ لوگ، رشتے دار، دوست احباب اس قدر خفیہ نکاح کرنے پر استفسار کر رہے تھے۔ وہ سب لوگوں کو بس کسی نہ کسی طرح مطمئن کرتے رہے تھے جب کہ اندر ہی اندر برا حال ہو رہا تھا۔ ایک تماشا سا بن گیا تھا اور جو تماشے کا سبب تھا وہ شاداں و فرحاں لوگوں سے مل رہا تھا، یوں جیسے کچھ انوکھا نرالا ہوا ہی نہیں۔ خدا خدا کر کے ولیمے کی تقریب اپنے انجام کو پہنچی تھی، سب نے شکر ادا کیا۔ تقریب کے اختتام پر وہ لباس بدل کر ابھی بیٹھی ہی تھی کہ بھابی، حفظہ اور عصمہ وغیرہ آ گئیں۔ بھابی ساتھ چائے بھی لائی تھیں۔ چاروں خاموشی سے پینے لگیں۔

"آج تم بہت خوبصورت لگ رہی تھیں رانیل..... پہلے کبھی بھی تمہیں یوں بنے سنورے دیکھا ہی نہیں تھا۔ پہلی مرتبہ تم اس قدر سجی ہو۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے حور زمین پر اتر آئی ہو۔ ایمان سے ہم تو حیران تھیں۔" بھابی چائے پیتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ وہ بمشکل مسکرائی۔ حفظہ اور عصمہ وغیرہ بھی مسکرا دی تھیں۔

"عبدالباری بھی بہت جچ رہا تھا۔ دونوں ساتھ بیٹھے غضب کے لگ رہے تھے۔ آہ... کاش ظاہر کی طرح اس کا باطن بھی خوبصورت اور دلکش ہوتا۔" عصمہ نے دکھ سے کہا تھا۔ سب کچھ دیر تک خاموش سی ہو گئیں تو کچھ وقفے کے بعد حفظہ نے اس کا ہاتھ تھاما۔

"رانیل! اب ہماری ساری امیدیں اللہ کے بعد تم ہی سے ہیں۔ وہ جن رستوں پر چل رہا ہے ان سے اسے تم ہی واپس لا سکتی ہو۔ اس کی زندگی کا ہر لمحہ تمہارے سامنے ہے، اس کے مزاج کے ہر رنگ سے تم واقف ہو۔ اس کی نیچر، عادت و اطوار اور اس کی سرگرمیاں کچھ بھی تو تم سے چھپا ہوا نہیں۔ ہم نے پوری کوشش کی تھی کہ وہ نارمل انسانوں جیسی زندگی گزارے مگر سب تدبیریں اکارت گئی ہیں۔ اس نے سب جائز و ناجائز بس کر تم سے شادی کی ہے۔ تم ہی وہ واحد ہستی ہو جو اسے بدل سکتی ہو۔ اس کی زندگی میں تبدیلی لا سکتی ہو۔" حفظہ رندھی ہوئی آواز میں اسے سمجھا رہی تھی۔ وہ چپ رہی۔

"آپ کے لئے یہ کہنا آسان ہے مگر آپ سب کیا جانیں یہ کرنا کس قدر مشکل ہے۔ میں کس ذہنیت میں ہوں، کون جانے۔ ابھی تک تو میں یہ بھی نہیں جان سکی کہ آپ کے بھائی کی نظروں میں میرا اصل مقام کیا ہے۔ ابھی تک تو میں صرف اس کے لئے ایک ضد ہی ہوں۔ صرف ایک انتقام ہوں۔ نہ جانے میرا اصل مقام کیا ہے۔ ابھی تک تو میں اس کو وقتی سکون پہنچانے والی چیز ہی ہوں۔" وہ بہت تلخی سے انداز میں سوچ رہی تھی۔ آج جس جس طرح لوگوں نے ان کے عبدالباری کے متعلق کرید کرید کر پوچھا تھا اس سے اس کے اندر کا اشتعال بڑھ گیا تھا۔ اس بے ضرر سی لڑکی کا ذہن بھرنے کو کوئی چارہ نہ تھا، وہ تو کچھ بھی نہیں تھی مگر اب بدنام ہو گئی تھی۔ یہ دکھ ہی بہت بڑا تھا، بہت اذیت دے رہا تھا۔

"کتنے عرصے بعد ہم نے اس کی نظروں میں پرانی جوت دیکھی ہے۔ وہی عزت، وہی احترام دیکھا ہے اس کی آنکھوں میں جو کبھی یہاں آنے پر وہ ہمیں دیا کرتا تھا۔ وہ بدل سکتا ہے، اگر تم کوشش کرو۔" عصمہ بھی کہہ رہی تھی۔

"کیسے کوشش کروں؟ اگر ضد کے بجائے کوئی جذبہ ہوتا تو شاید میں اپنی ذات کی اتنی بے توقیری اور عزت نفس کی اس قدر پامالی برداشت بھی کر لیتی۔ اب یہ دکھ ہی کم نہیں ہوتا کہ میں صرف ایک ضد تھی۔ چاہے جانے کی خواہش کسے نہیں ہوتی اور یہاں تو ایک لمحہ بھی نہیں سوائے بے عزتی کے۔ ہر شوق، ہر لگن، ہر خواہش ہی مر گئی ہے۔ اب تو اپنا آپ ایک مٹی کی مانند لگتا ہے جس سے کھیل وہ صرف اور صرف اپنے نفس کی خواہش پوری کرتا ہے ورنہ درمیان میں تو کچھ بھی نہیں۔" آج کے تجربے نے اسے بہت دکھی اور رنجیدہ کر دیا تھا۔ کچھ کہنے سے خود کو پھر بھی باز رکھا تھا۔

وہ سب کچھ دیر مزید بیٹھی تھیں۔ عبدالباری کمرے میں داخل ہوا تو وہ تینوں اسے شب بخیر کہہ کر کمرے سے نکل گئی تھیں۔ وہ تکیہ درست کر کے دراز ہو گئی۔ نماز وہ لباس بدلتے ہی پڑھ چکی تھی اب صرف سونے کی خواہش تھی۔

"کیا مصیبت ہے، اس گھر میں پرائیویسی نام کی کوئی چیز ہی نہیں..... جسے دیکھو منہ اٹھاتا ہوا کمرے میں گھسا ہوا ہے۔" کوٹ اتار کر بیڈ پر اچھالتے وہ سخت غصے میں تھا۔ آنکھیں کافی سرخ ہو رہی تھیں شاید باہر کسی سے کوئی بات ہوئی تھی، وہ بھی اندازہ لگا کر چپ چاپ اسے دیکھے گئی جس کے نزدیک اس کے وجود کی اہمیت دو کوڑی کی بھی نہیں تھی۔ پھر وہ کس بنیاد پر اس سے کچھ پوچھتی۔ بھلا تھی کہ کچھ پل گزرنے کے بعد وہ بھی بستر پر آ گیا تھا۔

"تم نے اتنی جلدی لباس بدل لیا، میرا انتظار بھی نہ کر سکیں۔" اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر وہ کہہ رہا تھا۔ وہ کتنے دلوں

سے یہ سب برداشت کر رہی تھی۔ جب سے نکاح ہوا تھا اس کی یہی روٹین تھی مگر آج کے تجربے نے اندر تک اس میں اترتی اشتعال نے اس کا ذہن بدل دیا تھا۔ پہلے وہ اس کے ہاتھ نہیں روکتی تھی مگر اب اس کے ہاتھ برداشت نہیں ہوتے تھے۔ سارے وجود میں تکلیف کی لہر اترتی چلی گئی تھی۔ وہ بستر پر بیٹھ کر اس پر جھکا تھا۔ اسے اپنے بازوؤں کے حصار میں لینا چاہتا تھا، لہجہ یکسر بدل گیا تھا آنکھوں میں واضح طلب سی اتر آئی تھی۔

"چھوڑو مجھے۔ اپنے غلیظ، ناپاک ہاتھ نہیں لگاؤ مجھے۔" شاید اب ضبط کا پیمانہ چھلک گیا تھا۔ اب وہ اپنے وجود کی مزید توہین برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ بپھرے ہوئے انداز میں اس کے ہاتھوں کو جھٹک دیا تھا۔

"کیا بکواس کرتی ہو تم۔" یوں ہتک آمیز انداز میں اپنے ہاتھ جھٹکے جانے پر وہ بھی برداشت نہیں کر پایا تھا۔ وہ بستر سے اترنے لگی تھی، اس نے فوراً بازو پکڑ کر دھکیلا تھا۔

"کہاں جا رہی ہو۔ یہ کیا تماشا ہے۔ یہاں لیٹو۔" اسے کھینچ کر بستر پر گرایا تھا۔ رانیل کا تن بدن سلگنے لگا۔

"تماشا کیا ہوتا ہے تم کیا جانو۔ سارے عالم میں میری ذات کا تماشہ لگوا کر تم مجھے تماشبین کا لفظ سنا رہے ہو۔" آج رانیل کا ہر انداز ہی نرالا تھا۔ وہ خود حیران تھی۔ جب احتجاج کرنے کا وقت تھا تب وہ چپ چاپ سب سہہ گئی تھی اور اب۔

"رانیل! بند کرو اپنی بکواس۔" وہ آہستہ آواز میں چیخا تھا۔ شاید اسے گھر میں موجود مہمانوں اور لوگوں کی پروا تھی جب کہ رانیل کو اب کسی کی بھی پروا نہیں تھی۔

"کیوں کروں اپنی بکواس بند۔ میں کہہ رہی ہوں چھوڑو مجھے۔ اپنے ناپاک ہاتھوں کو صرف اپنے تک محدود رکھو۔ اتنے دنوں سے سہہ رہی ہوں۔ بس بہت ہو گیا، اب برداشت نہیں کروں گی۔" وہ اونچی آواز میں چیخی تھی، ساتھ ہی آنسو بھی بے اختیار باہر نکل آئے تھے۔ رانیل نے عبدالباری کی مضبوط و چٹانی گرفت سے اپنا بازو چھڑوانے کی کوشش بھی کی تھی۔

"آہستہ بولو۔ ورنہ حلق سے سانس کھینچ لوں گا۔ اسی لیے میں اس گھر میں رہنے کے حق میں نہیں تھا۔ جانتا تھا تمہیں اور شہ مل جائے گی۔ ویسے بھی اس گھر میں تمہارے بہت خیر خواہ ہیں۔" رانیل کے منہ پر اپنا کھردرا ہاتھ رکھ کر وہ غرایا تھا۔ رانیل صرف بے بس چڑیا کی طرح پھڑپھڑا سی گئی۔ آنسو ٹوٹ کر دائیں بائیں گرنے لگے۔ عبدالباری نے اس کے منہ سے ہاتھ اٹھایا تو وہ اسے پیچھے دھکیل کر بستر سے اتری۔

"بہت برداشت کر لیا ہے میں نے۔ اب نہیں کروں گی۔ انسان ہوں، بت نہیں..... کیا سمجھ رکھا ہے تم نے مجھے۔ اف میرے خدا! اتنی تذلیل، اتنی توہین۔ کوئی تقدس ہی نہیں تمہارے نزدیک اس رشتے کا..... اصل پاکیزگی کیا ہوتی ہے تم جیسے نفس پرست، رشوت خور انسان کیا جانیں..... تم نے مجھے بے غیرتوں کی طرح گھر کی چار دیواری سے نکال کر چوراہے میں سر عام برہنہ پا کھڑا کر دیا اور میں چپ رہی، خاموش ہو گئی۔ صرف اس لیے کہ تم ضد پر اترے ہوئے ہو، اگر میں نے کچھ کیا تو رہا سہا بھرم بھی ختم ہو جائے گا مگر آج جو تذلیل لوگوں کی نظروں میں، میں نے دیکھی ہے، جو باتیں میرے کانوں نے سنی ہیں اور جو نظریں میرے وجود نے برداشت کی ہیں، وہ میں مزید نہیں سہہ سکتی۔ ختم کرو اپنا یہ کھیل۔"

"چٹاخ..." ابھی وہ مزید کچھ کہنا چاہتی تھی کہ عبدالباری کا زناٹے دار تھپڑ اس کے نرم و نازک رخسار کو سلگا گیا تھا۔ اس کی بولتی ایک دم بند ہوئی تھی۔

"شٹ اپ۔ بہت کر لی تم نے اپنی بکواس۔ اب ایک لفظ مزید نہیں سنوں گا۔ بیوی ہو تم میری۔ یاد رکھو! کوئی غلط لفظ نہیں سنوں گا۔" اس کا انداز مالکانہ حقوق کے نشے میں ڈوبا ہوا تھا۔ "میں نے کبھی تم پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ اب بھی صرف تمہاری بکواس کا نتیجہ ہے۔ آئندہ ایسی بکواس کی تو زبان گدی سے کھینچ لوں گا۔" اس کا بازو تھام کر اسے بستر کی جانب دھکیل

دیا تھا، اس طرح کہ وہ منہ کے بل بستر پر جا گری تھی۔ وہ شدت سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

"کیوں کروں اپنی بکواس بند۔ کیا ہے ہمارے درمیان، صرف ضد۔ جب خاص کچھ ہے ہی نہیں تو کیوں برداشت کروں یہ سب۔ صرف ایک ضد تھی میں تمہارے لیے۔ اب تمہاری تحویل میں، تمہاری دسترس میں ہوں۔ فاتح ہو تم، میرے وجود پر ملکیت کا جھنڈا گاڑ کے روز جشن مناتے ہو تم..... نہ جانے کیا ثابت کرنا چاہتے ہو تم۔ میں یہ سب سہہ لیتی، سب برداشت کر لیتی اگر تمہارے نزدیک میرے وجود کی نہیں میرے کردار کی کوئی اہمیت ہوتی۔ محبت نہ سہی، احترام کا جذبہ ہی ہوتا۔ وفا اور یقین کا نہ سہی اس رشتے کا تقدس ہی پامال نہ کرتے تم۔ مگر۔ تم تو انتہائی بدنیت و بدفطرت انسان ہو..... تم پر تو تھوکا جا سکتا ہے کبھی گلے نہیں لگایا جا سکتا۔"

رخسار آگ کی طرح دہک رہا تھا جب کہ زبان شعلے اگل رہی تھی۔ نرم و نازک روئی جیسے رخسار کی اسکن سرخ ہو چکی تھی۔ انگلیوں کے نشان بہت واضح تھے۔ وہ منہ کے بل ابھی بھی دراز تھی، سب کہہ رہی تھی۔ کوئی خوف، کوئی ہراس دامن گیر نہیں تھا۔ عبدالباری کچھ دیر سب بھینچے کھڑا رہا پھر آگے بڑھ کر سائیڈ پر رکھے جگ سے گلاس میں پانی بھرا تھا۔

"لو یہ پانی پی لو۔" وہ اب بالکل خاموش تھی۔ اس پکار پر بھی سر نہیں اٹھایا تھا شاید سب الفاظ ختم کر چکی تھی۔ اندر اٹھنے والا طوفان اپنی طغیانی سمیت کر مدھم پڑ چکا تھا۔ وہ اس کے قریب بیٹھا تھا، ہاتھ سے اس کا رخ سیدھا کیا تھا۔ آنکھیں قاتل ہو رہی تھیں۔ چہرے پر اپنی بے دردی کے نشان دیکھ کر نہ جانے اندر کیا کچھ ہوا تھا۔

"پانی پی لو۔" گلاس اس کے ہونٹوں کے قریب لے جاتے نرمی سے کہا تھا۔

"مجھے نہیں پینا۔" اس نے سختی سے جھٹکنا چاہا تھا۔ عبدالباری نے دوسرے ہاتھ سے اس کا بازو تھام لیا۔

"میں نخرے اٹھانے یا ناز برداریاں کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ تمہاری بھلائی کے لیے کہہ رہا ہوں۔ چپ چاپ پانی پی لو ورنہ۔" نرم لہجہ گلے ہی پل پھر سخت و کرخت ہو گیا تھا۔ رانیل نے عجیب نظروں سے دیکھا تھا پھر گلاس ہونٹوں سے لگا لیا۔ سانس اکھڑ رہی تھی سو پانی پینا مجبوری تھی۔

"گڈ گرل۔" وہ فتح مندی سے مسکرایا تھا۔ رانیل نظریں پھیر گئی پھر خالی گلاس سائیڈ پر رکھ کر وہ لائٹ آف کر کے بستر پر آ گیا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر اسے پھر اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ اس دفعہ کوئی مزاحمت نہیں ہوئی تھی شاید چیخ کر، رو کر وہ اپنے دل کا غبار نکال چکی تھی یا پھر اس کے مد مقابل لڑنے کی ہمت ہی اس قدر کم تھی۔

* * *

وہ اسکول میں تھی جب عبدالباری کا فون اس کے لیے آیا تھا۔ تین دن سے وہ گھر نہیں آیا تھا۔ کوئی فون، کوئی اطلاع تک نہ تھی۔ اس نے پتہ کروایا تھا فرقان بھائی سے تو معلوم ہوا کہ وہ اس شہر میں بھی نہیں ہے، کہاں ہے کسی کو کچھ علم نہیں۔ اس کی طرف سے ایک فطری سی پریشانی بہر حال تھی۔ وہ اردو کا پیریڈ لے رہی تھی جب اطلاع ملی تھی۔ وہ سب چھوڑ چھاڑ فون سننے آفس میں آ گئی تھی۔

"عبدل کا فون ہے۔" بابا اسے ریسیور تھما کر آفس سے نکل گئے تھے۔

"ہیلو۔" وہ کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

"رانیل! میں نے گھر فون کیا تھا تو پتہ چلا کہ تم اسکول میں ہو۔" بغیر سلام و دعا کے وہ اس کی آواز پہچانتے ہی کہہ رہا تھا۔

"بس گھر میں فارغ تھی اسی لیے چلی آئی۔" اس نے بے تاثر لہجے میں بتایا۔

"اچھی بات ہے۔ مزاج یار میں کچھ تو تبدیلی آئے گی۔" دوسری طرف سے دل جلایا گیا تھا۔ وہ سلگ سی گئی۔ کچھ سخت

کہنے سے بمشکل زبان کو روکا۔

"کیسے فون کیا؟" تین دن سے کوئی رابطہ نہ تھا اسی لئے اصل مقصد کی طرف آ گئی۔ لہجے میں ایک واضح تلخی تھی جسے شاید وہ بھی نوٹ کر گیا تھا۔

"کیوں بغیر کسی وجہ کے میں تمہیں فون نہیں کر سکتا۔ نصف بہتر ہو تم میری۔"

"اچھا اتنی جلدی یاد آ گیا کہ ہمارے درمیان ایسا کوئی رشتہ بھی ہے۔ مزید کچھ اور بھی یاد ہے کہ نہیں....." اس نے تلخی سے پوچھا تھا جب کہ انا ہلبلا رہی تھی کہ چپ رہو مگر نہ جانے کون سا احساس تھا جو یہ سب اگلوا گیا تھا۔ شاید آنکھ سے آنسو بھی بہنے لگے تھے۔ آج کل اپنی بے وقعتی اور توہین کا احساس ہر احساس پر حاوی ہونے لگا تھا۔

"خیریت بیگم صاحبہ! اتنی مرچیں کیوں چبا رہی ہیں۔" عام انداز میں دونوں بات کرنا جیسے جانتے ہی نہ تھے۔ دوسری طرف سے بھی وہی انداز اختیار کیا گیا تھا۔ وہ مزید سلگ گئی۔

"اگر واقعی ہمارے درمیان ایسا کوئی رشتہ ہے تو پھر پوچھ سکتی ہوں کہ تم اس وقت کہاں سے فون کر رہے ہو اور تین دن سے کہاں تھے؟ کوئی اطلاع، کوئی خبر نہیں یہاں سب، خاص طور پر بڑی بی کس قدر پریشان ہیں۔ بار بار مجھ سے پوچھ چکی ہیں مگر مجھے کچھ علم ہوتا تو میں بتاتی۔ مجھے تو ابھی تک یہ بھی علم نہ تھا کہ اوقات ہے میری؟ کیا حیثیت ہے میری؟ بتانے سے اگر تمہاری کوئی توہین ہوتی تھی تو کم از کم کوئی طریقہ ہی کر دیا ہوتا یا پھر کوئی نشانی ہی چھوڑا ہوتا کہ دوسروں کو خواہ مخواہ شرمندگی برداشت نہ کرنا پڑتی..... مانا کہ یہ نئی بات نہیں مگر رشتے بدلے ہیں اور لوگ بھی اور عادات و اطوار بھی بدل جاتے ہیں۔ کاش اتنا تو جان لیا ہوتا....." وہ جانتی تھی اس بے حس پر کچھ اثر نہیں ہوگا مگر پھر بھی سب کہہ گئی تھی۔ دوسری طرف وہ مسکرا رہا تھا۔

"بیہودہ وقت تمہیں جانے کی حیثیت کی کیوں فکر رہتی ہے۔ اپنے نام تو تمہیں لکھوا چکا ہوں، بابا نے ویلمہ کروا کے لوگوں کو بتایا ہے، اب کس بات کی گنجائش ہے۔ اگر اطلاع نہ دینے کا صدمہ ہے تو جب جا رہا تھا اس وقت خاموش رہنے کے بجائے پوچھ لیتیں تو علم ہو جاتا۔ بہرحال بی بی سے فون پر بات کر چکا ہوں۔ تمہیں فون اس لئے کیا ہے کہ رات آٹھ بجے تک تیار رہنا، ایک جگہ دعوت ہے۔ کوئی اچھا سا لباس زیب تن کر لینا۔ سوگ کی حالت میں نہ دیکھوں تمہیں میں۔" اسے کسی بھی خاطر میں نہ لاتے اپنی کہے جا رہا تھا۔ رائیل کا جی چاہا کہ ایک لمحے کی تاخیر کئے بغیر فون بند کر دے یعنی کوئی وقعت ہی نہیں تھی اس کے رونے کی عبدالباری کی نظروں میں۔ نرا پتھر تھا وہ۔

"کیسی دعوت؟ کس نے انوائٹ کیا ہے؟"

"چند دوستوں نے مل کر انوائٹ کیا ہے شادی کے سلسلے میں دعوت دی ہے۔ کتنے دنوں سے کہہ رہے تھے میں فارغ نہیں تھا۔ آج رات فراغت ہی فراغت ہے سو ہامی بھر لی۔ تم اچھی طرح ڈریس اپ ہو جانا۔ میں تمہیں پک کر لوں گا۔" وہ چپ چاپ سنتی رہی جب کہ دل اندر ہی اندر دعوت کا پس منظر اور دینے والوں کے متعلق جان کر سخت کبیدہ خاطر ہوا تھا۔

ایک دو باتیں اس نے مزید کی تھیں پھر فون بند کر دیا۔ دعوت میں جانے کا نہ ہی اسے شوق تھا اور نہ ہی کوئی اشتیاق۔ عبدالباری پر جب اعتبار و بھروسہ ہی نہیں تھا تو اس کے دوست جائیں بھاڑ میں۔ اس نے نہ جانے کا پکا ارادہ کر لیا تھا۔ وہ دنیاداری میں اپنا آپ برباد نہیں کر سکتی تھی، خاص طور پر مردوں کے سامنے جانے سے اسے ہمیشہ ایک چڑ سی ہوتی تھی۔

گھر آ کر اس نے گھر والوں سے دعوت کے متعلق بالکل ذکر نہیں کیا تھا۔ آمنہ اس کی بچپن کی دوست تھی، اکثر دونوں ایک دوسرے کے گھر آتی جاتی رہتی تھیں۔ بھابی کو اس نے راضی کر لیا تھا، شام ہوتے ہی تیار ہو کر دونوں آمنہ کے گھر آ گئی تھیں۔ دو گھنٹے سکون سے گزرے تھے، واپسی میں گھر چلنے کے بجائے اس نے ڈرائیور کو شاپنگ سینٹر چلنے کو کہا تھا۔

"اس وقت..... بھلا یہ کون سا وقت ہے۔ ایک تو تم بے وقت گھر سے نکلی ہو اب یہ بے وقت کی شاپنگ۔ کل کر لینا۔" بھابی نے منع کیا تھا۔

"نہیں بھابی! مجھے آج ہی شاپنگ کرنی ہے، میرے پاس جو لباس ہیں وہ باری کو پسند نہیں۔ کسی دعوت میں چلتے ہوئے باتیں سننا پڑتی ہیں۔ والدہ فیشن کہہ کر ہر لباس میں سو سو کیڑے نکالے جاتے ہیں۔ یہ کام میں آج ہی نمٹانا چاہتی ہوں۔" اس ... کا نام لے کر بھابی کو لاجواب کر دیا تھا۔ بس وہ کچھ وقت مزید سکون سے گزارنا چاہتی تھی۔ موبائل اپنا آف کر چکی تھی، ... اس نے ساتھ لانے ہی نہیں دیا تھا یہ کہہ کر ایک ہی کافی ہے۔ سو حسد سواری کی طرف سے چند گھنٹے سکون سے گزرے تھے۔

واپسی میں انہوں نے آئس کریم کھائی تھی گھر لوٹتے لوٹتے بھی گیارہ کا وقت ہو گیا تھا جیسے ہی گاڑی رکی سامنے ہی بڑی بی پریشانی سے ٹہلتے مل گئیں۔

"کہاں رہ گئی تھیں تم دونوں؟" چھوٹتے ہی انہوں نے پوچھا تھا۔

"خیریت؟" "انہیں اس قدر پریشان دیکھ کر" بھابی نے پوچھا تھا۔

"رائیل! تمہیں عبدل نے کسی دعوت میں چلنے کو کہا تھا، جب تم گھر سے نکلیں تمہاری غیر موجودگی میں اس نے ... کا پیک کر دیا تھا۔ دو گھنٹے انتظار کرتے بھی نکلے، کئی بار تمہارے موبائل پر بھی کال کرتا رہا ہے وہ ... گیا ہوا تھا تم ..." وہ متفکر لہجے میں پوچھ رہی تھیں۔

"میرے پاس اس کی شادیوں شادیوں کے ... تھے ... نکلی تھی بس کچھ دیر ہو گئی۔" وہ خود پر کوئی الزام نہیں لینا چاہتی تھی۔

"عبدل بہت غصے میں تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ تم جان بوجھ کر گھر سے نکل ہو۔ اب آئے تو آرام سے بات کرنا۔ تمہیں اس کے غصے کا اندازہ تو ہی نا۔" وہ اسے سمجھا رہی تھیں۔

"وہ کب غصے میں نہیں ہوتا ... اپنے گریبان میں جھانکنے کے بجائے دوسروں کو ہی الزام دینے پر تلا ہوا ہے۔ خود تو تین دن غائب رہے، یہ تک نہیں بتایا کہ گیا کہاں تھا، اب مجھ پر غصہ آ رہا ہے جان بوجھ کر میں گئی تھی۔ بہت برداشت کر لیا اس کی حاکم طبیعت کو اب نہیں کروں گی۔ آئے تو بتا دیجئے گا اسے۔" غصہ تو اصل میں اسی بات کا تھا، جو منہ میں آیا کہہ دیا۔ کوئی بھی پرواہ کئے بغیر بڑی بی اور بھابی کیا کہیں گی۔ عبدالباری کے روم میں جانے کے بجائے اپنے کمرے میں آ گئی جو کہ شادی سے پہلے اس کے استعمال میں تھا۔

"جی حضوری کر کے نواب زادے کو سر چڑھایا ہوا ہے۔ پہلے ہی کنٹرول کیا ہوتا تو یہ دن تو نہ دیکھنے پڑتے۔" الٹا سیدھا سوچتے اس نے تمام شاپنگ بیگز بیڈ پر اچھال دیئے۔ بھوک بہت شدت سے محسوس ہو رہی تھی، بالکل نظر انداز کئے وضو کر کے جائے نماز پر ... ہو گئی۔

صبح نو بجے کے قریب وہ کمرے سے باہر نکلی تھی۔ بھوک سے برا حال تھا، کچن میں آ کر اپنے لئے کھانا نکالا تھا۔ بھابی اس کے ... دیکھ کر خاموش رہیں۔ وہ خاموشی سے ناشتہ کرتی رہی۔

"بہت دیر تک آج تم سوتی رہی ہو عبدل کتنی مرتبہ تمہارا پوچھ چکا ہے۔" وہ چائے پی رہی تھی جب بھابی نے اطلاع دی تھی۔ وہ چونک گئی۔

"وہ آفس نہیں گیا ابھی تک۔" وہ دل ہی دل میں سوچ کر رہ گئی۔

"جب اوکھلی میں سر دیا تو پھر موسل سے کیا ڈرنا۔" آخری گھونٹ حلق میں اتار کر وہ کمرے میں چلی آئی۔ عبدل نے دروازے کی طرف پشت کی تھی، وہ فون پر کسی سے مخاطب تھا۔

"نہیں بتاتا تو تم زبان کاٹ دو اس کی... چمڑی ادھیڑ دو، اس کے فرشتے بھی بتائیں گے۔ مجھے ہر حال میں اس کی زبان کھلی چاہیے... چند گھنٹوں کے اندر، ورنہ میں تم لوگوں کے ہاتھ سلامت رہنے کی گارنٹی نہیں دوں گا۔ انڈر اسٹینڈ!"

اتنا وحشیانہ لب و لہجہ تھا، دوٹوک انداز میں ایک خاص تحکم لپٹا ہوا تھا۔ وہ لرز کر رہ گئی۔ اس کا یہ نیا روپ اس کے سامنے تھا۔ فون بند کر کے وہ پلٹا تھا۔ اسے کمرے میں دیکھ کر رک گیا۔

"اوہ... تو آ گئیں رانیل صاحبہ!" وہ اس کے مقابل آ کھڑا ہوا۔ "کیسی گزری رات...؟" وہ خاموش رہی۔ "کل جب میں نے کہہ دیا تھا کہ تم مجھے ہر حال میں تیار ملو تو پھر گھر سے کیوں نکلیں..." دیکھنے کا انداز بھی نہایت سفاک و وحشیانہ تھا۔

"بس میرا دل نہیں چاہتا تمہارے ساتھ کہیں بھی جانے کو۔" اس نے سادہ لہجے میں پراعتماد انداز میں کہا تھا۔ عبدل کا جی چاہا کہ کھینچ کر اسے طمانچہ رسید کر دے۔

"تم یہ کوشش اس وقت بھی کر سکتی تھیں جب میں نے فون پر اطلاع دی تھی۔" یہ پوچھتے ہوئے اس کا غصہ آسمان کو چھو رہا تھا جب کہ وہ اسے کسی بھی خاطر میں نہیں لا رہی تھی۔

"ہاں دے سکتی تھی اگر یہ یقین ہوتا کہ تم میرے انکار کو مان جاؤ گے جب کہ اس کے برعکس تم یہ کرتے کہ رات کو لے جانے کے بجائے تم مجھے صبح... تمام... اسی وقت... لے جاتے... اور میں تمہارے ساتھ کہیں بھی نہیں جانا چاہتی تھی۔"

"رانیل! تم... تم، کیا چیز ہو تم... کیا سمجھتی ہو خود کو؟" وہ اس وقت عبدالباری کے غصے سے ذرا بھی مرعوب دکھائی نہیں دے رہی تھی اور اس وقت اسے یہی بات سب سے زیادہ چبھ رہی تھی۔ اس نے رانیل کو جھنجوڑ ڈالا تھا۔ "میرے سامنے بڑے بڑوں کی زبانیں بند ہو جاتی ہیں اور تم ہو کہ..."

رانیل کو لگا اس کے کندھے عبدالباری کے ہاتھوں سے کٹ جائیں گے۔

"میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ میں تمہاری زرخرید نہیں ہوں... بیوی سمجھتے ہو تو بیوی کی طرح رکھو۔ طوائف یا بازاری عورت نہیں ہوں جو تمہارے دیا تمہارے دوستوں کے دل بہلانے کا ساماں کروں۔ میری اپنی بھی ایک ذات ہے، پسند اور ناپسند کے معیار ہیں جو تمہاری سرگرمیاں اور حرکتیں ہیں ویسے ہی انداز تمہارے دوستوں نے بھی اپنا رکھے ہوں گے۔ جب تمہیں برداشت کرنا میرے لیے ناممکن ہے تو پھر اور لوگوں کو کیوں کروں... یہ بات میری بجائے تمہیں سمجھنی چاہیے تھی۔" وہ اس کے ہاتھوں کو جھٹکتے ہوئے دو قدم دور ہٹتے بے خوفی سے کہہ گئی۔

"رانیل! تم میری نرمی کا ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہو..." عبدالباری کا بس نہیں چل رہا تھا کہ بے خوفی اور بڑے انداز میں چلتی رانیل کی زبان کو ایک لمحے میں کاٹ دے۔ کب عادت تھی اسے ایسے لہجے سننے کی اور اوپر سے رانیل کی باتیں..... اس رات بھی اس کی زبان نے اسے آؤٹ کر دیا تھا، اس وقت تو اور بھی برا حال ہو رہا تھا۔

"بس رانیل بیگم... اب کسی بھول میں مت رہو۔ بہت ڈھیل دی ہے میں نے تمہیں۔ اس گھر میں تمہیں لے کر آنے پر راضی صرف اس لیے ہوا تھا کہ مجھے امی کی محبت مار گئی تھی لیکن اب تمہیں اس گھر میں رکھنا بہت بڑی غلطی ہوگی اور مجھے غلطیاں کرنے کی عادت نہیں... کہنے کے بجائے عمل کرتا ہوں۔ سمیٹ لو اپنی چیزیں اور چلو یہاں سے..." عبدالباری نے رانیل کا بازو تھام کر الماری کی طرف دھکیلا تھا۔ وہ دیوار کا سہارا لے کر خود کو گرنے سے بمشکل بچا سکی تھی۔

"میں کہیں نہیں جاؤں گی... تم مجھے کہیں نہیں لے جا سکتے۔" پہلی دفعہ اس وقت اس کا لہجہ لڑکھڑایا تھا۔

"اچھا..." عبدالباری چند ثانیے تک دیکھتا رہا تھا۔ عبدالباری کے تیور ان لمحوں میں رانیل کو ناقابل فہم لگے تھے۔

"ٹھیک ہے۔ تم کوئی چیز نہیں لینا چاہتی تو نہ سہی... یوں ہی سہی..... چلو آؤ..." اس نے اس کی کلائی تھام لی تھی۔

"اب نہیں باری! اس دفعہ نہیں... چھوڑو مجھے..." اس نے اپنا بازو چھڑانے کی سخت کوشش کی تھی مگر بری طرح ناکام ہوئی تھی۔ مقابل کی گرفت فولاد کی مانند سخت تھی۔ وہ اسے لے کر باہر نکل آیا تھا۔

"باری... پلیز... زبردستی نہیں کرو...." وہ پوری جان سے چیخی تھی۔ راستے میں بھابی مل گئیں۔ اس وقت امی اور بابا ... میں تھے اور فرقان بھائی آفس میں۔

"کہاں لے جا رہے ہو عبدل تم رانیل کو؟" رانیل کو روتے، چیختے اور عبدل کو اسے کھینچ کر لے جاتے دیکھ کر بھابی ایک دم تیزی سے آگے بڑھی تھیں۔

"مت جائیے بھابی آپ سامنے سے... یہ سمجھتی ہے میں بہت گھٹیا ہوں... اس گھر کی چار دیواری کے علاوہ یہ میرے ساتھ کہیں بھی محفوظ نہیں... اب میں اسے دکھانا چاہتا ہوں کہ میں کس قدر گھٹیا ہوں اور کس حد تک گر سکتا ہوں۔" عبدالباری کا ... کسی بھی احساس ... سے عاری سفاک اور ... تھا، بھابی کی ... سمجھ نہیں... رانیل پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

"معاملہ کیا ہے...؟" انہوں نے مداخلت کی تھی۔

"بہت شوق ہے اسے خود کو طوائف اور بازاری عورتوں ... اس کی اوقات اور اپنی زندگی میں کیا مقام ہے، بتانے لے جا رہا ہوں... امی آ گئیں تو بتا دیجئے گا کہ میں اسے اپنے ساتھ ... لے گیا ہوں۔" ایک رحم بھری نظر رانیل پر ڈال... وہ پھر اس کی کلائی کھینچتا اپنے ساتھ گھسیٹتا آگے بڑھ گیا تھا۔

"عبدل... بات سنو، پلیز رکو..." بھابی پیچھے آوازیں دیتی رہ گئی تھیں مگر اس نے کان نہیں دھرے تھے۔ اسے گاڑی میں دھکیل کر زن سے گیٹ سے گاڑی نکال کر لے گیا تھا۔

* * *

کتنے دنوں سے رانیل کی طبیعت خاصی خراب تھی۔ کچھ بخار تھا، زکام نے الگ حالت خراب کر رکھی تھی اور دیر سے وقت بے وقت کے چکر... یہاں آ کر وہ صرف بیمار ہو کر رہ گئی تھی۔ عبدالباری نہ صرف اسے یہاں لے کر آیا تھا بلکہ باہر کی دنیا سے جیسے ہر طرح کا تعلق ہی ختم کر دیا تھا۔ قید، بیماری، اذیت و تنہائی کی سزا کیا ہوتی ہے وہ اب سمجھ سکی تھی۔ عبدالباری کو اس کی دن بدن بگڑتی حالت کا ذرا احساس نہیں تھا۔ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر انجان بن جاتا تھا۔ کتنی دفعہ اس کی موجودگی میں چکرا گئی تھی مگر مجال ہے جو ذرا بھی پگھلا ہو۔ گھر سے امی، بابا، فرقان بھائی، بھابی وغیرہ سب ہی کتنی دفعہ آ چکے تھے، ہر ایک نے اپنی طرف سے بھرپور کوشش کی تھی معاملے کو سلجھانے کی لیکن عبدالباری ان کی بات کیا سنتا بلکہ اس نے تو ان کو رانیل سے بھی ملنے نہیں دیا تھا۔ وہ ایک قیدی بن کر رہ گئی تھی۔ وہ اپنے سارے افسرانہ حربے شاید اسی پر آزمانا چاہتا تھا۔

عبدالباری کے کچھ دوست آئے ہوئے تھے، ان کے ساتھ ڈرائنگ روم میں تھا۔

"پہلی دفعہ تم یہاں نہیں تھے اور کچھ گڑبڑ ہو گئی تھی۔ تمہارے محکمے نے بہت تنگ کیا ہوا ہے، ہر چوکی پر روک کر تفتیش شروع کر دیتے ہیں۔ اس دفعہ ذرا خود دیکھو کون لوگ ہیں وہ... باس کا بھی یہی حکم ہے۔" تنویر کہہ رہا تھا، اس نے ایک نظر اس پر ڈالی اور بریف کیس پر جو کہ نوٹوں سے بھرا میز پر رکھا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ تم پاس سے کہہ دینا کام ہو جائے گا۔ میں خود جانچ پڑتال کر لوں گا۔ کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔" بریف کیس بند کرتے باری نے ایک طرف رکھ دیا تھا۔ تنویر مسکرا دیا۔

"مجھے یقین تھا تم انکار نہیں کرو گے۔ یہ تو صرف ایڈوانس ہے۔ باقی رقم کام ہونے کے بعد ہوگی۔ جو چاہو گے ملے گا۔ تم تو یاروں کے یار ہو۔ باس بڑی تعریفیں کرتا ہے تمہاری۔ بڑا مقام ہے تمہارا۔"

عبدالباری کے چہرے پر صرف ایک پل کو مسکراہٹ آئی تھی پھر معدوم ہو گئی۔ رائنل جو ادھر یوں ہی آ نکلی تھی، دروازے پر ہی ٹھٹک گئی۔ یہ چہرے اس کے لئے بالکل اجنبی تھے۔ فیصلہ نہ کر پائی کہ کیا کرے، اندر جائے یا نہیں۔

"عبدالباری! سنا ہے یار شادی کر لی ہے تم نے۔ بڑے بے مروت نکلے، ویسے کے لڈو تک نہ کھلائے۔ ایک راز کی بات سنا، لڑکی بڑی عالی نسل کی چنی ہے تم نے، ایک دفعہ ماجد نے ذکر کیا تھا کہ تم خوار ہو رہے ہو کسی کے لئے مگر یقین نہیں آیا تھا تم اس ٹائپ کے ہو بھی ہو۔ ہنس یہ وہی لڑکی تو نہیں۔" جبار پوچھ رہا تھا جو تنویر کے ساتھ ہی آیا تھا۔ عبدالباری کے ماتھے پر اس کے ذکر سے چند بل ابھرے تھے مگر واضح نہ ہو سکے۔

"ہوں۔" وہ صرف ہنکارا بھر سکا تھا۔

"تمہارے دل سے چھپے... حیران ہوئی تھی... سے انکشاف کیا تھا، نکاح کے کاغذات پہلے بنوائے تھے اور شادی بعد میں کی تھی۔ ویسے بڑے تیز نکلے تم تو۔ ہم تو پانے کا عشق... تھے۔ ہم تو تمہیں خشک مزاج ہی سمجھتے رہے۔ جہاں کہیں کسی لڑکی کا ذکر آیا تم یوں پہلو بچا کر نکلے کہ کبھی جانے کتنا... اس جماعت کو در اب سچ کہوں تمہاری اس عشق والی شادی نے بڑا حیران کیا ہے۔" جبار نے مزید کہا تھا۔ ... عبدالباری کی پیشانی کی لکیریں بہت واضح تھیں۔

"ویسے یار وہ ہو گی بہت خوبصورت، ہم بھی تو دیکھیں کیسی ہے... جس نے ہمارے یار کے دل کو فتح کر لیا ہے۔ یوں ہوش اڑے ہیں کہ اب اسے یاروں کی بھی یاد نہیں آتی۔ مگر بھی فون کریں تو بھی مس کرتے۔"

رائنل کو اس شخص کی باتیں ناقابل برداشت لگ رہی تھیں۔ صرف اور صرف عبدالباری کا ردعمل دیکھنا چاہتی تھی۔

"یار عبدالباری! ہم تو تمہیں سنا ہے اسی گھر میں رکھا ہے تم نے اسے بھی۔ بڑی خوب صورت ہے وہ اور تو اور تمہارے..."

"بس۔" عبدالباری جو اتنی دیر سے خاموش تھا ایک دم صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ہاتھ اٹھا کر جبار کو روک دیا تھا۔ وہ کچھ مزید بکواس کر رہا تھا مگر عبدالباری کی چنگھاڑ پر الفاظ حلق میں ہی اٹک گئے تھے۔

"میں اتنی دیر سے اگر تمہاری بکواس سن رہا ہوں تو صرف اس لئے کہ مجھے پچھلی دوستی کا لحاظ ہے ورنہ میری بیوی کے متعلق ایک بھی بات کہنے والے کی اس وقت یہاں لاش تڑپ رہی ہوتی۔" عبدالباری نے آگے بڑھ کر جبار کا گریبان پکڑ لیا تھا جب کہ وہیں ہونٹوں پر ہاتھ رکھے ہکا بکا رہ گئی۔ باری کا ردعمل اس کی توقع کے برعکس تھا۔

"وہ قانونی و شرعی طور پر میری بیوی ہے۔ میں نے اسے جیسے بھی حاصل کیا ہو وہ تمہارا نہیں میرا مسئلہ ہے۔ آئندہ میرے سامنے آتے ہوئے سو مرتبہ سوچنا...." لہجے میں سفاکی ہی سفاکی تھی۔ جبار ہراساں ہو گیا تھا۔ عبدالباری کا ردعمل بہت شدید اور غیر متوقع تھا۔

"یار کیا کرتے ہو.... نا سمجھ ہے یوں ہی کہہ گیا ہے.... اب چھوڑ دو بھی۔" صورت حال خراب ہوتی دیکھ کر اس کا دوست تنویر آگے بڑھا تھا۔

"تو پھر لے جاؤ اسے، آئندہ یہ مجھے نظر نہ آئے۔ سمجھا لینا اسے اگر اس نے میرے متعلق کوئی الٹی سیدھی بکواس کی تو..."

زندہ رہنے کی گارنٹی نہیں دوں گا۔" اسے جھنجوڑ کر پیچھے دھکیل دیا تھا۔ وہ صوفے پر جا گرا تھا۔ عبدالباری کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ رائنل کو لگا وہ کسی بھی لمحے ان لوگوں پر گولی چلا دے گا، وہ انتہائی وحشی تھا۔ وہ سہم کر پیچھے ہٹ گئی تھی۔ اسے حقیقتاً عبدالباری سے بہت خوف محسوس ہوا تھا۔

"تم کول ڈاؤن رہو.... آئندہ ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔ یہ تمہیں نظر نہیں آئے گا۔" تنویر اس کے تیور دیکھ کر اسے بہلا رہا تھا۔

"تم جاؤ یہاں سے اور اسے بھی لے جاؤ۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا تھا اور رخ بھی بدل لیا تھا۔ تنویر، جبار کو لے کر باہر نکل گیا تھا۔

وہ کمرے میں ابھی بھی اسی طرح ساکت سی بیٹھی ہوئی تھی، پاؤں نیچے لٹک رہے تھے دونوں ہاتھ گود میں تھے۔ وہ مضطرب انداز میں کبھی ہونٹ کاٹنے لگتی تو کبھی انگلیاں مروڑنے لگتی۔ وہ مسلسل باری کے متعلق ہی سوچ رہی تھی۔ وہ جیسا بھی تھا، وہ جو کچھ کرتا رہا تھا، اس کا جو بھی رویہ تھا جو بھی عادات، اطوار اور سرگرمیاں تھیں ان سب کے برعکس اس نے آج جو بھی دیکھا وہ سب تھا بالکل مختلف تھا۔ دل اس حقیقت پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھا کہ عبدالباری کے اس سب کا تجزیہ بہت اچھا موجود ہے۔ وہ تو سوچ بیٹھی تھی کہ یہ شخص ہر جذبے، ہر احساس سے عاری ہو چکا ہے مگر...

آنسو آہستہ آہستہ اس کے رخساروں پر بہہ نکلے تھے۔ وہ رونا نہیں چاہتی تھی، خاص طور پر عبدالباری کے لئے تو کبھی بھی نہیں مگر اب اسے اپنے اوپر اختیار نہیں رہا تھا۔ کچھ دیر قبل دیکھا جانے والا واقعہ پوری جزئیات کے ساتھ اس کے دل و دماغ پر اپنے نقش چھوڑ گیا تھا۔

عبدالباری کمرے میں داخل ہوا تو ایک دم نظر ٹھٹکی۔ وہ بے حس و حرکت دونوں پاؤں نیچے لٹکائے دونوں ہاتھ گود میں رکھے سر جھکائے بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔

"کیا ہوا....؟ اب کون مر گیا ہے جس کا سوگ منا رہی ہو۔" وہ اس کے قریب آیا تھا۔ الفاظ تھے کہ پتھر، رائنل کے آنسوؤں میں روانی آ گئی۔

"اگر ماں باپ کا سوگ منا رہی ہو تو جتنا عرصہ انہیں مرے ہوئے ہوا ہے اس میں انسان خود بخود سنبھل جاتا ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے اس کے زخموں کو کرید رہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا گئی۔ جانے کون کون سے دکھ یاد دلا رہے تھے۔ عبدالباری دونوں گھٹنے زمین پر ٹیک کر دو زانو اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ وہ شدت سے رو رہی تھی۔ یہ وجود دل رہا تھا، جب عبدالباری نے اس کے چہرے سے ہٹا کر دونوں ہاتھوں کو اپنے فولادی ہاتھوں میں مضبوطی سے تھام لیا تھا۔

"اگر اس بات کا سوگ منا رہی ہو کہ میں مر کیوں نہیں رہا تو میری جان! تم صرف اپنی جان کو نقصان میں ڈال رہی ہو۔ میں اتنی جلدی اور آسانی سے نہیں مروں گا..... ابھی تو مجھے اپنا بہت سارا گھٹیا پن اور کالے کرتوت تمہیں دکھانے ہیں..... ابھی سے کمزور پڑنے لگی ہو۔ بھی دیکھا ہی کیا ہے تم نے۔ شاباش سوگ منانا بند کرو، کچھ آنسو سنبھال کر رکھو شاید دنیا کو دکھانے کے لئے ہی کبھی میری میت پر بہانے پڑ جائیں۔" رائنل کے ہاتھوں کو ہونٹوں سے چھوتے ہوئے دلکش انداز میں یوں ہی تھامے چہرہ اوپر کرتے وہ مسکرا رہا تھا۔ موت اس کے لئے صرف ایک مذاق تھی، وہ اندر ٹوٹ کر روئی تھی۔ اس وقت وہ اپنی کیفیت خود بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔ دل پر اختیار سا اٹھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ مزید ستم یہ تھا کہ وہ بالکل سامنے بیٹھا کتنے قریب تھا۔ عبدالباری کی سانسوں کی گرماہٹ، ہاتھوں کی حدت اور لمس اس کے وجود کو پگھلنے دے رہا تھا۔ عجیب بے قراری نے آ لیا تھا۔

"بند کرو یہ تماشا میں ان آنسوؤں سے پگھلنے والا نہیں ہوں۔ اگر تم یہ سوچے بیٹھی ہو کہ میں تمہارے ڈرامے سے متاثر

ہو کر تمہیں واپس اسی گھر میں لے جاؤں گا تو یہ تمہاری سخت بھول ہے۔ عبدالباری ابھی اتنا کمزور نہیں ہوا کہ پالی کے ان ٹکڑوں میں بہہ جائے۔ کنٹرول کرو خود پر۔" درشتی سے اسے ڈانٹتے اس نے اسے کندھوں سے جکڑتے جھنجوڑ ڈالا تھا۔ پھر اسے پیچھے دھکیل کر اٹھ کر وارڈ روب کی طرف بڑھا۔

"کیا پکایا ہے تم نے؟" کپڑے نکالنے کے بعد وہ کھانے کی بابت پوچھ رہا تھا۔

وہ بمشکل سر ہلا پائی تھی۔ آنکھیں قاتل رنگ ہو رہی تھیں اوپر سے بہتے آنسو کسی قیامت سے کم نہ تھے۔ وہ نلی میں سرہلاگئی تھی۔ کتنی کمزور لگ رہی تھی وہ اس وقت۔ آنکھوں کے گھیرے میں کٹورے مقابل کو چاروں شانے چت کر دینے کو کافی تھے۔ دل کر کچھ ہو تھا شاید سخت خول چٹخ تھا شاید وہ جھنجلا کر آگے بڑھا تھا۔ لباس بستر پر پھینک کر وحشیانہ انداز میں اس کا بازو تھام کر مقابل کھڑا کیا تھا۔

"کہہ دے نا بند کر دیا نا تک ابھی زندہ ہوں، جب مر جاؤں تو تب جتنا چاہے جی بھر کر رو لینا تم... رانئیل جانم! ابھی تمہارا ہنسنا اور رونا صرف اور صرف میری مرضی سے ہوگا سمجھیں تم" وہ اس پر حلق کے بل چیخا تھا۔

"باری میرے دل کو کچھ ہو رہا ہے مجھے اپنے جسم سے الگ پڑی رو... نکلتی لگ رہی ہے۔ پلیز باری...!" وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر اور شدت سے صبط کھو بیٹھی تھی۔ یہ موقع تھا کہ اس نے آگے بڑھ کر باری کی قربت اختیار کی تھی، وہ بھی اس حالت میں جب کہ جسم بخار سے پھنک رہا تھا۔

باری سالحوں میں کچھ بھی نہیں سمجھ پایا تھا اور پھر کچھ سمجھنا چاہتا تھا بس کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لینا چاہتا تھا۔ رانئیل کی یہ دیوانگی اس کی قربت اور خود سپردگی کا یہ انداز پاگل بنا تھا۔ بہت کچھ کہتا ہوا تھا۔ رانئیل کے نرم و نازک وجود کی مہک اتنی دلکش و سحر طاری کرنے والی تھی کہ وہ اپنے اندر کے شیطان سے ہارتے ہوئے اس کے گرد حصار کھینچ بیٹھا تھا۔ رانئیل کا وجود کتنا گرم تھا، ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے آگ دہک رہی ہو۔

"باری پلیز! مجھے کھل ہو میں جانے دو باری دیکھو ورنہ میرا دم گھٹ جائے گا۔" اس کی شرٹ کو دونوں ہاتھوں سے دبوچے وہ اپنے اختیار میں بھی نہیں لگ رہی تھی۔ آنسوؤں کی نمی عبدالباری کے سینے میں ایک ٹھنڈک سی اتار رہی تھی حتیٰ کہ لمحوں میں اس کا موڈ کافی بحال ہو گیا تھا۔

"ہوں..... تم اپنا حلیہ درست کرو پھر چلتے ہیں باہر۔" وہ جب سے اسے کر یہاں آیا تھا پہلی بات نرمی سے کی تھی۔ اس نے بہت نرمی سے اسے خود سے جدا کیا تھا۔

رانئیل خود بھی اپنی کیفیت سمجھنے سے قاصر تھی۔ یہ صرف آج کا واقعہ نہیں ہوا تھا، کتنے دنوں سے یہی حالت ہو رہی تھی۔ کئی بار وہ یونہی چھوٹی چھوٹی باتوں پر بلاوجہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگ جاتی تھی۔ شاید آج کل بخار اور زکام رہنے لگا تھا اسی وجہ سے حوصلہ کم پڑتا جا رہا تھا اوپر سے اس پر جان چھڑکنے والے پیارے بھی اس سے دور تھے۔ عبدالباری کا سرد رویہ الگ اس کی روح کو گھائل کیے دے رہا تھا۔ آج وہ کتنے دنوں بعد یوں ٹوٹ کر مہربان ہو تھا۔ دل کو ایک سکون سا ہو تھا۔

عبدالباری رانئیل کو لے کر پہلے شاپنگ سینٹر گیا تھا وہاں سے چھوٹی موٹی چیزیں لی تھیں پھر وہ اسے لے ریسٹورنٹ میں آ گیا۔

"کیا لو گی؟" مینو دیکھتے ہوئے اس نے چپ چپ سی افسردہ رانئیل سے پوچھا۔ وہ نفی میں سر ہلا گئی۔ عبدالباری خود ہی مینو لکھوانے لگا۔

تھوڑی دیر بعد کھانا سرو کر دیا گیا تھا۔

عبدالباری روسٹ پر طبع آزمائی کر رہا تھا جب کہ رانئیل تھوڑی سی بریانی پلیٹ میں ڈالے کھا رہی تھی۔ ابھی اس نے چند لقمے ہی لیے تھے جب اسے زبردست ابکائی آئی تھی۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھے یک دم اٹھی تھی۔

"کیا ہوا؟" اسے تیر کی طرح اٹھتے دیکھ کر عبدالباری حیران ہوا تھا۔ وہ جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ ارد گرد موجود تھی کچھ سمجھ نہ آئی کہ کیا کرے جب کہ اب اسے منہ بھر کر قے آئی تھی۔ وہ ہاتھ منہ پر رکھنے کے باوجود خود کو سنبھال نہ سکی فوراً میں پر گری گئی تھی۔ باری ایک دم اٹھا تھا، ارد گرد کی ٹیبلز پر موجود، افراد اور ہوٹل کی سروس بھی متوجہ ہوگئی تھی۔

"کیا ہوا ہے کچھ تو بتاؤ" رانئیل کا وومٹنگ سے برا حال تھا جب عبدالباری نے اسے کندھوں سے تھام کر سہارا دیا تھا۔

"باری...!" رانئیل نے اس کی شرٹ دبوچی تھی جب کہ گرفت انتہائی سخت تھی کہ حد نہیں۔ وہ سخت متوحش ہوا۔

"رانئیل!"

"باری..." وہ حواس کھو چکی تھی شاید تکلیف ناقابل برداشت تھی۔

"رانئیل..." وہ دیوانوں کی طرح اس پر جھکتے چیخا تھا وہ ہوش میں کہاں تھی جو جواب دیتی۔ وہ پاگلوں کی طرح اسے جھنجوڑنے لگا۔

"فوڈ پوائزننگ" اس کے ذہن میں سب سے پہلے یہی بات آئی تھی۔

"رانئیل اٹھو آنکھیں کھولو رانئیل" اس نے نبض دیکھے اس کو اب کچھ ہوش نہیں تھا ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے جسم سے جان نکل رہی ہو۔

وہ اسے کسی قیمتی متاع کی طرح فوراً بازوؤں میں سمیٹتے ہوئے باہر بھاگا تھا جب کہ رہ رہ کر یہی خیال آ رہا تھا کہ ہوٹل کے کھانے میں ضرور کچھ غلط ہوگا۔

اسپتال کے کوریڈور میں سخت بے چینی و بے قراری سے ٹہلتے ہوئے بہت فکر مند تھا۔ ویسے تو ڈاکٹر نے چیک اپ کے بعد تسلی دی تھی مگر اسے سکون نہیں آ رہا تھا۔ رانئیل کو کسی اور روم میں لے جایا گیا تھا، اب تک وہ روم میں ہی تھی۔ نہ جانے وہ حواس میں تھی یا نہیں، وہ یکسر لاعلم تھا۔ وہ لیفٹ اینڈ رائٹ کرتے پلٹا تھا جب کمرے سے اس کا بلاوا آ گیا تھا۔ وہ فوراً اندر داخل ہوا تھا، رانئیل بستر پر پڑی ہوئی تھی۔ آنکھیں بند تھیں، ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ ابھی بھی حواس میں نہیں تھی جب کہ لیڈی ڈاکٹر اپنی ٹیبل پر موجود تھی۔

"ڈاکٹر! خیریت؟" وہ صرف اتنا ہی پوچھ سکا تھا۔ ڈاکٹر کے ہونٹوں پر ایک رنگین سی مسکراہٹ آ گئی تھی۔

"یس..... آپ اتنے پریشان کیوں ہیں شی از آل رائٹ۔" اسے کچھ سکون ملا تھا، ایک گہری سانس لی تھی۔ "لگتا ہے بہت محبت کرتے ہیں اپنی بیوی سے آپ۔" ڈاکٹر کے ہونٹوں پر اگرچہ پیشہ ورانہ مسکراہٹ تھی مگر انداز چھیڑنے والا تھا۔ وہ بس بے ارادہ اس پر نظر پڑ گئی، جو بے خبر تھی۔ اسے آج تک یہ نہیں معلوم ہو سکا تھا کہ اسے رانئیل کی اتنی چاہ و طلب کیوں ہے۔ دل بس اسے دیکھ کر اتنا پرسکون کیوں ہو جاتا ہے۔ محبت جیسی لغویات پر اسے کبھی یقین نہیں تھا بس ہمیشہ دل کو یہی باور کرایا تھا کہ وہ اس کی ضد ہے۔ محبت کی کتنی ہیبت ہوتی ہے؟ اس حقیقت کا اندازہ اسے اس وقت ہوا تھا جب ولیمے کی رات رانئیل نے محبت کی بات کی تھی۔ اگرچہ ڈھکے چھپے تھے مگر مفہوم واضح تھا اور اب جو ڈاکٹر کہہ رہی تھیں وہ حیران کن تھا۔

"کیا ہوا انہیں..... ان کی طبیعت اتنی خراب کیوں ہوئی... کہیں کوئی فوڈ پوائزننگ کا مسئلہ تو نہیں؟"

"نہیں..... شی از پریگننٹ۔" ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے بتایا تھا۔

وہ منہ کھولے ہکا بکا رہ گیا۔ اس پوائنٹ تک تو اس کی رسائی ہی نہیں ہوئی تھی۔

"کیا..." "وہ کئی ثانیے تک حرکت بھی نہ کر سکا۔" "دوبارہ کہیے آپ کی بات کا کیا مطلب ہے......؟" وہ بے یقینی تھا وہ کیا سمجھ تھا اور معاملہ کیا نکلا تھا ورنہ وہ تو ہوٹل کی انتظامیہ کی درگت بنانے کا سوچ رہا تھا اور یہاں

"آپ اتنے شاکڈ کیوں ہو رہے ہیں...... آئی ایم رائٹ...... شی از ریئلی پریگننٹ۔ یوں سمجھیے کہ آپ باپ بننے والے ہیں۔"

عبدالباری نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ ان لمحوں میں نہ جانے کیا ہوا تھا، کیفیت یکسر بدل رہی تھی۔ انکشاف اگرچہ حیران کن تھا مگر بے پناہ خوش کن تھا۔ فرط انبساط سے وہ ہونٹوں پر ہاتھ رکھ گیا۔

"پہلا کیس ہے ان کا اسی لئے آپ کی وائف بہت ویک ہو رہی ہیں۔ فرسٹ ٹائم ہو جاتا ہے ایسے۔ چند ماہ تک یہ کنڈیشن رہے گی پھر ٹھیک ہو جائیں گی۔ کمزوری سے یہ بے ہوش ہو گئی ہیں، ڈرپ لگا دی ہے۔ اس وقت یہ ٹرینکولائزر کے زیر اثر پرسکون ہیں۔ ان کی بی پی بہت لو ہو رہا تھا اور بخار بھی کافی زیادہ تھا۔ تین چار گھنٹے بعد ڈرپ اتار دی جائے گی، کچھ میڈیسن ہیں ان کی صحت کا بہت خیال رکھیں۔ ٹینشن وغیرہ سے تو بالکل دور رکھیں۔ کوشش کریں یہ خوش رہا کریں صبح تک فارغ ہو جائیں گی پھر آپ انہیں گھر لے جا سکیں گے۔"

مطلوبہ میڈیسن [illegible] ہدایات جاری کیں اور پھر کمرے سے رخصت ہو گئیں۔ وہ بستر کی طرف آ گیا۔

ایک گھنٹہ پہلے وہ کافی تکلیف میں تھی اور اب کسی قدر سکون سے نیند سو رہی تھی۔
رانیل [illegible] اس کا ہاتھ پکڑ کر وہ کرسی کھینچ کر بستر کے قریب ہی بیٹھ گیا تھا جب کہ رات کافی گہری ہو گئی تھی۔

وہ اسے گھر لے آیا تھا بڑی بابا کے پاس۔ دن پر لگا کر گزرنے لگے تھے، سب کچھ جیسے ایک دم ٹھیک ہو گیا تھا۔ عبدالباری، اس کا رویہ انداز اطوار سب کچھ یکسر بدل گیا تھا۔ سب ہی اس کی اس کایا پلٹ پر بہت خوش تھے، بے پناہ خیال رکھنے لگے تھے۔ رانیل کے لئے یہ سب کچھ حیران کن تھا مگر کبھی کبھار وہ الجھن کا شکار ہو جاتی تھی۔ کوئی طنز، کڑوی کسیلی بات، کوئی زور زبردستی، کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ وہ اس کے رویوں کی عادی ہو چکی تھی، اب یہ انداز ہضم نہیں ہو رہے تھے۔ وہ بہت حلیم و مہربان سا انسان بن گیا تھا۔ حتیٰ کہ اسی حالت میں دو ماہ پر لگا کر گزر گئے تھے۔

آج رات وہ کتنے دنوں بعد گھر لوٹا تھا جہاں وہ یکسر بدلا تھا اس کی یہ عادت نہیں بدلی تھی بغیر کچھ بتائے غائب ہو جانے والی بات۔ رات کے اس پہر سب ہی اپنے کمروں میں سونے جا چکے تھے۔ رانیل کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ بستر پر کروٹیں بدل رہی تھی، جب اس کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا تھا۔ وہ اٹھ بیٹھی۔ کچھ دیر بعد وہ کمرے میں داخل ہوا تھا، اسے جاگتے ہوئے دیکھ کر چونکا تھا۔

"تم سوئی نہیں" گھڑی دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔ رات کے بارہ بج رہے تھے۔ وہ بستر کی طرف آ گیا۔ وہ جب بھی گھر لوٹتا تھا کافی گرم جوشی کا مظاہرہ کرتا تھا۔ آج کچھ بھی نہ تھا۔ رانیل جو عادی ہو چکی تھی، کچھ حیران ہوئی تھی۔ جواباً صرف سر ہلا دیا جب کہ دل چاہ رہا تھا کہ کچھ بھی خیال کیے بغیر اس سے الجھ پڑے۔ وہ اتنے دنوں سے کہاں تھا؟ کیوں تھا؟ یہ جاننا اس کا حق تھا مگر وہ مصلحتاً خاموش تھی۔ عبدالباری نے بستر کے قریب ہی کھڑے کھڑے ٹوپی، بیلٹ اور اوپری قمیص اتار کر بستر پر پھینکی تھی۔ وہ کافی حد تک ٹینس لگ رہا تھا۔ چہرے پر جامد تاثرات رقم تھے۔ وہ کچھ بھی نتیجہ اخذ نہ کر سکی۔ شرٹ اتارنے کے بعد وہ وارڈ روب سے لباس نکالنے لگا تھا۔

"کھانا کھائیں گے؟" وقت تو کھانے کا نہیں تھا مگر پوچھ گئی۔

"نہیں، میں کھا آیا ہوں تم سو جاؤ۔ آرام کرو۔" وہ پر سکون تھا مگر وہ چونک گئی تھی، اتنا ٹھہرا ہوا لہجہ کبھی بھی نہیں، کچھ تشویش سے اسے دیکھا تھا۔ وہ کپڑے لے کر باتھ روم میں چلا گیا تھا۔ اس نے اٹھ کر اس کی ٹوپی، بیلٹ اور شرٹ اتار کر اس کی جگہ پر رکھی پھر بستر کے کنارے ہی ٹک کر اس کا انتظار کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ نہا کر نکلا تھا۔

"تم ابھی تک نہیں سوئیں طبیعت خراب ہو جائے گی تمہاری۔" وہ پریشانی سے گویا تھا۔

"پوچھ سکتی ہوں کہ اتنے دن جناب کہاں رہے جب کہ آفس سے بھی چھٹی لی ہوئی تھی۔"

وہ تولیے سے بال رگڑ رہا تھا جب اس نے پوچھا تھا۔ وہ تولیہ صوفے پر پھینک کر بستر پر آ گیا۔

"یہیں تھا اسی شہر میں کچھ معاملات تھے۔ دوسرے گھر پر ہی تھا۔"

"جھوٹ بول رہے ہیں آپ کیسے بہلا رہے ہیں، مجھے یا خود کو آپ اس شہر میں تھے ہی نہیں۔ جب بھی اس گھر میں پتہ کروایا علم ہوا کہ جناب نے کئی دن سے ادھر قدم بھی نہیں رکھا۔ آپ کے آفس اور گھر کے فرقان بھائی کتنے چکر لگا چکے ہیں۔ کتنی مرتبہ آپ کے سیل، ہر جگہ ٹرائی کر چکی ہوں۔"

"تو پھر؟" رانیل کے یوں جرح کرنے پر اس نے کچھ [illegible] پوچھا تھا۔

"تو پھر یہ کہ میں جاننا چاہتی ہوں آپ کی اصلیت کیا ہے۔ آپ کی سرگرمیوں کا پس منظر کیا ہے؟ کن لوگوں کے لئے اور کیا کرتے ہیں آپ؟" وہ پہلے سے زیادہ بے خوف و نڈر ہو گئی تھی [illegible]

"تم اپنے کام سے کام رکھا کرو ہر وقت ادھر ادھر کی [illegible] مت کیا کرو۔ آئندہ اس گھر سے وہاں کوئی بھی نہیں جائے گا بیچ دیا ہے میں نے وہ گھر سب میرا وہاں سے کوئی تعلق نہیں [illegible] اور کیا نہیں، تمہارے لئے یہ جاننا ضروری نہیں سکون سے آرام سے اس گھر میں [illegible] کیا چاہتی ہو تم [illegible] قطعی لہجہ تھا، وہ لب کاٹ گئی۔

"میرے لئے یہ سب جاننا بہت ضروری ہے۔ بیوی ہوں یہ حق رکھتی ہوں۔" [illegible] وہ پھر چوٹ کر گئی تھی۔ عبدالباری کو بے پناہ غصہ آیا۔

"کیا چاہتی ہو تم یہ جو میں اتنے دنوں بعد گھر لوٹا ہوں وہ بھی نہ [illegible] کروں......" انداز خونخوار تھا۔ وہ قطعی متاثر نہ ہوئی تھی جب کہ آج وہ کتنے دنوں بعد یہ پرانا مرنے مارنے والا انداز دیکھ رہی تھی۔

"یہاں سب کو ایک فکر ہوتی ہے...... سب مجھ سے پوچھتے رہتے ہیں کہ کہاں ہوتے ہو تم۔ جب کہ میرے فرشتوں کو بھی تمہاری سرگرمیوں کا علم نہیں ہوتا...... پھر میں انہیں کیا جواب دوں۔"

"کوئی نئی بات تو نہیں ہوئی جو سب فکر مند ہوتے ہیں...... مجھے میرے حال پر چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔"

"کتنے بے حس اور بے ضمیر ہیں آپ باری، ذرا بھی احساس نہیں کسی کا حتیٰ کہ اپنی آنے والی اولاد کا بھی نہیں۔" اس کی آواز رندھ گئی تھی۔ عبدالباری اب کے کچھ بھی نہ بول سکا۔

"تین دن پہلے بڑے بابا کی طبیعت اچانک سخت خراب ہو گئی تھی سو آپ کا پتہ کروایا تھا۔ آفس سے علم ہوا کہ چھٹی پر ہیں اور باقی جگہوں پر بھی کوئی نام و نشان نہیں تھا آپ کی ذات پر صرف تنہا آپ کا حق تو نہیں۔ صرف یہ انداز اپنا کر خود اپنی ذات کو نارچر تو نہیں کر رہے۔ زبردستی ہی سہی کوئی اور بھی آپ کے سفر میں ہم راہ ہے۔ ابھی تو میں تنہا ہوں، کل کو ایک اور وجود آ جائے گا پھر کیا کروں گی، کبھی تو دیکھ لیا کریں اس پہلو سے بھی سوچ لیا کریں۔" اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ وہ کیا

کہنا چاہتی تھی، سمجھانے کے اصل مقصد کے پیچھے کیا کارفرما تھا، وہ بخوبی دیکھ گیا۔

"جن لوگوں کے لیے آج آپ کام کرتے ہیں... جن کی خاطر آپ اس وطن کی جڑیں کھوکھلی کر رہے ہیں، کبھی یہ اندازہ لگایا ہے وہ کون ہیں؟ ان کا دین ایمان کیا ہے؟ روپے کی ہوس اتنی نہیں ہونی چاہیے کہ انسان جائز و ناجائز، حلال و حرام صحیح اور غلط کا فرق بھی نہ جان پائے۔ جس طرح ہر کلمہ گو مسلمان نہیں، ہر انسان انسان نہیں ہے۔ یہ حقیقت مت بھولیں، ایک نہ ایک دن ہم سب کو مرنا بھی ہے، دنیا کے بادشاہوں کے سامنے نہیں۔ کل کائنات کے رب کے سامنے جواب دہ ہونا ہے۔ اس دن یہ ساتھی، یہ غلط کاریاں، یہ حلقہ احباب کسی کام نہیں آئیں گے حتیٰ کہ نصیحتیں کرنے والے، رو رو کر دعائیں مانگنے والے، ساری ساری رات آپ کی فکر میں دبلے ہونے والے ماں باپ اور یہ دنیاوی رشتے بھی کام نہیں آئیں گے۔ اگر اس دن کچھ کام آئیں گے تو وہ انسان کے اپنے اعمال ہیں۔ اس دن بتائیں آپ جیسے لوگ کیا کریں گے۔ جب دونوں ہاتھوں سے خالی ہوں گے، ہاتھوں میں گناہوں کی ایک لمبی فہرست کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔" اتنی سی عمر میں سوچ کی حد تک پختہ دماغ تھی... سمجھانے کا انداز کتنا سحر طاری کرنے والا تھا، وہ کچھ جوش اور کچھ جذبے سے سب کہتی گئی تھی۔ دل نشیں لہجہ سماعتوں میں جیسے رس گھولتا گیا تھا۔ وہ جو یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا اس کے اس طرح سراپا سوال بننے پر مسکرا دیا تھا۔ وہ اور چڑ گئی تھی۔

"پتہ نہیں کیسے بے حس انسان ہیں... میں ہی پاگل ہوں جو پتھر سے سر پھوڑ رہی ہوں۔" وہ بڑبڑا کر بستر سے اترنے لگی تھی۔ اس نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ تب اس نے خونخوار ہو کر دیکھا تھا۔

"کیا ہے...؟" لہجہ اس کا... وہ خونخوار تھا۔

"جب میں قیامت کے روز دونوں ہاتھوں سے خالی ہوں گا تو کہوں گا یہ جو لڑکی ہے یہ میری بیوی ہے... زبردستی کی بنے نکاح میں یہ تھی اگر میں نے دنیا میں کوئی نیک کام کیا ہے تو وہ یہی ہے۔ سنا ہے نیک بیوی کے بدلے بچے جاتے ہیں، ماں جیسی ہوگی اولاد بھی ویسی ہوگی کل قیامت کے دن تمہارا سر بلند ہوگا۔ نیک صالح بیوی بھی اللہ کا بڑا انعام ہوتی ہے۔" حد ہے اس پر تو رانیل کے کچھ سمجھانے کا بھی اثر نہیں ہوا تھا۔ ہاتھ کھینچ کر ایک دم موڈ میں آیا تھا۔ آنکھیں شرارت پر آمادہ تھیں۔

"باری پلیز... میں اب یہ سب برداشت نہیں کروں گی۔ اولاد کی اصل شناخت ماں نہیں ہوتی باپ ہوتا ہے۔ باپ کا کردار اور عمل اسے تربیت دیتے ہیں۔" عبدالباری کی باتوں سے رانیل کا دماغ بھی بھک گیا تھا۔ آج اس کا یہ موڈ فیصلہ کن تھا۔

"آج فیصلہ ہوگا... یا تو اپنی سرگرمیاں ترک کر دیں یا پھر مجھے چھوڑ دیں۔ میں آپ جیسے کرپٹ، دھوکے باز، غدار وطن کے ساتھ کبھی زندگی نہیں گزار سکتی... ساری زندگی رونے سے بہتر ہے آج ہی فیصلہ کر لیں۔" اپنا ہاتھ کھینچتے ہوئے وہ پہلے سے زیادہ وحشتوں میں تھی۔ باری مسکرا دیا۔

"رانیل میری جان! یہ ہمیشہ تم کا صیغہ استعمال کرنے والی زبان کو اب کچھ عرصے سے کیا ہو گیا ہے۔ اب مجھے "آپ" کا یہ صیغہ ہضم نہیں ہو رہا... اتنا ادب، رانیل ڈیئر، اتنا احترام۔ او مائی گاڈ... پلیز چیک مائی ہارٹ پلیز۔ کہیں فیل ہی نہ ہو جائے۔" وہ اپنے موڈ میں واپس آ چکا تھا۔ وہ جو سر کھپا رہی تھی دیکھتی رہ گئی۔ کتنے دنوں کی سنجیدگی و خاموشی کی ردا چھٹ گئی تھی۔ وہ لب کاٹنے لگی۔ وہ اس کا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ چکا تھا۔ رانیل کے ہاتھ کے نیچے عبدالباری کا دل تھا جو خوب صورت لے میں دھڑک رہا تھا۔ وہ نظریں پھیر گئی۔

"چھوڑیں مجھے..." خونخوار جھنجلانے لگی جب کہ وہ مخمور لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"اے رانیل... آج کا یہ دل کا مکین کتنے دنوں بعد لوٹا ہے، کچھ نظر کرم نہیں کرو گی... یہ لہجہ، یہ انداز چھوڑ دو۔ یہ تو زندگی کے ساتھ چلتا رہتا ہے۔ کچھ ایسا خاص ہو کہ دل و روح سیراب ہو جائے۔" وہ لفظوں کا کھلاڑی پل میں اسے پانی پانی کر گیا تھا۔ اس

... ہر یک اپنی سی مچا گیا تھا۔ وہ روہانسی ہو گئی۔

"اللہ کی آپ جیسے بندوں سے سمجھے..." سارا اعتماد، ساری جرأت عبدل کی ایک نگاہ کی نذر ہو گئی تھی۔ اب تو صرف بے بسی ہی چاروں اور تھی۔

"آئی لو یو... رنیلی آئی لو..." عبدل کی سرگوشیانہ آواز اس کے کان کے قریب گونجی تھی۔ اس نے آہستگی و نرمی سے اس کے گرد گھیرا تنگ کیا تھا، جیسے وہ بہت قیمتی شے ہو۔ بلور کی مانند نازک و حساس۔

* * *

ناشتہ سجا کر کمرے میں لوٹی تو عبدل ابھی بھی بے خبر تھا۔

"باری اٹھیے... ناشتہ تیار ہے۔" اسے پکار کر وہ جلدی جلدی کمرے کی چیزیں سمیٹنے لگی۔ وہ اٹھنے کے بجائے کروٹ بدل کر پھر غافل ہو گیا تھا۔ ڈریسنگ کی چیزیں درست کر کے بیڈ کے قریب آئی تو عبدل کے موبائل کی بیپ بجنے لگی۔ ایک نظر گہری نیند میں غرق عبدل پر ڈال کر اس نے موبائل اٹھایا۔

"توبہ ہے... سوتا ہوتا ہے تو ساری دنیا کی خبر بھول جاتے ہیں... اور ... تو پھر جاں کو آ جاتا ہے۔" عبدل پر کچھ ... وہ بڑبڑا رہی تھی۔

"عبدالباری اچھا نہیں کیا تم نے ہمارے ساتھ۔" ... وہ کبھی سوچ بھی نہ پائی تھی جب کوئی اجنبی ... آواز سنائی دی تھی۔ وہ لب سی گئی۔

"ہمارے اعتماد، ہمارے بھروسے کا بڑا فائدہ اٹھایا ہے تم نے... سب ... کرنے کے بعد اب ہم سے تعلق توڑ کر تم سکون سے جی سکو گے... قبر کی تاریکیوں میں نہ پہنچا دیا تو ہمارا... زندگی کا گھیرا تنگ کر دیں گے ہم تم پر... پانچ کروڑ بہت بڑی رقم ہوتی ہے۔ ... دور بھاگنے والے بہت ہیں۔ تم سمجھتے ہو کہ رقم، گھر، گاڑی اور دوسری آسائشیں واپس کر کے ہم سے کٹ گئے ہو۔ اگر تم ہمیں ... رہے تھے تو اناڑی ہم بھی نہیں تھے۔ ہمارے پاس بھی تمہاری ایک ایک حرکت، ایک ایک ملاقات کی نہ صرف فوٹوگرافس موجود ہیں بلکہ آج تک تم جو بھی ہمارے لیے کرتے رہے ہو ان سب کے واضح ثبوت ہیں ہمارے پاس بمعہ ویڈیو کیسٹس۔ ہمارے راستے سے ہٹ جاؤ ورنہ نتائج کے ذمہ دار تم ہو گے... یہ آخری وارننگ تھی۔ اب کوئی رعایت نہیں دوں گا۔" وہ ساکت کھڑی تھی موبائل اسی طرح کان سے لگائے جب کہ فون کرنے والا فون بند کر چکا تھا۔

عبدالباری نے کروٹ بدلی، آنکھ کھلی تو بے ساختہ نگاہ رانیل پر ٹھہر گئی۔ موبائل اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ٹھٹکا، کمبل ہٹا کر فوراً اٹھ ...

"کیا بات ہے... ایسے کیوں کھڑی ہو... کس کا فون تھا؟" موبائل اس کے ہاتھ سے جھپٹنے والے انداز میں چھینتے ... اس نے پوچھا تھا۔ وہ اسے دیکھنے لگی، پہلے تو عبدالباری نے موبائل کی اسکرین دیکھی وہ آف تھی پھر اسے دیکھا۔

"بتاتی کیوں نہیں، کس کی کال تھی؟" موبائل چیک کرنے سے پہلے اس نے پھر درشتی سے پوچھا۔ وہ پھر بھی چپ رہی ... چہرے کی رنگت سفید ہو چکی تھی۔ وہ مس کالز اور ریسیو کالز چیک کرنے لگا تھا۔ آخری ریسیو کال پر وہ ٹھٹکا۔

"میں نے تمہیں پہلے بھی وارن کیا تھا کہ میرا سیل ریسیو نہیں کرنا... میں... کیا بات ہوئی ہے۔" نمبر دیکھ کر وہ آپے سے باہر ہو گیا تھا۔ وہ سہم کر پیچھے ہٹی۔ کال کرنے والے کی گفتگو خاص طور پر دھمکی آمیز انداز اسے اپنے زیر اثر لیے ہوئے تھا اور اب ... کا لہجہ

"کیا بات ہوئی ہے اس قدر شاک میں کیوں ہو؟ بتاؤ" عبدالباری کی زیرک نگاہیں رائنل کی کیفیت بھانپ گئی تھیں۔ کندھوں سے تھام کر پوچھا تھا۔ وہ نفی میں گردن ہلا گئی۔ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ کیا بتائے۔

"کیا جاننا چاہتے ہیں مجھ سے جس نے کال کی ہے اس سے پوچھیں یا خود سے۔" اس کے ہاتھوں کو جھٹک کر وہ صوفے پر جا بیٹھی۔ ایک دم بہہ آنے والے آنسوؤں کو صاف کیا، عبدالباری پریشانی سے دیکھتے پاس آ گیا۔

"پلیز رائنل بتاؤ میں کچھ پوچھ رہا ہوں۔" وہ اس وقت بہت بے بس سا محسوس ہو رہا تھا۔ رائنل نے اسے مختصرا سب بتا دیا۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا لب بھینچے، مٹھیوں کو کھولتے بند کرتے اس کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔

"اب تو بتا دیں یہ سب کیا ہے؟ کیا کر رہے ہیں آپ؟ اور کون ہیں یہ لوگ؟" وہ اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔

"بتا دوں گا تمہیں بھی بڑا شوق ہے تمہیں میرے ہر کام میں ٹانگ اڑانے کا کروں گا تمہارا یہ شوق بھی پورا ابھی کچھ دن انتظار کرو۔" اسے ایک طرف ہٹا کر وہ اسٹڈی روم میں جا گھسا تھا۔ وہ اس کے الفاظ کو تولنے کی کوشش کرنے لگی۔

وہ آفس میں تھا جب اس کا موبائل بیل بج اٹھا تھا۔ اس پر آنے والا نمبر بہت خاص تھا، وہ ایک دم چونک گیا تھا۔ ادھر ادھر دیکھ کر پھر فوراً باتھ روم میں گھس گیا۔ کتنے دنوں سے اسے اس کال کا انتظار تھا اور آج انتظار ختم ہو گیا تھا۔

"ہیلو ایس پی عبدالباری اسپیکنگ!"

"سر میں۔ رستم ایک خاص اطلاع ہے۔"

"ہاں بولو میں سن رہا ہوں۔"

"سب حالات بہت بگڑ چکے ہیں دشمنوں کو ہماری ساری پلاننگ کی خبر ہو چکی ہے۔ حالات سازگار نہیں..... وہ آپ کے متعلق کوئی ایکشن لینے کی سوچ رہے ہیں۔ ان لوگوں کا نیٹ ورک اب سمٹنے لگا ہے ہو سکتا ہے جلد ہی وہ کوئی قدم بھی اٹھا لیں۔ آپ کو جلد ہی کوئی ایکشن لینا ہوگا ورنہ یہ ملک بہت خطرے میں ہے۔"

"ہوں کوئی اور بات؟" اس نے پوچھا تھا۔

"یس سر! میں نے کچھ خاص نقشے تیار کئے ہیں وہ ہماری خاص رہنمائی کریں گے۔ اس کے علاوہ کچھ بہت اہم ثبوت بھی ہاتھ لگے ہیں۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ تم اپنی جگہ پر رہنا میں خود تم سے ملنے کی کوشش کروں گا۔ میک اپ میں ہوں گا، کوڈ ورڈز کا استعمال کروں گا، خیال رکھنا۔ اب فون بند کرو...... میں کسی بھی وقت تم سے ملوں گا۔"

"یس سر۔" دوسری طرف سے فون بند کر دیا گیا تھا۔ وہ روم میں آ گیا۔ اس کا بہت بڑا مسئلہ جیسے حل ہو گیا تھا۔ اب اسے فائنل ایکشن لینے کی ضرورت تھی۔ ساری کارروائی مکمل تھی۔ اس نے خفیہ لاکرز میں سے ضروری ڈاکومنٹس نکالے تھے انہیں اچھی طرح چیک کیا تھا، ایک فائل بنائی تھی، پھر لاکرز بھی بند کر دیئے تھے۔

اب اسے رستم سے ملنا تھا، کچھ سوچتے ہوئے وہ آفس سے نکل آیا۔ ہاتھ میں ایک فائل تھی جو بہت ضروری تھی۔ ارادہ اس کو گھر میں رکھنے کا تھا، گھر آیا تو رائنل لان میں پودوں کے ساتھ معروف تھی۔ اسے دیکھ کر سب کام چھوڑ چھاڑ مالی بابا کو چند ہدایات دے کر اسی کی طرف آ گئی۔ خوب صورت سراپے میں ایک واضح تبدیلی با آسانی محسوس کی جا سکتی تھی۔ عبدالباری کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ ٹھہری تھی۔ اسے دیکھ کر دل میں خود بخود ایک تراوٹ سی اترنے لگی تھی۔ من چاہی، با کردار، باحیا بیوی کا نشہ شاید ایسا ہی ہوتا ہے، وہ روح تک سرشار سا ہو گیا تھا۔

"السلام علیکم خیریت آج اس وقت گھر پر؟" اس فون کال کے بعد وہ کافی بہتر ہو گئی تھی۔ عبدالباری کے ساتھ اس کا رویہ خود بخود بدل گیا تھا۔ درمیان میں کتنے دن گزر گئے تھے، تقریباً ایک ڈیڑھ ماہ کا عرصہ اور اس دوران میں اس نے اسے اب کچھ نہیں بتایا تھا مگر ایک خلش سی پھر بھی برقرار تھی۔ وہ اپنا آپ مکمل کر کھول ہی نہیں رہا تھا، وہ منتظر تھی مگر یہ حال ہے جو ہوا ہو۔

"وعلیکم السلام ہاں بس ایک کام تھا، میں کمرے میں ہوں کوئی ڈسٹرب نہ کرے مجھے۔" اسے ہدایت خاص کر کے وہ کمرے میں جا گھسا۔ وہ کچن میں آ گئی۔ عبدل نے ڈسٹرب نہ کرنے کا کہا تھا سو وہ کچن میں آ کر کباب تلنے لگی۔ صبح اس نے قیمہ ابال کر تیار کر رکھا تھا۔ ساتھ میں آلو کے تیار کئے گئے خستہ اور کرارے رول تھے۔ چائے بنا کر ٹرے سجا کر وہ کمرے میں چلی آئی۔

عبدالباری بستر پر بیٹھا ہوا تھا۔ سامنے کچھ کاغذات تھے۔ کوئی چارٹ پھیلائے پنسل سے نشان وغیرہ لگا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر اس کے چہرے پر ناپسندیدگی کے تاثرات ابھرے۔

"میں نے کہا تھا کہ مجھے کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔" جیسے ہی اس نے ٹرے بستر پر رکھی عبدالباری نے کہا۔

"آپ نے کوئی کے لئے کہا تھا میرے لئے نہیں۔" لہجہ پر اعتماد اور بھرپور انداز تھا، اس کے ہاتھ رک گئے۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے نقشہ اٹھا لیا۔ عبدالباری نے اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

"میرے کاموں میں ٹانگ اڑانے والی تمہاری یہ عادت نہیں جائے گی کیونکہ تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔" مسکرا کر کہتے کاغذات فولڈ کر کے ایک طرف رکھے۔

"کیوں؟" غصہ تو بہت آیا مگر کنٹرول کر گئی۔ مگر وہ مسکرا تا رہا۔

"کیوں کہ عقل موٹی ہے بمشکل ہی کچھ سمجھ پاتی ہو کسی بات کی سمجھ نہیں آتی اور لگی ہو ادھر ادھر ٹانگیں اڑانے۔" انداز اب شرارتی تھا۔ وہ حقیقتاً حیران ہوئی۔

"آپ سے زیادہ عقلمند ہوں پھر آپ نے کبھی کون سا کچھ سمجھانے کی کوشش کی ہے جو مجھے سمجھ نہیں آئی ہمیشہ تو ویسے راز کی طرح رکھا ہے، کوئی لاکھ سر پھوڑے مگر اثر کہاں ہے۔" وہ ناراض سی ہو گئی تھی پھر چائے ڈال کر جانے لگی تو اس نے بازو تھام لیا۔

"کدھر چلی ہو ڈیئر بیٹھو۔" توجہ خاص تھی مگر وہ متاثر نہ ہوئی۔

"سوری میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا۔" چہرہ پھر بھی نہیں موڑا۔ انداز روٹھ جانے والا تھا وہ کھل کر مسکرایا۔

"جب کہا تھا عقل میں بات نہیں آتی تھی اور اب ڈسٹرب ہو گیا ہوں تو میرے آتشیں شوق کو بڑھا کر جا رہی ہو اب تو رکو۔" معنی خیز انداز میں گنگنا دیا تھا، وہ اس کے ساتھ جا لگی۔ ذو معنی بات سے پورے بدن میں ایک سنسنی خیز لہر دوڑ گئی تھی۔

"آج تمہیں چیک اپ کے لئے جانا تھا وزٹ کیسی رہی؟" ناراضی سے چہرے کو اپنی طرف پھیرتے بہت لگاوٹ سے پوچھا تو وہ کاٹ کھانے والی نظروں سے دیکھنے لگی۔

"جب آپ کو مجھ سے یا میری ذات سے کوئی دلچسپی نہیں تو پھر یہ زبانی بناوٹی مظاہرے بھی مت کیا کریں بہت زہر لگتے اور بہت برے لگتے ہیں مجھے ایسے لوگ۔" کڑوی تو وہ شروع سے ہی تھی اب بھی کوئی لحاظ مروت رکھے بغیر اس کے ہاتھوں کو پیچھے ہٹا کر اپنا توازن بحال کر کے کاٹ دار لہجے میں کہا تھا۔ عبدالباری کو صبح کا واقعہ یاد آ گیا جب اس نے اسے جلدی گھر آنے اور ساتھ چلنے کا کہا تھا چونکہ آج اسے کچھ ضروری کام تھا، عجلت میں تھا سو انکار کر دیا تھا تب تو رائنل چپ ہو گئی تھی مگر اب اس کی یہ ناراضگی کافی تیکھی سی تھی۔

"بتایا نہیں تم نے کیا کہا ڈاکٹر نے گئی بھی تھیں یا نہیں؟" چائے کا کپ لیتے ہوئے اس نے دوبارہ پوچھا تو وہ منہ

چھپائے بتانے لگی۔

"مِنی تھی بھابی کے ساتھ۔ کچھ خاص نہیں کہا ڈاکٹر نے، وہی پرانی باتیں کہ ان دنوں کچھ خاص احتیاط کرنی ہو گی وغیرہ وغیرہ۔ منتھلی چیک اپ ضرور کروایا کروں، ادھر ادھر کی ہدایات تھیں۔" وہ نظریں جھکائے بتا رہی تھی، وہ کچھ سوچتا رہا۔

"رائنل! یہ کچھ ضروری ڈاکومنٹس ہیں آفس میں یہ محفوظ نہیں تھے گھر لے آیا ہوں، لاکرز میں رکھ لینا۔ کسی بھی لمحے ان کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔" بیگ میں سب کاغذات رکھ کر اس نے چمڑے کا بیگ اسے تھما دیا۔

"حیرت ہے ... مجھ پر اعتماد کر رہے ہیں ... اگر میں ان کو کھول کر دیکھ لوں تو کہیں گے کہ میں ٹانگ اڑاتی ہوں ہر کام میں ... ویسے بتا ہی دیں ... کیا ہیں یہ کاغذات۔" انداز اگرچہ چڑانے والا تھا مگر آب بھی تجسس سے بھرپور تھا۔ وہ محظوظ ہوا تھا۔

"بے فکر ہو ... دیکھ لینا، سمجھ میں نہیں آئیں گے۔ بس کچھ ضروری کاغذات ہیں۔" کباب اور رولز پر ہاتھ صاف کرتے عبد الباری نے کہا تو وہ چپ ہو گئی۔

"ویسے یار رائنل! یہ کباب اور رولز تم نے بنائے ہیں ... تمہارے ہاتھ کی بنی ہوئی چیزوں کا ذائقہ ہی الگ سا ہوتا ہے۔ خود بخود دلچسپی ہو جاتی ہے۔" وہ تعریف کرتا ہوا بمشکل مسکرایا، پھر سے بغور دیکھنے لگی۔

"کیا بات ہے بیگم صاحبہ ... ایسے کیوں دیکھ رہی ہو ... کیا بہت زیادہ ہی اچھا لگ رہا ہوں یا بہت پیار آ رہا ہے مجھ پر ..." وہ سر جھکائے ہوئے تھی مگر چہرہ سرخ ہو رہا تھا [illegible] اس کی نفی میں سر ہلا دیا تھا۔

"نہیں ... میں تو بس ویسے ہی [illegible]" اس سے کوئی بات ہی نہ بن پڑی۔ وہ کھل کر مسکرایا۔ وہ جھینپ گئی۔ جب سے وہ بھی گئی ہر ہر انداز، ہر رنگ نرالا تھا۔ [illegible] کچھ زیادہ ہی نکھری نکھری سی لگ رہی تھی۔ خوب صورت تو پہلے بھی حد سے سوا تھی مگر اب یوں لگتا تھا کہ جیسے کائنات کا سارا حسن اس کے وجود میں آ سمایا ہو۔ شاید ماں بننے کا اعزاز تھا یہ۔

"سنو رائنل! تم خوش ہو نا ... چند ماہ بعد بھیا بھابی کی طرح ہماری بھی اولاد ہو گی۔ ہیں نا ... وہ دن کتنا خوب صورت ہو گا ..." وہ چشم تصور میں نہ جانے کہاں گم تھا۔ اس خیال سے ہی خوش ہو رہا تھا۔ وہ مسکرا دی۔

"ظاہر ہے، ماں بننے کی خوشی کس عورت کو نہیں ہوتی ... اسی خیال سے میری روح سرشار ہونے لگتی ہے کہ جنت کچھ ہی میرے قدموں تلے سرکتی آ رہی ہے۔ "وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ" شاید اسی لیے کہا گیا ہے مگر ڈر بھی لگتا ہے، اس نامعلوم وقت سے۔ یہ مقام، یہ رتبہ، کیا اس کے لائق ہوں؟ اللہ بہت رحیم و کریم ہے۔ کہیں زندگی کی بساط میں کوئی مہرہ الٹا نہ چل جائے ہم سے۔ نہ جانے وقت کے دامن میں ہمارے لیے کیا ہے۔ اولاد پیدا کرنا شاید اتنا مشکل امر نہیں، اس کی بہتر تربیت کرنا مشکل مرحلہ ہے۔ ماں باپ کی ذرا سی چوک، تھوڑی سی غفلت اولاد کو کیا سے کیا بنا دیتی ہے۔"

عبد الباری چپ کا چپ رہ گیا تھا، صرف اس کو دیکھ رہا تھا جس کا ایمان بہت پختہ تھا، یقین بہت راسخ تھا، سوچ بہت شفاف اور پاکیزہ تھی ورنہ اتنی کم عمری میں وہ بھی اس تجربے سے گزرتے ہوئے لڑکیاں اتنی پختگی اور گہرائی سے بھلا کب سوچتی ہیں۔ رائنل کی یہی خوبی تو اسے متاثر کرتی تھی۔

"میں چلتی ہوں۔ باہر دیکھوں امی بابا نے کیا کیا ہے۔" وہ بیگ لے کر وارڈ روب کی طرف بڑھ گئی تھی۔ بیگ کو لاکر میں رکھ کر وہ باہر نکل گئی تھی۔ عبد الباری کتنی دیر تک دروازے کو تکتا رہا تھا جب کہ ہونٹوں پر ایک خوب صورت مسکراہٹ تھی۔

رائنل کا خیال تھا کہ وہ پرانے راستوں کو چھوڑ چکا ہے مگر آنے والے دنوں میں وہ دن رات گھر سے غائب ایسا مصروف رہا کہ وہ کچھ اندازہ بھی نہ لگا سکی۔ عجیب معمہ بن کر رہ گیا تھا وہ اس کے لیے، کچھ بھی سمجھنے سمجھانے کا اس پر اثر نہیں ہوتا تھا۔

"ایسے لوگ بمشکل ہی سدھر سکتے ہیں۔ جرم کی دنیا ہی ان کی آخری پناہ گاہ ثابت ہوتی ہے، اگر کوئی لوٹنا چاہے بھی تو نہیں

سکتا۔" عبد الباری کی مشکوک سرگرمیوں سے وہ سخت شاکی ہو گئی تھی۔ ہر وقت یہی سوچ کر کڑھتی رہتی، سوائے عبد الباری کے کچھ سوچ ہی نہیں پاتی تھی۔ ڈاکٹرز کا کہنا تھا وہ اپنے آپ کو نارمل رکھے مگر ہر گزرتا لمحہ اس کو صرف اور صرف ٹینشن دے رہا تھا۔

دو دن ہو گئے تھے عبد الباری نہ صرف گھر سے غائب تھا بلکہ اس شہر سے بھی غائب تھا۔ وہ ضروری کام کا کہہ کر گیا تھا واپسی کی کوئی خیر خبر نہ تھی۔ رائنل اور گھر والوں کی جان سخت مشکل میں تھی۔ وہ جیسا بھی تھا بہرحال خون تھا اپنا، پھر رائنل کے لیے تو وہ بہت خاص تھا۔ پہلے پہل اس نے اسے واقعی کوئی اہمیت نہیں دی تھی مگر جب سے ایک تیسرا وجود دونوں کے درمیان آیا تھا وہ خاصی بدلنے لگی تھی۔ اب نہ صرف وہ اس کے وجود کا مالک تھا بلکہ اس کے ہونے والے بچے کا باپ تھا یہی سوچ ہر جذبے پر حاوی تھی۔

صبح صبح ناشتے کی ٹیبل پر سب ہی بیٹھے تھے۔ وہ کھانا لے کر آئی تو بابا اور فرقان بھائی دونوں ہی اخبار میں غرق تھے۔ وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ اخبار کا ایک پیج اس نے بھی تھام لیا۔ پہلا صفحہ پلٹا تھا، دوسرے پیج پر نظر پڑتے ہی وہ حیران ہی رہ گئی۔ جوں جوں پڑھتی جا رہی تھی حیرتوں کے سمندر میں ڈوبتی جا رہی تھی۔

"بابا ... بابا ... بھائی ... یہ ..." اس نے فوراً باقی لوگوں کو بھی خبر کی طرف متوجہ کیا۔ امی، بابا، بھابی اور فرقان بھائی سب ہی متوجہ ہوئے تھے۔ انہوں نے اخبار تھام لیا تھا۔

"ملک کی جڑیں کھوکھلی کرنے والا ایک گینگ اپنے انجام [illegible]" فرقان بھائی نے با آواز بلند پڑھا۔ وہ دوسرے اخبار دیکھنے لگی۔ دوسروں کے اندر بھی تقریباً یہی خبریں [illegible]

"اس گینگ کے افراد مختلف غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث تھے، بچوں کا اغوا، اسمگلنگ، تخریبی کارروائیوں میں پیش پیش تھے۔ ایک عرصے سے کچھ ہاتھ ان کو بے نقاب کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ گزشتہ روز پورے گروپ کو گرفتار کر لیا گیا۔ مزید تفصیلات کچھ یوں ہیں کہ ..."

فرقان بھائی کی آواز میں جوش نمایاں تھا جب کہ وہ کچھ بھی نہیں سمجھ پا رہی تھیں۔

"ایس پی عبد الباری ایک عرصے سے ان لوگوں کے متعلق ثبوت اکٹھے کر رہے تھے۔ بہت خفیہ پیمانے پر یہ کام ہو رہا تھا۔ خاص طور پر ایس پی عبد الباری اس علاقے میں تعینات ہی اسی کام کے لیے ہوئے تھے۔ انڈر گراؤنڈ کے لوگوں سے تعلق رکھنے کی بنا پر بہت جلد جرائم کی دنیا کے اصل مہروں تک جا پہنچے۔ اس کے لیے انہیں سخت مصائب اور دشواریوں کا بھی سامنا کرنا پڑا مگر ان کا جذبہ [illegible] ہو گیا، اصل لوگوں تک پہنچنے کے بعد انہوں نے فوراً ایکشن لیا تھا۔ گزشتہ روز بھاری نفری کے ساتھ انہوں نے دشمن شر پسندوں پر دھاوا بول دیا تھا۔ بھاری مقدار میں اسلحہ، بچے وغیرہ بازیاب ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے چند سپاہی وطن کے کام آ گئے [illegible] کا حوصلہ وطن کی آنے والی نسلوں کو ایک بہت بڑے خطرے سے بچا گیا ہے۔" امی اور بھابی وغیرہ شاکڈ سی بیٹھی تھیں۔ اگلے [illegible] میں وہ سب بہر حال بھلائے صرف اور صرف اخباروں کو چاٹ رہے تھے۔ یقین کسی کو بھی نہیں آ رہا تھا مگر نیچے دی گئی تصاویر اور [illegible] پڑھ کر وہ حیران تھے۔

"ہم کتنا غلط سمجھتے رہے اور وہ کیا نکلا ... وہ سب خفیہ پلانوں پر کام کر رہا تھا اسی لیے تو کچھ بتاتا نہیں تھا اور ہم سمجھتے رہے کہ وہ راستے سے بھٹک گیا ہے۔" امی کی آنسوؤں سے بھری آواز پر اس نے اپنا چہرہ صاف کیا۔ نہ جانے کب سے آنسو بہہ رہے تھے۔ احساس ندامت اور پچھتاوا تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

"ہمارا کیا قصور ہے۔ اس کی سرگرمیاں ہی ایسی مشکوک تھیں۔ ہم ہی اندازہ نہ کر سکے۔ کتنی بار کہا تھا اس نے کہ وہ ایسا کچھ بھی نہیں کرے گا جس سے ہمارے سر جھکیں مگر ہمیں ہی یقین نہیں آتا تھا وہ اتنا حساس اور اتنا وطن پرست ہو گا۔ سوچا بھی نہیں تھا۔" فرقان بھائی بھی نہ جانے کون کون سی بات یاد کر کے پچھتا رہے تھے۔

"میرا دل کہتا تھا وہ غلط نہیں ہے، ہماری تربیت بری نہیں تھی... وہ سب کچھ جان بوجھ کر کرتا رہا۔ ہمیں چڑاتا رہا اور ہم پاگل بنتے چڑتے رہے، یہ سوچتے رہے کہ وہ اب بھی نہیں سدھر سکتا... کسی دوسرے پہلو سے کبھی سوچا ہی نہیں۔" بابا بھی رندھی ہوئی آواز میں کہہ رہے تھے اور رانیل تھی کہ اس کی زبان پر تالے لگ گئے تھے۔ سب سے زیادہ بے یقین و بے اعتبار تو اس کی جانب سے وہ تھی۔ کب کبھی آنکھ کھول کر عقل استعمال کرتے اس پر بھی سوچا تھا، کیا کچھ غلط الفاظ اس کے لئے استعمال نہیں کئے تھے۔ کرپٹ، دھوکے باز، رشوت خور اور بھی نہ جانے کیا کچھ کہتی رہی تھی اور وہ تھا کہ سب کتنے آرام سے سنتا رہا تھا صرف ایک دفعہ اشتعال میں آ کر وہ اسے یہاں سے لے گیا تھا مگر اس کا سلوک کبھی بھی نامہربانوں والا نہیں رہا تھا۔ اس کے ساتھ تو وہ ہمیشہ سے فیئر رہا تھا اور اب تصویر کا یہ رخ، وہ چپ سادھے رہ گئی تھی۔

اس مشن پر جانے سے پہلے جب اس نے اس کے حوالے کئے تھے، کوشش نے تھے تو اس نے اس پر کس کس انداز میں طنز کے تیر نہیں اچھالے تھے، جواباً وہ بڑا مانے بغیر مسکراتا رہا تھا سو طرح سے چڑاتا رہا تھا اور وہ چڑتی بھی رہی تھی، اسے غدار وطن سے لے کر غاصب، اور بھی نہ جانے کیا کچھ کہا تھا۔ پھر وہ چلا گیا تھا اور سب

بھائی، بابا، اور وہ خود باقی سب... دل پر یہ ٹری کرتے رہے تھے مگر وہ تھا کہ رسیو ہی نہیں کرتا تھا۔ سو وہ دن گزر گیا اور وہ نہ لوٹا۔ اگلے دن... اخبارات بھی اس کے کارناموں سے بھرے پڑے تھے۔ ہر جگہ اس کی تصاویر تھیں، مسکراتی ہوئی، جھلملاتی ہوئی۔ سب ہی... تھے... اور وہ تھا کہ گلا سارا دن بھی گزر گیا مگر واپس نہیں آیا تھا۔ بھائی نے ایک دو دفعہ اس میں بھی... کیا تو وہاں بھی... تھا۔ سب جہاں خوش تھے وہیں اس کی طرف سے متفکر بھی تھے۔

مغرب کے بعد کا وقت تھا جب وہ... میں داخل ہوا تھا۔ کتنے دنوں بعد گھر لوٹا تھا، عجب سا سکون تھا دل میں۔ جانتا تھا ان سب نے ہوں... دل دکھایا ہے... دانستہ یا نادانستہ وہ گناہ گار ضرور تھا۔ امی، بابا، اس کی طرف سے سخت شاکی و بدگماں تھے۔ بہن بھائی سب ہی کا معترض تھا، خاص طور پر سب سے زیادہ رانیل کا۔ نہ جانے کیا کیا اسے کہتا اور کیا کچھ اس کے ساتھ کرتا آیا تھا۔

...ونج میں جائے نماز بچھائے امی نماز کے بعد تسبیح کر رہی تھیں، بابا بھی وہیں تھے جب کہ باقی لوگ اسے نظر نہ آئے۔

"امی! بابا!" آج کتنے عرصے بعد وہ اپنے خاص محبت بھرے انداز میں ادب سے ان سے مخاطب ہوا تھا۔ وہ دونوں تڑپ کر دیکھنے لگے تھے۔ کتنا انتظار کروایا تھا اس نے انہیں۔

"عبد الباری!" امی چونکی تھیں پھر جائے نماز سے اٹھ کر آگے بڑھ آئی تھیں۔ بے اختیار اس کے چوڑے چکلے سڈول وجود کو اپنے ناتواں بازوؤں میں لے لیا تھا۔

"ہم سے چھپاتے رہے... بھنک تک نہ پڑنے دی ہمیں... کیا کچھ نہیں کہا ہم نے تمہیں کبھی کچھ تو کہا ہوتا... اشارہ ہی کر دیا ہوتا... اصل بات بتائی ہوتی اور ہم بھی کتنے نادان اور کم فہم تھے، کچھ بھی نہ سمجھ سکے... ہمیشہ تمہیں غلط سمجھتے رہے... شک کرتے رہے تم پر... برا بھلا کہتے رہے۔" امی رو رہی تھیں۔ بابا بھی آنکھوں میں نمی لئے اس کے پاس آ کھڑے ہوئے تھے۔ امی کو ایک طرف ہٹا کر ان کی طرف بڑھا۔ انہوں نے گرم جوشی سے بازو وا کر کے اسے سینے میں بھینچ لیا تھا۔

"مجھے تم پر فخر محسوس ہو رہا ہے بیٹے! تم نے میری تربیت کی لاج رکھ لی۔ میرا سر فخر سے بلند کر دیا، اس وطن کی مٹی کے سامنے۔" آواز رندھی ہوئی تھی۔ خوشی و انبساط کے جذبات سے لبریز تھی۔ عرصے بعد وہ ان کے سینے سے لگا تھا۔ فخر، مان، غرور اور اعتماد کچھ اور بڑھنے لگا تھا۔

"یہ سب کیا تھا... ؟ ہمارے جذبات سے کیوں کھیلتے رہے۔" خود سے جدا کر کے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام

کر پیشانی چومتے ہوئے پوچھ رہا تھا، وہ مسکرا دیا پھر ان کو لے کر صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ شروع سے لے کر اب تک کی ساری روداد تفصیل سے سنانے لگا تھا۔ اتنے عرصے کی محنت کا ایک ایک لمحہ، حرف بہ حرف... پوری سچائی کے ساتھ، کچھ بھی چھپائے یا جھوٹ بولے بغیر

"رانیل کہاں ہے...؟" کچھ وقت گزرنے کے بعد اس کا خیال آیا امی سے پوچھا۔

"نماز پڑھنے کمرے میں گئی تھی، اندر ہی ہوگی..." اپنا چہرہ صاف کرتے انہوں نے بتایا۔

وہ کمرے میں آ گیا۔ رانیل جائے نماز بچھائے بیٹھی ہوئی تھی۔ دعا کے لئے ہاتھ اٹھے ہوئے تھے۔ آنکھیں بند تھیں۔ کپکپاتے لبوں سے اپنے اللہ سے ناتا جوڑے ہوئے تھی۔ وہ خاموشی سے آگے بڑھ کر صوفے پر جا بیٹھا۔ دعا مانگ کر جائے نماز لپیٹ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ دوپٹے کو ڈھیلا کرتے وہ پلٹی تھی، جب عبد الباری کو کمرے میں دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

"باری! آپ" وہ وہیں ساکت ہو گئی۔

"کیوں میرا آنا پسند نہیں آیا... یا میرا زندہ سلامت آنا شاک زدہ کر گیا ہے... دعائیں تو بڑی مانگی ہوں گی میرے مرنے کی... مگر افسوس۔" ہونٹوں پر ایک بھرپور مچلتی مسکراہٹ لئے آنکھوں میں شوخ جذبات لئے عبد الباری نے گوہر افشانی کی تھی۔ وہ تڑپ کر دیکھنے لگی۔ آنکھیں لمحوں میں چھلک آنے کو بے تاب ہو گئیں۔

"بہت خراب ہیں آپ..." ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

عبد الباری آگے بڑھ آیا تھا۔ دونوں مضبوط توانا بازوؤں میں اس کے نازک سے پیکر کو سمیٹ لیا۔ سارا وجود بچے کی... رہا تھا، وہ لے کر بستر پر آ بیٹھا۔

"ہمیشہ یوں ہی کیا ہے... میرے جذبات سے ہمیشہ اسی طرح کھیلتے ہیں دعوت مذاق ہے آپ کے لئے۔" روتے ہوئے ہچکیوں میں اس نے بھرپور شکوہ کیا تھا۔ وہ مسکرا دیا۔

"ساری غلطیاں آپ کی ہیں... سارے قصور آپ کے ہیں... ہمیں دھوکہ دیتے رہے... حقیقت کیا ہے کبھی بتائی ہی نہیں۔" سسکیوں سمیت وہ کہہ رہی تھی۔ وہ کچھ کہے بغیر اس کے بس چپ ہونے کا منتظر تھا۔ وہ یوں رو دھو کر استقبال کرے گی امید نہیں تھی۔ تصور میں تو اس کا طنز برساتا، ناک تاک کر وار کرتا، کڑوی کسیلی باتیں سناتا سراپا تھا اور اب وہ ساون بھادوں بنی ہوئی تھی۔ رو دھو کر دل کا غبار اچھی طرح نکال کر فارغ ہوئی تو آنکھیں بے رحمی سے رگڑیں۔

"آئم سوری..." پتہ نہیں وہ کس بات پر نادم تھی۔ وہ کھل کر مسکرایا تھا۔

"یہ ڈرامہ کرنے کی کیا ضرورت تھی... اتنے دن سے کہاں تھے؟ گھر کیوں نہیں آ رہے تھے؟" لہجہ ابھی بھی ناراضگی سے بوجھل تھا۔ وہ ہنس دیا۔

"دھیرج سے جان عزیز... سب بتاتا ہوں۔" انداز تخاطب پر وہ چڑ گئی مگر مصلحتاً چپ رہی۔

"کہانی یوں ہے کہ..." وہ شروع ہوا تھا۔ وہ بغور سننے لگی وہ پہلی دفعہ اپنا آپ کھول رہا تھا یوں حرف بہ حرف۔

"جب میں نے یہ سروس جوائن کی تو ہر قدم پر یہی حالات تھے، جہاں ہاتھ ڈالتے کرپشن ہی کرپشن تھی۔ کچھ عرصہ میں صرف دیکھتا رہا تھا، کیا کیا ارادے، کیا کیا مقاصد لے کر میں اس فیلڈ میں نہیں آیا تھا مگر سب ملیا میٹ ہو گئے۔ جذباتی تو میں شروع سے ہی تھا سو میں نے اپنے طور پر اپنی مرضی سے کام کرنا شروع کر دیا۔ یہاں صرف بے انصافی اور لوٹ مار کا راج ہے۔ کوئی دیانت دار بندہ چلتا ہی نہیں، حکام اعلیٰ سے لے کر ایک عام کانسٹیبل تک اسی بیماری میں مبتلا ہے جسے میری تمہاری زبان میں جرم کہا جاتا ہے۔ جہاں کالی بھیڑیں ہیں وہیں کچھ نیک اور وطن پرست لوگ بھی ہوتے ہیں۔ اس کا مشاہدہ مجھے ڈی آئی جی یار سرفراز سے مل کر ہوا۔ وہ

صحیح معنوں میں ایک محب وطن شخص تھا، کراچی سے ٹرانسفر ہو کر یہاں آیا تھا، آتے ہی اس نے ہمیں کال کی تھی خفیہ میٹنگ بھی۔ اس میٹنگ میں انہوں نے ہمیں اپنی پوری پلاننگ سے آگاہ کیا تھا۔ اس وطن کو شر پسندوں کے اثر سے پاک کرنا تھا۔ مجھے بہت سوچی گئی تھی، میرا ریکارڈ ابھی تک بالکل صاف تھا شاید اسی لئے انہوں نے مجھ پر اتنا بڑا اعتماد کر لیا تھا، ہر بات سے آگاہ کیا تھا۔ میرے ساتھ میرے چند وفادار بھی شامل ہیں جن میں میرا ایک خاص ساتھی ارقم خاص سرفہرست ہے۔ اس کا پورا خاندان ایک تخریب کاری کے حادثے میں جاں بحق ہو گیا تھا اب اس کا مقصد ان لوگوں کو چن چن کر ختم کرنا تھا، جو اس کے خاندان کی بربادی کے ذمہ دار تھے۔ شروع سے ہی میری ارقم سے بہت اچھی دوستی تھی، اس کا دکھ مجھے دل کی گہرائیوں سے محسوس ہوتا تھا میں جب بھی ارقم کی جگہ خود کو رکھ کر سوچتا تو میرا تن بدن سلگنے لگتا تھا۔ ہم لوگوں کو اپنے انداز و اطوار بدلنا تھے تاکہ کسی کو بھی ہماری کارروائیوں پر شبہ نہ ہو۔ سو آہستہ آہستہ ہم لوگ ان شر پسندوں کے گروہ میں شامل ہو گئے تھے۔ ہر جائز و ناجائز کام کرنے لگے تھے۔ اس دور میں دین و ایمان کو کوئی پوچھتا ہی نہیں، صرف بد دیانتی و بدامنی کا راج ہے، روپے پیسے کو ہی خدا سمجھا ہوا ہے، بد سے بدنام برا کے مصداق ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا تھا۔ ڈی آئی جی صاحب کا پورا تعاون ہمارے ساتھ تھا سو کوئی ہم پر ہاتھ نہیں ڈالتا تھا پھر ہماری ریپوٹیشن بھی ایسی تھی کہ کسی کو ہم پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ ایک عرصے سے ہم اس مقصد کے پیچھے خوار ہو رہے تھے، صرف چند ماہ پہلے ہی ڈی آئی جی صاحب کا اچانک انتقال ہو گیا تھا شاید ہم پکڑے جاتے اگر ہم راز رکھتے اگر کرم رحمن کی صورت میں ایک نیا ڈی آئی جی ہم پر تعینات نہ ہوتا۔ جس طرح اتنے لوگوں میں ایک ایاز سرفراز نیک انسان تھا اسی طرح اکرام رحمن کا دل بھیڑ ثابت ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ ہماری ساری پلاننگ پر لگ گئے تھے۔ وہ ہمیں دھوکے سے لگا تھا اب اتنے عرصے سے کی گئی محنت میں یوں اکارت نہیں جانے دینا چاہتا تھا سو کوئی فائنل قدم ابھی اٹھانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اکرام رحمن دشمنوں کے ہاتھوں بک گیا۔ ہماری ساری پلاننگ کی خبر دشمنوں کو ہو گئی تھی سو مجھے ان لوگوں سے ہر تعلق ختم کرنا پڑا تھا۔ تمام ثبوت و شواہد ہمیں حاصل ہو چکے تھے اب ارادہ صرف فائنل قدم اٹھانے کا تھا۔ وہ کال جو تم نے ریسیو کی تھی وہ بھی صرف نہیں دھمکی دینے کے لئے تھی تاکہ ہم ڈر کر اپنے مقصد سے پیچھے ہٹ جائیں..... اسی لیے میں تمہیں منع کرتا تھا کہ تم کال ریسیو مت کیا کرو۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری وجہ سے میری فیملی کا کوئی فرد کسی تکلیف سے دوچار ہو مگر تم بے تجسس کے ہاتھوں مجبور تھیں۔" وہ مسکرا رہا تھا۔ وہ اسے گھورنے لگی پھر بھی کچھ نہ کہا۔

"ہم پر بہت دباؤ تھا اور اب جب میں اپنے مقصد کے اتنے قریب تھا تو کیسے ہار مان لیتا سو ہر کام بہت جلدی سمیٹا تھا۔ فائنل قدم اٹھایا تو رزلٹ ہماری توقع سے کہیں بڑھ کر تھا۔ اس وطن کے افسران اگرچہ بے ضمیر ہیں مگر عوام ابھی مردہ نہیں ہوئے۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں اکرام رحمن ہم پر کوئی دباؤ نہ ڈالے اسی لئے مجھے مجبوراً سب کچھ میڈیا کے سامنے لانا پڑا تھا۔ اب جو کچھ ہے تمہارے سامنے ہے۔ میڈیا نے ہمارے اس اقدام کو بہت سراہا ہے، پاکستانی عوام بہت پرجوش ہیں، ہمارے حوصلے ایک دم بہت بلند ہو گئے ہیں۔

میرا ارادہ فوراً گھر رابطہ کرنے کا تھا مگر ایک شرمندگی سی تھی، دانستہ و نادانستہ میں بہت کچھ غلط کام کر چکا ہوں صرف اور صرف برائی کو اس کی جڑ سے اکھاڑنے کے لئے۔ اس سلسلے میں تم سب لوگوں کو بھی بہت تکلیف پہنچائی..... سو بہت چاہنے کے باوجود گھر نہ آ سکا اور اب جو بھی جیسا بھی ہوں تم سب کے سامنے ہوں۔" وہ جذباتی آنکھوں سے دیکھے گئی۔

"جس شخص کی شہرت ایک دفعہ بری ہو جائے، کوئی اس کی بات پر یقین نہیں کرتا۔ پتہ نہیں تم لوگوں کا کیا ری ایکشن ہوتا..... یقین بھی کرتے یا نہیں..... بس اسی سوچ میں الجھا رہا....." وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا۔ رابیل نے اپنی آنکھیں صاف کیں۔ ابھی تو صرف ایک گرہ کھلی تھی، بہت سارا ابھی باقی تھے۔

"یقین کرنے یا نہ کرنے کا سوال تو ایک طرف رہتا ہے۔ میرے ساتھ جو کچھ کیا ہے آپ نے وہ کس زمرے میں آتا

ہے۔ ہر عمل کا ایک ردعمل ہوتا ہے، کسی سے نظر ملانے کے قابل نہیں چھوڑا مجھے..... کوئی یوں بھی کرتا ہے۔ کبھی بھی آپ کو اپنی غلطی کا احساس نہیں ہوا، بھولے بھٹکے سے بھی تسلی و تشفی کا ایک لفظ نہ بولا۔ ذرہ برابر بھی کچھ نہیں کیا، ہمیشہ میرا دل جلاتے رہے، اتنی بے رخی کی باتیں کرتے رہے..... اگر ان باتوں کو سوچوں تو ایک پل کو بھی یقین نہ آئے مگر جذبات سے نکل کر دیکھوں تو شک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں بچتی اب..... پوچھ سکتی ہوں ناں جو میرے ساتھ کیا وہ کیا تھا؟" اس کے پاس شکوؤں کا ایک دفتر موجود تھا۔ وہ بے اختیار رو دے گی۔

"تو پھر میں کیا کرتا رابیل جان!..... تم مجھے شروع سے ہی اچھی لگتی تھیں، کبھی اظہار نہ کیا کیوں..... کہ ہماری تربیت ان دنوں پر ہوئی ہی نہیں تھی کہ دوسرے دل کو یہ تسلی بھی تھی کہ اپنی چیز ہو جب خواہش کروں گا پا لوں گا، کون سا تم کہیں بھاگی جا رہی ہو، ابھی تعلیم کا سلسلہ چل رہا ہے۔ بس خود کو ریلیکس کرتا رہا اسی مسئلے پر الجھا رہا۔ کبھی توجہ ہی نہ دی کہ فرض کی خاطر جو میں غلط شہرت حاصل کر رہا ہوں یہ تمہارے حصول کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بن کر کھڑی ہو گی۔ جب امی، بابا سے بات کی تو تم نے انکار کر دیا جس وجہ سے انکار کیا تھا، وہ مجھے قابل قبول نہ تھی۔ ایک ضدی بندھے لگی تھی مجھے تم سے۔ تم تک رسائی کا ہر راستہ بند نظر آنے لگا۔ اوپر سے امی، بابا اور بھابی، بھائی بھی تمہارے موقف کی طرفداری کر رہے تھے۔ میں اس اہم موڑ پر کہ جب تک کامیابی کے امکانات بہت روشن تھے تو کوئی حماقت افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ ارادہ تھا کہ سب کو راضی کر لوں گا مگر پھر ارادہ بدل دیا، سیدھی طرح تم حاصل نہیں ہو رہی تھیں اوپر سے تم نے سعودیہ جانے کا فیصلہ کر کے گویا ضبط کو آواز دی تھی۔ میں شاید کچھ عرصہ انتظار کر لیتا مگر یہ ناممکن تھا۔ میں تمہیں روک نہیں سکتا تھا کوئی رشتہ نہیں تھا میرا تم سے سو مجبوراً جھوٹا نکاح نامہ حاصل کرنا پڑا تھا پھر جو بھی کیا جائز و ناجائز طریقے سے، یہی سوچتا رہا کہ جب بھی حقیقت کھلے گی تم سب لوگ مجھے معاف کر دو گے۔ صرف ایک یہی سوچ پر کاربند سب کرتا گیا۔" وہ سب بتاتے ہوئے ہنس دیا تھا۔ وہ خفگی سے اسے دیکھے گئی۔

"ضد میں بھی انسان اصول و ضوابط کا خیال کر لیتا ہے، یہ کیسی ضد یا پسندیدگی کہ وہ بھی ہو گیا۔" وہ اتنی ضدی کیسے بن جاتی وہ اس کی ضد نہیں پسندیدگی۔ غصہ بے پناہ آیا تھا۔

"ارے رابیل یار، اتنی خفگی..... میرا خیال تھا کہ جب حقیقت کھلے گی سب اگلے پچھلے گناہ معاف ہو جائیں گے مگر تم تو.....!" وہ ہنسنے لگا تھا۔ "وہ کہتے ہیں ناں کہ محبت و جنگ میں سب جائز ہے۔ ضد تو بعد میں بنی تھی، محبت تو اول روز سے ہی تھی..... محبت میں تو انسان کے سب گناہ بخش دیے جاتے ہیں..... اور تم ہو کہ.....!" وہ ہنسی روک کر رابیل کے سرخ چہرے کو بغور تکنے لگا۔

"یہ محبت تھی..... ایسی ہوتی ہے محبت..... میرے رونے گڑگڑانے کسی بھی منت سماجت کا کچھ بھی اثر نہیں ہوا تھا۔ اوپر سے اتنی گھٹیا باتیں کرتے تھے مر جانے کو جی چاہتا تھا اور اب بہلا رہے ہیں کہ محبت ہے..... مجھے بے وقوف نہ بنائیں بچی نہیں ہوں سب سمجھتی ہوں۔" اس نے زچ ہوتے اس کے صبیح پر رونق چہرے کو دونوں ہاتھوں کے پیالے میں تھام لیا۔

"بے وقوف ہی نہیں کم علم بھی ہو۔ اوپر سے محترمہ کو دعویٰ ہے کہ مجھ سے زیادہ عقل و فہم کی مالک ہیں۔ حس نام کی کوئی چیز نہیں ہے تم میں۔ ہاں میں کرتا ہوں تم سے محبت..... دعویٰ کرنے کے بجائے عملی مظاہرے کرتا ہوں۔ غازی بن کر لوٹا ہوں، جس مشن پہ گیا تھا وہاں تمہارے بیوہ ہونے کے سو فیصد چانسز تھے۔ شکر کرو زندہ سلامت لوٹا ہوں..... تو اب بتاؤ اب شروع کروں عملی مظاہرہ تاکہ محترمہ کو اچھی طرح یقین آ جائے۔" آنکھوں میں بے پناہ شرارت سموئے گمبھیر لہجے میں کہتے اس کے دل کی دھڑکنوں میں تلاطم برپا کرتے رابیل کی جان مشکل میں ڈال گیا تھا۔

"انتہائی بدنیت ہیں آپ۔" اسے بری طرح گھورتے وہ بس یہی کہہ سکی۔ عبدالباری کے ہاتھ جھٹکتے اس سے کافی دور ہو گئی۔ وہ ان الفاظ پر قہقہہ بار ہوا تھا جو وہ کئی بار پہلے بھی دہرا چکی تھی۔

"رانیل... رکو تو... کہاں جا رہی ہو... اتنی جلدی بھاگ رہی ہو۔ محبت کا کھل مظاہرہ تو دیکھتی جاؤ... ابھی تو جان عزیز دل کے بہت سے راز کھولنے ہیں۔" وہ فل موڈ میں تھا، سرمستی لئے گویا تھا۔ وہ دھیان دیئے بغیر باہر نکل گئی کہ ابھی اسی میں عافیت تھی۔

وہ یک دم بے پناہ محبتوں کے حصار میں آ گئی تھی۔ زندگی کتنی خوب صورت ہو گئی تھی۔ ایک درد سا دل میں ہر وقت رہتا تھا اب وہ ختم ہو چکا تھا۔ عبدالباری کی ساری زندگی کھلی کتاب کی طرح اس کے سامنے تھی۔ اب کوئی راز، راز نہیں تھا۔ ہر طرف محبتیں ہی محبتیں تھیں۔ عبدالباری کی محبتوں، شدتوں، بے چینیوں و بے قراریوں کا یہ دل ہر لمحہ ٹوٹ کر برسنے کو بے تاب رہتا تھا۔ وہ اللہ تعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کرتی کم تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے ایک گوہر نایاب منتخب کیا تھا، اپنی گزشتہ تمام باتوں، اعتراضات اور بے وقوفیوں پر ہر لمحہ شرمندگی محسوس ہوتی تھی بلکہ اب تو اس سوچ سے ہی دل کی دھڑکن تھمنے لگتی تھی کہ اگر عبدالباری کے علاوہ کوئی اور زندگی میں آ جاتا تو نہ جانے کیا ہوتا۔

اس کے بعد عبدالباری اب تندہی سے نئے کارنامے سرانجام دے رہا تھا۔ افسران بالا نے اس پر اچھا خاصا دباؤ ڈالا تھا مگر وہ کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ اس کیس کی کامیابی پر عبدالباری اور اس کے ساتھیوں کو بھاری اعزازات، انعامات اور ترقی اور اعزازات دیئے گئے۔ ہر طرف عبدالباری کا دل دہلا دینا والا تھا، کے افسران بالا کچھ دیر کو خاموش ہو گئے تھے اسی لئے عبدالباری اب سر عام بغیر کسی کی پروا کئے ہر کام ڈنکے کی چوٹ پر سرانجام دینے لگا تھا۔ آج کل بھی کسی اہم کیس پر وہ کام کر رہا تھا۔ کسی بچے کے اغوا کا کیس تھا، اس کے پیچھے پورا ایک گروپ کام کر رہا تھا۔ دن رات ایک کئے وہ اس کیس کو حل کرنے پر لگا ہوا تھا۔ اب صرف فائنل اسٹیپ اٹھانے کی دیر تھی۔ اب اس کے گھر والوں کو عادت ہو چکی تھی نے بھی اعتراضات نہیں کئے بلکہ سب ہی اب فکر مند رہنے لگے تھے، اس کی کامیابی کے لئے دعائیں کرنے والے بے شمار ہاتھ ہوتے تھے۔

عبدالباری دوپہر کے قریب گھر آیا تو وہ سامنے ہی لاؤنج میں بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ کوئی نغمہ چل رہا تھا، پورے لاؤنج میں آواز نمایاں تھی۔

"ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان، نئی آن
گفتار میں، کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان، نئی آن
گفتار میں، کردار میں، اللہ کی برہان"

رانیل پوری طرح منہمک تھی، وہ آگے بڑھ آیا تھا۔

"السلام علیکم رانیل جان...!" پرجوش انداز تھا، وہ چونک کر پلٹی عبدالباری کو دیکھ کر مسکرا دی۔

"وعلیکم السلام... اس وقت گھر پر کیسے؟" وہ ٹی وی کی آواز دھیمی کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کیا کروں... تمہارے بنا آفس میں بھی ایک پل کو سکون نہیں ملتا... دل چاہ رہا تھا کہ اڑ کر تم تک پہنچ جاؤں اور دیکھو اب سامنے ہوں۔" بے تابانہ انداز میں والہانہ پن لئے اس کے گرد مضبوط بازوؤں کا حصار کھینچتے ہوئے وہ انتہائی محبت سے کہہ رہا تھا۔ ہر گزرتا پل دونوں کی محبت میں اضافہ کرتا جا رہا تھا۔ وہ تو اپنے آپ کو سنبھال لیتی تھی مگر عبدالباری کب کوئی بات چھپا کر رکھنے والا تھا۔ جب سے بنا آپ میاں کیا تھا تو پھر کچھ نہیں چھپا رہا تھا۔ وہ اس کی قربت کی گرمی میں بول بھی نہ سکی۔

"رانیل! تمہاری آنکھیں کتنی خوب صورت ہیں... جب بھی تمہاری آنکھوں میں دیکھتا ہوں مجھے اپنا آپ بھولنے لگتا ہے... جانے تم کیا ہو... میری ساری سدھ بدھ ختم کر دی ہے تم نے... کسی کام کا نہیں رہا میں۔" وہ اردگرد کو فراموش کئے کہہ رہا تھا۔ رانیل پسینے پسینے ہو گئی۔

"کیا کرتے ہیں آپ... بھابی گھر پر ہیں... آج وہ اپنے کمرے میں ہیں۔" اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے وہ بمشکل کہہ پائی ورنہ کچھ بولنا مشکل تھا۔ اس کی قربت کا نشہ ایسے ہی سر چڑھ کر بولتا تھا۔

"اچھا...!" اس نے آہستگی سے اسے خود سے جدا کیا، بغور تکنے لگا۔ وہ پزل ہونے لگی۔

"آپ بیٹھیں میں کھانے کو کچھ لاتی ہوں۔" اس کی نظروں کی وارفتگی سے گھبرا کر اس نے کھسکنا چاہا تھا مگر عبدالباری نے بیچ میں سر ہلا دیا۔

"کھانے کا میرے پاس وقت نہیں... بس تمہیں ملنے آیا تھا۔" وہ اسے اپنے حصار میں لئے صوفے پر جا بیٹھا۔ وہ کوئی مزاحمت بھی نہ کر سکی جب کہ بھابی گھر پر تھیں اور عبدالباری کو کوئی پروا ہی نہ تھی۔

"تمہارے ہاتھ بھی کتنے خوب صورت ہیں... نرم و نازک روئی کے گالوں جیسے...!" رانیل کے ہاتھ اپنے چہرے پر پھیرتے آنکھیں بند کئے وہ گم تھا۔ رانیل نے گھبرا کر اردگرد دیکھا پھر ہاتھ کھینچ لئے۔ عبدالباری نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔

"کتنی ظالم ہو تم... میں تمہاری دید کے لئے اتنی دور سے بھاگا آیا ہوں اور تم ہو کہ..." اس نے کچھ خفگی سے کہا مگر پھر اگلے ہی پل ٹون بدل گیا۔

"تم نے کبھی سوچا ہے، اگر کبھی میں نہ رہوں تو تم میرے بغیر کیسے گزارو گی؟"

وہ اتنی غیر متوقع گفتگو اور وہ بھی اتنی سنجیدگی سے، شرارتی گفتگو سے بات... وہ ٹھٹکی تھی۔ رانیل نے کچھ الجھ کر دیکھا۔

"کیا بات ہے... یہ ایک دم مرنے کا شوق کیوں ہو رہا ہے۔" اپنے آپ کو نارمل کرتے پوچھا۔

"فرض کرو نا... اگر میں واقعی مر جاؤں... تمہیں دوسری شادی کے چانس تو ہیں نا۔" آنکھوں اور چہرے پر واضح شرارت چمک رہی تھی۔ وہ یک دم پیچھے ہٹی۔

"عبدالباری...!" وہ بہت کم ہی پورے نام سے پکارتی تھی ورنہ باری ہی کہتی تھی۔ وہ مسکرایا۔ اس وقت رانیل کا غصہ دیکھنے کے قابل تھا۔

"بھئی... فرض کر رہا ہوں نا... بیوہ کو اسلام دوسری شادی کا حق دیتا ہے۔" وہ اب بھی شرارت پر آمادہ تھا۔ رانیل نے کشن اٹھا کر اسے دے مارا۔

"یہ تو میں بعد میں دیکھوں گی کہ کیا حق حاصل ہے اور کیا نہیں... پہلے یہ تو بتائیں یہ موت کا بھوت ایک دم سر پر کیوں سوار ہونے لگا ہے...؟" وہ فوراً دو دو ہاتھ کرنے پر تل گئی تھی۔ عبدالباری کا ہنس ہنس کے برا حال ہونے لگا۔

"باری...!" اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

"جی باری کی جان...!" وہ فوراً سنجیدہ ہوا تھا۔ "دراصل تھوڑی دیر بعد میں ایک اہم ریڈ پر جا رہا ہوں... ایک بچے کی بازیابی کا کیس ہے... کافی بڑا گینگ ہے۔ کبھی اتنا دل نہیں گھبرایا اسی لئے تم سے ملنے گھر آ گیا تھا۔ دعا کرنا، کامیاب ہو جاؤں... حالات خطرناک ہیں۔ زندگی اور موت کا کچھ علم نہیں... پہلے مجھے موت کی کوئی پروا نہیں ہوتی تھی مگر ابھی میں اپنے بچے کو دیکھے بغیر نہیں مرنا چاہتا۔" کتنی حسرت تھی اس کے لہجے میں۔ وہ حیران رہ گئی۔ کس قدر سنجیدہ تھا۔ وہ دل ہی دل میں خوف زدہ ہوئی مگر پھر بھی حوصلہ دینے کو کہنے لگی۔

"حد ہوتی ہے کم ہمتی اور بزدلی کی بھی۔ جب اس لیول میں ہیں۔ تو کیا پتہ کون سی گولی کب زندگی سے جدا کر دے اس کے باوجود بزدلوں والی باتیں کر رہے ہیں۔ اگر موت کا اتنا ہی خوف سر پر سوار ہے تو مت جائیں جس طرح دوسرے افسر ہاتھ پر ہاتھ دھرے ضمیر فروش بنے بیٹھے دونوں ہاتھوں سے جیبیں بھر رہے ہیں، آپ بھی بھر لیں۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا اس وطن کے نونہال جو کہ کل کے معمار وطن وہ بک جائیں گے، جہاں اتنے گناہ ہو رہے ہیں صرف فائلوں تک محدود ہیں وہ بھی کسی فائل میں بند کر کے ربن سے گرہ لگا کر ایک کونے میں رکھ دیں۔ جہاں اتنے لوگ وطن کو اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹ رہے ہیں وہیں آپ بھی بے ضمیر بن جائیں۔ یہاں چوری ہو یا ڈاکہ کسی کا بچہ اغوا ہو یا قتل اعلیٰ حکام کے سر پر جوں تک نہیں رینگتی۔ آپ بھی خاموش ہو جائیں۔ بے فکر ہو جائیں...... یہ ملک جس کے لیے لاکھوں قربانیاں دی گئی ہیں، برباد ہو یا مسمار۔" اس کا لہجہ آخر میں کتنا کڑوا اور زہر خند ہو گیا تھا۔

"نہیں رابیل! میں ایسا نہیں ہوں۔ میرا تو خود دل چاہتا ہے کہ اس ملک کی جڑیں کھوکھلی کرنے والوں کو چن چن کر واصل جہنم کر دوں۔ نیست و نابود کر دوں۔ مگر بہت بااختیار ہونے کے باوجود میرے ہاتھ ابھی تک بندھے ہوئے ہیں۔ اب مجھے ایاز سرفراز جیسا رہبر نہیں ملے گا۔ سی ایس پی تیمور ثقلین سے لے کر ڈی آئی جی اکرم رحمن تک میری جان کے دشمن ہیں۔ ان کا بس نہیں چل رہا کہ وہ مجھے صفحۂ ہستی سے ہی مٹا دیں۔ تم مجھے بزدلی کا طعنہ مت دو، میں اس میدان میں ایک مقصد لے کر آیا تھا شہادت کا رتبہ یا پھر فتح۔ زندگی سے کبھی اتنا پیار نہیں ہوا۔ جب سے تم سے بچھڑ کے دور نہیں جا سکتا، ہر لمحہ زندہ رہنے کی خواہش بڑھتی جا رہی ہے۔ جب بھی خیال آتا ہے کہ اگر میں مر گیا تو ابھی اپنے بچے کو دیکھے بغیر آخری سانس تک ایک تشنگی سی دل میں رہے گی۔" وہ پرعزم تھا مگر آخر میں اس کا لہجہ ٹوٹ سا گیا تھا۔ رابیل کی آنکھیں اس کے لہجے کو بے تاب ہو گئیں۔ دل چاہ رہا تھا کہ اسے روک دے کہ وہ ایسی باتیں مت کرے مگر دل خود بھی چاہ رہا تھا کہ آج وہ اس سے جی بھر کر باتیں کرے۔ وہ جس مقصد کے لیے نکل رہا ہے وہاں نہ جانے اس کے لیے کیا ہو۔

"اب ایسی باتیں کر کے اپنا مقصد اور عزم مت کھوئیں۔ خوش خوش جائیں، اپنی طرف نہیں دیکھیں۔ ان ماؤں کی طرف دیکھیں نہ جانے کتنی ماؤں کی گودیں ایسے ہاتھ برباد کر چکے ہیں۔ کل جب ہمارا بچہ ہوگا تو کیا پتہ کون سے ہاتھ اس کی طرف لپک آئیں۔ بہتر یہی ہے کہ ان ہاتھوں کو ابھی سے کاٹ دیں۔" وہ بہت حوصلے سے اسے سمجھا رہی تھی۔

"تم کتنی حوصلہ مند ہو۔ تمہیں دیکھ کر مجھے تم پر رشک آتا ہے۔ کبھی نہیں تم ڈگمگائیں۔ اب بھی تم میری راہ کی کرن و روشنی ہو۔ میری محبت ہو۔" عبدالباری نے بہت جذب سے اسے خود میں سمیٹ لیا تھا۔ آنسو بہنے کو بے تاب تھے۔ وہ بمشکل پیچھے دھکیل رہی تھی۔ دھیرے دھیرے مسکرا رہی تھی جب کہ جسم جاں کنی کے عمل سے گزر رہا تھا۔ کتنا عزیز ہو گیا تھا وہ اسے۔ اب اس کے بغیر رہنے کا تصور ہی سوہان روح تھا۔

"ابھی نکل رہے ہیں؟" خود کو کمپوز کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہوں۔ بس دعا کرنا۔" عبدالباری نے اس کے کندھے پر بنا سر رکھ دیا تھا۔ وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی۔

کچھ دیر بعد وہ چلا گیا۔ وہ جیسے جیسے دور ہو رہا تھا رابیل کی نگاہوں میں آنسو بھرتے جا رہے تھے۔

"یا اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو۔ اللہ آپ کو اپنے مقصد میں کامیاب کرے۔ اس وطن کے دشمنوں کو نیست و نابود کرے۔" اس کے ہونٹ دعا کر رہے تھے۔

* * *

اس دفعہ بھی عبدالباری سرخرو و کامیاب لوٹا تھا، پورا گروہ گرفتار کر لیا گیا تھا صرف دو افراد بھاگنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ وہ یہ سب اپنے طور پر کر رہا تھا۔ تیمور ثقلین سی ایس پی کی طرف سے اس پر بہت دباؤ تھا مگر وہ کسی کی بھی نہیں سن رہا تھا۔ کسی کو بھی خبر میں نہیں لا رہا تھا چونکہ اس کا گزشتہ ریکارڈ بے داغ تھا سو اس کے متعلق کوئی عملی قدم بھی نہیں اٹھا رہا تھا۔ وہ ہر کیس بہت احتیاط سے حل کرتا تھا۔ گزشتہ واقعات کی طرح اس نے اس کیس کی بھی پریس میں اور پورے میڈیا کے ذریعے کوریج کروا دی تھی سو کوئی بھی اس پر ہاتھ ڈالتے ہوئے سو بار سوچ رہا تھا جب کہ اس دفعہ اس نے جن لوگوں کو گرفتار کیا تھا انہوں نے ڈی آئی جی اکرام رحمن کے متعلق کافی کچھ اگلا تھا۔ عبدالباری کا اب اگلا ٹارگٹ اکرم رحمن تھا مگر وہ اس پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے ہر طرح سے تسلی کر لینا چاہتا تھا۔ مضبوط اور ٹھوس شواہد کی روشنی میں پکے ہاتھ ڈالنا چاہتا تھا۔

وہ اپنے آفس میں تھا جب رقم کی کال آئی تھی۔ وہ فوراً نکل کھڑا ہوا تھا۔ ارقم کے پاس اکرم رحمن کے متعلق کافی ثبوت تھے۔ دھر ادھر کی بھاگ دوڑ میں عبدالباری کا سارا دن نکل گیا تھا۔ شام کے قریب وہ گھر لوٹا تھا، سامنے سب ہی پریشان و متفکر دکھائی دے رہے تھے۔

"کیا ہوا...؟" بھابی، امی اور رابیل کو روتے دیکھ کر اس نے پوچھا۔

"صبح فہد اسکول گیا تھا اسے کسی نے اغوا کر لیا ہے۔ جب وہ اسکول سے پتہ کروایا تو علم ہوا کہ کوئی دو آدمی تمہارا نام لے کر اسے لے گئے تھے۔" بابا نے بتایا وہ حیران و ششدر رہ گیا۔

"تھوڑی دیر پہلے کچھ نامعلوم لوگوں کا فون آیا ہے... دھمکیاں دے رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے اگر ہمیں فہد زندہ سلامت چاہیے تو تم ان کے گرفتار کیے ہوئے آدمیوں کو چھوڑ دو۔" وہ چپ کا چپ رہ گیا۔ رابیل اپنے بچے کی بات کر رہی تھی اور یہاں وہ ہاتھ ان کے گھر پر بھی پہنچ گئے تھے۔ فرقان بھائی نے بتایا۔

"امی، بھابی کا رو رو کر برا حال ہو رہا تھا۔ رابیل جس کی اپنی حالت ان دنوں کچھ ایسی تھی کہ اسے جتنا بھی ٹینشن وغیرہ سے دور رکھا جاتا اتنا ہی بہتر تھا مگر وہ اپنی حالت کی پروا کیے بغیر بھابی و امی کے ساتھ لگی دل جوئی کر رہی تھی۔

"رابطہ کرنے کے لیے انہوں نے کوئی میسج وغیرہ تو چھوڑا ہوگا۔ فہد تو اسے بھی بہت عزیز تھا۔ یہ اور بات تھی کہ کبھی آگے بڑھ کر مظاہرہ نہیں کیا تھا۔

"یہ نمبر لکھوائے تھے انہوں نے۔ ہم نے ایک دو دفعہ ان نمبروں کو ٹریس کروانے کی کوشش کی ہے مگر کوئی رسپانس ہی نہیں مل رہا۔" بابا نے اسے ایک پرچہ تھمایا تھا۔ وہ بغور دیکھنے لگا۔

"بے فکر رہیے اور حوصلہ کیجیے۔ میں دیکھتا ہوں...... انشاء اللہ فہد زندہ سلامت گھر آئے گا۔" پرچہ جیب میں ڈال کر وہ باہر نکل گیا تھا۔

"باری۔ رکو۔" ابھی وہ گاڑی میں بیٹھ رہا تھا جب رابیل کی آواز پر رک گیا۔ پلٹ کر اسے دیکھا، رو رو کر آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ بڑی سی چادر میں اپنے وجود کو چھپائے وہ اس کے قریب آئی تھی۔

"خیال رکھیے گا۔ کسی بھی لمحے جذباتی نہ ہو جائیے گا۔ ایک طرف وطن کے دشمن ہیں تو دوسری طرف فہد۔ بس کسی طرح فہد چاہیے زندہ و سلامت۔ کچھ بھی کریں بس وہ ہمیں لا دیں ورنہ بھابی رو رو کر مر جائیں گی۔" ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر وہ رو پڑی تھی۔ عبدالباری نے لب بھینچ لیے تھے۔

"حوصلہ رکھو۔ انشاء اللہ وہ مل جائے گا۔" آگ جب گھر کو لگتی ہے تو علم ہوتا ہے کہ اس کی تپش کیا ہے۔ اس نے اس

سے دعویٰ بہت بڑا کیا تھا اور آج عبدالباری اس کا کندھا تھپتھپا کر چلا گیا تھا۔ خون کے رشتوں کی کشش اور دکھ کتنا گہرا تھا پیچھے وہ ڈبڈبائی آنکھوں سمیت اسے دیکھتی رہی۔

عبدالباری نے ان لوگوں سے رابطہ کیا، مصالحت کی کوئی راہ نکالنا چاہی مگر وہ کسی بھی طرح آمادہ نہ ہوئے۔ فہد کے بدلے ان کی ڈیمانڈ بہت بڑی تھی۔ اس نے بڑی جان جوکھوں سے یہ کیس حل کیا تھا، بہت سا دباؤ برداشت کیا تھا حتیٰ کہ موت کی بھی پروا نہ کرتے ہوئے بے خوف و خطر آگ میں کود پڑا تھا۔ ایک طرف اگر وطن کی باگ ڈور سنبھالنے والے نونہالوں کا مستقبل خطرے میں تھا، مٹی کا قرض تھا تو دوسری طرف عزیز از جان بہن تھی۔ وہ کبھی بھی رشتوں کے متعلق، اتنا حساس نہیں ہوا تھا سوائے رانیل کے مگر اس موڑ پر آ کر وہ الجھ گیا تھا۔

"وطن سے بڑھ کر کوئی چیز اہم نہیں۔ جب یہ وطن ہی نہیں ہوگا، اس کی باگ ڈور سنبھالنے والے ہاتھ ہی نہیں ہوں گے تو پھر کیا ہم اور کیا ہمارے بچے۔" خود سے لڑتے لڑتے ایک فیصلہ ہو گیا تھا۔ خون کی کشش سے زیادہ وطن کی محبت جیت گئی تھی۔

ایک نئے عزم، ایک نئے ولولے کے ساتھ وہ میدان میں اترنے کے لیے تیار تھا۔ تیاری ہر طرح سے مکمل تھی، زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ بہتر تدبیر تو کر سکتا تھا اور وہ آخری دم تک اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں تھا۔

جدید دور تھا، سب لوگ بہر طور بدلے ہوئے تھے۔ پوری پلاننگ کی گئی تھی۔ کئی تو وہ پہلے بھی کوئی نہیں ہونے دیتا تھا اس دفعہ خاص تیاری کی تھی۔ بہت خفیہ طریقے سے کارروائی کی گئی تھی۔ مس کی تہہ تک جا پہنچا تھا۔ فہد صحیح سلامت مل گیا تھا مگر وہ خود اس ریڈ میں بری طرح زخمی ہوا تھا۔

ارقم، فہد کو گھر لے گیا تھا۔ گھر کے اردگرد پولیس کا سخت پہرا لگوا دیا گیا تھا۔ خود تو وہ اس حالت میں بھی نہ تھا کہ کچھ کر سکتا۔ ارقم کو سخت تاکید کی تھی کہ گھر والوں کو اس کے بارے میں قطعاً بے خبر رکھا جائے اور ارقم نے اور دوسرے ساتھیوں نے اس کے کام کو بخوبی سرانجام دیا تھا۔ پیچھے گھر والے قطعی بے خبر تھے، سب یہی سمجھے ہوئے تھے کہ وہ کسی نہ کسی کام میں الجھا ہوگا البتہ فون پر ایک دو دفعہ بات کی تھی جس سے گھر والے مطمئن ہو گئے تھے۔

اسے اسپتال میں تیسری رات تھی۔ ڈاکٹر نے اسے اوکے کر دیا تھا اور بیڈ ریسٹ کی تاکید کی تھی۔ رات اسپتال میں گزارنے کے بجائے اس نے ارقم سے چھٹی لینے کی بات کی تھی۔ دو بجے کے قریب وہ گھر پہنچا تھا، ارقم اسے گھر چھوڑ کر چلا گیا تو وہ کمرے میں آ گیا۔ گیٹ پر چوکیدار تھا، اس نے دروازہ کھولا تھا، اسے ایک دو خاص تاکیدیں کر کے وہ اندر آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ رانیل سوئی ہوئی ہو گی مگر اسے جائے نماز پر کھڑے دیکھ کر رک گیا۔ وہ شرٹ اتار کر صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔ جولائی کا مہینہ چل رہا تھا، گرمی خاصی زوروں پر تھی۔ ڈاکٹر کی دی گئی میڈیسن سے غنودگی طاری ہو رہی تھی مگر وہ اتنی جلدی رانیل سے بات کیے بغیر سونا نہیں چاہتا تھا۔ سلام پھیر کر پلٹ کر رانیل نے دیکھا، عبدالباری کو روم میں دیکھ کر حیران ہوئی۔ عبدالباری کی اس وقت جو حالت تھی وہ زیادہ شاک زدہ کر گئی۔ سینے، بازو پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ وہ بہت سرعت سے اس کی طرف آئی تھی۔ اس دن سے غائب تھا، فہد کو بھیج دیا تھا، خود نہیں آیا تھا۔ فون پر ایک دو دفعہ بات ہوئی تو سب خیریت ہے کہہ کر تسلی دے دی مگر اب یہ حالت۔ وہ آنکھیں بند کیے نیم دراز تھا۔

"باری...!" وہ گھٹنوں کے بل اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ باری نے بوجھل آنکھیں کھول دی تھیں۔

"یہ سب کیا ہے باری...؟" اس کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے وہ پوچھ رہی تھی جب کہ آنکھیں بس بہنے کو بے تاب تھیں۔

"ایک قرض تھا محبتوں کا، رشتوں کا، خیال ہی نہ رہا اور یہ حالت ہو گئی۔ اب دعا ہے کہ کسی طور مٹی کا قرض بھی اتار دوں۔ صد شکر میں خود غرض نہ بنا ورنہ یہ محبتیں بہت بڑا خراج مانگ رہی تھیں۔ بس اب تو وطن کی راہوں کو اپنے خون سے منور کرنا

باقی ہے۔" وہ بوجھل آواز میں بوجھل آنکھیں لیے نہ جانے کیا کہہ رہا تھا۔ اس کی حالت رانیل کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ کب دیکھی تھی اس نے کبھی اس شیر جوان مرد کو یوں اس حالت میں۔ غنودگی طاری تھی اس پر۔ رانیل نے اسے جھنجوڑ ڈالا تھا۔

"باری... ہوش کریں... پلیز بستر پر چل کر لیٹیں۔" روہانسے لہجے میں کہا گیا تھا۔ باری اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ رانیل نے اپنے کمزور سے وجود کا سہارا دیا تھا۔ لیٹ کر وہ بمشکل آنکھیں کھول کر مسکرایا۔

"اسی لیے میں گھر نہیں آ رہا تھا... جانتا تھا اس حالت میں دیکھ کر تم سب لوگ پریشان ہو جاؤ گے۔" اسے مسلسل آنسو بہاتے دیکھ کر باری نے ٹوکا تو وہ ضبط کھو گئی۔

"تو پھر میں کیا کروں... بتائیں مجھے، میں کیا کروں...؟" وہ اس کے کندھے پر اپنا سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ حتیٰ کہ یہ بھی خیال نہیں رہا تھا کہ اس کے سینے پر زخم ہیں۔

"رانیل..." درد ناقابل برداشت ہوا تو اس نے اپنے کندھے سے اس کا سر ہٹایا۔ عبدالباری کے چہرے پر تکلیف کے آثار دیکھ کر وہ خود ہی نادم ہو گئی تھی۔

"آئم سوری... کیسے ہوا یہ سب؟" خود پر کچھ قابو پا کر پوچھا۔ عبدالباری نے ہنستے ہنستے ساری تفصیل کہہ سنائی۔

"بس زخم ہیں... چند دنوں میں نارمل ہو جائیں گے... اسپتال میں تمہیں بہت مس کر رہا تھا۔ ڈاکٹروں کی مسیحائی سکون نہیں دے رہی تھی۔ تمہیں دیکھنے کی طلب تھی بس رات کے اس پہر سب چھوڑ چھاڑ کر تمہاری مسیحائی میں چلا آیا۔" وہ کہہ رہا تھا۔ کتنی شدت تھی جذبوں میں، وہ جواب میں کچھ بھی نہ کہہ پائی۔ بس اس کا سر اپنے ہاتھوں سے دبانے لگی۔ اس کے ہاتھوں کی نرماہٹ تھی شاید کہ وہ بہت جلد غافل ہو گیا تھا۔

وہ جب تک ٹھیک نہیں ہو گیا تھا چھٹی پر رہا تھا۔ گھر میں سب ہی اس کے آگے پیچھے اس کی خاطر مدارت میں لگے ہوئے تھے۔

پورے ایک ہفتے بعد اس نے آفس کا دوبارہ چارج سنبھالا تھا۔ بہت سے کام تھے نمٹانے والے پھر ارقم اس کا رائٹ ہینڈ اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ چند دن وہ بہت مصروف رہا تھا۔ بچوں کو اغوا کرنے والے مجرمان کا ریمانڈ جاری کروا کر پوچھ گچھ کے بعد ان کا کیس عدالت میں چل رہا تھا۔ وہ بہت مصروف تھا، اوپر سے وہ اکرام رحمن کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ وہ دفتر میں تھا جب اس کے کے ایس پی تیمور ثقلین کا فون آ گیا تھا۔

"تمہاری کارروائیاں دن بہ دن ناقابل برداشت ہوتی جا رہی ہیں ایس پی عبدالباری!" تیمور ثقلین کافی برہم لہجے میں مخاطب تھا۔

"خیریت سر... میں سمجھا نہیں..." اس کا انداز اگرچہ مؤدب تھا مگر کسی بھی خوف سے عاری تھا۔

"تمہارے خلاف کئی شکایتیں آ رہی ہیں... تم اپنے اختیارات کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہو۔ ہم چپ ہیں ورنہ تمہارے ہاتھ باندھنا مجھے خوب آتا ہے۔"

"تو پھر شوق سے باندھیں ناں... میرے ہاتھ بالکل صاف ہیں، کسی بات کا کوئی خوف نہیں ہاں البتہ آپ اپنی فکر کریں۔ سنا ہے کرسی سے بڑا پیار ہے آپ کو...۔" وہ بھلا اپنے باپ سے نہیں ڈرا تھا اب کیا خاک ڈرتا۔

"تم عبدالباری پچھتاؤ گے... سن لو... ڈی آئی جی صاحب آج کل میں تمہارا فیصلہ کرنے والے ہیں..." وہ غرایا تھا۔ وہ مسکرا دیا۔

"منتظر ہوں، میں بھی منتظر ہوں ڈی آئی جی کس حد تک جا سکتے ہیں۔ خوش خبری سنا دیجیے انہیں بھی کرسی بڑی پیاری ہے، میں

بھی آج کل میں کچھ انوکھا کر دکھانے والا ہوں۔" اس نے بھی دھمکی دی تھی اور فون بند کر دیا تھا۔

اس نے دھمکی دی تھی۔ اکرام رحمٰن اور تیمور ثقلین نے کوئی قدم نہیں اٹھایا تھا اور جوابا وہ بھی خاموش رہا تھا۔ وہ ہوا کا رخ دیکھ رہا تھا۔ وہ منتظر تھا کہ یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ دن اپنے مخصوص چکر میں تھے، وہ کسی کی پروا کیے بغیر اپنے کام کر رہا تھا۔ تیمور ثقلین اور اکرام رحمٰن بالکل خاموش تھے۔ اسے ان کی خاموشی بہت کھٹک رہی تھی مگر وہ بالکل پہل نہیں کرنا چاہتا تھا۔

وہ اس وقت گھر پر تھا، نہا کر نکلا تھا جب اس کے موبائل کی اسکرین چمکنے لگی تھی۔

"ہیلو..."

"بہت خطرناک کھیل شروع کیا ہے عبدالباری! میں خاموش تھا صرف اس لئے کہ میں مصالحت چاہتا تھا اور تم نے..."

"ہرگز نہیں ڈی آئی جی صاحب، آپ خاموش نہیں تھے بلکہ اندر ہی اندر مجھے ختم کرنے کی سازشیں کر رہے تھے۔ ہاں البتہ چپ ضرور تھے صرف اس لئے کہ تم اپنی کرسی بچانے کے چکر میں ہو۔ میرے پاس تمہارے متعلق جو ثبوت ہیں وہ اتنے ٹھوس اور جامع ہیں کہ تم لاکھ کوشش کر لو مگر اپنا بچاؤ نہیں کر پاؤ گے۔ تیمور ثقلین اور تم جیسے دس اور بھی آ جائیں تو عبدالباری کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ میں یا میرا ایمان اتنا کمزور نہیں کہ تم جیسے لوگوں کی گیدڑ بھبکیوں سے ڈر جاؤں۔ اپنا بوریا بستر سمیت لو، آج سے تمہارے دن گنے جا چکے ہیں۔" اسے اچھی طرح سے کہہ کر موبائل آف کر کے بیڈ پر پھینکنے لگا تھا۔ ریبل کمرے میں آئی تو اس کا موڈ آف دیکھ کر حیران ہوئی۔

"خیریت جناب! موڈ شریف اتنا برہم کیوں ہے جب کہ ابھی کچھ دیر پہلے آپ کو اچھے خاصے رومینٹک موڈ میں چھوڑ کر گئی تھی۔" چائے کا کپ اسے تھما کر اس نے چھیڑا تو وہ مسکرا دیا تھا۔

"کچھ نہیں یار... تم بھی بس..." وہ بستر پر بیٹھ کر چائے پینے لگا تھا۔

"باری! کیا بات ہے، پریشان ہیں..." چائے پیتے ہوئے بھی وہ الجھا ہوا تھا۔ وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

"ہوں... نہیں... ہاں ڈاکٹر کیا کہہ رہی تھیں۔" آج وہ ڈاکٹر سے چیک اپ کروا کر آئی تھی۔ اسی بابت وہ پوچھ رہا تھا۔

"اگلے ماہ کی چودہ یا پندرہ کی ڈیٹ دی ہے۔ ویسے تو ڈاکٹر مطمئن ہی ہے۔"

وہ سر ہلا گیا تھا، انداز اب بھی پر سوچ تھا۔

"کوئی خاص بات ہے؟"

"ہاں... نہیں... بس لگتا ہے تیمور ثقلین اور اکرام رحمٰن مل کر کوئی پروپیگنڈہ کر رہے ہیں میرے خلاف۔ ارقم کو ان کے پیچھے چھوڑا ہوا تو ہے میں نے مگر صورت حال واضح نہیں ہو رہی۔" وہ بتانے لگا تھا۔

"بہت غلط کھیل ہے یہ... مجھے تو بڑا ڈر لگ رہا ہے۔ آپ کچھ دن خاموش ہو جائیں... دیکھیں تو سہی وہ کیا کرتا ہے پھر کوئی قدم اٹھائیں۔"

"تمہارا مطلب ہے... پسپائی..." وہ تلخ ہوا۔

"نہیں... میرا یہ مطلب نہیں۔ یہ حالات ابھی آپ کے لئے سازگار نہیں ہیں... باد مخالف میں آپ کبھی بھی روشنی کا دیا نہیں جلا سکیں گے... کچھ دن رک جائیں، انتظار کریں... ہوا کا رخ دیکھیں اور پھر تیر چلائیں... ورنہ کچھ ہاتھ نہیں آئے گا... یہ ذاتی مخالفت نہیں ہے، وطن کی ساکھ کا سوال ہے جب کہ وہ ذاتی دشمنی پر اتر آیا ہے۔"

"اب تک تو میں ہوا کا رخ دیکھ رہا تھا مگر اب انتظار کرنا میرے بس میں نہیں... اس کی بقا خطرے میں ہوگی۔ اب میں

لیے کا بھی، انتظار نہیں کر سکتا... یہ جان کیا ہے، اللہ کی دین ہے۔ کیا حرج ہے اگر اس کی راہ میں چلی جائے۔ تو رابیل جان اگر چلی بھی تو شہادت جیسا رتبہ ہوگا، جیتا تو غازی ہوں گا۔ یہ احساس ہوگا کہ یہ جان وطن کی امانت تھی اور وطن کے کام آ گئی جو مقصد دل میں لے کر چلا تھا اس کی خاطر اگر یہ بے کار سی جان بھی چلی جائے تو کوئی خوف نہیں... یہ تو وطن کی مٹی کا قرض ہوگا اگر میرے خون کا آخری قطرہ بھی اس ملک کی مٹی میں جذب ہوگا تو سمجھوں گا میں نے اپنا حق ادا کر دیا ہے۔ میں گناہ گار تھا مگر اللہ نے دل میں ایک روشنی جلا دی تھی۔ آخری سانس تک لڑوں گا۔" وہ پرعزم تھا، آنکھوں میں ایمان کے ستارے چمک رہے تھے۔

"آمین..." رابیل کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں مگر ہونٹ کہہ رہے تھے۔

* * *

عبدالباری نے آخر کار بلی تھیلے سے نکال ہی لی تھی۔ اکرام رحمٰن سے متعلق تمام ثبوت منظر عام پر لے آیا تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا۔ صرف اکرام رحمٰن خود مستعفی ہوا بلکہ ساتھ ہی تیمور ثقلین کا مستقبل بھی خطرے میں پڑ گیا۔ اس دفعہ بھی اس نے میڈیا کا سہارا لیا تھا اور یہی اس کا مثبت پوائنٹ تھا۔ کیمروں کا دور تھا، خوب کوریج کیا گیا کیس کی۔ عبدالباری کو توقع سے بڑھ کر کامیابی ملی تھی۔

"تیمور ثقلین! تم بھول گئے ہو تم ایک عام ہیڈ کانسٹیبل تھے اور میں نے تمہیں ڈی ایس پی کے عہدے پر لایا تھا اور اب تمہارا ہاتھ میرے پرخچے اڑانے پر تلا ہوا ہے۔" اکرام رحمٰن نے تیمور ثقلین کے گریبان کو پکڑا تو وہ خوب برہم ہو رہا تھا۔

"میں شرمندہ ہوں سر! یہ لڑکا اپنے ارادوں میں اٹل ہے۔ اس طرح چال چلتا ہے کہ سمجھ ہی نہیں آ رہی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ میڈیا کو استعمال کر رہا ہے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ وہ دھمکیوں وغیرہ کے لالچ میں آنے والا نہیں۔"

"تو پھر کیا دیکھ رہے ہو۔ بتاؤ وہ اس کو اس سے پہلے کہ اس کے ہاتھ تمہاری گردن تک پہنچیں۔ کوئی بھی طریقہ استعمال کرو، راستے سے ہٹا دو، منظر سے غائب کر دو... اب میری زندگی کا سوال ہے۔" وہ کافی پریشان تھا۔

"سر میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اس طرح ہم پھنس بھی سکتے ہیں ہاں البتہ ایک اور طریقہ ہے جس سے نہ صرف یہ کیس ختم ہو سکتا ہے بلکہ آپ بحال بھی ہو جائیں گے اور یہ لڑکا بھی منظر سے ہٹ جائے گا۔" تیمور ثقلین کے شیطانی ذہن نے کہا۔

"وہ کیا... جلدی بولو..." وہ بے تاب تھا جاننے کو۔

"آپ کچھ دن خاموش رہیں... ریلیکس، میڈیا پرسکون ہو جائے، اس کیس کو اسی طرح رہنے دیں۔ آپ کے اچھے تعلقات ہیں انہیں استعمال کریں۔ ہر جگہ آج کل پیسہ استعمال ہو رہا ہے، سب عبدالباری جیسے نہیں ہیں۔ یہاں بہت سے لوگ پیسے سے خریدے جاتے ہیں، ان کو مجبور کریں کہ وہ اس کا ٹرانسفر کر دیں۔ آج کل اگست کے مہینے کے سلسلے میں مختلف پروگرام ترتیب دیئے جا رہے ہیں۔ رضاکارانہ طور پر بہت سے لوگوں کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں، اگست کا مہینہ آنے والا ہے اور یوم پاکستان کے سلسلے میں ملک بھر میں جہاں بے شمار تقریبات منعقد ہوتی ہیں وہیں تخریبی کارروائیاں بھی کی جاتی ہیں۔ خاص طور پر کراچی اور لاہور میں۔ بھجوا دیں اسے وہاں، لاہور یا کراچی۔ اس کے اندر وطن کی بڑی محبت ہے، کروا دیں ٹرانسفر ادھر کوئی گولی اسے بھی لگ سکتی ہے۔ ورنہ بھی لگی نہیں کیا، یہاں کوئی اور آ جائے گا پھر آپ افسران بالا سے کہہ کر کیس کلیئر بلکہ ختم کرا لیجئے گا۔ اس طرح آپ بحال بھی ہو جائیں گے اور ہمارے اوپر کوئی اعتراض بھی نہیں آئے گا۔ جہاں تک میڈیا کی بات ہے تو یہاں بے شمار ایسے کیس ہوتے رہتے ہیں، کون پوچھتا ہے۔ آج مرے کل دوسرا دن والی بات ہے۔ کوئی پوچھ گچھ نہیں ہوگی۔ بس جلد از جلد اس کے ٹرانسفر کے آرڈر جاری کروا دیں۔ یہ کام تو میں بھی کر سکتا ہوں اس طرح مجھ پر شک ہو سکتا ہے، بس یہی شو کروائیں کہ اوپر سے آرڈر آئے ہیں۔"

تیمور ثقلین کے سازشی ذہن نے ایک نیا منصوبہ ترتیب دیا تھا۔

"واہ یار تم تو بڑے کام کی چیز نکلے پہلے کہاں تھا یہ مشورہ۔ جلدی کچھ کرواتا ہوں، چند دنوں میں ہی ....." اکرام رحمٰن خوش ہو کر کہہ رہا تھا۔

وہ قہقہے لگا رہا تھا، اس کے مکروہ قہقہوں کا ساتھ تیمور ثقلین نے بھی دیا تھا۔

* * *

ادھر ابھی اگست کا مہینہ بھی شروع نہیں ہوا تھا اور سب کچھ یوں آناً فاناً ہوا تھا کہ عبدالباری حیران تھا۔ اس کے لاہور ٹرانسفر کے آرڈرز آ گئے تھے۔ وہ سمجھ تو گیا تھا کہ کن لوگوں کی سازش ہے مگر اسے کام کرنا تھا، یہاں نہیں تو لاہور جا کر۔ یہاں جب تک وہ رہا تھا پوری ایمانداری سے اپنا کام سرانجام دینے کی کوشش کی تھی اور اب اسے لاہور چلے جانا تھا۔ اکرام رحمٰن کا کیس چل رہا تھا، ثبوت تو ٹھوس اور جامد تھے امید تھی کہ وہ بچ نہیں پائے گا سو وہ مطمئن تھا۔

وہ لاہور جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ رابیل اس کا سامان تیار کر رہی تھی۔ آج کل اس کی حالت ایسی تھی کہ اسے ہر لمحہ اس کی ضرورت پڑ سکتی تھی اگر فرض کی ادائیگی کا حساب نہ ہوتا تو وہ رک جاتا۔

"دیکھ لیں کوئی چیز رہ تو نہیں گئی، چیک کر لیں" بیگ تیار کر کے اس نے کہا تھا۔ عبدالباری اسے دیکھنے لگا۔ یہاں سے جانے کو دل نہیں مان رہا تھا۔ ایک ننھے نام ہی البیری کی دنیا نے دل کو اپنے حصار میں لیا ہوا تھا۔

"مجھے یقین نہیں آ رہا رابیل، سلاک ہو شخص جو میری جان کے درپے تھا وہ اتنی جلدی کیسے ہار مان گیا۔ یہ بھی اس کی سازش ہے... مجھے راستے سے ہٹانے کا ایک طریقہ ہے۔" وہ رابیل سے کہہ رہا تھا۔ وہ مسکرا دی۔

"ہو سکتا ہے یہ سازش نہ ہو، یہ بھی ہو سکتا ہے نیکی کی جیت ہوئی ہو۔ وہ شخص معطل ہو چکا ہے۔ اس کا کیس چل رہا ہے۔ اللہ نے چاہا تو بہتر فیصلہ ہوگا۔ نیکی اور راستی کی ہمیشہ جیت ہوتی ہے۔ تو اس پر ایمان پختہ کر لیں، آخر کب تک یہ لوگ جیتتے رہیں گے۔ نعوذ باللہ حق اور سچ غلط چیزیں تو نہیں، جب اللہ کے نزدیک ان کا بلند مقام ہے تو وہ زمین میں بھی ان کی حکمرانی پسند کرے گا۔ وہ کبھی اپنے بندوں کے لئے غلط نہیں کرتا۔ بس کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے شاید آپ کی ضرورت یہاں سے زیادہ لاہور میں ہوگی۔ یہ بات دل کو سمجھا لیں بس۔" وہ پھر اس کی روشنی بنی اس کو سمجھا رہی تھی۔ وہ ہنس دیا۔

"تم رابیل میرا حوصلہ ہو میری راہ کی روشنی ہو میں کوشش کروں گا جلدی ملنے آؤں..... تم پریشان نہ ہونا اور ان دنوں تو بالکل نہیں۔" وہ ایک دم سب چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ اس کے وجود کو بازوؤں میں بھر لیا تھا۔ وہ خوامخواہ چہرہ جھکا گئی۔ نہ جانے کیوں دل کی کیفیت بھی عجب ہو رہی تھی۔ دل چاہ رہا تھا کہ اسے کہیں بھی نہ جانے دے۔ آنسو بس بہنے کو بے تاب تھے۔ وہ بمشکل خود پر کنٹرول کر رہی تھی۔

"رابیل! تم رو رہی ہو" اس کا چہرہ اپنے ہاتھ سے اوپر کرتے وہ پوچھ رہا تھا۔ وہ خود پر ضبط نہ کر سکی تھی۔ اس کے سینے پر سر رکھے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"تم تو یوں رو رہی ہو جیسے میں ہمیشہ کے لئے جا رہا ہوں۔ کم آن جان باری، یار چند دنوں میں، میں لوٹ آؤں گا" اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے تسلی دے رہا تھا۔ وہ چہرہ اٹھا کر اسے شاکی نظروں سے دیکھنے لگی۔

"نہیں چھیڑیے، آپ کو تو تسلی دینا بھی نہیں آتی۔" وہ ایک دم خفا ہو گئی تھی۔ وہ قہقہہ مار ہوا تھا۔ پورا کمرہ گونج اٹھا تھا۔

"میری جان! جس جگہ میں جا رہا ہوں وہاں تمہارے بیوہ ہونے کے سو فیصد امکان ہیں۔" وہ اس کے ساتھ ساتھ اپنے

دل کو بھی بہلا رہا تھا۔ رابیل نے کھینچ کے ہاتھ اس کے سینے پر مار دیا۔ اپنے کندھوں سے اس کے ہاتھ جھٹک کر پیچھے ہٹ گئی تھی۔ سر سے کشن اٹھا کر دے مارا۔ وہ مزید ہنسنے لگا تھا۔

"میرے ساتھ ایسی باتیں مت کیا کریں۔ زہر لگتے ہیں آپ۔ میں کیوں بیوہ ہوں، آپ ہو جائیں۔" وہ پھر رونے لگی تھی۔ اس کی اس بات پر وہ پہلے سے زیادہ کھلکھلا کر ہنسا تھا۔

"یعنی بیوہ۔" اس نے جملہ پکڑا تھا۔

"ہاں۔" وہ زچ ہو گئی۔

"او میری جان! اتنے اہم موقع کو یوں لڑ جھگڑ کر آنسو بہا کر ضائع مت کرو۔ زادِ راہ اکٹھا کرنے دو، تنہائی میں کام آئے گا۔" اس نے اسے پھر بازوؤں میں بھر لیا تھا پھر لہجہ خود بخود آزردہ سا ہو گیا۔

"میرا دل نہیں چاہ رہا 'بی' جانے کو۔ کوئی ایسا منتر پھونکو کہ یہ گھڑی یہیں تھم جائے۔ وقت کی گردش رک جائے۔ پلیز رابیل۔" وہ سرگوشی کے سے انداز میں کہہ رہا تھا۔ عبدالباری کا سینہ اس کے آنسوؤں سے بھیگنے لگا تھا، اس کے مست نگاہ کی حدت پر جوش لمس، بے قراریاں اور بے تابیاں اس کے اندر کا حوال سنا رہی تھیں۔ وہ اس کی قربت میں مزید بکھرتی گئی۔

پھر وہ چلا گیا تھا، ہزار ہا وعدے کر کے اور بہلاوے دے کے۔ وہ تنہا ہو گئی۔ ایک ایک لمحہ کاٹنا مشکل ہونے لگا۔ ان دنوں وہ جس کیفیت سے گزر رہی تھی اس میں اسے کسی ساتھی، کسی اپنے کی اشد ضرورت تھی۔ کچھ دن باقی رہ گئے تھے پھر اس کے پاس بھی عبدالباری کا ایک اصول تھا۔ اس کے بغیر یہ ہاں، یہ دن گزارنا مشکل ہو گیا تھا۔ نہ جانے کس حال میں تھا وہ، فون تو وہ کرتا تھا سب خیریت ہے کہہ کر پھر پورتسلی بھی دیتا تھا، اپنا خیال رکھنے کی خاص تاکید بھی کرتا تھا۔ اور وہ تھی کہ اس کے بغیر یہاں ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔ رات کا آخری پہر اس کے لیے کاٹنا مشکل ہو جاتا تھا۔ کمرے میں اس کی سرگوشیاں گونجتیں تو دل بے قرار ہو کر تڑپ اٹھتا۔ آنکھوں کی جھڑی لگتی تو پھر رکتی ہی نہ تھی۔ یہ محبت تھی، بیوی کے جذبات تھے یا نہ جانے کیا تھا، بس اب دن بہ دن اس کا حوصلہ کم پڑتا جا رہا تھا۔

اس کی کنڈیشن کے پیش نظر امی اس کے پاس ہی سوتی تھیں۔ اس رات آخری پہر کوئی بھی نہیں سویا تھا۔ کل چودہ اگست کا دن تھا، ساری رات ٹیلی ویژن پر پروگرام آتے رہے تھے۔ سب ہی جاگ رہے تھے صرف وہی اپنے کمرے میں تھی۔ امی اس کے پاس ہی تھیں، ابھی ان کی آنکھ لگی تھی۔ رابیل کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ باری کو یاد کرتے کرتے اس کی طبیعت ایک دم خراب ہو گئی تھی۔ امی الرٹ ہوئی تھیں۔ فرقان بھائی اور بابا جاگ رہے تھے، پھوپھو انہیں پہلے ہی آگاہ کر چکی تھیں فوراً اسے ہسپتال لے جایا گیا تھا۔ اس حال میں اسے صرف اور صرف عبدالباری کا خیال آ رہا تھا، وہ وہ کر، کتنا شوق تھا اسے بچے نومولود کو دیکھنے کا۔ اور اب وہ کتنا دور تھا۔ میلوں کے فاصلے پر تھا۔ اسلام آباد سے لاہور تک فاصلہ کم بھی نہیں تھا۔

جنت ایک دم جیسے اس کے قدموں تلے آ گئی تھی۔ ایک خوب صورت، صحت مند بچے کو اس نے جنم دیا تھا۔ عبدالباری کا وارث اس دنیا میں آ چکا تھا۔ فجر کے قریب کا وقت تھا، چودہ اگست کی روشن تاریخ تھی اور عبدالباری خود قطعی بے خبر تھا۔ نہ جانے وہ کہاں تھا؟ کل سارا دن بھی اس نے کوئی فون نہیں کیا تھا۔

بچہ بہت پیارا تھا۔ ننھا منا سا چھوٹا عبدالباری تھا۔ وہ کئی ثانیے یک ٹک اسے دیکھے گئی۔ ہر تکلیف، ہر احساس جیسے بھول گئی۔ ماں بنے کی خوشی ہی ایسی انمول تھی۔ نہ جانے کب آنکھ کھلی تھی، کمرے میں سب ہی تھے۔ وہ دیکھنے لگی۔

"ماشاء اللہ بہت پیارا ہے ہمارا بیٹا ....." امی کہہ رہی تھیں۔ وہ مسکرا دی۔

"بالکل اپنے باپ پر گیا ہے۔ وہی ناک، وہی نقشہ، صرف آنکھیں موٹی موٹی ماں پر ہیں۔" بھابی ریمارکس دے رہی

تھیں۔ بہت محبت تھی ان کے لہجے میں۔

"بیٹا جو ہوا عبدالباری کا، اسی پر جاتا ہے۔" بابا نے بھی مسکرا کر کہا۔

"عبدالباری کو اطلاع دے دی۔۔۔" اسے جیسے ایک دم یاد آیا تھا۔

"نہیں۔۔ ایک دفعہ اس کے سیل پر کوشش کی تھی مگر شاید سیل آف ہے۔" فرقان بھیا نے بتایا تو وہ کچھ مایوس سی ہو گئی۔

باقی کا سارا دن اسی طرح گزر گیا۔ کیس بظاہر نارمل تھا مگر وہ بہت کمزور ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر نے دو دن اسپتال ایڈمٹ رہنے کی ہدایت کی تھی۔

رات کو امی سو گئی تھیں، باقی سب گھر چلے گئے تھے۔ اس نے سرہانے رکھا موبائل اٹھا لیا جو بھابی دے گئی تھیں۔ کتنی دیر تک نمبر ملاتی رہی پھر ایک کوشش آخر کار کامیاب ہو ہی گئی۔

"باری۔۔ باری۔۔ کہاں تھے۔۔ سیل کیوں آف کیا ہوا تھا؟" وہ اس کی آواز سن کر رو دینے کو تھی۔ بغیر سلام دعا کے ایک دم مخاطب تھی۔

"تم۔۔ رانیل۔۔ خیریت تو ہے اس وقت۔۔؟"

"آپ تو یہاں سے جا کر جیسے سب کچھ بھول گئے ہیں۔۔ اتنا بھی یاد نہیں رہا کہ آج کیا تاریخ ہے اور ڈاکٹر نے کیا ڈیٹ دی تھی۔" اب اس کے آنسو بے قابو ہونے لگے تھے۔ دوسری طرف وہ بری طرح چونکا۔

"اوہ تو۔۔! سوری۔۔ میری جان! آئم سو سوری۔۔ آج کل میں، میں بہت مصروف رہا ہوں۔۔۔۔ ایک لمحے کی بھی فرصت نہ تھی۔ یوم آزادی ہے نا، اسی لیے میں بھول گیا کہ ایک اور اہم واقعہ بھی اس ڈیٹ کو میری زندگی میں رونما ہونے والا ہے۔۔ رئیلی سوری۔۔ تم بتاؤ سب خیریت ہے نا؟" وہ جاننے کے لیے بے تاب ہوا۔

"آپ کا وارث گزشتہ آخر رات کو چودہ اگست کی تاریخ میں اس دنیا میں آ چکا ہے۔" وہ عجیب سے انداز میں اسے یہ خوش خبری سنا گئی تھی۔ اس وقت یوں حالت ہو رہی تھی جیسے وہ سامنے ہو۔

"اوہ رئیلی۔۔ رانی! تم سچ کہہ رہی ہو! میرا بیٹا پیدا ہوا ہے۔" دوسری طرف سے وہ خوشی سے پاگل ہونے کو تھا۔

"ہوں۔۔"

"اوہ رانیل۔۔ تھینک یو اللہ میاں۔۔۔" خوشی سے مخمور آواز تھی۔ "کیسا ہے وہ۔۔؟" لہجے میں دنیا بھر کا اشتیاق تھا۔

"میں کیا جانوں۔۔ آ کر دیکھ لیں نا۔۔" رانیل کا موڈ یک دم شگفتہ ہو گیا تھا، دوسری طرف پڑنے والا قہقہہ اسے جیسے گلنار کر گیا تھا۔

"اب تو ایک لمحہ بھی نہیں لگاؤں گا۔۔۔ ہوا کے دوش پر اڑتا آؤں گا۔"

"صرف بیٹے کو دیکھنے۔۔"

"نہیں، بیٹے کی والدہ ماجدہ کو بھی۔۔ پیار کرنے آؤں گا، آج کے دن کی اتنی انمول خوشی اسی کے توسط سے تو مجھے ملی ہے۔" وہ کتنا خوش تھا۔ وہ مارے حیا کے کئی لمحے بول بھی نہ سکی۔

"رانیل!" اس نے پکارا۔

"ہوں۔۔"

"تم ٹھیک ہو نا۔۔؟" وہ بہت توجہ سے پوچھ رہا تھا۔ وہ مسکرا دی۔

"ہوں۔۔ کب آ رہے ہیں آپ؟" کچھ ہمت کی تھی۔

"کیا تم میرے آنے کا عملی ثبوت دو گی۔۔ بتاؤ رانیل جانم۔۔" وہ ایک لمحہ بھی ضائع کرنے کو تیار نہیں تھا۔ وہ پزل ہو گئی اس کے دلے انداز پر۔

"آپ بہت۔۔"

"بدتمیز ہوں۔۔" اس کا جملہ باری نے اچک لیا تھا۔ وہ کھل کر مسکرائی۔

"وہ تو ہیں۔۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ آ کر بتاؤں گا۔۔ دل تو چاہ رہا ہے کہ ابھی آ جاؤں، بہت اہم ڈیوٹی پر ہوں۔۔ صرف انتظار کرو۔۔ دو تین دن۔۔ بس پھر آ جاؤں گا۔" وہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"اور ہاں رانیل اس وقت بہت بزی ہوں، فی الحال اجازت چاہوں گا۔ تم میرے بیٹے کو میری طرف سے بھرپور پیار کرنا۔۔" وہ ایک دم بہت ہی زیادہ عجلت میں لگ رہا تھا۔

"اور بیٹے کی ماں کو۔۔" رانیل کا جی نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ فون بند کرے۔

"بیٹے کی ماں کو ہم خود آ کر بنفس نفیس ہینڈل کر لیں گے۔۔ بس بیٹے کی والدہ ماجدہ تھوڑا سا انتظار کر لے۔۔" عبدالباری نے فون بند کر دیا تھا، وہ اس سے بات کر لینے کے خیال سے ہی پرسکون ہو گئی تھی۔

دو دن بعد وہ گھر شفٹ ہو گئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ عبدالباری ضرور آ جائے گا مگر اگلا دن بھی گزر گیا اور وہ نہ آیا۔ وہ انہی خدشوں میں الجھتی پریشان ہوتی۔۔ حتیٰ کہ اس سے اگلے دن اس کی کال آ گئی۔

"آپ بہت جھوٹے اور دغاباز ہیں، آنے کا وعدہ کیا اور نہیں آئے۔" وہ گویا دور تھا، سامنے ہوتا تو نہ جانے کیا حشر کر ڈالتی۔ اب صرف غصے کا اظہار ہی کر پائی تھی۔

"کیسا ہے ہمارا بیٹا۔۔؟" بہت محبت سے پوچھا گیا تھا۔ وہ پھٹ پڑی۔

"مجھے نہیں پتہ۔۔ اتنی پروا ہے بیٹے کی تو آ کر دیکھ لیں۔"

"لگتا ہے بہت ناراض ہو میری جان۔" وہ مسکرا رہا تھا۔

"تو اور کیا نہ ہوں۔۔ آپ کو کیا علم کتنی تکلیف سہی ہے میں نے۔ ایک ایک لمحہ آپ کو کتنا یاد کیا ہے میں نے۔۔ اگر مجھے کچھ ہو جاتا تو پھر کیا کرتے آپ۔۔" وہ رو پڑی تھی بالکل بچوں کی طرح۔ عبدالباری کی دوری نے اسے کیا سے کیا بنا دیا تھا۔ وہ تحیر سی تھی۔

"رانیل۔۔ جان عزیز۔۔ کیا ہوا؟ کیوں رو رہی ہو؟ میں تو بہت باحوصلہ اور سمجھدار سمجھتا تھا تمہیں۔۔۔۔ اتنی کم حوصلہ تو کبھی نہیں رہیں تم۔۔" دوسری طرف وہ اس کی کیفیت کے خیال سے حیران و پریشان ہو رہا تھا۔

"نہیں باری! یہ خول تھا بہادری اور حوصلہ مندی کا۔۔۔۔ آپ نزدیک تھے تو سب کچھ تھا۔ آپ کی دوری نے مجھے بہت کچھ سمجھا دیا ہے۔" وہ رو رہی تھی پوری شدت سے۔ پہلی دفعہ وہ یوں خود سپردگی کا زبان سے اقرار کر رہی تھی وہ بھی یوں کھل کر۔۔۔۔ ورنہ تو عبدالباری کو حسرت ہی رہی تھی کہ وہ بھی کچھ کہہ تو لے۔ کس کس انداز میں اسے نہیں چڑاتا تھا اور اب یہ اقرار۔۔ عبدالباری کا دل خوش کن انداز میں دھڑکنے لگا تھا۔

"کیا بھلا۔۔؟"

"میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔۔۔ مجھے اپنے پاس بلا لیں یا پھر خود آ جائیں ورنہ یہ انتظار مجھے مار دے گا۔" وہ اب بغیر کسی کوما فل اسٹاپ کے رو رہی تھی۔ وہ اس اظہار پر سرشار ہو گیا تھا مگر اس کے یوں اس قدر شدت سے رونے پر پریشان بھی ہوا

تھا۔

"میں آ رہا ہوں راحیل! صبح تک پہنچ جاؤں گا۔ بس ایک آخری مرحلہ رہ گیا ہے۔ بس دعا کرنا کامیاب ہو جاؤں۔ ورنہ۔" نہ جانے کیا تھا عبدالباری کے لہجے میں، وہ روتے ہوئے چونک گئی۔

"باری! کیا بات ہے۔ کوئی مسئلہ ہے؟" آنسو ایک دم صاف کئے تھے۔ دوسری طرف اسے کون سے حالات درپیش تھے وہ قطعی نابلد تھی۔ جب سے باری یہاں سے گیا تھا اس نے اس سے کچھ بھی ڈسکس نہیں کیا تھا۔ "سب ٹھیک ہے" کہہ کر ہمیشہ ٹال جاتا تھا۔

"کچھ نہیں راحیل جان! بس فیض یاد آ رہے ہیں۔"

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا، وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے، اس جان کی کوئی بات نہیں
میدانِ وفا دربار نہیں، یاں نام و نسب کی پوچھ کہاں
عاشق تو کسی کا نام نہیں، کچھ عشق کسی کی ذات نہیں
گر بازی عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنا، ہارے بھی تو بازی مات نہیں"

وہ اس کے لہجے کی بے فکری اور میں کھو سی گئی۔

"باری۔" راحیل کے لبوں سے نکلا اور وہ ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے۔

"ابھی کچھ مت کہنا میری جان! بہت کچھ کہنا ہے۔ بہت کچھ سننا ہے۔ سب آمنے سامنے کہیں گے۔" وہ گمبھیر لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "تم پر بلیک کلر بہت سوٹ کرتا ہے۔ وہ کل پہن رکھنا، میں جب آؤں تو تم مجھے اسی رنگ میں ملو۔ میرے بیٹے کو بھرپور پیار کرنا اور اپنا ہمیشہ خیال رکھنا۔ زندگی نے گر مہلت دی تو کل صبح تم سے ان شاء اللہ آ ملوں گا۔" عبدالباری کا لہجہ شاید ٹوٹ رہا تھا۔ نہ جانے کیا بات تھی۔ وہ رو پڑی۔

"باری! آپ کا بیٹا بالکل آپ پر گیا ہے، ننھا منا سا عبدالباری ہے۔ صرف آنکھیں مجھ پر ہیں۔" نہ جانے کس احساس سے کٹ کر وہ اسے بتا رہی تھی۔ لہجے میں حسرتیں تھیں۔

"میرا بیٹا جو ہوا۔" انداز اب سرگوشیانہ تھا۔ "وہ ایک امید کی کرن ہے ہمارے لئے۔ ایک روشن امید جو چودہ اگست کے دن پیدا ہوا ہے وہ میرے لئے، اندھیری راہوں میں ایک کرن، ایک روشنی، ایک عزم لے کر آیا ہے۔ میں لوٹا تو اس کا نام ایمان رکھوں گا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ چودہ اگست کا انمول تحفہ ہے میرے لئے۔"

فون بند ہو چکا تھا، وہ کتنی دیر تک ساکن سی بیٹھی رہ گئی۔ نہ جانے کون کون سی تشنگیاں تھیں جو عبدالباری کے لہجے میں بول رہی تھیں۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ سب کو ہی علم ہو گیا تھا کہ عبدالباری آ رہا ہے۔ سب ہی بہت پرجوش تھے اور وہ خود بھی کر اگلی صبح تک لباس فاخرہ بدل کر بچے کے بھی کپڑے بدل کر اس کی منتظر تھی۔ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا اس کا دل بیٹھتا جا رہا تھا حتیٰ کہ صبح سے دوپہر کا وقت آ گیا۔ کتنی دفعہ وہ اس کے سیل پر ٹرائی کر چکی تھی مگر وہ آف تھا۔ بیل ہی نہیں جاتی تھی۔ اس کا دل ان جانے خوف کے حصار میں سمٹنے لگا۔

بچے کو فیڈ کر کے وہ باہر آئی تھی۔ لاؤنج میں رکھے فون کی بیل بجی تھی۔ اس نے فوراً آگے بڑھ کر ریسیور اٹھا لیا تھا۔ باقی سب بھی وہیں تھے، سب متوجہ ہوئے۔

"ہیلو.... جی کون.... اچھا مسز عبدالباری؟ جی ایک اطلاع ہے آپ کے لئے لاہور سے۔ میں ان کا خاص ساتھی ارقم بول رہا ہوں۔"

"کیسی اطلاع؟" اس کا دل اچھل کر حلق میں آ اٹکا گویا ناخنوں سے جان نکل گئی۔ اس خیال سے کہ وہ خود کلام کیوں نہیں کر رہا جب کہ اس وقت اسے یہاں اس گھر میں ہونا چاہئے تھا اور اب یہ فون؟

"میرے اللہ! میرے حافظ! مجھ پر میری برداشت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالنا....." راحیل کا رواں رواں عرش الٰہی کی طرف محو پکار تھا۔

"ایس پی عبدالباری صاحب جب سے یہاں لاہور آئے ہوئے تھے کچھ نادیدہ ہاتھ ان کے پیچھے لگے ہوئے تھے، ہر موقع پر وہ بال بال بچ جاتے تھے پھر انہوں نے سراغ بھی لگوایا کہ یہ نادیدہ ہاتھ کن لوگوں کے ہیں۔ وہ جرم کی دنیا میں بڑے نام سے جانے جاتے تھے۔ وطن کے محافظ جب اس کے دشمن بن جائیں تو پھر ان کے سینوں میں دل کی جگہ پتھر ہوتے ہیں۔ غاصب و میر جعفروں کے مالک بے ضمیر لوگ ہوتے ہیں۔ عبدالباری صاحب جو ایک خاص مقصد کے لئے لڑنے کو اس میدان میں اترے تھے وہ اب کیسے ان لوگوں کو جانے دیتے۔ اس ملک کی مٹی کا قرض ادا کرنا چاہتے تھے اپنے خون کا نذرانہ دے کر اس ملک کو شرانگیزوں سے پاک و صاف کر کے۔ دن رات کی پروا کئے بغیر وہ صرف ان لوگوں کو کاٹ دینا چاہتے تھے جو ملک کے ناسور تھے اور اندر ہی اندر اس کی جڑیں کھوکھلی کر رہے تھے۔ اس کام کے لئے انہوں نے مجھے بطور خاص اسلام آباد سے لاہور بلوایا تھا۔ کچھ غیر ملکی بندے تھے جو اس وطن کے اہم راز اور ویڈیو کیسٹس وغیرہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ وطن کے غدار حکام اعلیٰ ان کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ چودہ اگست والے دن جب وہ بادشاہی مسجد میں علامہ اقبال کے مزار پر سلامی پیش کر کے افسران کے ساتھ تھے تو اس کے بعد بھی ان پر حملہ ہوا تھا۔ وہ بال بال بچے تھے، قدرت کو شاید ابھی کچھ اور منظور تھا۔ وہ بچ گئے۔ دشمنوں کا مقصد ان کو اپنے راستے سے ہٹانا تھا۔ وہ ایک عرصے سے ان کی ہٹ لسٹ پر تھے۔ گزشتہ رات بھی عبدالباری صاحب نے کچھ نفری کے ساتھ ان تخریب کاروں، غدارِ وطن، ضمیر فروشوں پر حملہ کر دیا تھا۔ ان کے تمام ساتھی ان کو عین وقت پر دغا دے گئے تھے۔ وہ سب وطن کے دشمنوں کے ہاتھوں بک گئے تھے۔ آخری دم تک عبدالباری صاحب نے ڈٹ کر بڑی جواں مردی، ہمت، حوصلے، عزم و طاقت سے ان سفاک درندوں کا مقابلہ کیا تھا۔ وہ اہم راز اور کیسٹس وغیرہ حاصل کر لی تھیں مگر پھر وہ دشمنوں کی کثیر نفری کے آگے تنہا کچھ بھی نہ کر سکے۔ مجھے انہوں نے وہ تمام ضروری راز اور چیزیں دے کر بھگا دیا تھا۔ میں آخری دم میں ان کا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا مگر اس ملک کی بقا و سالمیت کے لئے مجبور ہو گیا۔ میں ان کی حفاظت نہ کر سکا۔ وہ مجھے بھی بہت عزیز تھے۔ دشمنوں نے ان کو گولیوں کی بوچھاڑ سے چھلنی چھلنی کر دیا تھا۔ انہوں نے وطن کی زمین پر آخری سانس تک جنگ لڑی تھی حتیٰ کہ خون پانی کی طرح بہنے لگا تھا۔ بہت افسوس سے کہتا ہوں کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ آپ حوصلہ کیجئے گا، آخری دم تک وہ آپ کو یاد کرتے رہے تھے۔"

فون کی لائن بے جان ہو چکی تھی۔ وہ زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔

"عبدالباری۔ بابا۔ امی۔ بابا۔"

اس کے اندر سے کراہیں اٹھنے لگی تھیں۔ بدن سے شعلے سے بلند ہونے لگے تھے۔ جان جسم سے نکلی جا رہی تھی..... بین تھے، سسکیاں تھیں..... کراہیں تھیں..... ایک حشر سا برپا ہو گیا تھا پورے وجود میں.....

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا
وہ شان سلامت رہتی ہے

چاروں طرف سے صرف ایک ہی آواز گونج رہی تھی۔

وہ عاشق تھا وطن کا، اسے عشق تھا وطن کی مٹی سے۔ وہ اپنا کہا پورا کر گیا تھا۔ وطن کی آن، بان، بقا و سلامتی کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر گیا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے کہرام برپا ہو گیا ہو۔ اگلے ہی دن عبدالباری کی لاش آ گئی تھی جس نے سنا تڑپ اٹھا۔ اس کا وجود پہچانا ہی نہیں جا رہا تھا۔ دشمنوں نے اس پر بری طرح اپنے شوق پورے کیے تھے۔ ہر آنکھ اشک بار تھی، ہر دل تڑپ رہا تھا۔ ہر کوئی غم سے نڈھال تھا۔

کتنے ہی دن اوپر تلے گزرتے چلے گئے۔ پرسہ دینے والوں کی قطاریں سی لگ گئیں اور ان میں دو چہرے تیمور ثقلین اور اکرام رحمٰن کے تھے جو اپنے عہدے پر بحال ہو چکا تھا جو عبدالباری کی موت کا اصل سبب تھا۔

"وہ بہت نڈر، بے باک اور جواں مرد تھا۔ ہر آگ میں بے خوف و خطر کود پڑتا تھا۔ اس کے ارادے بہت بلند تھے۔ کوئی ڈھا نہیں سکتا تھا اس کے ارادوں کو۔ تخریب کاروں، وطن غداروں کے لیے اس کے دل میں ایک نفرت سی تھی وطن کے لیے اس کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔" تیمور ثقلین بابا کو کہہ رہے تھے۔ وہ سرد آہ بھر کر رہ گئے تھے۔ ان کا بیٹا مر گیا تھا وہ کس سے شکوہ کرتے۔ پردے کے پیچھے کھڑی رائنل سن رہی تھی۔

"وہ جرأت و حوصلے میں بے مثال تھا۔ وطن کے دشمنوں کو ختم کرنے کا اٹل ارادہ رکھتا تھا۔ وہ نہیں رہا مگر اس کے عہد کو ہم آگے ضرور بڑھائیں گے۔ ہمارے درمیان صرف ایک غلط فہمی تھی۔ ثبوت جھوٹے تھے سو میں دوبارہ بحال ہو گیا ہوں مگر میرے دل میں اس کے لیے ابھی بھی بہت مقام ہے۔ اللہ اسے جنت میں جگہ عطا فرمائے۔ اس ملک میں اس جیسے کئی عبدالباری ہیں مگر وہ اپنی مثال آپ تھا۔ ابھی بھی بہت سے ایسے ہیں جو اپنی جان ہتھیلی پر رکھے وطن کی آن، بان اور شان کے لیے لڑ رہے ہیں۔ وہ شہید وطن ہے، حکام اعلیٰ اور افسران سے گزارش کروں گا کہ اسے خصوصی اعزازات اور ستارۂ جرأت و امتیاز سے نوازیں۔ وہ اس لائق تھا۔ اللہ آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔"

رحمٰن، اکرام اپنی مکروہ زبان سے سب کچھ کہہ رہا تھا۔ رائنل کا جی چاہ رہا تھا کہ ان کو ان کے مکروہ چہروں سمیت اس دنیا سے ہی رخصت کر دے۔

وہ کمرے میں بند ہو گئی تھی۔ عبدالباری کو گئے کتنے دن ہو گئے تھے مگر وہ ابھی تک اسی سیاہ ماتمی لباس میں تھی جو عبدالباری کو بہت پسند تھا۔ آخری خواہش یہی کی تھی اس نے اور ہمیشہ کے لیے یہی لباس اس کا مقدر کر گیا تھا۔

عبدالباری کا بیٹا بے خبر سو رہا تھا۔ اس معصوم کو تو یہ علم بھی نہیں تھا کہ اس پر کتنی بڑی قیامت ٹوٹ چکی ہے۔ بدنصیب کو باپ کے ہاتھ کا لمس بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔

جھک کر اس کی پیشانی چوم لی جو عبدالباری کے لیے ایمان تھا۔ تجدید عہد کے دن پیدا ہونے والا اللہ تعالیٰ کا انمول تحفہ تھا۔ عبدالباری کی قربت کے حسین لمحات کی واحد نشانی تھا۔ ابھی وہ عبدالباری کی تصویر لے کر بستر پر بیٹھی ہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ امی اور بابا اندر آ گئے تھے۔

"عبدالباری کا ساتھی آیا تھا۔ ارقم جو آخر وقت میں اس کے ساتھ تھا، وہ یہ چند چیزیں دے گیا ہے۔ کہہ رہا تھا کہ باری کی خاص تاکید تھی کہ تمہیں دے دی جائیں۔" چمڑے کا مضبوط بیگ تھا اس نے تھام لیا۔

"حوصلہ رکھو ... اب ہمیں اس کے بغیر ہی جینا ہے...... وہ اتنی ہی عمر لکھوا کر آیا تھا۔" اس کے سر پر دست شفقت رکھ کر بابا پرنم لہجے میں کہتے ہوئے باہر نکل گئے تھے پھر امی بھی آنکھیں صاف کرتے ہوئے باہر چلی گئیں۔ اس نے بیگ کھولا تھا۔ چند کیسٹس تھیں ویڈیو، کچھ اور کاغذات تھے۔ کچھ نقشے تھے پھر ایک لفافہ تھا جس کے اوپر لکھا ہوا تھا۔

"میری رائنل کے لیے" وہ کٹ سی گئی۔

اس نے لفافہ کھول لیا۔ عبدالباری کی پہلی اور آخری تحریر اس کے سامنے تھی۔ اس کے نام پر

"جانِ عبدالباری!

ہو سکتا ہے جب یہ خط تمہیں ملے میں تم لوگوں میں نہ ہوں...... اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس خط کے بجائے میں خود آ جاؤں۔ بہرحال امید پر دنیا قائم ہے۔ اب تو ہمارا تعلق پہلے سے زیادہ مضبوط ہو گیا ہے۔ تم سے فون پر بات کرنے کے بعد خط لکھ رہا ہوں، وقت کا کچھ بھروسہ نہیں اگر خود نہ آ سکا تو یہ خط تو ہوگا نا۔ اب تو ایک ہی خواہش ہے اپنے بیٹے اپنے نور چشم کو دیکھنے کی۔ اولاد کی محبت انسان کو کتنا حریص بنا دیتی ہے، کچھ سوچا بھی نہ تھا۔ میرے اور تمہارے رشتے کا حسین تحفہ، میرے اور تمہارے خوب صورت محبت کا، اللہ کی طرف سے عطا کیا گیا بہترین ہدیہ ہمارا بیٹا ہمارا ایمان رائنل جان! بہت عرصہ پہلے ہی میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر ہمارا بیٹا پیدا ہوا تو اس کا نام ایمان رکھوں گا اور اگر بیٹی پیدا ہوئی تو اس کا نام امید رکھوں گا۔ یہ ایمان اور امید ہی میرے حوصلے اور میری راہوں کی تاریکیوں کو دور کرنے کا سبب بنے ہیں۔ تمہارا وجود میری کرن ہے۔ تمہارے کردار کی پاکیزگی میری روشنی ہے۔ میرے جذبات کی صحیح راہ متعین کرنے کا سبب بنی ہو تم۔ اگر اللہ نے میرا امید ایمان کی روشنی سے بھر دیا تھا تو بہت حد تک یہ روشنی تم سے مستعار لی ہے میں نے۔ تمہاری باتیں، تمہارا حوصلہ اور کردار کی پختگی دیکھ کر میں دنگ رہ گیا ہوں۔ کیا کچھ نہیں کیا میں نے تمہارے ساتھ اور تم کسی موڑ پر نہیں ڈگمگائیں۔ میں نے جو زیادتی کی ہے ہر بار وہ ... لڑکی پروا نہیں کی تو صرف اس لیے کہ میں واقعی تمہیں کھونا نہیں چاہتا تھا کسی بھی قیمت پر نہیں اور تم تھیں کہ رائنل تمہیں میرے جذبات کو سمجھنے کے بجائے میری زبان کے اقرار کو ضد "مان" کر مجھے ہمیشہ غلط سمجھتی رہی تھیں۔ تم ایمان کی دیوی تھیں، میرا ایمان، میرا فخر اور میرا یقین، سب کچھ تھیں۔

رائنل! جب سے میں یہاں آیا ہوں بہت کچھ تم سے چھپائے رکھا ہوں مقصد صرف یہی تھا کہ تم ہر طرح کی ٹینشن سے دور رہو۔ اسلام آباد میں تو پھر کچھ امن ہوتی ہے، پاکستان کا دارالحکومت ہونے کی بنا پر تھوڑا بہت سکون قائم ہے یہاں میں مگر جب سے یہاں آیا ہوں حیران ہوں۔ تیمور ثقلین اور اکرام رحمٰن جو اس وطن کے ناسور ہیں، جن کے ارادے بہت گھٹیا ہیں، وہ تو کچھ بھی نہیں، یہاں ان سے بڑے ناسور چھپے ہوئے ہیں۔ ان سے بڑے غدار اور شر پسند موجود ہیں یہاں۔ اب مجھے لگتا ہے کہ میرا مقصد تو ابھی شروع ہوا ہے۔ پیچھے جو کچھ کر کے آیا ہوں وہ تو کچھ بھی نہیں۔ میں کس کس کو ختم کروں گا۔ یہاں تو ہر طرف ان دیکھے ہاتھ وطن کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اس کی سلامتی کے درپے ہیں۔ تخریب کاروں کی کارروائیاں دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہیں، غیر ملکی عناصر اپنا نیٹ ورک اس قدر وسیع پیمانے پر پھیلائے ہوئے ہیں کہ جہاں بھی پاؤں رکھتے ہیں، بم باری ہونے لگتی ہے۔

رائنل میری جان! ایسا اسلامی ملک ہے، جہاں کسی کو بھی امان حاصل نہیں۔ ہر کوئی جل رہا ہے، تڑپ رہا ہے، مر رہا ہے۔ کوئی پوچھنے والا نہیں، کوئی دیکھنے والا نہیں، اس قوم پر اتنا بڑا زمینی قہر زلزلے کی صورت میں نازل ہوا ہے پھر بھی عبرت حاصل نہیں ہوئی۔ میں تو تیمور ثقلین اور اکرام رحمٰن وغیرہ سے گریزاں تھا، خار کھاتا تھا، یہاں تو ہر شخص کے چہرے پر نقاب ہے۔ ہر شخص کے ہاتھ میں خنجر ہے۔ میں کس کس کو بے نقاب کروں سمجھ میں نہیں آتا۔ جان باری! کیا کہوں کیا بتاؤں؟ جب یہاں آیا تو سب سے پہلا کیس جو ہاتھ لگا وہ ان چند غیر ملکیوں کا تھا جو مشکوک سرگرمیاں کرتے ہاتھ لگے تھے۔ پوچھ گچھ کی تو حقیقت کھلی کہ وہ لوگ یہاں سے کچھ اہم راز اور ویڈیو کیسٹس حاصل کرنے آئے ہیں۔ جب سے آیا ہوں اسی کیس کو سلجھانے پر لگا ہوں۔ انتہائی افسوس سے لکھ رہا ہوں اس وطن کو دشمنوں کے ہاتھوں فروخت کرنے والے ہمارے افسران ہیں جن کے ہاتھوں میں اس وقت ہمارے ملک کی باگ ڈور ہے۔

رائنل! اس وقت بھی میں ایک اہم ریڈ پر جا رہا ہوں، اس سے پہلے کہ وہ اہم راز غیر ملکیوں کے ہاتھ لگیں میں انہیں وطن دشمنوں کے ہاتھوں سے چھین لینا چاہتا ہوں جن پر وطن کی بقا اور سلامتی کا انحصار ہے۔ میں نہیں جانتا واپس لوٹتا ہوں یا نہیں۔ تیاری تو اپنی طرف سے خاصی مکمل ہے مگر مجھے اتنا یقین ہے کہ اب میرا ایمان کبھی کمزور نہیں ہوگا۔ تم میری روشنی ہو۔ وطن کی محبت میری

آکسیجن ہے۔ میرا بیٹا میرا ایمان بن کر میرے چار سو ہے۔ اللہ نے چاہا اگر کامیاب و سرخرو لوٹا تو وعدہ ہے اپنے بیٹے امید کو بھی لا کے بندوبست کروں گا۔ بس کچھ انتظار کرلو ۔ اس سے پہلے اس وطن کے حالات سنوارنا چاہتا ہوں۔ یہ ناسور وطن کے ان کھوکھلا کرنے والوں کی جماعت ہے جو بظاہر وطن پرست ہیں مگر باطن شیطان کو بھی پیچھے چھوڑتے ہیں۔ انتہائی گھٹیا اور فرعون فطرت لوگ ہیں۔ ان کو ختم کرنا میرا مقصد ہے۔

رانیل! ایک خاص ہدایت ہے، اگر زندہ رہا تو ٹھیک ورنہ میرے بیٹے کے اندر میرے وطن سے محبت کا جذبہ ضرور پیدا کرنا۔ اسے ضرور بتانا کہ یہ وطن کتنی قربانیوں کے بعد حاصل ہوا تھا۔ اس کی بنیادوں میں کتنے لوگوں نے اپنا لہو ڈالا ہوا تھا، اسے یہ سبق ضرور دینا کہ "یہ جان تو آنی جانی ہے اس جاں کی کوئی بات نہیں" جب مرنا طے ہے تو کیا فرق پڑتا ہے کہ اگر ایمان کی حالت میں وطن کی راہ میں خون بہے

میرے بعد کبھی حوصلہ نہ ہارنا۔ تمہارا عزم میری ذات سے ہے، ہو۔ وہ امین ہو، وہ امید ہو جو اللہ کی طرف سے بیٹے میں پھوٹی ہے۔ کبھی ہمت نہ ہارنا، تھوڑی دیر پہلے تم رو رہی تھیں اور تمہارے آنسو میرے دل پر گر رہے تھے۔ تم تو بہت مضبوط ہو، پھر یہ رونا کیوں؟ بہت کم عمری میں، میں نے تمہارے اندر وہ جوہر دیکھے ہیں جو بڑے بڑوں میں نہیں ہوتے۔ تم سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ ایسی ہی تربیت میرے بیٹے کی بھی کرنا۔ تمہارا نام کچھ نام کے علاوہ کسی اور سے برداشت کرنا میرے اختیار میں نہیں تھا مگر میرے بعد تم آزاد ہو، زندگی کے لئے کوئی بھی فیصلہ کر لینا۔ یہ زندگی بہت بڑی ہے اور وقت و حالات کا کچھ پتہ نہیں۔ میرے بیٹے کو میری طرف سے بھرپور پیار کرنا۔ گر لوٹ آ گیا تو ٹھیک ... رانیل! اگر تم تک یہ خبر پہنچے کہ میں وطن کے کام آ گیا ہوں تو حوصلہ نہ کھونا، تمہارے آنسو بہت تکلیف دیتے ہیں۔ کس کو پتہ ہے نہ جانے کتنی سہاگنوں کے شوہر وطن کے کام آ جاتے ہیں۔ ایسے لوگ جن کے نام تک نہیں پتہ۔ نہ جانے کتنی لاشیں روز بے گور و کفن قبر میں اترتی ہیں کون جانتا ہے

رانیل! اگر یہ ویسا کچھ ہو گیا تو میں نے ارقم کو تاکید کر دی ہے۔ وہ تم تک وہ تمام راز اور ویڈیو کیسٹس پہنچا دے گا۔ اب مجھے کسی پر بھروسہ نہیں رہا کہ کس کے حوالے یہ امانت کروں۔ کوئی قابل بھروسہ دکھائی نہیں دیتا اور ارقم تنہا یہ ذمہ داری نہیں نبھا پائے گا سو تمہیں حوصلہ کرنا ہوگا یا پھر میرے بیٹے کے بڑے ہونے کا انتظار کرنا۔ میرے پاس اس کو وراثت میں دینے کو کچھ نہیں سوائے نیک جذبات اور اس تحفے کے، اس امانت کے۔ تم اس امانت کی حفاظت کرنا، اگر کوشش کرو تو خود میدان میں اترنا۔ تم کم حوصلہ نہیں، بہت کچھ کر سکتی ہو۔ بس میں منتظر تھا تمہارے فارغ ہونے کا۔ اگر زندہ رہا تو دونوں مل کر اس وطن کو غلط ہاتھوں کے شر سے بچائیں گے۔ اب مزید وقت نہیں ہے میرے پاس۔ وقت بہت کم ہے اور بہت سے امور سرانجام دینے ہیں۔ اجازت دینا۔ کچھ کہا سنا معاف کرنا۔ میں نے تمہیں بہت ستایا تھا، صرف تمہارے حوصلے کو آزما رہا تھا۔ جب میں نہ رہا تو یاد کرو گی۔ کاش تم محبت بھرا اقرار پہلے کر دیتیں تو نہ جانے کیا کرتا۔ ہاں اگر لوٹا تو ضرور پوچھوں گا، اتنی دیر کیوں کی اقرار محبت کرنے میں، جب ہر طرف میں ہی میں تھا تو پھر کیوں جھجکتی رہیں مجھ سے۔ امی ابو کے لئے اس لفافے میں علیحدہ خط ہیں انہیں دے دینا۔

زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔ اللہ نگہبان

والسلام

تمہارا۔ عبدالباری"

ضبط کے سارے بندھن ریزہ ریزہ ہو گئے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر پوری شدت سے رونے لگی۔ بلک بلک کر سسکنے لگی۔ وہ پاس تھا تو کبھی خاطر میں نہ لاتی تھی اور اب اس دیس جا بسا تھا کہ جہاں کبھی کوئی لوٹ کر نہیں آتا تو دل بار بار اس کے لوٹ آنے کی دعائیں کر رہا تھا۔

"کہا تھا ... بند کرو اپنا یہ ناٹک ... ابھی زندہ ہوں جب مر جاؤں تو تب جتنا چاہے رو لینا! ابھی تمہارا ہنسنا اور رونا صرف اور صرف میری مرضی سے ہوا کرے گا ... رانیل بیگم ... سمجھیں تم" تب وہ سمجھ نہیں سکی تھی اور اب جب وہ نہیں تھا تو صرف رونا ہی آ رہا تھا۔ دل تڑپ رہا تھا، کسی بھی پل سکون نہ تھا۔

"تم پر بلیک کلر بہت سوٹ کرتا ہے۔ وہ پہن رکھنا ... جب واپس لوٹوں تو تمہیں اسی کلر میں دیکھوں۔" کیسی انوکھی فرمائش کی تھی۔ وہ کٹ سی گئی۔ اب ایسی فرمائش کرنے والا کبھی کوئی فرمائش نہیں کرے گا جب کہ وہ ابھی بھی اس کی خواہش کے احترام میں ویسا لباس پہنے ہوئے تھی۔ ابھی تک یہی گمان تھا کہ شاید سب غلط ہو۔ ابھی پلٹ کر دیکھے گی تو وہ کمرے میں ہوگا۔ کچھ پوچھے گی تو جواب دینے لگے گا۔ اتنا سیدھا بولنے لگا اور جب رونے لگے گی تو ٹوٹ کر بکھرے گا۔ اس کا بے جان چھلنی چھلنی وجود دیکھ کر بھی یقین نہیں آیا تھا مگر اب ... اس کا خط اس کو یقین دلانے لگا تھا اس کی موت کا۔

"تم تو بہت مضبوط ہو ... پھر یہ رونا کیوں؟ بہت کم عمری میں، میں نے تمہارے اندر وہ جوہر دیکھے ہیں جو بڑے بڑوں میں نہیں ہوتے۔" وہ پھر اندر کے اندر اس کے کان میں سرگوشی کر رہا تھا۔

"رانیل! اگر تم تک یہ خبر پہنچے کہ میں وطن کے کام آ گیا ہوں تو حوصلہ رکھنا، تمہارے آنسو مجھے بہت تکلیف دیتے ہیں۔ یہ سوچنا کہ نہ جانے کتنی سہاگنوں کے شوہر وطن کے کام آ جاتے ہیں ... ایسے لوگ جن کے نام تک نہیں پتا۔ کتنی لاشیں روز بے گور ... قبر میں اترتی ہیں کون جانے"

عبدالباری کے لفظوں نے اس کے کندھے پر اپنا ... وہ چونک گئی۔ بے اختیار اپنے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ... اس کے ہاتھ پہلو میں گر گئے۔

"... نہیں تھا مگر وہ ایک کرن، ایک امید چھوڑ گیا تھا۔ ایمان کی صورت ... کی صورت

"رانیل! تمہیں حوصلہ کرنا ہوگا ... یا پھر میرے بیٹے کے بڑے ہونے کا انتظار کرنا۔ میرے پاس اسے وراثت میں دینے کو کچھ نہیں سوائے نیک جذبات اور اس تحفے کے، اس امانت کے۔ تم اس امانت کی حفاظت کرنا، اگر کوشش کرو تو خود میدان میں اترنا۔ تم کم حوصلہ نہیں ... بہت کچھ کر سکتی ہو" عبدالباری اس کے کان میں پھر سرگوشی کر رہا تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"میں منتظر تھا تمہارے فارغ ہونے کا، اگر زندہ رہا تو دونوں مل کر اس وطن کو غلط ہاتھوں کے شر سے بچائیں گے۔" اس کے خیالات کتنے انوکھے تھے۔

"ہاں میں تمہارا ساتھ دوں گی ... تمہارے مقصد کو آگے پہنچاؤں گی ... ان لوگوں کو کیفر کردار تک پہنچاؤں گی جنہوں نے تمہیں ہمیشہ کے لئے مجھ سے چھین لیا ہے۔ میرے ایمان کے سر سے باپ کا سایہ چھین لیا ہے۔"

وہ ایک عزم لے کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے مگر پہلے جیسی شکستگی نہ تھی۔ بیڈ سے تصویر اٹھا کر سینے سے لگا لی۔

"تم تو میرا سایہ تھے۔ تم تو خود میری روشنی تھے۔ تم اتنے اچھے تھے علم نہ تھا ... تم تو خدا کی طرف سے میرے لئے ایک تحفہ تھے۔ جب حقیقت جان گئی تو اس ساتھ پر ہمیشہ شکر کیا تھا۔ گناہ گار تم نہیں میں ہوں ... جو تمہاری قدر نہ کر سکی ... اگر علم ہوتا کہ تم اتنی تھوڑی زندگی لکھوا کر لائے ہو تو خدا کی قسم ہمیشہ اپنے بدن کی چھاؤں کئے رکھتی۔ کبھی تمہارا دل نہ دکھاتی ... کبھی تمہارے بڑھے ہاتھوں کو نہ جھٹکتی، کبھی انکار نہ کرتی" وہ اب اسے صرف یاد کر سکتی تھی۔

"وقت مرگ نہ جانے کتنا تڑپے ہو گے ... ظالموں نے کس طرح سارا وجود چھلنی کر دیا تھا ... کاش میں ساتھ ہوتی کچھ تو تدبیر کرتی ... اپنے بدن کا سایہ کر لیتی ... کم از کم کوئی قطرہ پانی حلق میں انڈیلتی، کتنی تکلیف ہوئی ہوگی تمہیں جب سارا بدن چھلنی ہو گیا ہوگا ... کتنے خوب صورت خواب تھے تمہارے شہادت یا فتح ... اور تم نے اپنا مقصد پا لیا ..." وہ رو رہی تھی تصویر کو سینے سے

تھا ... جب ننھے نیمان کے رونے کی آواز پر چونکی تھی۔

"تم تو مجھے جینے کا ساماں دے گئے ہو ہمارے رشتے کی واحد نشانی، ہمارا ایمان۔ میں وعدہ کرتی ہوں تم سے کہ میں تمہارا مقصد پورا کروں گی۔ وہ لوگ جو وطن کو دیمک کی طرح چاٹ رہے ہیں انہیں ختم کرنا ہے۔ تم مجھے جینے کا اک مقصد دے گئے ہو۔ تمہارا ساتھ تھا تو سب کچھ تھا تم نہیں ہو تو سب کچھ یہ وطن ہے۔ اور اللہ سے دعا کرتی ہوں کہ اپنے بیٹے کو صحیح معنوں میں ایمان بناؤں۔ اس قابل بناؤں کہ یہ تمہارے سب ارادوں کی عملی تعبیر بن جائے۔ تمہارے مقصد کی تکمیل کرے۔ یہ وطن کے ان ناسوروں کو نیست و نابود کرے جن کو ختم کرنے کی خواہش لیے تم قبر میں جا اترے۔"

اس نے ننھے نیمان کو اٹھا لیا تھا۔ جھلملاتی آنکھوں سے عبدالباری کی تصویر کو دیکھا تھا۔ عبدالباری کے ہونٹوں پر ایک بھرپور مسکراہٹ تھی۔

اے ارض پاک کے جاں باز سپاہی تمہیں ہمارا سلام
اے ملک و قوم کے جاں نثار غازی تمہیں وطن کی مٹی کا سلام!
اے دل کے مکیں! تمہیں وطن عزیز کے نظارے جادو دریا کی نکھری
فضاؤں کی گنگناہٹوں کا سلام!
اے شہید وطن پاکستان تمہیں ...
"جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے اس جاں کی کوئی بات نہیں"

وہ عبدالباری کی آواز کا ساتھ دیتے ... ساری زندگی اس کے چھوڑے ہوئے مقصد کو نبھانا تھا۔ زندگی کچھ پرسکون سی لگنے لگی تھی۔

ختم

کسی پتھر کی مورت

یا رب! غم ہجراں میں اتنا تو کیا ہوتا
جو ہاتھ جگر پر ہے وہ دست دعا ہوتا
اُمید تو بندھ جاتی، تسکین تو ہو جاتی
وعدہ نہ وفا کرتے، وعدہ تو کیا ہوتا

میں ابھی تک ہتھوڑوں کی بارش محسوس کر رہا تھا۔ مجھے اپنا آپ ادھورا ادھورا معلق ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا گویا کوئی انہونی ہو گئی، میری دنیا میں کوئی طوفان آ گیا ہو اور واقعی کوئی طوفان آ گیا تھا۔ مجھ پر سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔

"یہ کیا کر دیا میں نے ... میں کس قدر ظالم باپ تھا۔ کسی کی دولت کے حصول میں مقید اپنے ہی نقصان کا شدید سبب بنتا چلا گیا اور مجھے علم ہی نہ ہو سکا۔ وہ لڑکی جسے میں نے ہمیشہ نفرت کی نظر سے دیکھا، اس کے وجود پر لاتعلقی کے کوڑے برسائے، وہ آج میری روح، میری زندگی کی واحد خوشی، میری زندگی کا سبب بن جائے گی۔ اس قدر شدید محبت کرتا ہوں اسے اور ہمیشہ بے خبر رہا۔ تین دن سے وہ اسپتال میں تھی اور میں تین دن سے ضمیر کی سخت گرفت میں تھا۔ مجھے ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے وہ ابھی بھی میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر رہی ہو۔ وہی بیٹی جس نے آج تک میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہیں کی تھی۔ جس کی زبان سے میرے رویے پر احتجاج کا ایک لفظ تک نہیں نکلا تھا، وہ تین دن پہلے میرے سامنے کھڑی میری یک ایک لغزش مجھے بتاتی ہوئی، مجھے آئینہ دکھا رہی تھی۔ میں تین دن سے اسپتال میں تھا۔ رات کو سلامہ شاہ نے مجھے زبردستی گھر بھیج دیا تھا کہ میں آرام کر سکوں مگر اب آرام کہاں؟ رات بھر اپنی کمپنیوں کو ملنے والے اپنے شدید نقصان کا تعین کرنے میں مصروف تھا۔ کہاں کہاں میں غلط تھا۔ مجھے اپنی ساری زندگی سے ہی شرم آ رہی تھی۔

"پاپا! آئی ہیٹ یو۔ آئی ہیٹ یو......" سورا کے الفاظ ایک دفعہ پھر میرے ذہن میں گردش کرنے لگے تھے۔ میں ایک دم بستر سے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ بیڈ کی سائیڈ دراز کے اوپر میری اور سارا کی شادی کی تصویر رکھی ہوئی تھی۔ جسے میں نے کبھی اپنی زندگی سے جدا نہیں کیا تھا۔ میں نے وہ تصویر اٹھا لی۔

تصویر میں موجود سارا آج بھی اپنے ملکوتی حسن سمیت لاثانی تھی۔ وہ ہمیشہ اپنے بھرپور حسن سمیت میرے دل پر بجلیاں گراتی رہی تھی اور یہی خود فراموشی آج میری اس اذیت کا سبب بنی ہوئی تھی۔ میں واقعی جنونی تھا۔ سارہ کی وفات کے تیس، چوبیس سال بعد بھی میں نے اسے زندہ رکھا ہوا تھا۔ اپنی یادوں میں، اپنے خیالوں میں، اپنی سوچوں میں اپنی ساری زندگی میں۔ وہ کبھی مجھ سے جدا نہیں ہوئی تھی۔ ایک عرصہ پہلے میں نے اپنے ہاتھوں سے سارہ کے وجود کو لحد میں اتارا تھا مگر تیس، چوبیس سال تک میں نے خود کو اس کی موت کا یقین ہو جانے کے باوجود دھوکے میں مبتلا کر رکھا تھا کہ وہ ابھی بھی زندہ ہے۔ محبت کبھی بھی نہیں مرتی۔ ہاں واقعی

میں بہت جنونی تھا اور ماضی نے تو مادرا مجھ سے چھین لی تھی۔

"بہت جنونی ہیں پاپا آپ!...... آپ نے صرف ایک محبت کی اور کیا کیا آپ نے ساری زندگی۔ ماضی پر ماتم کرتے گزار دی' یہ تک نہ خیال آیا کہ میں کون ہوں' کیا رشتہ ہے میرا آپ سے۔" پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے اس نے کہا اور میں دل سے وہ جس طرح چپ چاپ اسپتال کے بستر پر پڑی تھی مجھے ہر آن ہر لمحہ طوفانوں کی زد میں دھکیلتی جا رہی تھی اور اب سارہ کی تصویر کو دیکھتے' اس کے الفاظ یاد کر کے کوئی میرا دل مٹھی میں بھینچ رہا تھا۔

"مادرا! میری زندگی' سچ کہا تم نے میں واقعی بہت جنونی ہوں۔ ماضی میں جینے والا۔" اپنے آپ سے اعتراف کرتے ہوئے میں نے وہ تصویر واپس رکھ دی اور خود کو ماضی کی بھول بھلیوں میں گم ہونے سے نہ روک پایا۔

* * *

سارہ رحمان میری کلاس فیلو تھی۔ وہ بہت حسین اور پورے ڈیپارٹمنٹ کی جان تھی۔ ہم دونوں ایم بی اے کے ڈیپارٹمنٹ سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ شہر کے ایک بڑے بزنس مین کی بیٹی تھی۔ تھا تو حیثیت میں بھی کچھ کم نہیں۔ میرا تعلق بھی ایک کھاتے پیتے فیوڈل گھرانے سے تھا۔ اپنے والدین سے ناراض ہو کر میں نے ان سے تعلق ختم کر لیا تھا۔ مجھے اپنے باپ کی وراثت میں ایکڑوں کے حساب سے ملنے والی جائیداد سے کوئی غرض نہ تھی۔ مجھے پڑھ کر کام کرنے کا جنون تھا جو میرے باپ کو ناپسند تھا۔ انہیں میری ذات کے ہر کام میں مداخلت کرنے کی عادت تھی' بچپن ہی سے میں نے اپنی مرضی کرنا شروع کر دی تھی۔ انہیں ہر ایک کو اپنے زیر اثر رکھنے کا خبط تھا اور میں ان کے زیر اثر رہنے پر قطعی تیار نہ تھا۔ بابا جان کا خیال تھا کہ میں سیاست کی لائن میں آؤں اور مجھے اس سے کوئی غرض نہ تھی۔ میری وجہ سے ان کی حیثیت مجروح ہوتی تھی جب کہ میں نے ان کے سب ارادوں پر پانی پھیرتے ہوئے بزنس لائن جوائن کی تھی۔ میرے اور بابا جان کے ہمیشہ نظریاتی اختلافات رہے تھے۔ میں بے حس تم سے اکتایا برگشتہ فطرت کا مالک انسان تھا۔ ایسے میں سارہ سے ملاقات ہوئی تو اسے دیکھا۔ پھر تو احساسات کا محور بدل گیا تھا۔ پہلی نظر کی محبت کیا ہوتی ہے' مجھ پر آشکار ہوئی تھی۔ ایم بی اے کا پورا عرصہ میں نے سارہ سے دوستی رکھی اور اپنے سب جذبات کو دل میں سنبھالے رکھا۔ پھر جیسے ہی میں نے تعلیم کو خیرباد کہا تو بی بی جان سے سارہ کے متعلق بات کی اور انہوں نے بابا جان سے۔ ہمارے خاندان میں کبھی شادیاں نہیں کی جاتی تھیں۔ میری خواہش جان کر بابا جان بہت برگشتہ ہوئے۔ بی بی جان نے ہر طرح سے مجھے سمجھانے کی کوشش کی مگر میں اپنے جذبوں پر بند نہ باندھ سکا۔ بابا جان کسی بھی طور پر میری شادی اپنی مرضی کے بغیر کسی غیر خاندان میں کرنے پر راضی نہ تھے اور میں بھی اپنے ارادوں میں اٹل اور ضد کا پکا انسان تھا۔ نجانے کیوں بابا جان سے نظریاتی اختلافات رکھتے' ان کے ہر فیصلے سے انکار کرنے کی ضدی خاصیت میرے اندر اپنی جڑیں مضبوط کرتی جا رہی تھی۔ بابا جان' سبحان بھائی' دونوں بہنیں بھاوج' بی بی جان سب نے سمجھانے کی کوشش کی مگر میں راضی نہ ہوا اور پھر بابا جان نے غصے میں آ کر مجھے ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل جانے کو کہا اور میں بھی اپنا مختصر سا سامان لے کر ان سے قطع تعلق کر آیا۔

حویلی سے نکلتے ہوئے میں بالکل خالی تھا لیکن ایک عزم میرے ساتھ تھا اور شاید قسمت بھی مجھ پر مہربان تھی کہ مجھے ایک بہت اچھی کمپنی میں اعلیٰ درجے کی ایک ملازمت مل گئی۔ گاڑی' گھر وغیرہ کی بھی سہولت تھی پھر میں نے سارہ کے حصول کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔

پہلے پہل جب سارہ کو یہ علم ہوا کہ میں اسے ایک عرصے سے چاہنے کی جسارت کرتا آیا ہوں تو وہ بہت حیران ہوئی مگر پھر آہستہ آہستہ میرے بار بار اس کی راہ میں آنے پر وہ بھی میری محبت میں مبتلا ہوتی چلی گئی۔ شاید سارہ کے والدین مجھ جیسے تنہا شخص سے اپنی چہیتی بیٹی کی شادی کرنے پر کبھی راضی نہ ہوتے اگر میری خاطر وہ اپنے والدین کے سامنے نہ کھڑی ہوتی۔ رو دھو کر ضد کر کے آخر

کار اس نے اپنے والدین کو راضی کر ہی لیا اور پھر ہماری شادی ہو گئی۔

سارہ کا میری زندگی میں آنا بہت خوش آئند ثابت ہوا۔ جن حالات میں وہ میری زندگی میں آئی تھی' میں مالی مسائل میں الجھا ہوا تھا لیکن اس نے ہر حال میں میرا ساتھ دیا' کبھی بھی میری کم مائیگی پر مجھے طعنہ نہیں دیا۔ وہ عیش و عشرت میں پلی بڑھی لڑکی تھی لیکن میری زندگی میں آتے ہی وہ اپنی گزشتہ زندگی کو اپنے والدین کے ہی گھر بھول آئی تھی۔ شادی کے بعد میں نے اپنے ایک دوست کے ساتھ بینک سے لون لے کر شراکت داری کی بنیاد پر چھوٹا سا بزنس شروع کر دیا۔ ذرا اسٹیبل ہوا تو سارہ کے ہمراہ دوبارہ حویلی گیا' میرا خیال تھا کہ اب بابا جان شاید اپنی ضد کو بھول کر مجھے اپنا لیں مگر یہ میری خام خیالی ہی ثابت ہوئی اور بابا جان نے ہم دونوں کو بہت بے عزت کر کے حویلی سے نکال دیا اور پھر اس کے بعد میرے دل میں دوبارہ حویلی والوں سے ملنے کی کوئی حسرت نہ جاگی۔

سارہ سے شادی کے تین سال بعد اللہ تعالیٰ نے ہم پر کرم کیا۔ سارہ ماں بننے والی تھی۔ جہاں میں بے انتہا خوش تھا وہیں سارہ کی خوشی دیکھنے کے لائق تھی۔ سارہ کے والدین جو وقتی طور پر ہم دونوں سے بدظن تھے یہ خوشخبری سن کر وہ سارہ کو اپنے پاس لے گئے۔ میں بھی اکثر وہاں چلا جاتا۔ جوں جوں سارہ کی ڈلیوری کے دن قریب آتے جا رہے تھے میری بے چینی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ڈاکٹر نے سارہ کے کیس کو نارمل قرار نہیں دیا تھا۔ ان ہی دنوں مجھے اپنے کام کے سلسلے میں ترکی کے وزٹ پر جانا پڑ گیا۔ میں جانے پر راضی نہیں تھا لیکن سارہ نے اصرار کر کے بھیج دیا۔ بقول اس کے کہ میں اس کی خاطر اپنی ترقی کے اتنے اہم موقعے کو مت گنواؤں اور میں چلا گیا۔ ابھی مجھے وہاں پہنچے چار دن ہی گزرے تھے کہ پاکستان سے میرے لیے خبر آئی کہ سارہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ ڈلیوری کے دوران اس کی ڈیتھ ہو گئی تھی۔ یہ خبر میرے لیے ایک زبردست ذہنی جھٹکا ثابت ہوئی۔ نجانے میں کیسے پاکستان پہنچا۔ سارہ نے ایک بیٹی کو جنم دیا تھا۔ مجھے اپنی نومولود بچی سے بے انتہا نفرت ہوئی جس کی آمد نے مجھ سے میری عزیز از جان بیوی کو چھین لیا۔ میں نے اس کے بعد بھی اپنی بیٹی کو دیکھنے کی خواہش نہ کی۔ اس کی نانی ہی اسے سنبھال رہی تھیں۔ سارہ کی وفات کے کئی ہفتے بعد بھی میری ذہنی حالت سنبھل نہ پائی۔ اپنے خاندان والوں سے میں بالکل کٹا ہوا تھا ایسے حالات میں کوئی بھی مجھے ذہنی سپورٹ دینے والا نہ تھا۔ میری توجہ بزنس سے ختم ہو کر رہ گئی تھی بلکہ زندگی سے بھی ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ میری مسلسل عدم دلچسپی کا نتیجہ تھا کہ میرا بزنس ختم ہو کر رہ گیا۔ اب اس جگہ رہنے کو میرا دل نہیں چاہتا تھا۔ سب کچھ چھوڑ کر میں واپس گاؤں پہنچا۔ بی بی جان مجھے یوں تباہ دیکھ کر بہت آزردہ ہوئیں۔ بابا جان اور سبحان بھائی البتہ خاموش ہی تھے۔ کچھ وقت گزرا تو بی بی جان مجھ پر دوبارہ شادی کے لیے زور ڈالنے لگیں لیکن سارہ کے بعد کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ حقیقتاً میں نے سارہ کے بعد کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ حقیقتاً میں نے سارہ کو اپنے تصور میں مرنے ہی نہیں دیا تھا وہ مر کر بھی میرے اندر سے نہ نکل سکی تھی۔ ایسے میں کسی دوسرے وجود کو اپنی زندگی میں کیسے شامل کر لیتا۔ یہ میرے بس میں نہیں تھا۔ جب اماں بی کے ساتھ بھاوج اور بابا کا بھی دباؤ بڑھنے لگا تو میں پھر سب تعلق ختم کر کے وہاں سے نکل آیا۔ مادرا اپنی نانی کے پاس تھی۔ انہوں نے ہی اس کا نام مادرا رکھا تھا۔ میری عدم دلچسپی دیکھتے ہوئے انہوں نے اسے پاس ہی رکھنے کا فیصلہ کیا تھا جس سے میں بھی مطمئن ہو گیا تھا۔ اب پاکستان میں رہنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ بچا کھچا سب کچھ سمیٹ کر میں لندن آ بسا اور پھر یہاں جاب کر لی۔ پتا نہیں کتنا عرصہ گزر رہا تھا۔ مجھے کبھی مادرا کے وجود کا خیال نہیں آیا۔ ہاں البتہ مادرا کے ننھیال والے اکثر رابطہ کر کے اس کی خیریت سے آگاہ کرتے رہتے تھے۔ اس سے زیادہ مجھے مادرا سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ایک نفرت سی میرے دل میں اس کے لیے تھی۔ رفتہ رفتہ دس سال گزر گئے اور ایک دن مادرا کی نانی کا فون آیا۔

* * *

"میں بہت بیمار ہوں۔ زندگی کا کچھ نہیں کہہ سکتی...... مادرا کو میں سارہ کی نشانی سمجھ کر سینے سے لگا کر پالتی آ رہی تھی مگر اب یہاں کے حالات پہلے جیسے نہیں رہے۔ مجھے علم نہیں کہ سارہ کے بھائی بھی مادرا کو بہن کی نشانی سمجھ کر وہی محبت و پیار دیں گے جو میری

موجودگی میں دیتے ہیں۔ وہ تمہاری امانت ہے بیٹا۔ اپنی بچی کے بارے میں سوچو۔ وہ اب بڑی ہو رہی ہے۔ تمہاری مسلسل غیر حاضری کے متعلق سوال کرنے لگی ہے۔ میں اسے مسلسل کسی نہ کسی طرح بہلا رہی ہوں مگر اب بچی کو تمہاری ضرورت ہے۔ جو تحفظ تم اسے دے سکتے ہو وہ میں یا کوئی اور نہیں دے سکتا۔ اس لیے بیٹا اپنی بچی کے بارے میں سوچو۔"

پھر مجھے واپس آنا پڑا۔ ماورا کے لیے میرے دل میں قطعی کوئی گنجائش نہ تھی۔ بس ولدیت کے خانے میں میرا نام ہونا ہی وہ رشتہ تھا جو اسے میری بیٹی بناتا تھا۔ اسے لے کر میں حویلی چلا آیا۔ دس سال بعد میں دوبارہ وہاں آیا تھا۔ وہاں کا ماحول ویسا ہی تھا۔ بابا جان کا رویہ ہنوز وہی تھا۔ پہلے انہوں نے سارہ کو بہو ماننے سے انکار کیا تھا اب میری بیٹی کو اس خاندان کا خون ماننے سے انکاری ہو گئے تھے اور تب پہلی بار میرے دل میں یہ احساس جاگا کہ وہ میری بیٹی ہے۔ میرا خیال تھا کہ اسے میں حویلی چھوڑ کر واپس لندن چلا جاؤں گا لیکن بابا جان کے خود پسند رویے نے میرے اندر اشتعال بڑھا دیا۔ انہیں یہ گوارا نہیں تھا کہ ان کے اعلیٰ حسب نسب والے خون میں غیر خون کی آمیزش ہو۔ مجھ سے تو وہ متنفر تھے ہی، ماورا کو بھی میری بیٹی ماننے سے انکاری ہو گئے۔ میرے نزدیک بابا جان کا یوں ماورا کو میری بیٹی ماننے سے انکار کرنا کھلم کھلا میری توہین تھی اور یہ توہین میری مردانگی کو گوارا نہ تھی۔ میں ماورا کو لے کر لندن آ بسا۔

وقت گزرتا چلا گیا اور میں اپنی ذات کے حصار میں بند ہوتا چلا گیا۔ اپنی خود ساختہ نفرت میں غرق یہ جان ہی نہ سکا کہ میں کیا کیا غلطیاں کرتا چلا جا رہا ہوں۔ اب بھی میرے شب و روز سارہ کی یاد میں گزرتے تھے۔ اس کی ذات سے ہٹ کر میں نے دوبارہ زندگی میں کسی اور طرف دیکھا ہی نہ تھا۔ حتیٰ کہ ماورا کو بھی میں یہاں لا کر بھول گیا تھا۔ اس کے لیے میں نے ایک مسلمان گورنس کا بندوبست کر دیا تھا۔ کہنے کو میں اس کی سب ضروریات پوری کرتا تھا۔ بہتر اداروں میں اسے تعلیم دلوا رہا تھا مگر میری نفرت جوں کی توں تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میرے اندر پلنے والے احساسات کا مالک رہبان غفار شاہ حریہ سرد گلیشیر میں بدلتا چلا گیا۔

حویلی والوں میں سے سبحان بھائی کے بڑے صاحبزادے سلامہ شاہ نے مجھ سے رابطہ رکھا تھا۔ بس وہی ایک شخص تھا جو صحیح معنوں میں میرا حوصلہ بنتا تھا۔ کتنے سالوں بعد ایک دن بالکل اچانک وہ مجھ سے ملنے میرے اپارٹمنٹ پر چلا آیا۔ اسے دیکھ کر جیسے نئے سرے سے جی اٹھا۔ اسی دن مجھے دفتری کام کے سلسلے میں کسی دوسرے شہر میں جانا تھا۔ اسے اپنے گھر میں ٹھہرنے کا کہہ کر میں چلا گیا دو دن کا کام تھا مگر چند گھنٹے بعد ہی سلامہ شاہ نے موبائل پر اطلاع دی کہ ماورا کا نروس بریک ڈاؤن ہوا ہے وہ اسپتال میں ہے۔ حیرت کی بات تھی تب بھی میرے احساسات سرد ہی رہے تھے۔ میں آرام سے اپنا کام مکمل کر کے اگلے دن گھر پہنچا۔ ماورا اسپتال میں ہی تھی۔ سارا دن آرام کر کے میں شام کو ہسپتال گیا۔ سلامہ بے چارہ میری محبت و مروت میں وہیں تھا۔ میرے کہنے پر وہ چلا گیا۔ اس کے بعد بھی وہ اکثر ملتا رہتا۔ میرے اصرار پر وہ میرے ساتھ ہی رہنے لگا۔ پھر جیسے ہی اس کا کام ختم ہوا وہ چلا گیا۔ جاتے ہوئے وہ مجھے کہہ گیا کہ وہ بابا جان کو راضی کرنے کی کوشش کرے گا کہ وہ سب پرانی باتیں اور رنجشیں بھلا کر مجھے واپس بلا لیں۔ شاید وہ میرے دل میں حویلی والوں سے متعلق محبت کو اچھی طرح محسوس کر رہا تھا اور میں اس کے جانے کے بعد حویلی والوں کی پیش رفت کا انتظار کرنے لگا۔ سلامہ سے رابطہ اسی طرح قائم تھا۔ اب تو اس کی بدولت بی بی جان، سبحان بھائی، بھاوج وغیرہ سے بھی بات ہونے لگی تھی۔ اکثر خط ملتے تھے اور میں شدت سے واپسی کا منتظر تھا۔ یہاں رہتے ہوئے مجھے یہاں کے معاشرے سے ایک الجھن ضرور رہی تھی۔ ماورا اگرچہ یہیں پلی بڑھی تھی مگر اپنی تمام لاتعلقی کے باوجود میری پوری کوشش تھی کہ اس پر اس معاشرے کے اثرات غالب نہ آئیں۔ اسی لیے تو میں نے اس کے لیے فاطمہ جیسی خاتون کا بندوبست کیا تھا۔ فاطمہ خاتون بہت مذہبی تھیں۔ صوم و صلوٰۃ کی پابند۔ انہوں نے ماورا کی تربیت بھی انہی خطوط پر کی تھی۔ ماورا اپنے لباس، گفتگو، انداز و اطوار ہر لحاظ سے ایک مکمل مشرقی لڑکی تھی اور اب میری خواہش تھی کہ اس کی شادی یہاں کرنے کے بجائے پاکستان جا کر کروں۔ سلامہ کو جب سے دیکھا تھا میرے اندر عجیب و غریب سے احساسات پیدا ہونے لگے تھے۔ رفتہ رفتہ میری خواہش جڑ پکڑتی جا رہی تھی کہ کیا ہی اچھا ہو کہ سلامہ شاہ ماورا سے شادی کر لے۔

اس طرح ایک تو ماورا خاندان میں ہی رہ جائے گی دوسرے شاید بابا جان کے دل میں بھی جگہ بن جائے۔ اس عمر میں میری سوچ بہت بچکانہ ہوتی جا رہی تھی۔ ایک سال کے عرصے میں سلامہ صرف ایک دفعہ لندن آ سکا تھا۔ وہ بھی دو دن کے لیے اس نے مجھے بتایا کہ حالات آہستہ آہستہ بدل رہے ہیں۔

پھر چند ماہ بعد ہی اچانک سلامہ شاہ نے فون کر کے بابا جان پر فالج کا اٹیک ہونے کی اطلاع دی۔ اب میں اتنا پتھر دل بھی نہ تھا کہ ان کی بیماری کی اطلاع سن کر بھی نہ آتا۔ نجانے کیوں مجھے یقین تھا کہ اب کے بابا جان مجھے نہیں دھتکاریں گے۔ میں ماورا سمیت وہاں پہنچا۔

فالج کے اٹیک نے بابا جان کی ساری اکڑ ختم کر کے رکھ دی تھی۔ حسب نسب پر فخر و غرور کرنا اور جاگیردار ہونے کا سارا زعم دودھ کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ انہیں اس حالت میں دیکھ کر میرا دل کانپ گیا تھا۔ میرے دل میں کبھی بھی نظریاتی اختلافات کے سوا کوئی برا خیال نہیں آیا تھا۔

"مجھے معاف کر دے رہبان پتر! میں نے بہت برا کیا۔" حویلی کے کمرے میں لیٹے وہ کہہ رہے تھے۔ فالج نے ان کے دماغ کو بھی متاثر کیا تھا۔ جسمانی طور پر وہ ٹھیک تھے میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں تھامے وہ رو رہے تھے۔

"معافی مانگ کر مجھے شرمندہ مت کریں۔ سب قصور میرا ہے۔ بلکہ میں تو خود شرمسار ہوں۔" اس لمحے میری ساری ناراضگی، برسوں کی ضدی فطرت، خود سری و غفلت نجانے کہاں جا سویا تھا۔ شاید عمر ڈھلنے کے ساتھ ساتھ میری انا بھی سرنگوں ہوتی جا رہی تھی یا پھر بوڑھے باپ کو اس حالت میں دیکھنے کا اثر تھا۔

"یہ تمہاری بیٹی ہے؟" میں نے ان کے ہاتھوں پر بوسہ دیا تو وہ مسکرا کر میرے عقب میں کھڑی ماورا کو دیکھ کر پوچھنے لگے۔ کبھی انہوں نے اسے میرا خون ماننے سے انکار کیا تھا اور اب [illegible]

"ادھر کیوں کھڑی ہو بیٹی...... ادھر آؤ... میرے قریب آؤ... میں تمہارا دادا ہوں، مجھ سے نہیں ملو گی...؟"
مجھے حیران کرتے اسے بلایا تو وہ کچھ جھجکتی دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر پیار دیا۔

"میں غلط تھا...... مجھے بڑا زعم تھا اپنے حسب نسب پر... مگر اس بیماری نے سب سمجھا دیا ہے۔ اللہ کی لاٹھی بے آواز ہے۔ مجھے معاف کر دو بیٹی۔" بابا جان ماورا سے کہہ رہے تھے اور میں خاموش تھا۔

"پاکستان آ کر میں نے بی بی جان کے اصرار پر مستقل یہیں رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں لندن کچھ کام نمٹانے گیا تو میرے پیچھے ماورا اپنے ننھیال والوں سے ملنے چلی گئی۔ میں واپس آیا تو وہ بھی آ چکی تھی۔ یہاں آ کر میں بہت خوش تھا۔ ان ہی دنوں ماورا کی نانی اور ممانی اپنے بیٹے شہریار کا رشتہ ماورا کے لیے مانگنے آئیں۔ ابھی میں کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ بابا جان نے سلامہ شاہ کے لیے بات کی۔ میری تو دلی مراد بر آئی تھی۔ سلامہ شاہ ہر لحاظ سے معقول تھا۔ بابا جان نے بات کی تو میں انکار کرنے کی گنجائش نہیں نکال سکا۔ پھر ہاں کی دیر تھی بابا جان اور سبحان بھائی نے وہیں بیٹھے بیٹھے دونوں کی شادی کی تاریخ عیدالاضحیٰ کے فوراً بعد طے کر دی تھی۔ میں بھی خوش تھا یہ بوجھ جتنی جلدی اترتا اتنا ہی اچھا تھا۔

سلامہ شاہ سے ماورا کی شادی کا فیصلہ کر کے میں بہت خوش تھا۔ لیکن تین دن پہلے ماورا جس طرح اس رشتے پر انکار کر کے برسوں کی گئی میری کوتاہیاں بھی گنوا گئی تھی ان کو یاد کر کے مجھے اپنے آپ سے بھی نظر ملانا باعث شرم لگ رہا تھا۔

"میں تو ایک بوجھ کی طرح آپ پر مسلط رہی ہوں۔ بیٹی تو کبھی تھی ہی نہیں اور اب بھی ایک بوجھ کی طرح مجھے اتار پھینکنا چاہتے ہیں۔ بڑا دعویٰ ہے آپ کو کہ آپ نے ماما سے بڑی بااصول محبت کی ہے۔ ان کی موت کے بعد بھی ان کی محبت کا عہد نبھاتے رہے ہیں۔"

ماورا کی آواز میرے دماغ میں گھس رہی تھی۔ ہر طرف صرف انہی لفظوں کی بازگشت تھی۔

"مگر مجھ سے پوچھیے کہ آپ دراصل کیا ہیں؟ آپ تو انسان بھی نہیں ہیں۔ باپ کیا بنتے؟" ہمیشہ میری سب زیادتیاں چپ چاپ سہنے والی میری بیٹی کیسے بلک بلک کر رو رہی تھی۔

"میرے ساتھ ناانصافیاں کیں ... اور اب چاہتے ہیں کہ آپ ہی کی طرح کے ایک جنونی شخص سے شادی کرلوں ... نہیں پاپا ... ایسا کبھی نہیں ہوگا ..... نفرت کرتی ہوں اس سے اس خاندان سے اور آپ سے بھی ..... پاپا! ..... میں آپ کو اس زیادتی پر کبھی معاف نہیں کروں گی ... "

اس کی آواز کی بازگشت تین دن سے میرا احتساب کر رہی تھی۔ میری جانب سے میرے رویوں سے بددل ہو کر وہ اپنی زندگی ہی ختم کر دینا چاہتی تھی۔ وہ تو اگر بروقت سلامہ شاہ اس کے روم میں نہ چلا جاتا تو شاید اس وقت اس کی قبر پر بیٹھا میں پچھتاوے کے آنسو بہا رہا ہوتا۔ میری آنکھوں سے آنسو روانی سے بہہ رہے تھے۔ "اے اللہ مجھے معاف کردے ... میں تیرا گناہ گار بندہ بہت ناشکر تھا۔ ساری عمر تیرے حکم سے سرتابی کی ..... تیری رضا سے منہ موڑا ... مجھ سے میری زندگی چھین لے مگر میری بیٹی کو تندرستی دے دے ... مجھے معاف کردے اے میرے پروردگار معاف کردے۔" وضو کر کے آنے کے بعد جائے نماز بچھا کر میں رب کے حضور اپنی غلطیوں پر آنسو بہا رہا تھا۔ بے شک وہی معاف سے درگزر کرنے والا ہے اور گناہ گاروں کی بخشش کرنے والا ہے۔ وہ ضرور مجھ گناہ گار کی سنے گا۔

*

میں ماورا ہوں رہبان شاہ کی اکلوتی بیٹی اور غفار شاہ کی پوتی۔ تھوڑی دیر پہلے سلامہ شاہ میرے سرہانے بیٹھا بہت آزردہ سا تھا۔ وہ مجھے ٹرینکولائزر کے زیر اثر جان کر اپنے رویوں پر پشیمانی کا اظہار کر رہا تھا۔ میرے ہاتھ کی پشت پر اس کے ہونٹوں کا لمس ابھی بھی باقی تھا۔ میں جو اس سے ہمیشہ نفرت کرتی چلی آ رہی تھی اس وقت آنکھیں کھول کر اس کی جانب دیکھنے کی ہمت نہیں کر پائی تھی۔ آج پہلی دفعہ مجھے اس کی محبت کی شدت و گہرائی کا اندازہ ہوا تھا ورنہ اپنے دل میں نفرت کی دنیا بسائے میں کچھ اور محسوس کرنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ اس کا آزردہ سا لہجہ میرے دل و دماغ پر اپنے نقش چھوڑ گیا تھا

"آئی ایم سوری ماورا ... اگر مجھے علم ہوتا کہ تمہاری نفرت کے پیچھے یہ سب کارفرما ہے تو میں کبھی تمہیں زچ کرنے کی کوشش نہ کرتا۔ میں تو یہی سمجھ رہا تھا کہ تم میرے گزشتہ رویے کی وجہ سے مجھے قبول نہیں کر رہی۔ میری محبت کو ٹھکرا رہی ہو۔ تم ایک دفعہ اپنے دل کی بھڑاس میرے سامنے نکالتی تو سہی ..... اب میں اتنا خود سر و جنونی بھی نہیں ہوں۔ میں تم سے صرف محبت ہی نہیں کرتا تمہاری عزت بھی کرتا ہوں ورنہ بارہا تمہارے رویے نے مجھے مشتعل کیا اور بارہا میرا دل حد سے گزر جانے کو چاہا ..... اگر تمہارے احساسات کا پاس نہ ہوتا تو نجانے کیا کر گزرتا۔"

اس کے لفظوں کی پشیمانی میری سماعت میں گھلتی جا رہی تھی۔ کہیں سے کوئی بازگشت بار بار میرے حواس کو جھنجوڑ رہی تھی۔

کسی پتھر کی مورت سے محبت کا ارادہ ہے
پرستش کی تمنا ہے عبادت کا ارادہ ہے

میں نے بے بسی سے اپنے ہاتھ کو دیکھا وہاں ان دیکھا لمس ابھی بھی میرے ہاتھ کو دہکا رہا تھا۔ آنسو تواتر سے بہہ رہے تھے۔ وہ تو مجھے سویا ہوا جان کر سب کہہ گیا لیکن میں اپنے آپ کو اب پہلے والی ماورا نہیں بنا پا رہی تھی۔ شاید پاپا کے سامنے سب کچھ کہہ کر رو دھو کر اپنے دل کا درد بہا کر اب سب احساسات منجمد ہو گئے تھے کوئی فیلنگ نہیں رہی تھیں۔ بار بار ذہن پیچھے کی طرف گردش کر رہا تھا۔ ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ میرا ذہن نارمل ہے مگر شاید پاپا کی طرح میں بھی شدت

پسند تھی جو اپنے آپ کو ماضی میں سفر کرنے سے نہیں روک پا رہی تھی۔ کافی دیر تک خود پر کنٹرول کرتے اور بے بس ہوتے میں نے اپنے آپ کو گزشتہ یادوں کے حوالے کر دیا۔ جہاں میرا ماضی تھا۔

پاپا کا تعلق ایک جاگیردار گھرانے سے تھا۔ ماما سے محبت اور پسند کی شادی کی پاداش میں انہیں اپنے خاندان سے قطع تعلق کر دیا گیا تھا اور پھر ماما کی وفات اور میرا دنیا میں آنا ان کی نفرت کا سبب بنا تھا۔ میرا بچپن نانی اماں کے گھر میں گزرا تھا۔ انہوں نے ہی میرا نام ماورا رکھا تھا۔ انہیں ماما سے بہت محبت تھی۔ ماما کی وفات کے بعد پاپا کی نفرت کو دیکھتے ہوئے انہوں نے مجھے اپنے پاس رکھ لیا تھا اور پھر دس سال میں ان کے پاس رہی۔

ماما کل سات بہن بھائی تھے۔ بڑی خالہ آمنہ پھر ماموں زبیران کے بعد ماموں یحیٰی اور خالہ فوزیہ تھیں پھر دو ماموں عمران اور سیف الرحمن تھے سب سے آخر میں ماما تھیں۔ ماموں زبیر کی بیگم شہلا ممانی ان کے بعد آسیہ مامی طیبہ اور عظمیٰ تھیں۔ سب کے ہی بچے تھے۔ سب ہی گھربار والے تھے۔ ماں کی عدم موجودگی پاپا کی عدم دلچسپی نے مجھے بچپن سے ہی بہت حساس بنا دیا تھا۔ پھر نانی کے گھر میں سب کے رویے کو دیکھتے ہوئے میرے اندر شدید قسم کا کمپلیکس پیدا ہو گیا تھا۔ چاروں ممانیاں اور ان کے بچے ہر لمحہ مجھے یہ احساس دلانے کے لیے کافی تھے کہ میں ان کے گھر رہ رہی ہوں۔ ان کے روپے پر پل رہی ہوں۔ چاروں ممانیاں ایک دوسرے سے برتری لینے کے چکر میں رہتی تھیں۔ ایسے میں اکثر مجھے بھی ہرٹ کر جاتی تھیں لیکن یہاں میرے لیے سب سے بڑا اور مضبوط سہارا نانا اور نانی ہوتے تھے۔ مجھ سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ اکثر میری خاطر ممانیوں اور ان کے بچوں سے بھی الجھ پڑتے تھے۔ بارہا ممانیوں کے طنز اور پاپا کے رویے پر آزردہ ہو جاتی تھی۔

ایک دن نانو اچانک بیمار پڑ گئیں اور پھر وہ اکثر بیمار رہنے لگیں۔ چاروں ممانیاں ایسے میں ان پر زور ڈالنے لگیں کہ وہ پاپا سے بات کر کے مجھے ان کے حوالے کریں۔ پہلے پہل تو ایسے کہنے پر نانو بھی چپ کرا دیتی تھیں مگر پھر رفتہ رفتہ نانو بھی خاموش ہو گئیں۔ نانو کو میرا بہت پرواہ رہنے لگی تھی۔ اسی لیے وہ میری جانب سے فکر مند تھیں اگر انہیں کچھ ہو گیا تو میرا کیا بنے گا۔ ممانیاں تو کسی طور مجھے برداشت نہیں کریں گی۔ ایک دن انہوں نے مجھے بتایا کہ انہوں نے پاپا سے رابطہ کیا ہے وہ بہت جلد مجھے لینے آئیں گے میں یہ جان کر بہت خوش ہوئی۔ یہ جان کر نئے سرے سے جی اٹھی کہ اب میں پاپا کے ساتھ رہوں گی پھر کتنے دنوں کا بے چینی وار انتظار ایک دن ختم ہو گیا۔ میں لان میں ایک طرف کیاری میں ٹوٹے مرجھائے پتے چن رہی تھی جب نانا کی گاڑی اندر داخل ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ ساری ممانیاں ان کے بچے اور ماموں نانو سمیت لان میں ہی کرسیاں ڈالے بیٹھے ہوئے تھے۔ سب ہی متوجہ ہو گئے۔ گاڑی میں نانا ابو کے ساتھ جو شخص برآمد ہوا اسے دیکھ کر میں وہیں ساکت ہو گئی۔

"پاپا ....."

جس شخص سے میں صرف تصویروں کی حد تک واقف تھی آج انہیں سامنے مجسم دیکھ کر مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں جہاں تھی وہیں ساکت کھڑی رہی۔ اتنی ہمت نہ ہو سکی کہ آگے بڑھ کر پاپا سے لپٹ جاؤں۔ وہ فرداً فرداً سب سے مل رہے تھے۔

"ماورا ..." نانی کی آواز پر میں جیسے خواب سے چونکی۔

"جی ....."

مٹی سے اٹے ہاتھوں کو جھاڑتے ہوئے میں نے خود کو سنبھالا۔

"ادھر آؤ ماورا ..... ان سے ملو یہ تمہارے پاپا ہیں۔" نانا جان نے بتایا میں ان کے پاس آ گئی۔ وہ بھی مجھے دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں سرد سے جامد تاثرات تھے۔ مجھ پر سرسری سی نظر ڈالی تھی۔

"رہبان یہ ماورا ہے ..... یہ تمہاری بیٹی ہے۔" نانو نے پاپا کو بتایا۔

"السلام علیکم پاپا! ..... " ان کے سرد سے انداز پر میں جھجک گئی تھی۔ انہوں نے سر ہلا دیا۔

"کیسی ہیں آپ؟..." نہ ہی کوئی پیار نہ ہی کوئی محبت بھرا اظہار تکلف کے لبادے میں لپٹا ہوا یہ استفسار میرے احساس کو بیدار کر گیا۔

"کیا باپ ایسے ہوتے ہیں؟" بھیگی آنکھوں سے انہیں دیکھتے میں نے سوچا۔

وہ مجھ پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد دیگر لوگوں سے مصروف گفتگو ہو گئے اور میرے اندر جتنی خواہشوں و آرزوؤں نے سر اٹھایا تھا وہ اپنی موت آپ مر گئیں۔

رات کو سب ہی کمروں میں جا چکے تھے۔ میں پاپا کے کمرے میں آ گئی۔ میرے اندر کی دس سالہ بچی اپنے باپ سے باتیں کرنے اپنی تعلیم کے بارے میں بتانے کو مچل رہی تھی۔

وہ کتاب پڑھ رہے تھے۔ مجھے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تو رک گئے تھے۔

"آپ اس وقت؟" وہ شاید اس وقت مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔

"وہ پاپا میں..." میں جھجک گئی۔

"کچھ کہنا ہے آپ کو...؟" میں منتظر تھی کہ وہ مجھے اپنے پاس بٹھا کر ڈھیروں باتیں کریں گے۔ خوب پیار کریں گے مگر ان کا سرد انداز دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔

"جی... نہیں..." میں نے نفی میں سر ہلایا تھا پھر، چھوٹا سا دل بہت دکھی ہوا۔

"تو پھر اپنے کمرے میں جا کر سو جائیں۔" وہ کتاب کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے سرد انداز اور سخت لہجے میں کہہ رہے تھے۔ میں ایک دم پلٹی اور باہر نکل آئی اور اپنے کمرے میں آ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ میرے اندر جو برسوں سے ایک احساس پل رہا تھا باپ کے سینے پر سر رکھ کر باتیں کرنے کا وہ جڑ سے جھڑتا گیا اور پھر ساری رات میری آنسوؤں میں کٹ گئی۔ میں اپنی دس سالہ عمر سے بڑی باتیں سوچ رہی تھی۔

میرے دل میں پاپا کے لیے بہت محبت تھی مگر ان کی سرد مہری سے کئی شکوے بھی جاگ گئے۔

"وہ مجھے ناپسند کرتے ہیں۔ مجھ سے محبت نہیں کرتے۔ میری صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتے۔" یہ سوچیں مجھے پاگل کر دینے کو کافی تھیں۔

ہم نانی ماں کے ہاں دو دن رہے پھر پاپا مجھے وہاں سے لے کر گاؤں چلے گئے۔ بہت بڑی حویلی تھی۔ وہاں سب لوگ بہت خوش ہو کر پاپا سے مل رہے تھے۔ بچے بھی تھے۔ میرے لیے سب انجان تھے۔ وہ مجھے لے کر اپنی اماں جی کے پاس چلے آئے جو بڑے سے تخت پر براجمان تھیں۔ پاپا کو دیکھ کر وہ والہانہ انداز میں اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"السلام علیکم بی بی جان!..." پاپا ان کے سامنے جھک گئے۔ انہوں نے پاپا کا سر چوم کر گلے سے لگا لیا۔ "کتنا تڑپایا ہے تو نے رہبان اپنی ایک ضد اور خواہش کی خاطر... کیا سے کیا بنا لی ہے زندگی تو نے... ایسے بھی کوئی اپنوں سے خفا ہو جاتا ہے۔"

بی بی جان رو رہی تھیں اور پاپا بالکل خاموش تھے۔

"برسوں بعد اس ماں کی یاد کیسے آ گئی تجھے..." دوپٹے سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے انہوں نے پاپا کو شاکی نظروں سے دیکھا۔

"میں تو بی بی جان صرف ناراض ہوں... سارے رشتے ناتے تو آپ لوگوں نے خود ختم کر لیے ہیں۔ کیا میرا دل نہیں تڑپتا آپ سے ملنے کو بھائی اور زہرہ بھابی بچوں کو دیکھنے کو بہنوں کے پاس جانے کو مگر بابا جان نے بھی حد کی ہے پھر میں کس منہ سے اور کیا لینے آ جاتا اور آج بھی..."

"چھوڑ چل پچھلی باتوں میں کیا رکھا ہے۔ آج تو خود چل کر آیا ہے۔ یہی کافی ہے میرے لیے۔"

"یہ کون ہے؟" میری طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے پاپا سے پوچھا۔

"یہ مادرا ہے۔ میری بیٹی..." ایک دم پاپا کا انداز سرد ہو گیا یا شاید مجھے محسوس ہوا۔

"اچھا... ماشاءاللہ بڑی پیاری بچی ہے بالکل ماں جیسی ہے صرف ایک دفعہ دیکھا تھا اسے جب تیرے ساتھ آئی تھی ہو بہو وہی ہے۔ ادھر آؤ بیٹی..." انہوں نے پیار سے کہتے ہوئے بازو سے تھام کر مجھے سینے سے لگا لیا۔

"بابا جان اور سبحان بھائی کہاں ہیں؟" پاپا نے پوچھا۔

"تیرے ابا جی تو دو دن سے اپنے کسی دوست کے ساتھ گئے ہوئے ہیں اور سبحان صبح کا زمینوں پر نکلا ہوا ہے... آنے ہی والا ہے..."

"اماں جی! میں صرف چند دن کی چھٹی پر آیا ہوں۔ آپ کو علم ہوگا کہ مادرا اپنی نانی کے پاس ہی رہتی تھی۔ وہ اب بیمار ہیں اس لیے بلوا کر اسے میرے ساتھ روانہ کر دیا ہے۔ لندن میں تنہا ہوتا ہوں۔ میں اسے کیسے پالوں گا... اسی لیے حویلی لے آیا ہوں نا"

وہ بی بی جان کو بتا رہے تھے اور مجھے جان کر حیرت ہو رہی تھی۔

"مجھے تو پتر کوئی اعتراض نہیں۔ تمہاری بیٹی ہے سو بسم اللہ پر تیرے ابا کو کون سمجھائے وہ ابھی تک اپنی ضد پر اڑے تجھے نہ دیکھنے کی ٹھانے ہوئے ہیں سو اپنے ابا سے پوچھ لینا... میں بات کر لوں گی..." پاپا نے ہامی بھری۔

حویلی میں بی بی جان کے علاوہ پاپا کے بڑے بھائی سبحان انکل کی فیملی رہتی تھی۔ ان کے کل پانچ بچے تھے۔ صبا آپی، سلامہ شاہ، ام رومان، علی اور رضا۔ صبا آپی، ام رومان اور سلامہ شاہ تینوں مجھ سے بڑے تھے جب کہ علی میرا ہم عمر تھا اور رضا مجھ سے چھوٹا تھا۔ ان کی والدہ کا نام زہرہ بیگم تھا جنہیں سب ماں جی کہتے تھے۔ بی بی جان، ماں جی، سبحان انکل کے علاوہ ان کے بچے بھی بہت اچھے تھے مجھ سے بڑا پیار کرتے تھے لیکن ان سب میں سلامہ شاہ کچھ بد دماغ سا انسان تھا جب بھی سامنا ہوتا عجیب نظروں سے گھورنے لگتا تھا۔ مجھ سے عمر میں کافی بڑا تھا۔ ڈیل ڈول اور جسامت کا بھی اچھا خاصا تھا۔ چہرے پر موجود ہلکی ہلکی مونچھیں اسے کچھ دلکش چہرے کا مالک بنا دیتی تھیں۔ بہر حال جو بھی تھا وہ مجھے ذرا بھی اچھا نہیں لگا۔ پاپا کے رویے سے میں بدظن ہو چکی تھی مگر ان لوگوں کے خلوص اور محبت بھرے رویے نے پھر سے مجھے پرامید بنا دیا تھا۔ میں جوں میں تھی اس احساس نے میرے اندر نئی زندگی دوڑا دی تھی۔

بابا جان ابھی تک حویلی نہیں لوٹے تھے۔ ہمیں یہاں آئے ہوئے تین دن ہو گئے تھے۔ پاپا سارا دن حویلی سے باہر رہتے نجانے کہاں کہاں گھومتے رہتے تھے۔ پاپا کا سن کر میری دونوں پھوپھیاں بھی آ گئی تھیں۔ وہ دونوں بہت اچھی تھیں۔ اتنے دن میں، میں سب کے ساتھ بہت اچھی طرح گھل مل گئی تھی۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ میں ان لوگوں کے لیے اجنبی ہوں۔ مجھے یہاں کسی سے خوف نہیں آتا تھا سوائے سلامہ شاہ کے۔ نجانے کیوں مجھے دیکھتے ہی اس کا اچھا خاصا پرکشش چہرہ بگڑ جاتا تھا۔ نظروں میں پاپا کی طرح کی سرد کیفیت ہوتی تھی۔ زبان سے ابھی تک اس نے کچھ نہیں کہا تھا مگر مجھے اس سے بڑا ڈر لگنے لگا تھا۔ ساتھ ساتھ نفرت سی بھی ہونے لگی تھی۔ نجانے کیوں مگر میری بچپن سے ہی عادت بنتی ہو گئی تھی کہ کوئی مجھے ایک دفعہ نفرت سے پکارتا تھا تو میرے دل میں اس کے لیے ہزار درجے نفرت پیدا ہو جاتی۔ ممانیوں کے ساتھ بھی یہی حال تھا لیکن یہاں۔

ام رومان مجھ سے تین سال بڑی تھی اس کے باوجود ہماری پکی دوستی ہو گئی تھی۔ وہ تھی بھی بہت اچھی اور پیاری ویسے تو صبا آپی بہت خوبصورت تھیں مگر وہ تو عمر میں سلامہ شاہ سے بھی دو تین سال بڑی تھیں۔ اسی لیے ان سے شرم آتی تھی۔ علی اور رضا بھی میرے دوست بن گئے تھے۔ ہم گھنٹوں اکٹھے مل کر کھیلتے تھے۔ یہاں آ کر سچ میں بہت خوش تھی۔

اگلے دن بابا جان بھی آ گئے۔ پاپا سبحان انکل کے ساتھ کہیں گئے ہوئے تھے۔ پاپا کی آمد اور مقصد جان کر وہ بڑے چراغ پا ہوئے۔ مجھے اور ماما کو برا بھلا کہتے رہے۔ پاپا حویلی لوٹے تو انہوں نے انہیں اپنے پاس بلا لیا اور ساتھ مجھے بھی۔

"کیا لینے آئے ہو اب تم یہاں..... کیا تعلق ہے تمہارا ہم سے۔" میری طرف حقارت سے دیکھتے ہوئے انہوں نے کہا تو نجانے کیوں پاپا کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا۔ وہاں کمرے میں سبھی تھے۔ میں پہلی دفعہ انہیں دیکھ رہی تھی۔ ان کے الفاظ میں رعونت تھی۔ جس طرح غرور نخوت کا اظہار کرتے انہوں نے کہا مجھے وہ بہت برے لگے۔ سلامہ شاہ کی ہی طرح زہر بھرے۔

"گستاخی معاف بابا جان! جس بات کا آپ کو غصہ ہے وہ تو کب کی منوں مٹی تلے جا سوئی ہے۔ دس سال ہو گئے ہیں اس کے باوجود آپ کی نفرت جوں کی توں برقرار ہے۔ اب تو معاف کر دیں...." پاپا نے کہا۔ تو جواباً بابا جان استہزائیہ مسکرائے۔

"چلو معاف کر دیتا ہوں مگر ہماری بات وہی ہے۔ جس عورت کو میں خاندان کی بہو تسلیم کرنے پر راضی نہ تھا اس کی بیٹی کو خاندان میں کیسے جگہ دے دوں..... تم اسے جہاں سے لائے ہو وہیں واپس چھوڑ دو تو ہم کچھ سوچیں گے..... میں اپنے اعلیٰ حسب نسب والے خون میں غیر خون کی ملاوٹ قطعی برداشت نہیں کر سکتا۔" ان کے نخوت بھرے انداز میں مطلق فرق نہیں آیا تھا۔

"بابا جی... یہ آپ زیادتی کر رہے ہیں۔ یہ میری اور سارہ کی بیٹی ہے۔ میرا خون ہے۔ آپ کے رد کرنے سے حقیقت بدل نہیں جائے گی۔ ویسے بھی اب میں اسے وہاں نہیں چھوڑ سکتا۔ دس سال انہوں نے اسے سنبھالا ہے۔ اب اسے اپنے خاندان کی ضرورت ہے۔" پاپا اپنے بابا جان سے کہہ رہے تھے۔ انہوں نے سر جھٹکا۔

"تو فرا ہم کرو تم اسے خاندان کی ضرورت۔ میری حویلی ہے کوئی یتیم خانہ نہیں کہ میں اس جیسی لڑکیوں کو رکھتا پھروں۔ نہیں سنبھالی جاتی تم سے تو کہیں چھوڑ دو۔ مجھ سے یہ توقع مت رکھو۔ میں نے جو کہہ دیا ہے وہ بدلے گا نہیں..... اگر مجھ سے یا اس حویلی کے کسی فرد سے تعلق رکھنا چاہتے ہو تو میری شرط ہے یہی۔ ورنہ میری حویلی کے دروازے تمہیں بھی روکیں گے نہیں۔"

"شاہ جی..... بی بی جان اب بولیں۔ انداز پر تڑپ تھیں۔

"بابو جان آپ..... " سمجھائیں کہ کچھ کہنا چاہو تو بیوی نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

"نہیں بیگم ایسی نافرمان اولاد کے لیے میری حویلی میں کوئی گنجائش نہیں۔ اس نے ہمیشہ اپنی من مانی کی ہے۔ برسوں پہلے میں اسے اپنی زندگی سے نکال چکا ہوں۔ یہ جتنے سالوں بعد آیا ہے میں معاف بھی کر دوں مگر اس لڑکی کو جگہ نہیں دوں گا۔ فیصلہ اس کے اپنے ہاتھ میں ہے جو میں نے کہنا تھا کہہ دیا۔"

میں خاموش تماشائی بنی ایک طرف کونے میں کھڑی تھی جب کہ میرا دل اندر ہی اندر کانپ رہا تھا کہ اگر پاپا نے مجھے چھوڑ دیا تو؟

"آپ نے ہمیشہ میری مخالفت ہی کی ہے۔ چاہے وہ معاملہ میری تعلیم کا ہو یا شادی کا۔ ہمیشہ اپنی مرضی ٹھونسنے کی کوشش کی ہے۔ ہماری درمیان صرف نظریاتی اور سوچ کی حد تک اختلافات تھے آپ نے ہمیشہ اس بات کو اپنی انا کا مسئلہ سمجھا۔ ہمیشہ مجھ سے نفرت سے پیش آئے۔ برسوں بعد میں یہاں آیا ہوں اس خیال سے کہ آپ کا دل پسیج گیا ہوگا۔ پتھر میں جونک لگ گئی ہوگی۔ شاید مجھے اپنے سامنے دیکھ کر دل میں تھوڑی بہت گنجائش نکل آئے۔ مگر افسوس۔ میں نے پسند کی شادی کر کے کوئی غلطی نہیں کی۔ غلطی تو اب کی ہے کہ آپ کے سامنے آیا ہوں..... جب میرے لیے آپ کے دل میں گنجائش نہیں بنی تو میری اولاد کے لیے خاک بنے گی۔ میں بہت بڑی بھول میں تھا۔" وہ غصے سے کہہ کر اور میرا بازو پکڑ کر وہاں سے نکل آئے تھے۔

رات تک ہم نے حویلی چھوڑ دی تھی۔ پاپا مجھے لے کر اپنے کسی دوست کے گھر آ گئے تھے۔ چند دن ہم وہاں رہے تھے۔ پاپا کا رویہ اگرچہ وہی تھا مگر اب میں مطمئن تھی کہ میں پاپا کے ساتھ ہوں۔ اس دوران پاپا میرے پاسپورٹ اور ویزہ وغیرہ کا انتظام کرتے رہے۔

پھر ہم لندن آ گئے۔ یہاں آتے ہی پاپا نے سب سے پہلے میرا ایڈمیشن کروایا۔ پھر میرے لیے ایک مسلمان گورنس کا بھی بندوبست کر دیا۔ وہ خاتون بہت پڑھی لکھی اور مذہبی تھیں۔ شادی کے بعد شوہر کا انتقال ہو جانے کے بعد بالکل تنہا تھیں۔ پاپا میری

طرف سے فکر مند تھے تو وہ میرے ساتھ رہنے پر رضا مند ہو گئیں اور اس طرح مجھے بالکل ایک ماں کی طرح انہوں نے پالا تھا۔ میرا دھیان رکھا تھا۔ وہ بہت محبت کرنے والی خاتون تھیں۔ پاپا کے متعلق سب کچھ جانتی تھیں۔ پاپا کا رویہ میرے ساتھ اب بھی ویسا ہی ہوتا تھا۔ سرد مہری لیے ہوئے اگرچہ وہ مجھ سے لاتعلق رہتے تھے مگر کبھی ضروریات سے بے خبر نہیں ہوئے تھے۔ تعلیم سے لے کر ہر چیز مجھے وقت پر مہیا کی۔ وہ بلاشبہ ایک بہت اچھے باپ تھے اگر کبھی اپنے خول سے نکل کر میرے ساتھ محبت بھرا رویہ رکھ لیتے تو۔ وقت آہستہ آہستہ گزرنے لگا۔ میں نے پہلے اسکولز پھر کالج اور اس کے بعد یونیورسٹی تک کا سفر بڑے آرام سے طے کیا تھا۔ اس دوران بارہا میرا جی چاہا کہ میں پاپا کے سرد رویے پر چیخ اٹھوں۔ انہیں جھنجوڑ دوں۔ وقت کے ساتھ ساتھ بجائے کمی آنے کے پاپا کے انداز و اطوار میں شدت ہی آئی تھی۔ برملا ناپسندیدگی کا اظہار کرنے لگے تھے۔ میں دس سالہ بچی کی طرح ہر وقت ان کے چہرے کی طرف دیکھتی رہتی تھی کہ شاید کوئی مسکراہٹ میرے نام کی بھی ہو۔ کوئی جذبہ میرے وجود سے بھی متعلق ہو اور ہر بار ناکام رہتی تھی۔ میں گھنٹوں پاپا کے رویے پر ملال اور رنجیدہ رہتی تھی۔

رفتہ رفتہ میرے دل و دماغ میں بھی ان کے خلاف غبار بڑھنا شروع ہو گیا۔ محبت کے ساتھ ساتھ نفرت بھی جگہ پانے لگی۔ ہر بار ایسا ہوا کہ میں شدید بیمار ہوئی مگر ان کے اندر احساس تک نہ جاگا۔ کبھی یک محبت بھرا جملہ بولا..... باپ پتھر بھی ہوتے ہیں مجھے یقین کرنا پڑا۔ گزرتے وقت میں پاپا کے خاندان نے پلٹ کر خبر تک نہ لی..... ایک فرد تھے اور وہ سلامہ شاہ تھا جس کا نام ابھی بھی میرے اندر نفرت کا احساس جگا دیتا تھا۔ کثر اس کی ٹیلیفون کالز آتی تھیں۔ گفتگو کا موضوع جگتے رہتے تھے جو سب کے سب پاپا کے نام ہوتے تھے۔

مجھے نہ اس شخص سے کوئی سروکار تھا نہ ہی اس کے خطوط سے۔ میرے لیے اس کا پورا خاندان ہی قابل نفرت تھا گزرتے وقت میں میں نے لوگوں سے بے پناہ نفرت محسوس کی تھی۔ بہت شدت سے نفرت کا جذبہ جاگا تھا۔ سلامہ شاہ اور اس کے غرور کے پہاڑ بابا جان دونوں کے الفاظ ہمیشہ بازگشت بن کر میرے دل و دماغ پر کچوکے لگاتے رہتے تھے۔ بابا جان کی آنکھوں سے جھلکتی گہری نفرت و ناگواری اب بھی میرے تصور میں زندہ تھی۔ سلامہ شاہ کی آنکھوں سے عیاں ہوتی وحشت میرے وجود میں ابھی تک عجیب سی آگ جلا دیتی تھی مگر ان سب کے باوجود میں پاپا کے رویے سے بدظن ہو کر کوئی انتہائی قدم نہ اٹھا سکی۔ پاپا پہلے تو مجھے ماما کی موت کا ذمہ دار ٹھہراتے تھے اب تو اپنے خاندان کی جدائی کا سبب بھی مجھے سمجھنے لگے تھے اور میں بے پناہ محبت کے ساتھ نفرت کا پودا پروان چڑھاتے ان سے ان کی کوتاہیوں کا سبب نہ پوچھ سکی۔ حتیٰ کہ وقت بدلنے لگا۔

* * *

"میں برسوں نفرتوں میں جیا، نفرتوں میں مرا، بس ایک آرزو تھی میری کوئی چاہتا مجھے بھی۔"

اپنے کمرے سے نکل کر لاؤنج کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی میں رک گئی۔

"ہاں تو پھر کیا کروں میں..... اپنے خاندان کی جدائی اب میرے لیے ناسور بنتی جا رہی ہے۔ مادرا اگر سارہ کی بیٹی اور میرا خون نہ ہوتی تو کبھی اتنی طویل سزا نہ جھیلتا....."

پاپا فون پر کسی سے کہہ رہے تھے اور میرا وجود سناٹوں کی زد میں تھا۔ وہ بارہا اپنے رویوں، لفظوں سے مجھے یہ احساس دلاتے تھے کہ میں ان کے لیے قابل نفرت ہوں مگر اب یوں دیگر لوگوں سے بھی اپنی نفرت بیان کرنے لگے کہ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ باپ کا یہ کون سا روپ ہے میں ساکت تھی۔ میرا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔

"یہ ناممکن ہے..... بابا جان کے حقارت بھرے جملوں نے مجھے مجبور کر دیا تھا کہ میں اسے لے کر یہاں آ گیا ورنہ سارہ کے بعد کبھی کسی اور چیز کی خواہش نہیں رہی۔ اب بھی صرف اور صرف اس لیے برداشت کر رہا ہوں کہ سارہ کی بیٹی ہے..... ورنہ۔"

جانے دوسری طرف کون تھا۔ کس سے کہہ رہے تھے مگر ان کا ایک ایک لفظ میرے دل میں ترازو ہوتا جا رہا تھا۔ وہ صرف اپنے باپ کی ضد میں مجھے یہاں لے کر آئے تھے۔ یہ احساس ہی میری محبت کا خون کر دینے کو کافی تھا۔ تنی نفرت...... اتنی ناگواری ...میں کبھی آنکھوں سے نہیں دیکھ رہی تھی جب کہ میرے دل میں طوفاں برپا تھا۔

"یار کیا بتاؤں میں ..... زندگی کے اس موڑ پر آ کر لگتا ہے سب کچھ بے کار ہے۔ ماما کی وجہ سے میں سب چھوڑنے پر مجبور ہوں، تھا ورنہ بابا جان تو مجھے، بھی حویلی میں رکھنے پر راضی ہیں۔ اب تو سلامہ شاہ بھی کہہ رہا تھا کہ وہ بابا جان کو راضی کرے گا۔ اللہ کرے ایسا ہی ہو۔" ابھی وہ مزید گفتگو میں مصروف تھے مگر میرے اندر مزید سننے کی سکت نہ تھی۔ ایک دم وہاں سے ہٹ آئی اور پھر اپنے بستر پر گر کر کتنی دیر تک، ماما کی موت کا ماتم کرتی رہی۔ اللہ سے شکوہ کرتی رہی۔

اگلے دو دن تک میری طبیعت کافی خراب رہی۔ میں بالکل گم صم ہوگئی۔ فاطمہ ماما بار ہا مجھ سے دریافت کر چکی تھیں مگر میری چپ نہ ٹوٹی۔ اکثر شدید ڈپریشن میں مجھ پر یہ کیفیت طاری ہو جاتی تھی مگر یہ کیفیت کبھی طویل نہیں ہوتی تھی۔ چند گھنٹے گزرنے کے بعد میں اپنے آپ کو نارمل کر لیتی تھی مگر اب مجھے بخار اور سر درد بھی تھا۔ فاطمہ ماما کے بے حد اصرار پر میں ڈاکٹر کے پاس چلی آئی چیک اپ کے بعد اس نے تنبیہ کی کہ اگر میرا ڈپریشن ختم نہ ہوا تو یقیناً میرا نروس سسٹم متاثر ہو سکتا ہے مگر میں کیا کرتی یہ حساسیت میرے اختیار میں نہیں تھی۔ میرا سب سے بڑا مسئلہ پاپا کی بے حسی تو تھی۔ دو دن آف کرنے کے بعد تیسرے دن میں یونیورسٹی چلی آئی۔ میرا سارا وقت یونیورسٹی میں خالی الذہنی کیفیت میں ہی گزرا۔ یونیورسٹی سے آنے کے بعد طبیعت ایک دم بگڑی تھی چکر پر چکر آ رہے تھے۔ میں فوراً گھر پہنچی۔ دروازہ بند کر کے آگے بڑھی تو وہیں لاؤنج کے صوفے پر پاپا اور ان کے ساتھ بیٹھے شخص کو دیکھ کر میرے قدم وہیں رک گئے۔ گو زندگی میں ایک دفعہ اس شخص کو نہ دیکھا بھی ہوتی تو تب بھی اسے تو پہچان جاتی۔ اس کی شکل ہو بہو پاپا سے ملتی جلتی تھی۔ حیرت سے میری آنکھیں پھیلتی گئیں۔

"سلامہ شاہ ... " میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ وقت نے اسے کافی بدل ڈالا تھا لمبا قد، بھرا بھرا صحت مند ترو تازہ سڈول جسم، سرخ و شاداب دلکش چہرہ اور اس پر گھنی سیاہ مونچھیں۔ وہ بھی مجھے دیکھ چکا تھا مگر اسے یوں اچانک اس حالت میں دیکھ کر میرے دل و دماغ میں اس کے کہے برسوں کے جیسے ہتھوڑے برسانے لگے تھے۔ ہر شخص مجھ سے نفرت کرتا ہے۔ برسوں پہلے اس کے منہ سے اپنے لیے نفرت سے بھرے الفاظ نکلے تھے کس طرح اس نے میری ذات کی توہین کی تھی۔ میرے چہرے کے تاثرات یک دم کرخت ہو گئے۔ ایسے شخص کو دیکھنے کو بھی میرا دل نہیں چاہتا تھا اس سے پہلے کہ میں سامنے سے ہٹتی وہ کھڑا ہو گیا۔

"السلام علیکم ....." وہ بڑی متانت و سنجیدگی سے سلام کر رہا تھا۔ بڑی اپنائیت تھی اس کے لہجے میں۔ شاید وہ بھی مجھے خوب پہچان چکا تھا۔ جوان سر ونگاہوں سے میں نے اسے دیکھا تھا۔ ایک سخت سی نظر پاپا پر اور اس پر ڈال کر میں جواب دیے اور توجہ دیے بغیر اپنے کمرے کی طرف چل دی۔

اپنے کمرے میں آ کر اپنی اس حرکت بلکہ بداخلاقی پر مجھے عجیب سا سکون ملا تھا۔ مجھے ایسے لگا جیسے میں نے اس شخص کے برسوں پہلے کہے گئے الفاظ کا بدلہ لے لیا ہو۔ میرے اندر کی تڑپتی سسکتی میری انا کو ایک گونا خوشی حاصل ہوئی تھی۔

میری طبیعت تو پہلے ہی خراب تھی سر چکرا رہا تھا۔ اب اسے یوں اچانک دیکھ کر مجھے کوفت بھی ہونے لگی۔ ڈاکٹر کی ہدایت تھی کہ میں اپنے آپ کو مکمل طور پر پر سکون رکھوں ورنہ میری کوئی نس پھٹ جائے گی لیکن اپنے آپ کو نارمل نہیں کر پا رہی تھی۔ چکراتے سر میں درد کی ٹیسیں شدت اختیار کرتی جا رہی تھیں۔ سرہانے پر سر پٹختے میری چیخیں نکلنے کو بے تاب تھیں مگر میں مسلسل ضبط کر رہی تھی اور پھر یک دم جیسے مجھے کچھ ہونے لگا تھا۔ ادھر سے اُدھر سر پٹختے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا اور مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا ہو رہا ہے۔

"آہ....." آنکھیں کھلی تو ایک کراہ کے ساتھ میں اطراف میں دیکھنے لگی۔ ذہن بالکل خالی تھا اپنے اردگرد کے ماحول

سے مانوس ہونے میں کچھ وقت لگا تھا پھر جب اجنبی چہروں میں ایک نحیف وجود کے ساتھ ایک سفید بستر پر اپنے وجود کو لیٹا دیکھ تو حیرت ہوئی۔ فوراً اٹھنے کی کوشش کی۔

"اوں .. ہوں... لیٹی رہو..." وہ مجھ پر جھکا ہوا میرے کندھوں پر ہاتھ رکھے کہہ رہا تھا "ڈرپ لگی ہوئی ہے۔" میں پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس دفعہ بھی اس کے لہجے میں بہت اپنائیت تھی۔ وہ مجھے دونوں کندھوں سے تھام کر لٹاتے ہوئے پیچھے ہٹا۔

"آپ....."

ساری صورت حال کا ادراک کرتے ہوئے میرے لبوں سے صرف یہی لفظ ادا ہو سکا۔

"تمہیں برین ہیمبرج ہوا ہے۔ اس وقت تم اسپتال میں ہو۔ خدا کا شکر ہے اب تم خطرے سے باہر ہو....." وہ کرسی گھسیٹ کر میرے قریب بیٹھ گیا۔ مسکرا کر بتا رہا تھا اور حیرت کے ساتھ یاد کرنے کی کوشش میں تھی کہ مجھے ہوا کیا تھا۔ بے پناہ سر درد اور بے ہوشی کے بعد اب ہوش آیا تھا تو علم ہوا کہ گزشتہ گھنٹوں میں مجھ پر کیا کیفیت گزری تھی۔

"پاپا..... ماما.... پاپا کہاں ہیں؟" کمرے میں صرف سلامہ شاہ کو ہی دیکھ کر میں نے پوچھا۔

"انکل تو اپنے آفس کے کام کے سلسلے میں آؤٹ آف سٹی ہیں۔ میں نے فون کر دیا ہے۔ وہ جلد پہنچ جائیں گے... البتہ فاطمہ آنٹی کو میں نے گھر بھیج دیا ہے وہ بہت تھکی ہوئی تھیں۔" میں نے مفصل جواب دیا تو میں چپ چاپ اسے دیکھنے لگی۔

"مجھے یہاں کون لایا تھا؟" کچھ دیر خود سے ہی الجھنے کے بعد آخر کار جھجکتے ہوئے اس سے پوچھ ہی لیا۔

"میں لایا تھا.. چچا جان تو چلے گئے تھے۔ رات کو تمہاری ہی اپارٹمنٹ میں تھا سو تمہارے پڑوسی ڈاکٹر مسعود کی مدد سے تمہیں یہاں پہنچایا تھا۔" مسکرا کر اپنائیت سے کہہ رہا تھا۔ گزرے وقت کا کوئی بھی شائبہ تک نہ تھا جب کہ اس کی اپنائیت محسوس کر کے میری سوچیں جود آ گئیں۔ میں اس شخص نے انتہائی نفرت بھری تھی جس نے مجھے یہ احساس دلایا تھا، مجھے اسپتال لے کر آنے والا یہ شخص تھا۔ میری بے یقینی ابھی بھی قائم تھی جب کہ اس نے مسکرا کر میری کلائی تھامی تھی۔ شاید نبض چیک کرنے کو۔ میں اب مکمل حواس میں تھی ایک دم میں نے اپنی کلائی کھینچ لی۔ اس کی مسکراہٹ گہری اور گہری ہوگئی تھی۔

"میں ڈاکٹر کو اطلاع کرتا ہوں کہ تمہیں ہوش آ گیا ہے۔" اس کی آنکھوں میں کچھ ایسی بات ضرور تھی کہ میں نے فی الفور آنکھیں بند کر لیں۔ وہ کمرے سے جا چکا تھا اور میں ابھی تک کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔ کہاں وہ مجھ سے شدید نفرت کرتا تھا اور اب کہاں اس کی مہربانیاں۔

"مجھے برین ہیمبرج ہوا تھا" مجھے حیرت ضرور ہو رہی تھی اس لیے کہ میں پھر بھی زندہ ہوں جب کہ مجھے انہوں نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا تھا کیا وہ اس قدر شدید نفرت کرتے ہیں مجھ سے کہ میرے مرنے اور جینے سے انہیں کوئی سروکار نہیں۔ دیوار پر آویزاں کیلنڈر سے نظر آتی اگلے دن کی تاریخ دیکھ کر میرا دل غم و کرب کی اتھاہ گہرائی میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ پھر وہی سوچیں تھیں اور وہی ذہنیت اور سلامہ شاہ..... میں نے سر جھٹکا پھر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔

سلامہ شاہ مجھے یہاں لایا تھا۔ میرے وجود کو چھونے والا وہ تھا جس سے میرا صرف نفرت کا رشتہ تھا۔ ایک دم میرا پورا وجود سنسنا اٹھا۔ اسی تصور سے کہ میں تو بے ہوش تھی اور وہ..... میں مزید کچھ بھی نہیں سوچ سکی تھی کیونکہ میرا ذہن ہی نہیں آنکھیں بھی ایک گہرے اندھیرے میں ڈوب گئی تھیں۔

مجھے دوبارہ ہوش شاید آدھی رات کو آیا تھا۔ وہ شخص ابھی بھی وہیں کمرے میں تھا۔ میں ابھی بھی مشینوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ ڈرپ بدستور لگی ہوئی تھی۔ سلامہ شاہ کرسی پر بیٹھا سو رہا تھا۔ میں کچھ زیادہ غور و فکر نہ کر سکی۔ میرے ذہن پر غنودگی چھائی ہوئی تھی۔

"پا... پ... پانی..." میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ ایک دم مجھے پانی کی طلب ہوئی۔ لیکن وہاں کوئی بھی نہیں تھا جو میری آواز سنتا اور جو تھا وہ شاید گہری نیند میں تھا۔ میں نے خود اٹھنے کی کوشش کی مگر ہاتھ ٹیبل پر رکھی دوائیوں سے الجھ گیا۔ نتیجتاً تمام دوائیاں زمین پر جا گری تھیں۔ میرا تنفس بری طرح الجھا ہوا تھا۔ نقاہت سے برا حال تھا۔ میں بے دم ہو کر وہیں لیٹ گئی۔ کھٹکے کی آواز سے سلامہ شاہ بھی متوجہ ہو گیا۔ پہلی نظر مجھ پر پڑی تھی مجھے ہوش میں پا کر وہ فوراً میرے قریب آ گیا۔

"کیا ہوا ماورا... طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟" مجھے بمشکل گہری سانس لیتے دیکھ کر اس نے پریشانی سے پوچھا تو میں رونے لگی۔ اٹھنے کی کوشش میں بازو میں لگی ڈرپ کی سرنج کسی نس میں الجھ گئی تھی۔ ڈرپ میں خون کی آمیزش ہونا شروع ہو چکی تھی۔ سلامہ شاہ کی نظر جیسے ہی ڈرپ پر پڑی اس نے سرعت سے سرنج بازو سے نکال کر نس کے اوپر روئی رکھ دی۔

"میں ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔" میری کیفیت سے پریشان ہو کر وہ کہہ رہا تھا۔

"پانی... مجھے پانی پینا ہے۔" میں بمشکل کہہ پائی تھی۔ ...وہ دوڑ کر پانی لے آیا۔

سلامہ شاہ کے سہارا دے کر پانی پلانے پر میرے خشک کانٹے چبھتے حلق میں کچھ سکون آیا۔ میں اس کے سہارے لیٹے ہوئے گہری سانس لے رہی تھی ساتھ ہی میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

"ماورا... تم ٹھیک تو ہونا... میں [illegible] کو بلاؤں۔" کچھ تشویش سے دیکھتے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر وہ پوچھ رہا تھا۔ میں نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا [illegible] پھر سر ہلا دیا۔ [illegible] وہ بستر پر ہی بیٹھ گیا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر سہلانے لگا۔ مجھے ساتھ ساتھ [illegible] پرسکون رکھنے کی ہدایت کر رہا تھا۔ اس کی مدھم آواز سنتے سنتے مجھے پتا نہیں چلا کہ کب دوبارہ آنکھ لگ گئی۔

اگلے دن دوپہر کے قریب میں بیدار ہوئی تھی۔ [illegible] کی نسبت میری طبیعت کچھ ٹھیک تھی۔ فاطمہ ماما کمرے میں تھیں اور ان کے ساتھ پاپا بھی تھے جب کہ سلامہ شاہ کہیں نہیں تھا۔

"کیسی طبیعت ہے اب آپ کی..." مجھے پکارتے ہوئے ان کا یہ پرتکلف انداز رہتا تھا۔ انہوں نے متوجہ دیکھ کر پوچھا تو میں ان کے اس قدر نارمل انداز پر سر ہلا گئی۔ ایک تلخ سی مسکراہٹ میرے ہونٹوں پر سرایت کر گئی تھی اور ساتھ ہی میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

میرے مکمل طور پر صحت یاب ہوتے ہی مجھے ڈسچارج کر دیا گیا۔ اس دوران سلامہ شاہ دوبارہ نہیں آیا تھا اور اس کے نہ آنے پر میں نے سکھ کی سانس لی۔ ورنہ اپنے جذبات و کیفیت پر قابو پانا میرے لیے مشکل ہو جاتا تھا۔ خوامخواہ میرا دامن جھٹکنے لگتا تھا اور خود بخود میرے دل و دماغ میں نفرت کے جھکڑ چلنے لگتے تھے۔

طبیعت سنبھلی تو میں یونیورسٹی جانے لگی۔ میری تعلیم متاثر ہو رہی تھی۔ میں اکنامکس میں ماسٹرز کر رہی تھی۔

سارا دن یونیورسٹی میں گزار کر گھر لوٹی تو فاطمہ ماما کھانا ٹیبل پر سجائے میری اور پاپا کی منتظر تھیں۔ ٹیبل پر کافی اہتمام کر رکھا تھا۔ لباس بدل کر اور نماز ادا کر کے ابھی میں ٹیبل پر پہنچی ہی تھی کہ کال بیل بجی۔ وہ مجھے کھانے کا کہہ کر چلی گئیں۔ میں ابھی پلیٹ میں سالن ڈال رہی تھی جب ماما کے ساتھ سلامہ شاہ کو دیکھ کر میرا حلق تک کڑوا ہو گیا۔

"السلام علیکم..." مسکرا کر اس نے مجھے کہا تو میں بس سر جھکا گئی۔

"آپ بیٹھیں نا، رحمان بھائی نے مجھے کال کر دی تھی اسی لیے میں نے ڈنر کا اہتمام کر لیا۔ وہ کچھ آفس ورک کی وجہ سے لیٹ ہو جائیں گے۔ آپ بیٹا بیٹھیں اور کھانا شروع کریں۔ وہ تھوڑی دیر میں پہنچ جائیں گے..." ماما کے انداز سے محسوس ہوا کہ اس شخص کو پاپا نے مدعو کیا تھا۔ میرا دل برا ہوا۔ وہ میرے سامنے ہی ٹیبل پر کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ میرا کوفت سے برا حال ہو گیا۔ میں پہلو بدل کر رہ گئی۔

"تمہاری طبیعت کیسی ہے اب ماورا..." ماما نے اسے سالن ڈال کر دیا تو کھانے کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے اس نے

مجھ سے پوچھا۔ میرے چہرے کے اعصاب بھی کشیدہ ہو گئے تھے۔ جب کہ ماما کچن سے نکل گئی تھیں۔

"ٹھیک ہوں... تھینکس..." کڑواہٹ میرے لہجے سے صاف عیاں تھی۔

وہ میرے کڑوے لہجے پر مسکرا دیا اور اس کی مسکراہٹ دیکھ کر میرا چہرہ مزید سرخ ہو گیا۔

"اسٹوپڈ کہیں کا..." میں دل ہی دل میں کڑھی۔

"انکل بتا رہے تھے کہ تم اکنامکس کی اسٹوڈنٹ ہو۔" کچھ توقف کے بعد اس نے پھر پوچھا۔ یا تو میرے چہرے کے تاثرات نظر نہیں آ رہے تھے یا پھر سمجھ کر بھی انجان بن رہا تھا۔ خوامخواہ بے تکلف ہونے کے چکر میں تھا۔ میں اور تپ گئی۔

"جی... میں..." اندر ہی اندر کڑھ کر رہ گئی۔ ادھر سے ادھر پہلو بدلا۔ اس شخص کی موجودگی میرے لیے ناقابل برداشت تھی جلدی جلدی نوالے لینے لگی۔ ماما نہ جانے کہاں رہ گئی تھیں ابھی تک نہیں لوٹی تھیں۔

"اسٹڈی کیسی جا رہی ہے تمہاری..." وہ شاید میرے ضبط کی حد دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے گھورا۔ میں کھانے سے ہاتھ کھینچ چکی تھی۔ کرسی کھسکا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میری ذات یا میری اسٹڈی سے آپ کو کوئی دلچسپی نہیں ہونی چاہیے مسٹر سلامہ شاہ۔ آپ اپنے انکل کے مہمان ہیں اسی حد تک محدود رہیں تو بہتر ہے۔" پھنکار کر غصے سے کہتے مجھے اس کے قریب سے [illegible] کر باہر نکلنا تھا جب اس کے قریب سے گزرتے اس نے میری کلائی تھام لی تو میں ششدر رہ گئی۔ بے یقینی سے اس پر نظر ڈالی۔ ایک دم سنجیدہ چہرہ لیے وہ مجھے بغور دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ آج تک کسی کے اندر اتنی جرأت [illegible] ہاں [illegible] تھی [illegible] انگلی سے بھی چھو لے اور یہ شخص...

"اوہ... چھوڑو میرا بازو..." احساس توہین اور وحشت سے میری آنکھوں میں [illegible] جانے کو تھی۔ ایک دم ہاتھ کھینچا تھا۔ اگلے ہی لمحے میرا ہاتھ اٹھا تھا کچھ بعید نہیں تھا کہ میرا ہاتھ اس پر اٹھ جاتا [illegible] اس کا حشر بگاڑ دیتی مگر اسی دوران فاطمہ ماما کچن میں داخل ہوئیں ان کے ہمراہ پاپا بھی تھے۔

"معاف کرنا بیٹا کچھ دیر ہو گئی..." پاپا سلامہ شاہ سے کہتے ہوئے آگے بڑھے۔ میں اس پر ایک زہر بھری نظر ڈال کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

رات کو کھانا تیار کرنے کے لیے میں کمرے سے باہر نکلی تو کچن میں داخل ہوتے ہی پہلا سامنا اسی سے ہوا۔ میں تو سمجھی تھی کہ وہ چلا گیا ہو گا مگر اسے اس قدر بے تکلفی سے کچن میں چائے بناتے دیکھ کر حیران ہوئی نجانے ماما کہاں تھیں۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ میرے چہرے کے زاویے خود بخود بدل گئے۔

"ہیلو... کیسے مزاج ہیں اب... دوپہر کو تو بڑی گرماگرمی والی کیفیت تھی۔" اسے نظر انداز کر کے میں فریج سے رات کے کھانے کا سامان نکالنے لگی۔ مجھے ایک دم غصہ آ گیا گویا جان ہی تو جل گئی میری اس کی اس قدر بے تکلفی پر۔

"شٹ اپ..." میں پلٹ کر پھنکاری۔ میں تلملاتے ہوئے تمام چیزیں لے کر ٹیبل پر جا بیٹھی۔ وہ میرے اس قدر آگ بگولا انداز پر متبسم تھا۔ میں جل کر رہ گئی جب سے آیا تھا میرا جی جلا رہا تھا۔

"اتنا غصہ... وہ بھی مجھ ناچیز سے... ویسے اتنی نازک سی ہو تم... اس قدر غصہ کرنے سے مزید غضب ڈھانے لگتی ہو۔" وہ بھی اپنے مگ میں چائے لے کر میری طرف آ گیا۔

"سلامہ شاہ..." میں حیرت سے گنگ رہ گئی۔ کس قدر بے تکلفی پر اتر آیا تھا یہ شخص۔

"میں جب سے آیا ہوں تمہارا یہی مزاج دیکھ رہا ہوں جب کہ فاطمہ ماما تعریفیں کرتی نہیں تھکتیں تمہاری۔ ویسے غصے کے علاوہ اور کیا مشاغل ہیں تمہارے۔" اس نے حد ہی تو کر دی تھی۔

"بکواس بند کرو... میں پاپا کی وجہ سے آپ کو برداشت کر رہی ہوں اگر مزید آپ نے کوئی بے ہودگی کی تو میں آپ کا

سر پھاڑ دوں گی.... "بے بسی کی حد ہی تو تھی۔ میں تلملا کر ایک دم ہونٹ بھینچ گئی وہ مسکرا کر کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ میرا رواں رواں نفرت سے جلنے لگا۔

"آپ کا پاپا سے رشتہ ہے اس کو اسی حد تک رکھیں..... میں آپ لوگوں کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔"

"کیوں ایسا کیا گناہ کر دیا ہے ہم لوگوں نے؟ تم کزن ہو میری سگی، بہت قریب تعلق ہے ہمارا..... تمہارے کہہ دینے سے رد تو نہیں ہو جائے گا۔" وہ بہت ہی سنجیدہ ہو کر کہہ رہا تھا۔ میرے چہرے پر خود بخود اس کے الفاظ سے استہزائیہ مسکراہٹ آ ٹھہری۔

"بڑی خوش فہمی میں مبتلا ہیں مسٹر سلامہ شاہ آپ تو۔" اس کی طرف دیکھتے ہوئے میں مسکرا دی جب کہ میری آنکھوں میں صرف نفرت ہی نفرت تھی۔ "آپ کی کزن وہ بھی میں، یعنی ماورا رہبان غفار شاہ۔ کیا مذاق ہے زبردست بھئی..... "اب میں باقاعدہ ہنس رہی تھی۔ "میں ماورا حسن ساده سی لڑکی ہوں جو آپ جیسے اعلیٰ حسب نسب والے خاندان کے لیے کلنک کا ٹیکا ثابت ہوئی تھیں، حیرت ہے بھول گئے آپ تو..... جب کہ مجھے تو اچھی طرح یاد ہے بڑا اعلیٰ حسب نسب والا خاندانی خون ہے آپ کا تو جس میں میری ماں اور میری وجہ سے ملاوٹ ہو جاتی۔ چہ چہ چہ "ہنسی کی بجائے اب میرے لہجے سے نفرت ہی نفرت جھلک رہی تھی وہ لب بھینچے مجھے دیکھ رہا تھا۔

"آپ سے بھی کیا خوب جملہ بولا ہے۔ میں آپ کی کزن ہوں یعنی گہرا تعلق ہے میرا آپ سے..... یہ بھی خوب کہی آپ نے۔ "پھر میری ہنسی شروع ہو گئی تھی وہ کچھ کہتے کہتے ہی خاموش ہو رہی تھی۔ میں نے برسوں پہلے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے نفرت دیکھی تھی۔ اس کے لہجے میں رچی نفرت نے زہر گھولا تھا اور اسی زہر نے میرا روم روم نیلا کر دیا تھا اور اب اچانک "یہ کزن" والی بات ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

"بس کرو ماورا۔ یہ کیا بے ہودگی ہے۔" وہ تو بھڑک اٹھا میری مسلسل ہنسنے پر آخر کار وہ چیخ اٹھا اور میں یہی چاہتی تھی ایک دم ہنسی ضبط کیے اسے زہر بھری نظروں سے گھورا۔

"بے ہودگی نہیں سلامہ شاہ! حقیقت ہے۔ جسے آپ بھول رہے ہیں۔ کیوں مجھے میری اوقات سے باہر نکال رہے ہیں آپ۔ محترم! جب کہ میں اپنی حدود اور قیود اچھی طرح پہچانتی ہوں اور میرا آپ کو بھی مخلصانہ مشورہ ہے کہ آپ بھی اپنی اوقات اچھی طرح جان لیجیے۔ ورنہ حد سے تجاوز کریں گے تو منہ کے بل گریں گے۔ اونچے حسب نسب والے اعلیٰ خاندان کے پاک وصاف خون ہیں۔ کیوں آپ محترم مجھ گناہ گار کو مزید گناہ گار کر رہے ہیں۔"

زہر بھرے انداز میں اس کی آنکھوں میں بے خوفی سے آنکھیں گاڑ کر کہتے میں نے دس سال کی عمر میں حویلی میں گزارے ان چند دنوں کا قرض اتارا جنھوں نے میری روح کو نفرت کے تیروں سے گھائل کیے رکھا تھا۔

وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا تھا پھر ایک گہری سانس خارج کرتا وہاں سے اٹھ گیا۔ اس کے چلے جانے پر میں نے سر جھٹکا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مزید کچھ کہے گا مگر اس کے یوں بغیر کچھ کہے چلے جانے پر مجھے حیرت ہوئی۔

سلامہ شاہ ہوٹل چھوڑ کر اب یہیں رہنے لگا تھا۔ میرے ہی گھر میں رہتے میرے ہی سامنے مالکانہ حقوق کا استعمال کرتے وہ مجھے مزید زہر لگنے لگا تھا۔ اس کی وجہ سے میں نے خود کو مزید مصروف کر لیا۔ میری پوری کوشش ہوتی تھی کہ اس سے کم سے کم سامنا ہو۔ بعض دفعات یونیورسٹی میں کلاسز کے بعد بھی لائبریری میں بیٹھی رہتی۔ گھر آتی تو کمرے میں بند ہو جاتی۔

اب دن میں روٹین سے کچھ لیٹ ہو گئی تھی بھاگم دوڑ میں تیار ہو کر گھر سے نکلی تو وہ بھی پاپا کی گاڑی لیے کہیں جانے کو تیار تھا۔ میں اسے نظر انداز کر کے تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گئی مگر چند منٹ بعد ہی اس نے گاڑی میرے قریب ہی لا کر روک دی۔

"یونیورسٹی جا رہی ہو..... آؤ بیٹھو میں تمہیں ڈراپ کر دوں گا..... "دروازہ کھول کر اس نے مجھے آفر کی۔ میں نے اسے

دیکھا۔ اس دن کے بعد ہمارا سامنا بہت کم ہوا تھا لیکن مخاطب صرف چند ایک بار ہی ہوئے تھے۔ اس کے باوجود اس کے رویے میں میری کسی بات کا اثر نہ تھا۔

"نو تھینکس..... یہ میرا روزانہ کا معمول ہے..... میں بآسانی چلی جاؤں گی..... "کھردرے لہجے میں انکار کر کے میں نے اس سے مزید الجھے آگے بڑھنا چاہا تو اس کی بات پر رک گئی۔

"یہ ہر وقت کی "انا" بھی اچھی نہیں ہوتی ماورا ڈیئر..... ماضی میں جو بھی ہوا اس میں نہ تو میرا قصور تھا اور نہ ہی تمہارا..... کبھی غصے سے نکل کر بھی دیکھ لیا کرو..... تمہاری صحت پر اچھا اثر پڑے گا۔" مسکرا کر آنکھوں میں شرارت لیے وہ مجھے دیکھ رہا تھا۔ میرا تو برا حال ہونے لگا۔

"شٹ یور ماؤتھ..... آپ کو کوئی حق نہیں میری ذات پر یوں کمنٹس پاس کریں۔" تڑخ کر میں نے کہا۔ وہ کھل کر ہنسا۔ میرا خون کھول اٹھا۔

"حق کی بھی تم نے خوب کہی، ماورا اگلی عمر زادتو ہوں ہی مزید رشتہ بنانے میں دیر نہیں لگے گی۔ بشرطیکہ تم بھی اپنے دل میں تھوڑی سے گنجائش پیدا کرو۔"

میں غصے میں آگے بڑھ گئی تھی۔

سارا دن یونیورسٹی میں میرا جلتے بھنتے گزرا۔ اس کی اتنی جرأت اور اتنی ہمت کہ مجھ سے اس طرح کی بات کر رہا ہے۔ پیریڈ آف ہوتے ہی میں لائبریری میں چلی آئی۔ عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ کچھ دیر وہ کرسی کے ساتھ میرا مذاق اڑا رہے تھے۔ میں بچی تو نہیں تھی جو اس کے لفظوں کا مفہوم نہ سمجھتی۔ میں سارا وقت لائبریری میں بیٹھی رہی۔ گھر جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا پھر وہاں تھا کون جو میری راہ تکتا سوائے فاطمہ ماں کے جب کہ پاپا کو میرے وجود سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ رغبت۔ تو پھر وہاں جا کر میں کیا کرتی۔ ایک دم سے کو میرا دل شدت سے چاہا کہ میں یہاں سے کہیں چلی جاؤں کہیں ایسی جگہ جہاں کسی انسان کا وجود تک نہ ہو۔ بے بسی ہی بے بسی تھی۔ کتنی بار میری آنکھیں بہہ گئیں اور کتنی بار میں نے چپکے سے صاف کر لیں۔ یہ بے بسی بھی تھی کہ حل کر دیا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ یونہی بیٹھے بیٹھے نجانے کتنا وقت گزر گیا۔

"اس طرح فرار اختیار کرنا کسی بھی مسئلے کا حل نہیں ہوا کرتا..... مل بیٹھ کر مسئلے حل ہو جاتے ہیں۔ یوں چھپ چھپ کر رونے سے بہتر ہے کہ آپ کسی اپنے کے پاس بیٹھ کر کھل کر رو لیں اپنا دکھ کہہ لیں۔ یہ فرار سچ آپ کو سوائے منظر عام پر لانے کے کچھ نہیں..... "ابھی میں بھیگی آنکھوں سمیت وقت کا تعین ہی نہیں کر پائی تھی۔ جب اس آواز کے برعکس آنکھیں استہزائیہ انداز میں میرے ضبط کو جھنجوڑ گئی تھیں۔ وہ اس لحاظ

"آپ..... یہاں..... "مجھے توقع نہیں تھی کہ وہ یہاں کہیں ہوگا۔ وہ مسکرا کر اپنے دونوں ہاتھ ٹیبل پر جما کر میری آنکھوں میں بغور دیکھتے ٹیبل پر جھک گیا تھا۔

"فاطمہ آنٹی نے بھیجا تھا تمہیں تلاش کرنے کو..... بقول ان کے کہ آج سے پہلے کبھی تم اتنی دیر گھر سے غائب نہیں ہوئیں۔ انہی کی نشاندہی پر میں سیدھا یہاں پہنچا ہوں اور شکر ہے تم مل گئیں ورنہ مجھے خوار ہونا پڑتا..... "اب وہ سیدھا کھڑا ارد گرد کا جائزہ لے رہا تھا۔ میں بغیر کچھ کہے اپنی چیزیں اٹھا کر وہاں سے نکل آئی یہ دیکھے بغیر کہ وہ بھی آ رہا ہے یا نہیں۔ روڈ کراس کر کے میں اسٹاپ کی طرف جا کر بس روٹ دیکھنے لگی۔ سلامہ شاہ گاڑی لیے منتظر تھا۔ میں نظر انداز کر گئی۔ تبھی وہ گاڑی لے کر میرے قریب آ کر رک گیا۔

"چلو آؤ بیٹھو..... "دروازہ کھول کر وہ یوں کہہ رہا تھا جیسے میں فوراً بیٹھ جاؤں گی۔ غصہ تو بہت آیا مگر میں لب بھینچے کھڑی رہی۔

"مادرا... " وہ گاڑی سے نکل آیا۔ "مانا کہ ماضی میں ہم سے بہت سی غلطیاں ہوئیں مگر ہر وقت حال کا ماضی کے تناظر میں جائزہ لینا عقل مندی نہیں کہلاتا... مانا کہ تم مجھ سے شدید نفرت کرتی ہو اتنی کہ میری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی مگر میں تو تم سے نفرت نہیں کرتا۔ میں تو ہر وقت تمہاری صورت دیکھنا چاہتا ہوں یہ کیوں نہیں سمجھتی" اس کے اس غیر سنجیدہ انداز پر میں نے تڑپ کراسے گھورا۔

"اس طرح گھورنے سے مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ اس وقت میں خود نہیں آیا بلکہ بھیجا گیا ہوں۔ مجھے کوئی شوق نہیں ہے یوں ہی سڑک پر کھڑے ہو کر تمہاری منتیں کرنے کا... اب میرا وقت ضائع نہیں کرو... اتنا فالتو نہیں ہوں کہ تمہارے نخرے برداشت کروں..." وہ اب بھی بانک رہا تھا۔ میرا ضبط سے برا حال تھا۔ کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

"وہ ہیونی فل کپل" میں اسی طرح کھڑی تھی جب ایک ویسٹرن لڑکی پتی ستائشی نظروں سے سراہتی بے باکی سے کمنٹس پاس کرتی آگے بڑھ گئی۔ سلامہ شاہ تو یک دم قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ جب کہ میرا خفت سے برا حال ہو گیا۔ میرا چہرہ تپش سے جھلنے لگا۔

تم نہیں چاہتی کہ ایسا مزید کوئی جملہ ہم سنیں تو پلیز مزید وقت ضائع کیے بغیر اندر بیٹھو۔ ورنہ اردگرد لوگوں کو تم دیکھ ہی رہی ہو کہ کیسے ہمیں سراہ رہے ہیں" حسب توہین کی انتہا تھی مگر اس کے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ میں نے دزدیدہ نظروں سے اطراف میں نگاہ دوڑائی تو واقعی بہت سی نظریں اپنی طرف متوجہ دیکھ کر مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق میں اندر بیٹھ گئی۔

"پہلے میں آپ کو پہلے بھی کہہ چکی ہوں آپ کا تعلق سراب کا ہے... اپنی حد میں رہیں تو بہتر ہے۔"

"گاڑی سلو رفتار سے چل رہی تھی۔ وہ کسی شوخ سی دھن پر جھوم کر کہا۔

"بدنصیب... بکواس تو کر رہا تھا... آج یہ بات کہیں رکھ کر بھول گئی ہو۔" مخلوط انداز میں میرے اس طرز عمل سے وہ لطف اندوز ہو رہا تھا۔

"پلیز سلامہ شاہ تنگ ہوتی ہے کسی چیز کی۔ کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہو" اب کے میرے انداز میں بے بسی و لاچاری تھی وہ چہرہ موڑ کر مجھے غور سے دیکھنے لگا۔

"میں آپ کو صاف صاف کہہ رہی ہوں۔ آئندہ میرے راستے میں آنے کی قطعی ضرورت نہیں۔"

"اور میں بھی تمہیں کہہ رہا ہوں۔ میرا ہر راستہ تم تک ہی آئے گا۔ تم پہلی نظر سے ہی مجھے اچھی لگی ہو اور مجھے بہت کم چیزیں یوں اٹریکٹ کرتی ہیں۔" گاڑی روک کر وہ کہہ رہا تھا۔ میں حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

"میں کوئی چیز نہیں ہوں۔ جیتی جاگتی انسان ہوں۔"

"ہوں... پھر محبت تو واقعی جیتے جاگتے انسانوں سے ہی ہوتی ہے۔" وہ اب بھی غیر سنجیدہ تھا۔ شوخ سی مسکراہٹ تھی لبوں پر۔

"کیا بکواس ہے یہ... شرم آنی چاہیے آپ کو ایسی باتیں کرتے ہوئے۔" اس کے لفظ "محبت" استعمال کرنے پر میرا ضبط جواب دے گیا تھا۔ میری ذات کے گلی پرخچے اڑانے والا آج مجھ سے محبت کی بات کر رہا تھا۔ "ہونہہ آپ محبت کریں گے مجھ سے۔ نفرت کرتی ہوں میں آپ سے اور آپ کے پورے خاندان سے۔ میں آج بھی وہی مادرا ہوں، جسے انتہائی حقارت سے اپنی حویلی کی چار دیواری میں کھڑے ہو کر آپ نے کہا تھا کہ میں اپنی وقات سے آگے مت بڑھوں۔ وہی مادرا ہوں پھر آپ کیسے بھول گئے۔ جب کہ میں نے ہر لمحے ان کی بازگشت اپنے اندر محسوس کرتے نفرت کے پودے کو جو آپ کی ہی دین تھا پروان چڑھایا ہے اور اب آپ بات کرتے ہیں محبت کی۔ مجھے وہ سب یاد ہے۔ نفرت و اذیت کے زہر میں ڈوبا آپ کا کہا گیا ایک ایک لفظ۔ میں بھی اپنی

توہین نہیں بھولوں گی اور آپ نے ہی سلامہ شاہ مجھے اپنی حدود میں رہنے کی تلقین کی تھی اور اب آپ خود حدود کو پار کر رہے ہیں۔" جرتی ہوئی بھیگی آواز میں بمشکل سب کہہ پائی۔

"مادرا... میں نادم ہوں۔ جو بھی کہا وہ بہت جذباتیت میں کہا تھا بالکل نا سمجھی میں۔ تب میں بابا جان کے زیر اثر تھا۔ اب ایسی کوئی بات نہیں... میں سب اچھی طرح دیکھنے اور سمجھنے لگا ہوں۔ اب حقیقت آنکھیں بند کر کے دیکھنے کے بجائے آنکھیں کھول کر قبول کرنے لگا ہوں۔"

"مجھے آپ کی کوئی معذرت نہیں چاہیے نہ ہی آئندہ آپ میرے سامنے ایسی باتیں کریں گے۔ میں اگرچہ یہاں پلی بڑھی ہوں مگر میری تربیت جن ہاتھوں میں ہوئی ہے۔ انہوں نے مجھے ان لغویات سے نفرت کرنا ہی سکھایا ہے۔ آپ کچھ بھی کہیں مگر اپنے ماضی سے جدا نہیں ہو پائیں گے۔ دکھ تو وہیں گزر گئے لیکن میری نفرت تو ختم نہیں ہوگی۔"

بات یہیں ختم کر کے میں باہر دیکھنے لگی۔ وہ بول سکتا تھا مگر میں نہیں... اس کے بعد ہمارے درمیان بالکل خاموشی رہی تھی۔ وہ مجھے گھر چھوڑ کر چلا گیا اور میں نے اس کے اتنی جلدی ٹل جانے پر شکر ادا کیا۔

سلامہ شاہ کچھ دن سے میرے رویوں سے مایوس ہو کر شاید اپنی روٹین بدل گیا تھا۔ میں نے سکھ کا سانس لیا۔ ورنہ میں سوچ رہی تھی کہ اگر وہ باز نہ آیا تو میں پاپا سے ضرور شکایت کر دوں گی۔ مجھے اس کا بار بار آنا اور یوں ظاہر کرنا صرف فراڈ لگ رہا تھا۔ شاید اپنے ماضی میں موجود روا رکھے گئے رویوں کی وجہ سے اسے مجھ کو تسکین پہنچانا مقصود تھا۔ مجھے تو اس کی یہ محبت صرف اور صرف زچ کرنے کا ایک انداز لگ رہی تھی۔

پاپا اپنے آفس میں تھے فاطمہ ماما گھر کے لیے خریداری کرنے گئی ہوئی تھیں۔ یونیورسٹی سے آکر میں گھر پر تنہا تھی۔ کچھ دن سے سلامہ شاہ بہت مصروف رہنے لگا تھا۔ فاطمہ ماما سے ہی علم ہوا کہ وہ جس کام کے لیے آیا تھا اس کا آفس سیٹ ہو چکا ہے اب وہ جلد واپس چلا جائے گا۔ کال بیل کی آواز پر میں نے دروازہ کھولا تو سلامہ شاہ کو سامنے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ چند دن سے وہ اس وقت گھر میں کم ہی آتا تھا جب کہ آج تو پنج ٹائم بھی اوور ہو چکا تھا۔

"السلام علیکم..." وہ اندر آ گیا۔ میں اپنے کمرے کی طرف بڑھتی وہ بھی پیچھے ہی چلا آیا۔

"مادرا..." میرے یوں نظر انداز کرنے پر اس نے یک دم میرا بازو تھام کر اپنی جانب کیا۔

"سلامہ شاہ! پلیز اپنی حد میں رہیں... آئندہ مجھے ہاتھ لگانے کی غلطی نہ کرنا ورنہ میں سچ مچ تمہارا سر پھوڑ دوں گی۔" اس کی بدتمیزی پر میرا دماغ تو گھوم ہی گیا۔

"حد میں ہی تو ہوں مادرا ابھی تک... ورنہ جس چیز کو میں ایک دفعہ اپنے لیے پسند کرتا ہوں اس کے لیے مجھے کبھی اتنا خوار نہیں ہونا پڑتا۔ وہ لمحوں میں میرے قبضے میں ہوتی ہے مگر تم مسلسل مجھے خوار کر رہی ہو۔" تحکم رعونت لیے وہ کہہ رہا تھا۔

"مگر سلامہ شاہ چیزوں اور انسانوں میں بہت فرق ہوتا ہے اور شاید آپ کو اس فرق کا اندازہ نہیں تبھی میرے سامنے اپنی حاکمانہ فطرت کا مظاہرہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ مگر یاد رکھیں میں آپ کے بابا جان کی جاگیر نہیں۔ جس پر آپ اپنا حق جتائیں۔" میرا لہجہ زہرخند تھا۔ وہ لب بھینچے مجھے دیکھ رہا تھا۔

"جانتا ہوں... مگر تم میرے جذبات کو کیوں نہیں سمجھ رہیں..." اپنے لہجے کو کنٹرول کر کے بہت دھیمے پن سے کہا تو میں خاموش رہی۔ بار بار ایک ہی بات کو دہراتے اب مجھے خود بھی کوفت ہونے لگی تھی۔

"مادرا..." وہ میرے سامنے آ کر میرے چہرے پر بکھرے بالوں کو پیچھے ہٹاتے مسکرا رہا تھا۔ میں ساکت سی اس کی

جرأت پر گنگ رہ گئی۔ کتنا ڈھیٹ تھا یہ شخص۔

"میرے پاس بہت کم دن رہ گئے ہیں۔ میرا کام ختم ہو چکا ہے تقریباً..... تم اگر....."

اس کے ہاتھ کو جھٹک کر میں نے اپنے آپ کو کچھ بھی کہنے سے روکا۔

"نادرا..." میری لاتعلقی پر وہ زچ ہو گیا۔

"بہت ڈھیٹ انسان ہیں آپ... بڑا دعویٰ ہے آپ کو کہ محبت کرتے ہیں مجھ سے۔ کیا ہے محبت آپ کی۔ صرف مجھے جھکانا۔ درحقیقت میں نے پہلی ہی نظر سے آپ کی نفی کی تھی اور آپ کو یہی بات ہضم نہیں ہو رہی۔ میری نفرت کے جواب میں میری انا اور نسوانیت کو پامال کرنے کو محبت کہتے ہیں۔ کیا خوب ناٹک رچایا ہے آپ نے۔ مگر افسوس میں آپ کے لیول کی لڑکی ہوں ہی نہیں۔ مجھے آپ جسٹ فار انجوائے منٹ استعمال کر لیں۔"

"نادر... نادرا... غلط سمجھ رہی ہو تم... انتہائی غلط سوچ ہے تمہاری۔"

"تو درست کیا ہے۔ آپ بتا دیں..." میرا لہجہ طنزیہ ورا استہزائیہ تھا۔

"درست یہی ہے کہ میں دل کی تمام تر گہرائیوں کے ساتھ تمہیں اپنانا چاہتا ہوں۔ صرف تمہاری ہاں کا منتظر ہوں تاکہ میں پاکستان جا کر اپنے والدین سے تمہارے لیے بات کر سکوں مگر اس سے پہلے میں تمہارے اپنے متعلق تمام گلے شکوے دور کرنا چاہتا ہوں۔ تم جس خود ساختہ نفرت میں جکڑی ہوئی ہو اور سوچ رہی ہو ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ تمام غلط فہمیاں دور کرنا چاہتا ہوں۔ اپنے گزشتہ تمام رویوں کی تلافی کرنا چاہتا ہوں۔ بشرطیکہ تم تحمل سے میری بات سن تو سکو۔" وہ انتہائی زچ انداز لیے کہہ رہا تھا اور میں نے اس کی تمام باتیں سن کر کوفت بھرے انداز میں اسے دیکھا۔

"اگر میں آپ کے رویوں کو بھول کر آپ کی باتوں پر یقین کر بھی لوں تو سلامہ شاہ حقیقت ہے کہ آپ کا خاندان مجھے کبھی قبول نہیں کرے گا۔ سلامہ شاہ آپ کے اونچے حسب نسب کے دعویدار بابا جان تو ناجانے اٹھیں گی۔ بڑا مان ہے انہیں اپنے اعلیٰ خاندانی خون پر... وہ میرا خون کیسے برداشت کریں گے۔ بتائیں آپ پھر کیا کریں گے۔"

"اول یہ کہ وہ صرف میرا خاندان ہی نہیں تمہارا بھی خاندان ہے۔"

"ہاں ضرور ہوتا اگر وہ میری ذات کی نفی نہ کرتے مجھے اپنے اعلیٰ خون ہونے کا احساس نہ دلاتے میں ضرور خود کو ان سے منسلک کرتی اگر درمیان میں کچھ نہ ہوتا۔" میرے جواب پر اس نے ایک گہری سانس لی تھی اور ساتھ ہی مجھے یوں دیکھا جیسے میرا دماغ لا علاج ہو۔

"تو تم طے کیے ہوئے ہو کہ اپنا دل صاف نہیں کرو گی۔"

"نہیں ضرور کروں گی جب آپ کے بابا جان مجھے قبول کر لیں گے تب بات کیجیے گا۔ تب آپ کے متعلق میں کوئی جواب دوں گی۔ قبل از وقت کچھ بھی نہیں۔" کچھ دھیمے پڑتے میں نے کہا۔

"میں انہیں راضی کر لوں گا اور مجھے یقین ہے وہ ضرور راضی ہوں گے....." اس کا لہجہ پرعزم تھا۔

مجھے بہت برا لگا تبھی میں استہزائیہ ہنس دی۔

"ہونہہ... وہ راضی ہوں گے..... میں آپ کے خاندان کو اچھی طرح جانتی ہوں سلامہ شاہ! آپ نفرت کی بنیادوں پر ایک ناقص عمارت تعمیر کرنے کے صرف خواب بن رہے ہیں جب کہ میری ایسی کوئی حماقت کرنے کی خواہش نہیں۔ جس شخص نے پچیس سال گزرنے کے باوجود اپنے بیٹے کو معاف نہیں کیا۔ وہ شخص مجھے کیسے قبول کرے گا۔ بہت بڑی خوش فہمی میں مبتلا ہیں آپ تو....." نخوت سے سر جھٹکتے میں اپنے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ لاک کر گئی تھی کہ اس بحث کا کوئی حل نہیں۔

اب تو شاید سلامہ شاہ نے بھی ہار مان لی تھی۔ اس دن تفصیلی گفتگو کے بعد اس نے دوبارہ اس موضوع کو نہیں چھیڑا۔ دل تو ہمارا سامنا ہی کم ہوتا تھا۔ گر کبھی ہو بھی گیا تو میں فوراً وہاں سے ہٹ جانے کی کوشش کرتی تھی۔ یہاں لندن میں اس کا کام ختم ہو گیا تھا۔ وہ واپس جا رہا تھا۔ ٹکٹ کنفرم ہو چکی تھی۔ پاپا اس کے چلے جانے کے احساس سے ہی رنجیدہ ہو رہے تھے جب کہ میں پرسکون ہو گئی تھی۔ خوامخواہ میں اپنے گھر میں ہی قیدی ہو کر رہ گئی تھی۔

سلامہ شاہ کی کل رات کی فلائٹ تھی۔ آج وہ سارا دن گھر پر ہی تھا۔ چھٹی کا دن تھا میں اور پاپا بھی گھر پر ہی تھے۔ فاطمہ ماما سے اس نے اپنی پیکنگ کر دینے کو کہا تھا۔ وہ گھر سے نکلا تو ماما نے مجھے آلیا ور کہا۔

"نادرا! سلامہ شاہ نے مجھے سامان پیکنگ کر دینے کو کہا تھا مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ تم ہی میرے ساتھ آ جاؤ....."

میں چینل سرچنگ کر رہی تھی۔ انکار کرنا چاہا پھر خاموش ہو گئی۔ اب وہ اس عمر میں بے چاری تنہا کیا کیا کرتیں سارا گھر تو سنبھالا ہوا تھا انہوں نے۔ وہ مجھے چیزیں پکڑاتی گئیں اور میں ترتیب سے پیکنگ کرتی گئی۔ انہوں نے مجھے ایک فائل پکڑائی اس وقت کال بیل بجی۔

"تم کام کرو میں دیکھتی ہوں....." مجھے اشارہ کر کے وہ باہر نکل گئیں۔ میں فائل کے اندر موجود کاغذات کو ترتیب دینے لگی تمام آفیشل پیپرز تھے تبھی کاغذات کے درمیان رکھی کتنی تصاویر میرے ہاتھوں میں آ گریں۔ وہ ساری کی ساری میری تصاویر تھیں۔ میں حیران تھی سب کی سب وقتاً فوقتاً مختلف مقامات پر لی گئی تھیں بچپن سے لے کر اب تک کی کئی تصاویر کچھ یونیورسٹی کی تھیں اور کچھ گزشتہ سالوں کی۔ نجانے اس کے ہاتھ کیسے لگ گئیں۔

ان وصدک آنکھوں میں ایک تصویر چھپا رکھی ہے

اس دل کی دھڑکن [illegible]

مت پوچھ اے جان دلبرا حال اس بے حال کا

کبھی تھا جو وہ بہت فرحاں اب اکثر رات بھر وہ رویا ہے

ایک تصویر کی پشت پر یہ اشعار درج تھے۔ اشعار پڑھنے کے بعد میں بھی حیرانگی کے سمندر میں غرق تھی کہ جب پشت سے ہاتھ بڑھا کر کسی نے یہ تمام تصاویر کھینچ لی تھیں۔ پلٹ کر دیکھا تو وہ خونخوار چہرہ لیے کھڑا گھور رہا تھا۔

"میرے سامان کی اس طرح تلاشی لینے کا تمہارا کیا مقصد تھا؟....." وہ پوچھ رہا تھا اور میں اس کے یوں الزام لگانے پر تپ ہی گئی۔ "الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔"

"یہ تصاویر....." فی الحال لڑنے جھگڑنے کے بجائے میرا ذہن اسی میں الجھا ہوا تھا۔

"تمہاری ہیں....." آرام سے بتا کر اس نے تمام تصاویر اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں منتقل کیں۔

"میں اندھی ہوں جو مجھے اپنی صورت دکھائی نہ دی۔ یہ آپ کے پاس کیا کر رہی ہیں؟"

تصاویر پر قبضہ جمانے سے مجھے طیش آ گیا تھا۔

"کم از کم یہ بے جان تصاویر میرا کوئی کام کرنے یا باتیں کرنے سے تو رہیں۔ البتہ تصویر والی کبھی کبھار میرے تصور میں آ کر میرے تمہارا تیں ضرور آباد کر دیتی ہے۔ اکثر تو سینے پر سر رکھ کر....." اس وقت مجھے اس سے اس گھٹیا جواب کی قطعی توقع نہ تھی اور پھر اس کی جسم میں آگ لگا دینے والی مسکراہٹ شرم و حیا تو جیسے اس میں تھی ہی نہیں۔ یوں گھور رہا تھا کہ گویا آنکھوں سے ہی نگل لے گا۔ میرا چہرہ سرخ انگارہ ہو گیا۔ شرم سے برا حال تھا۔

"واپس کریں شرافت سے میری تصویریں....."

"نکال سکتی ہو تو نکال لو..... "جیب کے اوپر ہاتھ رکھ کر تھپتھپاتے ہوئے مسکرا کر چیلنجنگ انداز میں گویا تھا۔

تمام شرم و حیا کو یا گھول کر پی گیا تھا اور میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کے پرخچے اڑا دوں۔

"ڈوب مرو تم..... اچار ڈال لیجیے گا ان تصویروں کا مگر یاد رکھیں آپ کے یہ حربے اور ایسی باتیں میرے دل میں مزید شدید نفرت پیدا کریں گی۔"

میں پھٹ ہی تو پڑی تھی۔ اس کی اس قدر عامیانہ نظریں مزید برداشت سے باہر تھیں۔ وہ یکدم میرے قریب آ گیا۔

"بہت توہین کی ہے تم نے میرے جذبوں کی..... تمہارا کیا خیال ہے میں کوئی گرا پڑا اور فلرٹ طبیعت کا حامل ایک جذباتی انسان ہوں.. نہیں مادام ڈیئر.. میں کبھی عام سے عام چیز کے لیے بھی اپنے معیار سے نہیں گرا اور تم سے محبت کرنا میری زندگی کی سب سے پہلی اور بڑی حماقت ہے۔ کبھی کسی کے سامنے اس طرح چاہ دعا بیاں نہیں کیا۔ تم نے ہر بار میری پیش رفت پر میری تضحیک کی۔ میری بے لوث محبت پر شک کیا۔ یوں مذاق اڑایا۔ مگر اب نہیں میں بار بار اگر تمہاری راہ میں اپنے مقام و مرتبے کو بھول کر حائل ہو بھی ہوں تو صرف اس لیے کہ شاید اسی طرح تمہارے دل سے نفرت کا رنگ اتر جائے مگر اب مزید نہیں..... محبت تم سے کی ہے اور شادی بھی تم سے ہی کروں گا وعدہ ہے میرا

تم سے۔ اپنی عزت نفس کو کچل کر مردانگی وانا کو پس پشت ڈال کے تمہاری نفرت کو برداشت کیا ہے تو صرف اس لیے کہ مجھے تم سے محبت تھی۔ تمہیں اپنا اسیر نہ بنا لو تو کہنا۔ بے شک چیلنج سمجھ لو یہ"



مجھے وہ اچھی طرح ساکر کر کے نکل گیا تھا۔ حیرت کے مارے میں دیکھتی رہ گئی۔ جہاں سے وہ چند سیکنڈ پہلے نکل کر گیا تھا۔

سلامہ شاہ پاکستان چلا گیا۔ جس دن اس کو جانا تھا اس دن میں سارا دن اپنے کمرے میں بند رہی تھی۔ وہ چلا گیا تو میں باہر نکلی۔ اگلے دن یونیورسٹی سے گھر میں اپنے کمرے میں آ گئی۔ رات کو پڑھنے کے لیے کتابیں نکالنے کی طرف آ گئی۔ تین دن ہو گئے تھے مجھے کسی بک کو ہاتھ لگائے۔ ابھی میں کتابیں دیکھ ہی رہی تھی جب کتابوں کی ایک جانب گفٹ ریپر میں لپٹا گفٹ دیکھ کر میں ٹھٹک گئی۔ یہی وہ گفٹ تھا جو میری سالگرہ والے دن سلامہ شاہ نے مجھے دینا چاہا تھا اور میں نے انکار کر دیا تھا اور اب یہ گفٹ یہاں کیسے پہنچا۔ کون رکھ کر گیا۔ میرا ذہن الجھ گیا تھا۔ تمام کتابیں چھوڑ کر میں نے گفٹ اٹھایا۔ گفٹ کے نیچے ہی ایک بند لفافہ بھی دکھائی دے گیا۔ میں دونوں چیزیں لے کر بستر پر آ بیٹھی۔

"مادام ڈیئر!

ہو سکتا ہے جب تک یہ گفٹ تمہاری نظروں میں آئے میں یہ سرزمین چھوڑ جاؤں۔ تمہارے رویوں سے یہ تو اندازہ ہو گیا ہے کہ تم کبھی میری بات نہیں سنو گی۔ تمہاری نفرت اتنی گہری ہے کہ میری بے پناہ محبت اور لاتعداد کوششیں بھی اسے ختم نہ کر سکیں۔ تم مجھ سے نفرت کرتی ہو اور تم اس سلسلے میں حق بجانب بھی ہو۔ پہلی دفعہ جب تم ہماری حویلی آئی تھیں تو اس وقت میں نے جو کہا تم سے جو رویہ رکھا وہ بھی سچ ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ اپنے ابا جان کے بجائے میں بابا جان کے زیادہ قریب رہا ہوں۔ بابا جان کی طرح میری سوچ بھی تنگ نظر ہوتی گئی۔ مگر پھر جب خود سوچنے سمجھنے کی صلاحیت جاگی تو علم ہوا کہ بابا جان کہاں کہاں غلط ہیں اور ساتھ ہی اپنی کوتاہیاں بھی۔ میں اپنے متعلق کوئی صفائی نہیں دوں گا۔ جب میں نے مانا کہ میں غلط ہوں تو وہیں سے میں نے واپسی کی طرف سفر شروع کر دیا۔ یہاں آنا تم لوگوں سے ملنا اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ میں جب یہاں آیا تھا تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کبھی تم سے محبت کر بیٹھوں گا۔ تمہیں دیکھا اور جانا اور تب ہی بہت آگے تک سوچا... مگر تمہاری سوچ نے مجھے بہت ٹھیس پہنچائی۔ یہ گفٹ تمہارے لیے ہی خریدا تھا۔ اب واپس لے جا کر کیا کروں گا۔ امید تو نہیں کہ تم قبول کرو بے شک پھینک دینا۔ ہاں جب سے

میں یہاں آیا ہوں ایک دفعہ بھی تمہیں جیولری کے نام پر کوئی چیز پہنے نہیں دیکھی۔ ہماری حویلی میں بی بی جان اماں جی اور دونوں بہنیں سب ہی کچھ نہ کچھ پہنے رکھتی ہیں۔ خاص طور پر چوڑیاں تو ہر وقت۔ تمہیں یوں ہر وقت سر جھاڑ منہ پہاڑ رہتے دیکھ کر اکثر میرا دل چاہا تو کہ دیکھوں تو سہی تم چوڑیاں پہن کر کیسی لگتی ہو۔ یہ تحفہ بھی اسی خواہش کی تکمیل کے لیے خریدا تھا۔ مگر افسوس۔ اللہ حافظ۔

خط لفافے میں رکھ کر میں نے گفٹ ریپر پھاڑا۔ اندر کیا ہے علم تو ہو ہی چکا تھا۔ اب دیکھنے میں حرج ہی کیا تھا۔ سنہری ڈبیہ تھی ڈھکن کھولا تو کوندے کی جگمگاتی باریک کانچ کی طرح کی ڈھیروں چوڑیاں تھیں۔ شاید درجن بھر..... میں حیران دیکھتی رہ گئی۔ اتنی قیمتی سونے کی چوڑیوں کی مجھے امید نہ تھی۔ میرے تصور میں صرف کانچ کی چوڑیاں تھیں اور یہ تحفہ خوبصورت بھی تھا اور قیمتی بھی۔ میں نے بے دلی سے ڈھکن بند کر کے بیڈ پر ڈال دیا۔

نہ سلامہ شاہ کے خط نے میرے دل و دماغ پر کوئی اثر ڈالا اور نہ ہی تحفے نے۔ میں خاموشی سے کتابیں لینے دوبارہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

پاپا نے سلامہ شاہ کے چلے جانے کا بہت اثر لیا۔ اس کی فون کالز اور خطوط وہ اس کا وہ اکثر بے چینی سے انتظار کرنے لگے تھے نجانے انہیں کون سی چیز بے چین رکھتی تھی۔ بارہا میرا جی چاہا کہ خود سے پوچھوں مگر رسوں کی سرد مہری و جنبیت کی دیوار ہم دونوں میں حائل تھی وہ کچھ بھی پوچھنے نہیں دیتی تھی۔

آہستہ آہستہ وقت آگے بڑھنے لگا۔ دن ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں بدلنے لگے۔ سلامہ شاہ کی پیش قدمیاں اسی طرح قائم دائم تھیں۔ اکثر اس کے خطوط آتے رہتے تھے۔ کوئی خط میرے نام بھی ہوتا تھا۔ جس میں اکثر سلامہ شاہ نے اپنے جذبات کا اظہار شاعری کی زبان میں کر دیا ہوتا۔ شروع شروع میں جب اس کے خط آنے لگے تو اکثر میری کیفیت بدلنے لگی تھی مگر جب یہ معمول بنتا چلا گیا تو میں نے بھی خود پر قابو پا لیا۔ میں سلامہ شاہ کو روک نہیں سکتی تھی مگر اس سے محبت کرنا بھی میرے اختیار میں نہیں تھا۔ اسی خاندان کا لڑکا تھا، جنہوں نے نہ صرف مجھے بلکہ میری ماں کو بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ میں سلامہ شاہ کی تمام باتوں کو سچ مان لیتی تو یہ فراموش نہیں کر سکتی تھی کہ میری ذات کو ابھی تک پاپا نے بھی تسلیم نہیں کیا تو ان لوگوں سے کیا توقع۔

میرے سالانہ امتحان اسٹارٹ ہوئے تو ہر بات بھلا کر یکسوئی کے ساتھ کچھ تھیسس پروجیکٹ رہ گیا تھا۔ اسے کمپلیٹ کرنے لگی۔ دن رات میرے ادھر صرف ہونے لگے۔ خدا خدا کر کے یہ کام مکمل ہوا تو میں نے سکھ کا سانس لیا۔ یونیورسٹی کے بعد میں نے تھوڑا عرصہ آرام کیا اور پھر ایک کمپنی میں ملازمت ڈھونڈ لی۔

اس دن تھکی ہاری گھر لوٹی تو روزانہ کی ڈاک چیک کی۔ پاکستان سے میرے نام آنے والا خط میں بغیر کھولے ہی بتا سکتی تھی کہ بھیجنے والا کون ہے۔

"کیوں نہیں ہوتا یہ شخص..... "ہمیشہ کی طرح لفافہ چاک کرنے سے پہلے میں نے یہ سوچا تھا۔

"ڈیئر مادام!

میری اس قدر پیش رفتی پر وہی سرد موسم ہے لگتا ہے اپنا سکھ چین برقرار و سکون سب وہیں تمہارے پاس ہی چھوڑ آیا ہوں کیونکہ تمہارے سلوک نے مجھ جیسے خردمند کا کیا حشر کر دیا ہے۔ یہاں تو صرف خالی خولی وجود ہی لے کر آیا ہوں۔ اب مہینوں گزرنے کے بعد بھی وہی کیفیت ہے۔ میرے سب جذبے تو تمہارے پاس ہی رہ گئے ہیں۔ اب تو بقول اہل زبان شاعر کچھ یہی صورت حال محسوس ہوتی ہے کہ

کس پتھر کی مورت سے محبت کا ارادہ ہے
پرستش کی تمنا ہے' عبادت کا ارادہ ہے

جو دل کی دھڑکنیں سمجھے نہ آنکھوں کی زبان سمجھے نظر کی گفتگو سمجھے نہ جذبوں کا بیان سمجھے اسی کے سامنے اس کی شکایت کا جس سے محبوب کے سر پر جوں تک نہ رینگے۔ اب تو میرے بے سکونی پر ماں جی' بہنیں اور بی بی جان تک سب استفسار کرنے لگی ہیں۔ تمہارا نام لے لوں تو لوں تمہاری جانب سے پیش رفت تو ہو...... نہ میرا مقصد تمہیں رسوا کرنا ہے اور نہ ہی تمہاری تضحیک۔ میری مراد ہے۔ یوں سمجھو لو عشق کے اپنے ہی آداب ہوا کرتے ہیں مائی ڈیئر...... بس اتنی چھوٹی سی التجا ہے کہ اتنا پتھر مت بن کر خود ہی ٹوٹ کر بکھر جاؤ اور پھر ہم سے بھی ٹوٹ کر ملو کہ یہ ماں جی کی خواہش ہے... کسی روز احساس کے آئینے میں اک عکس ہی کافی ہے' انتظار کی صلیب پر جاں بلب' اپنے وعدے کے ایفا ہونے کا منتظر سلامہ شاہ۔ خط تھا یا لفظوں کی صورت میں جذبات کا ایندھن۔ میرے اندر خط پڑھ کر احساس کی کئی تند و تیز لہریں برپا ہو گئی تھیں۔ بہت کوشش کے باوجود میں اپنے ذہن سے تمام الفاظ کو جھٹک نہیں سکی تھی۔ حیرت و احساسات اور جذبات کا ایک سیلاب تھا جو میرے اندر موجزن کئی نیا تلاطم خیز طوفان برپا کر گیا تھا۔

"نہیں..... مجھے خود کو سنبھالنا ہے..... ورنہ کچھ ہاتھ نہیں آئے گا....." اس سے پہلے کہ میں تباہی مچا دینے والے طوفان کی نذر ہوتی جذبات کے سمندر سے نکل کر میرے ہوش کے کنارے لیتے عقل کا دامن تھام لیا تھا۔

سلامہ شاہ کو گئے ایک سال ہونے کو آیا تھا۔ اس ایک سال میں وہ صرف ایک دفعہ دو دن کے لیے لندن اپنے کسی آفس ورک کے لیے آیا تھا ان دنوں میں سرور لسٹ پایا ہوا تھا۔ فاطمہ ماما کے ساتھ میں ان کے بھائی ہاں گئی ہوئی تھی۔ اکثر ماما کے ساتھ میں ان کے رشتہ داروں کے ہاں چلی جاتی تھی۔ ماما کہتی تھی بیٹی جوان ہو گئی ہے۔ اس لیے جہاں بھی جاتیں مجھے ساتھ لیے رکھتی تھیں۔ ہم واپس لوٹیں تو معلوم ہوا کہ وہ آیا تھا۔ ماما کو بہت دکھ ہوا کہ وہ اپنے چچا کے بیٹے بھائی کے ہاں کیوں ہوتیں۔ جلد آ جاتیں تو سلامہ شاہ سے بھی ملاقات ہو جاتی۔ وقت کے ساتھ ساتھ میں نے خود کو بہت مضبوط کر لیا تھا۔ پاپا کی نفرت اور سرد رویے نے میرے دل میں کسی کے لیے بھی کوئی گنجائش نہیں رکھی تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے میں پاپا کے کسی بھی رشتہ دار کو قبول نہیں کروں گی جس طرح یہ لوگ لمحہ بہ لمحہ میرے لیے اذیت کا باعث رہے تھے اسی طرح میں بھی انہیں ٹھکرا دوں گی۔ جب سے مجھے علم ہوا تھا کہ پاپا بھی سلامہ شاہ کو میرے لیے پسند کرنے لگے ہیں تب سے میں نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ چاہے پاپا کا خاندان مجھے قبول کرے یا نہ کرے مگر میں سلامہ شاہ کو کبھی قبول نہیں کروں گی۔ جب پاپا کے دل میں میرے لیے کوئی گنجائش نہیں تو دوسرے جائیں بھاڑ میں..... میری نفرت مزید بڑھ گئی تھی۔

پھر ایک دن سلامہ شاہ کا فون آیا کہ اس کے بابا جان کو فالج کا اٹیک ہوا ہے۔ پاپا یہ سن کر بہت بے چین ہوئے۔ ان کی بے چینی دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ ان کے باپ نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا اور اب وہ سب بھلا کے ان کے پاس جانے کے لیے بے تاب تھے۔ سلامہ شاہ نے پاپا کو پاکستان آنے کو کہا تھا اور پاپا اسی چکر میں بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ میں بھی ساتھ ہی جا رہی تھی۔ دل تو نہیں چاہ رہا تھا مگر فاطمہ ماما کے سمجھانے اور پھر اس مقصد نے مجھے ماما جان سے اپنا آپ تسلیم کروانا ہے۔ میں جانے کو راضی ہو گئی تھی۔ میرے اور پاپا کے بے پناہ اصرار پر بھی ماما ساتھ چلنے کو تیار نہ ہوئی تھیں۔ یہاں ان کے بہن بھائی تھے وہ ان کے پاس جانے کی تیاریاں کرنے لگیں۔

پاپا پاکستان اپنی آمد کی اطلاع کر چکے تھے۔ ہمیں ائیر پورٹ سے ریسیو کرنے والا سلامہ شاہ ہی تھا۔ ایک سال کے عرصے میں اس کا رنگ روپ مزید نکھر آیا تھا۔ پہلے ہی پُر وجاہت تھا۔ اب مزید غضب ڈھانے لگا۔ میں دیکھ کر رہ گئی۔ پاپا سے معانقہ کرنے کے بعد مجھے بغور دیکھنے لگا۔

"کیسی ہو تم ماورا..." بظاہر سادہ سا سادہ انداز تھا مگر اس کی آنکھیں... میں لمحہ بھر کو بھی دیکھ پائی۔

"آئی ایم فائن..." جواب دینا ہی تھا۔ ایک عرصہ بعد سامنا ہو رہا تھا اس کے باوجود میرا لہجہ خود بخود سرد ہو چکا تھا۔ یہ میں لندن سے ہی طے کر کے چلی تھی کہ سلامہ شاہ کے لیے مجھے اپنے رویے و انداز میں ذرا بھی تبدیلی گوارا نہیں۔ وہ میرے سرد انداز پر مسکرا دیا۔

"ذرا بھی نہیں بدلیں... بالکل ویسی کی ویسی ہو۔" سر سے پاؤں تک میرا بغور جائزہ لیتے اس نے کہا تو میں اندازہ نہ کر سکی کہ یہ کمنٹس میرے سر جھاڑ منہ پہاڑ' حلیے پر یا سرد انداز پر۔

"چلیں۔" وہ سامان اٹھا کر پاپا کے ساتھ چلنے لگا۔ حویلی پہنچنے پر ہمارا خوب اچھی طرح خیر مقدم کیا گیا۔ سب کے رویے قدرے بدل ہی تھے۔ خاص طور پر بابا جان کو دیکھتے ہوئے۔ پاپا سے مل کر وہ خوب روئے تھے بار بار اپنے رویے پر معافی مانگ رہے تھے۔ میں خاموشی سے انہیں دیکھتی رہی۔ یہی وہ شخص تھا جس نے انتہائی حقارت و نفرت سے اپنے خاندانی مرتبے و خون پر فخر کرتے میرے وجود سے انکار کیا تھا اور اب...

وہ مجھ سے بھی اپنے گزشتہ رویوں کی معافی مانگ رہے تھے۔ رو رہے تھے۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ ان کی جانب سے نفرت سے منہ موڑ لوں۔ چیخ چیخ کر کہوں کہ میں آپ کی کچھ نہیں لگتی۔ میرا آپ سے کوئی تعلق نہیں مگر کس بنیاد پر..... جب کہ مجھے تو میرے باپ نے بھی قبول نہیں کیا تھا۔ وہ تو ان کے ہی ساتھ رہی تھی ایک عمر زندہ رہی تھی اور یہ تو پھر دادا تھا۔ میں خاموشی سے سرد و جامد تاثرات لیے بیٹھی رہی۔

رات کھانے کے بعد میں لان میں آ گئی۔ سلامہ دونوں بہنیں شادی شدہ اور سسرال میں ہی تھیں۔ علی اور رجا میرے ہم عمر تھے قد کاٹھ میں سلامہ شاہ کی طرح کے تھے مگر مزاج میں قدرے مختلف تھے۔

تھک کر میں سیڑھیوں پر آ بیٹھی۔ میں یہاں تو آ گئی تھی مگر اندر ہی اندر ماضی کے حوالے سے ملی شکست و ریخت کا شکار تھی۔ پاپا کی سرد مہری ماضی کے بابا کے رویے مسلسل میری سوچوں کا مرکز بنے ہوئے تھے۔

"کیا سوچ رہی ہو؟..... ایسے کیوں بیٹھی ہو....." حساب کتاب کرتے کچھ وقت سرکا تھا جب سلامہ شاہ کی آواز پر پلٹ کر میں نے دیکھا تو وہ میرے عقب میں ہی ستون سے ٹیک لگائے مجھ پر ہی نظریں جمائے ہوئے تھا۔ چاند اپنی آخری تاریخوں میں تھا بالکل مدھم روشنی میں وہ بھی کچھ اداس سا تھا جب کہ ستون کے اوپر نصب الیکٹرک ٹیوب کی دودھیا روشنی میں اپنی مونچھوں کو انگلیوں سے سنوارتے سلامہ شاہ ایک خواب ناک تصور ہی تو لگا تھا۔ سرمئی رنگ کے سوٹ میں اس کی پر رعب چھا جانے والی شخصیت واقعی متاثر کن تھی۔ مجھے اس بات کا اعتراف دل ہی دل میں ضرور کرنا پڑا۔ ایک نظر ڈال کر آسمان کی جانب زرد سے چاند کو دیکھنے لگی۔

"ماورا..... کچھ پوچھا ہے میں نے تم سے؟....." وہ کچھ دیر میری جانب سے شاید جواب کا منتظر رہا تھا۔ جب کافی دیر تک میں نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ جھنجلا گیا۔ خاصا حق جتانے والا انداز تھا۔

"میں تمہارے کسی بھی سوال و جواب کی پابند نہیں....." اس کے یوں حق جتانے پر میں نے خفگی سے دیکھا تو وہ مسکرا کر میرے پاس آ بیٹھا۔

"ذرا بھی نہیں بدلی تم..... میرا خیال تھا کہ وقت و حالات تمہاری سوچوں پر ضرور اثر انداز ہوں گے مگر تم تو..... اس طرح سرد گلیشیر جذبات لیے ہوئے ہو۔" وہ مسلسل مسکرا رہا تھا۔

"ہاں سچ کہا آپ نے..... میرا ظاہر و باطن ایک سا ہے پھر میں کیسے بدل جاتی..... شاید وقت ضرور مجھ پر اثر انداز ہوتا اگر ایک عرصے آپ لوگوں کی نفرت کا ذائقہ نہ چکھا ہوتا۔ یہ تذلیل کیے جانے کا دکھ اتنی جلدی تو نہیں مٹے گا۔ نفرت کی گہری تہہ ہے جو

میرے دل و دماغ پر جمی ہوئی ہے یہ چیز رفت تو ان کے لیے کچھ بھی نہیں۔" "میں ایک عام سی لڑکی نہیں ہوں جو یہ سب دیکھ کر گزشتہ بھول جائے۔"

"اور ماضی کو مسلسل یاد کرکے صرف اسی میں جیے جانا بھی عقل مندی نہیں ہے۔" میری بات کے جواب میں اس نے بھی طنزاً کہا تھا۔

"آپ کہہ سکتے ہیں میری جگہ اگر آپ ہوتے تو کیا کرتے..." میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ میرا لہجہ طنزیہ تھا۔

"میں ماضی پر ماتم کرنے کے بجائے حال کو سازگار بنانے کی کوشش ضرور کرتا کیونکہ یہ میرے اختیار میں تھا۔"

اس نے بغیر میرے طنز کا برا مانے مسکرا کر کہا تو مجھے اپنے اندر آگ سی سلگتی محسوس ہوئی۔

"میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ میں بابا جان کو راضی کروں گا۔ آج میں سرخرو ہوں تم کیا کہتی ہو۔ تم نے ہی تو کہا تھا کہ اگر بابا جان تمہیں قبول کرلیں تو تب بات کروں۔ اب سب کچھ نارمل ہے۔ تم اس خاندان کا ایک حصہ ہو اب کیا کہتی ہو؟" اس کے سوال پر میں کچھ بھی بول نہیں سکی تھی یہ سچ تھا کہ میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ [illegible] تو میں لندن سے طے کرکے آئی تھی مگر اب مجھے نہیں آ رہی تھی کہ کیا کہوں۔ امید نہیں تھی کہ وہ میری ہی بات کو میرے سامنے دہرائے گا۔

"سلامہ شاہ! جب [illegible] آپ کے سلسلے میں نے انکار کیا تھا تو اس کی بنیاد آپ خود تھے اور اب..... میں کبھی بھی اس خاندان کا حصہ نہیں رہی اور نہ ہی [illegible] بننا چاہوں گی۔ [illegible] میری بنیاد میرا تشخص [illegible] سے ہے۔ میں کبھی اس حویلی میں قدم نہ رکھتی اگر مجھے اپنی ذات کی پہچان [illegible] یہ خاندان آپ کا ہے۔ بس اس خاندان کا فرد ہونے کے باوجود یہاں کے لیے اجنبی ہوں اور ہمیشہ رہوں گی۔ میں [illegible] جس کے لیے آپ کے چچا نے سب کو ٹھکرا کر شادی کی تھی۔ میں آج بھی اس کی بیٹی ہوں اور کل بھی رہوں گی۔ [illegible] آپ کے بابا جان نے بیماری کے ہاتھوں مجبور ہو کر مجھے تسلیم کر بھی لیا ہے مگر میں کبھی تسلیم نہیں کروں گی۔ [illegible] صرف [illegible] لیے یہاں [illegible] ہوں۔ اب مجھ سے یہ سوال دوبارہ مت کیجیے گا۔ تب بھی یہی جواب ہوگا۔" انکار کرکے میں اپنی جگہ سے اٹھنے لگی تھی جب سلامہ شاہ نے تلملا کر میرا بازو تھاما۔

"تم میری اور میری محبت کی مسلسل توہین کر رہی ہو ماورا!" اس کی اس حرکت پر میں بھڑک اٹھی۔

"کیسی توہین سلامہ شاہ... چھوڑیں میرا بازو۔ یاد رہیں میں آپ سے کہہ چکی ہوں مجھ سے اس طرح پیش مت آیا کریں۔ ہر عمل کا ردعمل ہوتا ہے۔ میرا دل نہیں [illegible] آپ کے ہے تو زبردستی ہے کیا۔ میں آپ کے لیے راضی ہوتی ہوں یا نہیں یہ میرا حق ہے۔ آپ کون ہوتے ہیں چھیننے والے۔ اس طرح کی حرکتیں کرکے آپ مجھ پر اپنا [illegible] ثابت کریں گے سوائے محبت کے۔ مجھے آپ سے غرض ہے اور نہ ہی آپ کی محبت سے۔" اس کے شکنجے سے بازو چھڑا کر میں اس سے زیادہ مشتعل ہوئی تھی۔ وہ مجھے گھور رہا تھا۔ میں اٹھ کر اندر کی جانب بڑھنے لگی تو ایک دم اس نے میرا راستہ روکا۔

"سنو ماورا..... آج تک تمہاری نفرت میں نے محبت سمجھ کر سہی ہے صرف یہی سوچ کر کہ بعض اوقات شدید ترین نفرت بھی شدید ترین محبت کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ میں تم پر اچھی طرح واضح کر چکا ہوں کہ سلامہ شاہ کی یہ فطرت نہیں کہ جس کو وہ اپنے لیے ایک دفعہ پسند کرلے وہ پھر اس سے دستبردار ہو جائے۔ یہ میری محبت میری انا اور غیرت کو گوارا نہیں۔ تم سے محبت میری پوری زندگی کا معاملہ ہے۔ تمہیں چاہا ہے دل کی گہرائیوں سے۔ تمہاری پرستش کی ہے۔ تمہارے پیچھے ایک عرصہ خوار ہوا ہوں۔ جب یہ سب کچھ میری شخصیت کو زیب نہیں دیتا تھا۔ بار بار اپنی عزت نفس کو کچل کر تمہیں راضی کرنا چاہا۔ حتیٰ کہ تمہاری خاطر بابا جان جیسے سنگدل، ضدی انسان کی ضد کو موم کیا۔ صرف تم تک رسائی پانے کے لیے۔ ہر پل تمہارے احساسات کا خیال رکھا ہے۔ اب مزید نہیں۔ اتنا کچھ کرنے کے بعد انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں تمہیں جھکا کر یا توڑ کر حاصل نہیں کرنا چاہتا تھا مگر اب..... میری طلب، میری

جستجو، میری آرزو تم ہو..... ابھی تم نے میری ضدی فطرت اور شدت پسندی دیکھی نہیں..... میں توڑنا بھی جانتا ہوں اور جھکانا بھی..... ذہن میں رکھنا مائی ڈیئر....." وہ ایک دھمکی آمیز نظر ڈال کر آگ برساتے لہجے میں سب سنا کر زمین پر اپنے وزنی جوتوں کی دھمک پیدا کرتا اندر بڑھ گیا۔

* * *

پاپا اپنے بابا کی عیادت کے لیے آئے تھے لیکن یہاں آکر انہوں نے مستقل رہائش کا ارادہ کرلیا تھا۔ مجھے یہ جان کر بہت اذیت ہوئی مگر میں اب بھی ان کو کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہ تھی۔ ان کے فیصلے پر خاموش رہی۔ وہ لندن کچھ ضروری امور نمٹانے چلے گئے تو میرا دل نانو کے ہاں جانے کو چاہنے لگا۔ یہاں میں سب کی توجہ کے باوجود بولائی بولائی پھرتی تھی۔ بس میرا دل چاہتا تھا کہ میں یہاں سے بھاگ جاؤں۔ سلامہ شاہ اپنے کام کے سلسلے میں زیادہ تر شہر میں ہی رہتا تھا مگر ہر دوسرے دن وہ حویلی میں ہوتا تھا۔ اس کا [illegible] بدل چکا تھا۔ طنزیہ فقرے، ذو معنی جملے میرے ضبط کی انتہا تھی۔ نجانے میں کیسے ضبط کیے ہوئی تھی۔ نانو کی تقریباً روز ہی کال آرہی تھیں۔ وہ مجھ سے ملنا چاہتی تھیں۔ پاکستان آکر میں نے ان سے سب سے پہلے رابطہ کیا تھا اسی لیے وہ بے قرار تھیں۔ میں نے سبحان انکل سے جانے کی بات کی تو وہ مجھے [illegible] جانے کو تیار ہوگئے۔ سلامہ شاہ نے بہت مخالفت کی مگر بابا جان اور بی بی جان کے کہنے پر چپ ہوگیا۔ اس طرح میں نانو کے ہاں چلی آئی۔ انکل مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ میرا کچھ دن رہنے کا ارادہ تھا۔

ماضی کے رویوں کے برعکس سب لوگ محبت سے ملے تھے۔ [illegible] گزشتہ رویوں کو بھول گئی تھی۔ لیکن یہاں اب ابھرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ جہاں رہ رہا تھا وہاں میں بھولی نہیں تھی۔ ساری [illegible] ٹھیک سے ملی تھیں۔ ان کے بچے سب ہی ملنسار تھے۔ ان سب کے لیے میرا لندن پلٹ ہونا خاص اہمیت رکھتا تھا۔ [illegible] مضبوط خاندانی پس منظر توجہ کا حامل تھا جو بھی تھا یہاں آکر حویلی کی نسبت میں نے زیادہ اطمینان محسوس کیا تھا۔ سب ہی کزنز لڑکے اور لڑکیاں ہم عمر تھے۔ خوب رونق ہوئی تھی۔ البتہ ان سب میں مجھے طیبہ مامی کا بڑا بیٹا شہریار برا لگا تھا۔ وہ شاید مجھ سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہوگیا تھا۔ بے چارہ ہر وقت مجھے امپریس کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔ وہاں حویلی میں سلامہ شاہ جان کا آزار تھا اور یہاں شہریار وبالِ جان ہوگیا۔ مجھے حیرت بھی ہوتی اور ہنسی بھی آتی وہ طیبہ مامی، جنہیں کبھی میرا یہاں مستقل رہنا بہت کھٹکا کرتا تھا۔ وہی اب مجھ پر دل و جان سے فریفتہ ہو رہی تھیں۔ دونوں ماں بیٹا کچھ زیادہ ہی متاثر ہوئے لگ رہے تھے۔ چلیں ان کے برعکس دیگر لوگ گزارے لائق تھے۔ اسی لیے میں انہیں نظر انداز کر جاتی تھی۔

رات کو میں اپنے کمرے میں تھی جب ملازمہ نے مجھے فون کی اطلاع دی۔ میں باہر آگئی۔

"ہیلو....."

"السلام علیکم..... میں سلامہ شاہ بات کر رہا ہوں....." دوسری طرف سے فوراً تعارف کرایا گیا۔ تعجب کے ساتھ میں نے ایک گہری سانس لی۔

"جی فرمائیے..... کیسے زحمت کرلی۔" حسب عادت میرا لہجہ سرد ہوگیا۔

"تم کب واپس لوٹ رہی ہو؟" جواباً وہ بھی آرام سے پوچھنے لگا۔

"فی الحال میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں..... اس ہفتے تو میں بڑی خالہ کے ہاں جاؤں گی اس کے بعد چھوٹی خالہ کے ہاں اگر جلدی فرصت مل گئی تو سوچوں گی....." جس طرح وہ میرے رویے سے چڑ رہا تھا میرا دل بھی اس کو چڑانے کو چاہ رہا تھا۔ میں نے اسے اپنا پروگرام سنایا۔

"کوئی ضرورت نہیں تمہیں اس طرح ادھر ادھر سیر سپاٹے کرنے کی۔ جلدی واپس آؤ۔ دو تین دنوں میں چچا جان واپس آ رہے ہیں اور تمہیں ان کے آنے سے پہلے یہاں ہونا چاہیے۔ بہت مل لیا تم نے اپنے رشتہ داروں سے......" وہ جس طرح حاکمانہ لہجے میں کہتا مجھ پر حکم چلا رہا تھا اس سے میرا خون کھولنے لگا۔

"میں آپ کی پابند نہیں ہوں کہ آپ کے حکم پر دوڑی چلی آؤں گی۔ حاکم ہوں گے آپ اپنی جاگیر کے.... جب جی چاہے گا آؤں گی۔"

"ماہ راجی! میں نے تمہیں کہا ہے نا کہ تم واپس آؤ۔ سمجھ میں نہیں آ رہا جو کہہ رہا ہوں وہ کرو۔" میرے غصہ دلانے پر وہ غصے سے کہنے لگا۔

"اور شاید آپ کو بھی سلامہ شاہ میری بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔ میں فی الحال نہیں آؤں گی اور نہیں کا مطلب ہوتا ہے نہیں سمجھے آپ" دو ٹوک انکار کر کے میں نے کھٹاک سے فون بند کر دیا۔ ابھی میں گہری سانس لے کر واپس پلٹی ہی تھی کہ دوبارہ گھنٹی بج اٹھی۔

"اب کون ہے؟"

"ماہ راجی... میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا کہ میرے صبر کو آزمائش مت دو۔ تمہیں یہ دھمکی مہنگی بھی پڑ سکتی ہے۔ سوچ لیں۔ کل صبح میں وہیں جا رہا ہوں۔ تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے بہرحال۔ لینے آؤں گا تمہیں تیار رہنا۔ بصورت دیگر جو بھی کروں گا پھر بھگتنا۔" جیسے ہی میں نے فون اٹھایا تھا اس نے پھنکارتے ہوئے کہہ کر فون بند بھی کر دیا اور میں ریسیور کو گھور کر رہ گئی۔

اگلے دن ناشتہ کر کے میں دوبارہ سوئی... دس بجے کے قریب نانو نے مجھے آ کر اٹھا دیا۔

"حویلی سے تمہارے دادا ابو کا فون آیا تھا وہ کہہ رہے تھے کہ تم آج ہی حویلی پہنچو کل تک تمہارے پاپا پاکستان آ رہے ہیں۔ تمہیں لینے تمہارا تایا زاد سلامہ شاہ پہنچا ہوا بیٹھا ہے۔"

انہوں نے مجھے بتایا تو میں ہونق چہرہ لیے انہیں دیکھتی رہ گئی۔

"مگر نانو مجھے تو ابھی کچھ دن رہنا تھا..."

"میں نے سلامہ شاہ سے کہا بھی تھا لیکن وہ مان ہی نہیں رہا... کہہ رہا تھا کہ تمہیں لے کر ہی جائے گا... پھر تمہارے دادا کا فون آ گیا اور میں انکار نہ کر سکی... جلدی سے تیار ہو جاؤ وہ نیچے انتظار کر رہا ہے۔"

سلامہ شاہ یوں اپنی دھمکی پر عمل کر کے دکھائے گا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا میں روہانسی ہو گئی۔ یہ شخص مجھے اپنی زندگی کی سب سے بڑی آزمائش لگا۔

"تم ہاتھ لے لو میں اقرا کو بھیجتی ہوں وہ تمہاری پیکنگ کر دے گی۔" نانو ہدایت دے کر باہر نکل گئیں اور میں بے بسی سے سر تھام کر رہ گئی۔

"کتنا چالاک اور حاکم طبیعت کا مالک ہے یہ شخص۔" میں کلستے ہوئے کپڑے لے کر باتھ روم میں گھس گئی۔ تیار ہو کر اپنا بیگ لے کر نیچے آئی تو وہ نانا جان کے ساتھ بیٹھا باتیں بگھار رہا تھا۔ مجھے مع سامان کے دیکھ کر اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ چمکی۔ جب کہ میں اندر ہی اندر بل کھاتی رہی۔

اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بھی میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اس شخص کو شوٹ کر دوں نجانے کیسے خود پر ضبط کر رہی تھی۔

"کیسے ماہ راجی! کیسے گزرے دن؟" گاڑی اسٹارٹ کر کے گیٹ سے نکالنے کے بعد بہت فاتحانہ مسکراہٹ لیے پوچھ رہا تھا میں تلملا کر رہ گئی۔

"بات نہیں کریں مجھ سے...." بے بسی نے آنکھوں میں مرچیں لگا دی تھیں۔

"اف اتنا غصہ...." وہ ہنس رہا تھا۔ "یار تم سے بات نہیں کروں گا تو پھر کس سے کروں گا۔ اس وقت تم ہی مجھے دستیاب ہو۔ یوں بھی اب تم ایسی بے مروت تو مت بنو.... میں تمہارے اس گھونچو کزن سے ہزار درجے بہتر ہوں۔ فرسٹ کزن ہوں بہت حق بنتا ہے میرا...." وہ مسلسل سلگتے ہوئے لہجے میں مسکرا کر میرا جی جلا رہا تھا۔

"میں نے آپ کو کہا بھی تھا کہ ابھی کچھ دن رہنا چاہتی ہوں۔" بے بسی سے میرا برا حال تھا۔

"رات فون کر کے میں نے تمہیں اسی لیے خبردار کر دیا تھا۔ اب کچھ کہنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔" میرا جی جل کر رہ گیا۔

"آپ... کتنے برے ہیں، میرا پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتے... کیوں میری جان کو آ گئے ہیں۔" میری آواز یکدم بھرا گئی تو اس نے بھی گاڑی کو بریک لگائے۔

"محبت کرتا ہوں تم سے کیسے چھوڑ دوں تمہیں... بہت آسان ہے... پیچھے چلنا میرا شیوہ نہیں۔ تمہاری عقل میں میری یہ بات نہیں آ رہی...."

"میں کچھ نہیں سمجھتی اور نہ ہی سمجھنا چاہتی ہوں۔ میں یہ اچھی طرح سے جان چکی ہوں اور آپ کر سکتے ہیں۔ خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دیں، مجھے معاف ہی رکھیں۔" ... میں واقعی رو دینے کو تھی۔ میری آنکھوں میں آنسو ٹھہرے تھے۔ جنہیں میں روکنے کی کوشش میں تھی۔

"تم ایسی ادائیں دکھاؤ گی تو سچ کہہ رہا ہوں ... مشکل ہو جائے گا۔" میں کہیں رستے میں ایکسیڈنٹ ضرور کر بیٹھوں گا۔ بہتر ہے خود پر کنٹرول رکھو۔" میرے آنسوؤں کی جانب اشارہ کرتے سلگتے انداز میں اس نے مجھے بری طرح ٹوک دیا۔ میں نے فوراً اپنا چہرہ صاف کیا۔ نجانے کیا ہو رہا تھا مجھے جو خود پر کنٹرول کرنا مشکل لگ رہا تھا۔ میں بھری آنکھوں سمیت رخ موڑ کر دوسری جانب دیکھنے لگی۔ وہ گاڑی اسٹارٹ کر چکا تھا۔

کسی پتھر کی مورت سے محبت کا ارادہ ہے پرستش کی تمنا ہے عبادت کا ارادہ ہے وہ دھیمے سروں میں ڈرائیونگ کرتے

"اسٹیرنگ پر اپنی انگلیاں بجاتے شوخ سی آواز میں گنگنانے لگا۔" گاڑی کے خاموش ماحول میں میری "سوں سوں" کے ساتھ اس کی آواز عجیب ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔

جو دل کی دھڑکنیں سمجھے نہ آنکھوں کی زباں سمجھے نظر کی گفتگو سمجھے نہ جذبوں کا بیاں سمجھے اسی کے سامنے اس کی شکایت کا ارادہ ہے

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں پہلو بدل کر رہ گئی۔ وہ اس درجہ شوخ جسارت پر اتر آئے گا میں لق و دق تھی۔ اپنی ظاہری شخصیت کے ساتھ بلاشبہ ایک خوبصورت گنگناتی آواز کا بھی مالک تھا۔ گیت کے بول ماحول کے ہم آہنگ تھے۔ مجھے یکدم اس کا خط یاد آ گیا جو اس نے لندن بھیجا تھا۔ اس میں بھی یہی اشعار تھے۔ میں صرف اپنے اوپر ضبط کیے گئی رہی۔

یہ سوچا ہے کہ دل کی بات اس کے روبرو کہہ دیں نتیجہ کچھ بھی نکلے آج اپنی آرزو کہہ دیں اس کی شوخ آواز مسلسل میرے اعصاب کو جھنجوڑ رہی تھی۔ میں بالکل لاتعلق ظاہر کیے باہر دیکھتی رہی جب کہ ذہن اس کے صرف ایک لفظ میں کھویا ہوا تھا۔

محبت بے رخی سے اور بھڑکے گی وہ کیا جانے طبیعت اس ادا سے اور بھڑکے گی وہ کیا جانے کہ اپنا کس قیامت کا ارادہ ہے۔ شوخ آواز میں گاتے اس نے میری طرف دیکھا تھا اسی دوران میں نے بھی پلٹ کر دیکھا تو وہ بھرپور انداز میں ہنس دیا۔ میں فوراً نظر پلٹ گئی۔ نجانے میں کیسے خود کو سنبھال رہی تھی۔ اپنی خودداری وانا اور نسوانیت کا پاس نہ ہوتا تو ایک لمحے کی دیر میں ٹوٹ کر رہ جاتی

ریزہ ہوتے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑتی تھی۔ میں بھی انسانی جذبات و احساسات کی مالک کب تک خود کو پتھر بنائے رکھتی جبکہ وہ مسلسل میرے پتھر جذبات کو پگھلانے کے درپے تھا۔

کسی پتھر کی مورت سے محبت کا ارادہ ہے پرستش کی تمنا ہے 'عبادت کا مادہ ہے وہ شوخ آواز میں مسلسل ان لفظوں کی تکرار کر رہا تھا۔ میری آنکھوں سے میرا دل بھی قطرہ قطرہ ٹپکنے لگا۔ آخر یہ شخص چپ کیوں نہیں ہو جاتا۔ چہرہ موڑے میں صرف رو رہی تھی۔ جب کہ میرے دل کی بستی نجانے کن طغیانیوں کے زیر اثر تھی۔ پہلی بار مجھے اپنی شکست کا احساس ہو رہا تھا کہ اگر اس طرح وہ میرے ضبط کو آزماتا رہا تو کسی دن میں واقعی ہار جاؤں گی۔

"ماورا ... " کچھ توقف کے بعد اس نے پکارا۔ "ماورا ..." اب کے اس نے میرا کندھا تھاما تو میں چیخ اٹھی۔

"کیا چاہتے ہیں آپ مجھ سے ... میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکتی ... نہیں کر سکتی قبول میں آپ کی محبت .... میرے دل میں نہیں ہے آپ کے لیے گنجائش ... جب سب جانتے ہیں تو پھر بھی کیوں میرا سکون برباد کر رہے ہیں ..... کیوں میری جان لینے کے درپے ہیں ... "

میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی ... وہ بغیر جواب دیے مسلسل گاڑی ڈرائیو کرتا رہا۔

"ساری بات یہ ہے ماورا کہ میں سب کچھ بھول کر بھی تمہاری جانب سے بری طرح ہونے والے ردعمل کے اظہار کو نظر انداز نہیں کر پا رہا ..... تمہیں حاصل کرنا میرے لیے مشکل نہیں ہے۔ میں آج ہی جان سے بات کروں تو تم آرام سے میری زندگی میں شامل ہو جاؤ گی۔ تمہارا حصول میرے لیے مشکل ہے نہ ہی ناممکن ... ساری بات دل کے تعلق کی ہے جو مجھے کوئی انتہائی قدم اٹھانے نہیں دیتا ... مجھے نہ جانے کیوں آج بھی یقین ہے تم ضرور بدلو گی۔ شاید اس لیے میں مسلسل خود کو تمہاری نظروں سے گراتا چلا جا رہا ہوں لیکن یہ سچ ہے نہ میری محبت کوئی فریب ہے اور نہ میرے جذبوں کی شدت میں کوئی کھوٹ میں صرف تمہیں راضی کرنا چاہتا ہوں۔ اتنی گہری نفرت کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی جب کہ اب تو سب حالات نارمل ہو چکے ہیں تو پھر تمہارا یوں رود کرنا آخر کیا وجہ ہے۔ جب تک تم وجہ نہیں بتاؤ گی میں پیچھے نہیں ہٹوں گا۔" کچھ دیر بعد میرے چپ ہونے پر اس نے یہ سب کہا تھا۔

"آپ صرف ایک لاحاصل کے لیے بھاگ رہے ہیں اور کچھ نہیں ... اگر آپکا یہی ارادہ ہے تو بخوشی بھاگتے رہیں مگر میں وہی رہوں گی ... " اب میں خود کو سنبھال چکی تھی۔ وقتی جذبات کا سمندر اتر چکا تھا۔ شاید سلامہ شاہ نے میری طرف دیکھ کر کچھ کہنا چاہا پھر وہ لب بھینچ گیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی سرد کیفیت اتر آئی تھی جو میری سمجھ سے بالاتر تھی۔

اگلے ہی دن پاپا بھی لوٹ آئے۔ سلامہ شاہ کا رویہ کبھی بے حد لونگ ہو جاتا اور کبھی بے حد سرد۔ انہی دنوں نانا نانی اور ماموں ممانی شہریار کا رشتہ لے کر آ گئے۔ میں جو سلامہ شاہ کی طرف سے پریشان تھی اب شہریار کے نام کے دو حرف نے آ گیا۔ میں کشمکش و پیچ میں تھی پاپا اور دیگر لوگوں نے سوچ کر جواب دینے کو کہا تو وہ لوگ پرامید انداز میں واپس لوٹ گئے۔ تیسرے دن سلامہ شاہ آ گیا۔ میرا خیال تھا کہ آتے ہی وہ ضرور باز پرس کرے گا طنز و تمسخر سے نوازے گا مگر رات تک خیر خیریت ہی رہی۔ سارا دن تو نہیں البتہ رات کو میرے کمرے میں آیا۔ میں بستر پر لیٹی ہوئی تھی اسے دیکھ کر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"کسی کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے شاید دستک دی جاتی ہے۔ لگتا ہے آپ کو ایسے آداب سکھائے نہیں گئے ....." اس کے یوں دندناتے کمرے میں گھس آنے پر مجھے بہت غصہ آیا۔ جتنی میں کوشش کرتی تھی کہ اس سے متعارض کم ہو اتنا ہی وہ مجھے اشتعال دلاتا تھا۔

"ایسی اخلاقیات کا مظاہرہ اجنبیوں کے لیے کیا جاتا ہے تم تو پھر میری اپنی ... "

"کیوں آئے ہیں یہاں؟" اس سے پہلے کوئی ناقابل برداشت جملہ اس کے منہ سے نکلتا میں نے گھبرا کر پیش بندی

کرتے ہوئے پوچھا۔ اس کا مسکراتا چہرہ مزید چمکنے لگا۔

"تمہیں مبارکباد دینے آیا ہوں۔ خیر سے تمہاری شادی کی تاریخ طے پا گئی ہے۔ عید الاضحیٰ کے پورے آٹھ دن بعد ..." بڑے آرام سے میرے حواس پر بم پھوڑے وہ کرسی پر ٹک گیا اور میں ہونق بنی دیکھ رہی تھی۔

"تو گویا پاپا نے تن تنہا ہی میری زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ مجھ سے پوچھے 'میری رضامندی جانے بغیر کر دیا ... " میں بے یقین تھی۔

"یہ تو میرے کل ہی فون کرنے پر اماں جی نے یہاں کی صورتحال بتائی تھی۔ فوراً سب کام چھوڑ کر بھاگا ہوں۔ ورنہ وہ کھونچو شخص سچ مچ تمہیں لے اڑتا اور میں تمہارے راضی ہونے کے انتظار میں ہاتھ ملتا رہ جاتا ......" وہ مزید کہہ رہا تھا اس کے اگلے جملوں نے میرے چھکے چھڑا دیے تھے۔ کتنا مطمئن تھا اب کے میں نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" میں ایک دم بے چین ہو گئی۔ سلامہ شاہ کے چہرے کی گہری طمانیت 'سو وہ حال فتح مند مسکراہٹ بہت سے ان کہے بھید کھول رہی تھی۔

"میں نے پھوپھو جان وغیرہ کو منع کر دیا ہے جب خاندان میں متبادل رشتہ موجود ہے تو پھر وہ لوگ باہر دیکھتے بھی کیوں ..... چچا جان تو خود بھی چاہتے تھے اور میرے لیے تو یہ زندگی اور موت کا معاملہ ہے پھر کیسے چوک جاتا۔ تم سے محبت کی ہے ماورا شاہ۔ تم میری ہو اور ہمیشہ رہو گی۔ کسی کو اعتراض نہیں۔ اس طرح منگنی بھی وہ کے مقرر وقت شادی کی تاریخ طے ہو چکی ہے۔"

وہ انکشاف پر انکشاف کر رہا تھا اور میرا سارے کا سارا وجود جیسے پتھر کا بن رہا تھا۔ سارے حواس گویا مختل ہو گئے تھے۔ پاپا یوں بھی کریں گے۔ ساری زندگی ہمیشہ لاتعلق رہے۔ میرے ساتھ ناانصافی کی حد تک نفرت بھرا رویہ رکھا اور اب میری زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ بغیر مجھ سے پوچھے۔ میری رضا جانے 'مجھے بتائے بغیر کر دیا۔ جیسے کوئی پتھر کی مورت ہوں جس کی کوئی حیثیت نہیں۔ میرے ذہن کو شدید جھٹکا لگا۔ سلامہ شاہ کی طرف سے نہیں پاپا کی جانب سے۔

"ماورا ..... لگتا ہے ..... اس خبر نے تمہارے حواس پر کچھ زیادہ ہی اثر کر دیا ہے۔"

"مجھے یوں بے حواس اپنی طرف گھورتے دیکھ کر وہ کرسی سے اٹھ کر میری طرف آیا۔

"نہیں ..... پاپا مجھ سے پوچھے بغیر اتنا بڑا قدم نہیں اٹھا سکتے ..... ہرگز نہیں ... جھوٹ بولتے ہیں آپ ... " یکدم حواسوں میں آ کر میں اس پر الٹ پڑی۔

"دھیرج سے ..... کول ڈاؤن ڈیئر ..... ایسا تو ایک دن ہونا ہی تھا۔ وہ اگر تم سے پوچھتے تو اتنا بڑا فیصلہ کبھی نہ ہوتا ..... ویسے بھی ہمارے خاندان میں لڑکیوں سے ان کی مرضی نہیں پوچھی جاتی۔ فیصلہ سنایا جاتا ہے۔" انتہائی غرور سے کہتا وہ میری حالت سے لطف اٹھا رہا تھا۔

"میں کبھی تم سے شادی نہیں کروں گی۔ سنا تم نے ..... وہ اور ہوتی ہوں گی جنہیں فیصلے سنائے جاتے ہوں ..... ماورا ان میں شامل نہیں ہو سکتی ..... " اس کے الفاظ اور صدمے سے میرا برا حال تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ چیخ چیخ کر سارے عالم کو بتا دوں کہ مجھے اس سے شادی نہیں کرنی۔

"جانتا ہوں میں ..... مگر میں تم سے شادی کروں گا اور اسی طے شدہ تاریخ پر ہی ہو گی۔ میں نے وعدہ کیا ہے اور نبھاؤں گا۔ تمہیں کسی اور کے نام کا ہونے دوں یہ میری غیرت کو کبھی گوارا نہیں ..... تم میری محبت کو مانو یا نہ مانو ..... میرے وجود سے لاکھ انکار کرو۔ نفرت کا اظہار کرو میں سب سہہ لوں گا ..... لیکن ماورا یہ کبھی گوارا نہیں کروں گا کہ تم میرے علاوہ کسی اور کے سنگ رخصت ہو' فیصلہ ہو چکا ہے اور تمہیں ہر حال میں ماننا ہو گا۔ تم اب اس خاندان کا حصہ ہو۔ یہاں کی ایک فرد ہو اور ہماری خاندانی روایتیں اپنے

فیصلے بدلا نہیں کرتیں۔ خاص طور پر اس طرح کے فیصلے تو ساری عمر برقرار رہتے ہیں چاہے کوئی خوش ہو یا ناخوش..... سمجھیں تم......"
اس کا مسکراتا لہجہ یک دم دو آتشہ ہو گیا۔ تجی درشتی سے کہتے وہ کمرے سے نکل بھی گیا اور میں منہ پر ہاتھ رکھے دیکھتی رہ گئی۔

"ہماری خاندانی روایتیں اپنے فیصلے بدلا نہیں کرتیں... خاص طور پر اس طرح کے فیصلے تو ساری عمر برقرار رہتے ہیں.. چاہے کوئی خوش ہو یا ناخوش... سمجھیں تم... " اس کے یہی الفاظ مسلسل میرے دماغ میں گردش کر رہے تھے۔
"نہیں ... اگر ایسا ہوا تو میں بے موت مر جاؤں گی..... پاپا آپ اس موڑ پر میرے ساتھ اتنی بڑی زیادتی نہیں کر سکتے.. اب مزید نہیں.. بالکل نہیں.. " میں زور سے چیخنے اور رونے لگی۔ یوں لگ رہا تھا کہ پاپا نے یہ آخری کیل ٹھونک کر میرے مکمل مردہ وجود کو تابوت کی نذر کر دیا ہو۔ میں بلک بلک کر رو دی مگر میری آواز سننے والا کوئی نہ تھا۔ میری روتی بلکتی سسکتی آواز سننے والا کوئی نہ تھا۔ میری روتی بلکتی سسکتی آواز دیواروں سے ٹکرا کر پلٹ آئی تھی اور میں روتے روتے بستر پر گر گئی۔

* * *

"آپ نے کیا سمجھ رکھا ہے کہ میں کٹھ پتلی ہوں آپ کی یا کوئی بے جان مورت ہوں۔ یک بے روح گڑیا ہوں جو کچھ محسوس نہ کرتی ہو۔ میں نے اپنی زندگی کے تئیس چوبیس سال آپ کی محبت کا خواب سجائے ... اس لیے کہ باپ تو صرف باپ ہوتے ہیں کبھی تو اس پتھر میں بھی شگاف پڑے گا۔ کبھی تو آپ موم ہوں گے میری چپ میرا خاموش احتجاج میری نظروں کی بے بسی آپ کا سینہ چیر دے گی مگر آج آپ نے ثابت کر دیا ہے کہ باپ پتھر بھی ہوتے ہیں ماں باپ جیسے ظالم بھی ہوتے ہیں۔ آئی ہیٹ یو پاپا۔ رئیلی آئی ہیٹ یو....."
ساری رات اپنی قسمت کو کوستے ہوئے میں نے پاپا کے کمرے کے دروازے پر دستک دے دی۔ کچھ دیر بعد کھل بھی گیا۔ پاپا مجھے یوں اپنے سامنے دیکھ کر حیران سے تھے مگر کچھ بھی سوچنے سمجھنے سے قاصر تھی۔ غم نے میرا دماغ شل کر دیا تھا۔ میں اندر آ گئی اور اب میرے منہ سے جو نکلتا جا رہا تھا میں کہتی جا رہی تھی۔ ساری رات روتی رہی تھی۔ اب بھی میری آنکھیں بہہ رہی تھیں۔
"مادرا... یہ کیا بدتمیزی ہے۔ تمیز سے بات کرو۔ کیا کہہ رہی ہو تم" انہوں نے مجھے میرے بے باک بدتمیزانہ انداز پر ٹوکا تو میں پہلے سے زیادہ چیخ اٹھی۔
"مت کہیں مجھے مادرا... کچھ نہیں لگتی میں آپ کی... آپ جیسے پتھر، بے ضمیر انسان کیا جانیں کہ تمیز کیا ہے۔ مت رسوا کریں میرے اور اپنے رشتے کو۔ کوئی حق نہیں آپ کو میرا نام لینے کا بھی۔ میں نے بچپن سے اب تک آپ سے صرف محبت کی ہے۔ بت کی طرح پوجا ہے آپ کو مگر جواباً آپ نے مجھے کیا دیا۔ نفرت۔ صرف اور صرف نفرت۔ اتنی گہری کہ بار ہا میرا مر جانے کو جی چاہا۔ ماما مر گئیں تو کیا میرا قصور تھا۔ نہیں پاپا اس سارے معاملے میں میرا کہیں بھی کوئی قصور نہ تھا مگر آپ نے صرف اور صرف مجھے سزا دی۔ آپ کتنے ناشکرے انسان ہیں پاپا... ماما کی موت تو امر ربی تھی۔ جس میں کسی کا کوئی دوش نہ تھا لیکن نہ صرف آپ نے اس کے حکم کو نہ مان کر اس کے حکم سے انکار کیا بلکہ اس کی وحدہ لاشریک ذات سے بھی منکر ہو گئے۔ آپ ساری عمر سوگ مناتے رہے۔ خود پر ساری زندگی کی خوشیاں حرام کر لیں صرف ایک بات کے پیچھے سب کچھ ختم کر دیا۔"
"بکواس نہیں کرو مادرا... حواس میں تو ہو تم....." پاپا نے مجھے یوں کہنے پر ٹوک دیا تھا۔
"یہ بکواس نہیں پاپا!..... کبھی آپ اپنا محاسبہ کریں تو احساس ہو گا کہ کتنے بڑے گناہ گار ہیں آپ۔ آپ کے سلوک نے مجھے پاگل بنا دیا ہے۔ یہ سب کچھ تو صرف ایک احساس ہے اور یہ احساس وہ تازیانہ ہے جو ہر لمحے آپ نے پاپا میرے وجود پر اپنی نفرت کی صورت میں برسایا ہے۔ بڑی نفرت تھی نا آپ کو میرے وجود سے اور بڑی محبت کرتے تھے ماما سے۔ تو کہا ہوتا اللہ سے کہ وہ

مجھے نہ پالے اور ماما کو بھیج دے۔ آپ اس کے حکم پر راضی ہی نہ ہوئے تو مجھے نانو کے گھر پھینک دیا۔ آپ کیا جانیں کہ وہاں گزرا ایک ایک لمحہ میری زندگی میں کتنی محرومیاں دے گیا تھا۔ کس قدر جذباتی بن گئی ہوں میں نفرت سی نفرت اگنے لگی تھی میرے اندر۔ اور یہ سب کچھ آپ کی بدولت ہوا۔ وہاں لوگوں کی باتیں ممانیوں کے طنز ان کے بچوں کے رویے سب میرے اندر کی لڑکی کو زندہ درگور کرتے گئے۔ کیا کیا نہ بیتی مجھ پر۔ میں نے آپ کے زندہ ہونے کے باوجود یتیموں سی حسرت بھری زندگی گزاری اور اب اس موڑ پر کیا خیال ہے آپ کا کہ آپ کے فیصلے پر سر جھکا دوں گی۔ آپ کی بدولت مجھے یہ خاندان بھی قبول نہیں..... سلامہ شاہ سے تو میں نے زندگی میں کبھی شادی کرنے کا سوچا بھی نہیں۔ پاپا میں سب سہہ لیتی اگر آپ مجھے اس موڑ پر روند کرتے جس شخص کا نام لینا بھی میں قابل نفرت گردانتی ہوں آپ اسی کے ساتھ مجھے ساری زندگی کے لیے باندھ رہے ہیں۔ آپ کے خاندان نے مجھے کبھی تسلیم نہیں کیا اور آج آپ ان کی ذرا سی عنایت پر مجھے قربان کر رہے ہیں تا کہ آپ ماضی کی تلخیوں کو مٹا کر اپنے لیے بہتر جگہ تلاش کر سکیں۔ میں تو اس خیال سے یہاں آ گئی تھی کہ شاید آپ بھی مجھے میری ذات کا مان سونپ دیں۔ سب نظر انداز کیے خود پر ہزاروں پہرے بٹھائے یہاں رہ رہی ہوں اور آپ کا خیال ہے میں اس شخص سے شادی کروں گی جس سے میری نفرت کا صرف اور صرف یک ہی سبب ہے کہ وہ آپ کا بھتیجا ہے۔ اس خاندان کا بیٹا ہے"
میں یکدم چپ ہو گئی روتے روتے مرا حلق خشک ہو گیا... پاپا بالکل خاموش تھے۔ بس مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں نے نفرت سے چہرہ دوسری طرف کر لیا۔
"بہت جنونی ہیں پاپا آپ' آپ نے صرف ایک محبت کی تھی اور بدلہ کیا آپ نے۔ آپ تو صرف ماضی میں جینے والے انسان ہیں اور مجھے بھی ایسا ہی بنا دیا... آپ نے اپنی ساری زندگی اسی کا ماتم کرتے کرتے گزار دی۔ حتیٰ کہ یہ تک یہ خیال نہ آیا کہ میں کون ہوں؟ کیا رشتہ ہے میرا آپ سے۔ کبھی احساس نہ ہوا کہ آپ کے علاوہ کسی کی صورت میں ایک جیتا جاگتا وجود بھی ہے آپ کے اردگرد ہے۔ جسے کھانے پینے تعلیم رہائش وغیرہ کے علاوہ کچھ اور بھی چاہیے" میں تو بیٹی ہو کر بھی طرف آپ پر مسلط رہی ہوں۔ بیٹی تو کبھی تھی ہی نہیں اور اب بھی یہی بوجھ آپ اتار پھینکنا چاہتے ہیں۔ بڑا دعویٰ ہے کہ آپ نے ماما سے بڑی انمول اور باوفا محبت کی ہے۔ ان کی محبت کے بعد بھی ان کی محبت کا عہد نبھاتے رہے ہیں مگر مجھ سے پوچھیے کہ در حقیقت آپ ہیں کیا... آپ تو اچھے انسان بھی نہیں باپ کیا بنتے؟ میرے ساتھ نا انصافیاں کیں اور اب چاہتے ہیں کہ آپ کی ہی طرح کے ایک جنونی شخص سے شادی کر دوں... نہیں پاپا..... ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ نفرت کرتی ہوں میں اس سے، اس خاندان سے بھی اور آپ سے بھی اور آپ کو بھی اس زیادتی پر کبھی معاف نہیں کروں گی۔" میں روتی ہوئی کمرے سے باہر نکلی تھی مگر دروازے ہی پر سلامہ شاہ کو کھڑے دیکھ کر میرے قدم ٹھٹکے۔ ایک نفرت بھری نظر میں نے اس پر ڈالی۔
"مادرا..... " اس نے مجھے پکارا مگر میں اپنی ہی آنکھوں کو سختی سے رگڑ کر بغیر پلٹ کر اسے دیکھے بھاگ کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔
میں ساری رات روتی رہی۔ میرا دل اندر ہی اندر ٹوٹ چکا تھا۔ سر اب درد سے پھٹ رہا تھا۔ میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفقود ہو چکی تھیں۔ ادھر سے ادھر ٹہلتے نجانے میرے ذہن میں یکدم کیا آ سمائی تھی۔ میں بابا جان کے کمرے آئی تو انہیں جائے نماز پر بیٹھے دیکھا۔ میری نظر ان کی دوائیوں پر جا پڑی۔ ان دوائیوں میں سے میں نے ایک شیشی اٹھا لی۔ میں انہیں انکار کرنے کے ارادے سے آئی تھی مگر اب ان کو نماز میں دیکھ کر میں کچھ اور سوچنے لگی۔
"اگر یہ زندگی ہی نہ ہوگی تو سب دکھ ہی ختم ہو جائیں گے۔" شیشی لے کر میں واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔ موت بہت سے مسئلوں کا حل ہوتی ہے۔ ایک میرے مر جانے سے اگر پاپا کو سکون مل جاتا ہے تو یہ سودا اتنا مہنگا بھی نہ تھا۔

ماضی میں چکر لگا تا میرا دماغ حقیقت کی دنیا میں آ گیا۔ گہری طویل سانس خارج کرکے میں نے اپنے بہتے آنسو صاف کیے۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ سوائے میرے۔ سو مجھے اتنا طویل وقت مل گیا تھا کہ میں گزشتہ واقعات کا اعادہ بآسانی کر سکی۔

اس دن میں نے بابا جان کی خواب آور گولیاں کافی مقدار میں نگل لی تھیں اور اس کے بعد مجھے اسپتال کے اس کمرے میں ہوش آیا تھا۔ ایک عرصہ میں نے نفرت کی وادیوں میں بھٹکتے زندگی گزاری تھی۔ اب پاپا کا رویہ بدلا ہوا اور محبت سے بھرا ہوا تھا۔ میرے لیے بہت اجنبی تھا۔ میرے اندر کے جذبات اب ختم ہو چکے تھے۔ نفرت محبت اب کچھ بھی باقی نہیں تھا مگر میں اپنے اندر کی کمی بھی ختم نہیں کر پا رہی تھی۔ تین دن سے میں کچھ نہیں بولی تھی۔ کسی سے کچھ نہیں کہا تھا۔ پاپا، سلامہ شاہ، بی بی جان، سلامہ کی والدہ کوئی بھی آتا تو میں آنکھیں بند کیے لیٹی رہتی۔ کسی سے بات کرنے، نظر ملانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ نفرت کرتے کرتے اب کچھ بھی کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ عجیب بے بسی کا مقام آ گیا تھا زندگی میں۔

پاپا کو میں نے ان کی غلطیوں کا احساس دلا دیا تھا مگر ساتھ ساتھ اپنی بھی بہت سے غلطیاں تین دن سے مجھے یاد ہو رہی تھیں۔ سب سے بڑی غلطی تو خودکشی کرنے کی یہ کوشش تھی میں بھی پاپا کی طرح وہی غلطی کرنے جا رہی تھی۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی کہ یہ کتنا قابل مذمت فعل ہے۔ اللہ کے ہاں ایسے لوگوں کی کوئی بخشش نہیں۔ جہنم ہی صرف حصے میں آتی ہے۔ جذبات میں انسان واقعی ہوش کھو بیٹھتا ہے۔ تبھی تو ہمارا مذہب ہر حالت میں ہوش سے، سوچ سمجھ کر کام کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ جذبات اندھے ہوتے ہیں، چاہے وہ بے پناہ محبت کے ہوں یا نفرت کے۔ پاپا کی نفرت نے مجھے کس قدر اندھا بنا دیا تھا کہ اپنی زندگی داؤ پر لگانے چلی تھی۔ اگر اللہ مجھے بچا تا تو میں تو اپنے جذبات کے ہاتھوں اپنی آخرت تباہ کر چکی تھی۔ مجھ جیسے جذباتی لوگوں کا شاید یہی المیہ ہوتا ہے کہ صرف پچھتاوے ہی ان کا مقدر رہتے ہیں۔ یہ زندگی تو صرف آزمائش کا گھر ہے اور میں بھی کتنی ناشکری ہوں۔ سب کچھ تو تھا میرے پاس اس کے باوجود میں اللہ سے شکوہ کرتی رہتی۔ وہ ذات تو بے نیاز رحمان و رحیم ہے اور ہم بندے اپنی کم ظرفی و کم عقلی سے نقصان اٹھا لیتے ہیں۔

یا اللہ تو مجھے معاف کر دے..... بے شک تو رحمان ہے..... میں غلط تھی.... جذبات میں بہت بڑا فعل سرزد ہو گیا..... یا اللہ احسان ہے تیرا۔ شکر ہے تیری ذات کا کہ تو نے مجھے بچا لیا ورنہ جہنم کی گہری کھائی ہی میرا مقدر ہوتی..... "سرہانے میں منہ دیے میں مسلسل رو رہی تھی۔

ہسپتال سے حویلی پہنچ کر بھی ماورا کی چپ نہیں ٹوٹی۔ وہ کسی سے کچھ نہیں کہتی۔ نہ ہی کوئی الزام اور نہ ہی کوئی ناراضگی بس مسلسل چپ سی تھی جو کسی کو بھی کچھ کہنے نہیں دیتی تھی۔ بابا جان سے لے کر پاپا تک سب ہی اندر ہی اندر پچھتا رہے تھے۔ سلامہ شاہ سے بھی سامنا کم ہوتا تھا وہ محسوس کرنے لگی تھی کہ وہ خود ہی اس کے سامنے نہیں آتا تھا۔

عیدالاضحیٰ قریب آ رہی تھی۔ سب اس کی طرف سے توجہ ہٹا کر دیگر امور کی طرف متوجہ ہو گئے تو اسے بالکل ہی چپ لگ گئی۔ ام رومان اور صبا دونوں ہی عید کرنے حویلی آئی ہوئی تھیں۔ ام رومان کا زیادہ تر وقت ماورا کے ساتھ ہی گزرتا تھا۔ اس کے باوجود ماورا کا خود ساختہ خول نہیں ٹوٹ پایا تھا۔ ام رومان اٹھ کر گئی تو وہ کھڑکی کھول کر باہر دیکھنے لگی۔ صبا اور رومان کے بچے لان میں کھیل رہے تھے۔ ان کی معصوم سی چہکاریں ماورا کے اندر مزید محرومیاں پیدا کر گئیں۔ وہ جھلملاتی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"ماورا..... "پاپا کی آواز تھی وہ یکدم پلٹی وہ مسکرا کر دیکھ رہے تھے۔ گزرے دنوں میں کس قدر شفیق و مہربان ہو گئے تھے۔

"کیا دیکھ رہی ہو باہر؟" خوشگوار موڈ لیے انہوں نے پوچھا تو وہ بستر پر آ بیٹھی۔ لب بالکل ساکت تھے۔

"ماورا..... کیا تم مجھے معاف نہیں کر سکتیں..... کیا میرے گناہ و غلطیاں ناقابل معافی ہیں۔ اب میرے پاس سوائے پچھتاوے و پشیمانی و ندامت کے کچھ بھی نہیں..... کیا تم میری جھولی میں معافی کے چند لفظ بھی نہیں ڈال سکتی..... کچھ تو کہو..... یہ

چپ تو توڑ دو۔ بے شک میرے گزشتہ تمام رویوں پر مجھے برا بھلا ہی کہو "اس کے یوں پتھر رویے پر آزردہ ہو کر کہہ رہے تھے۔ وہ یکدم ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔ اب وہ اتنی پتھر بھی نہیں تھی کہ اپنے باپ کو اپنے سامنے یوں گڑگڑاتے دیکھتی۔

"ماورا..... میری بیٹی..... میری جان۔" اس کے یوں پھوٹ پھوٹ کر رونے پر وہ تڑپ کر آگے بڑھے اور اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

"پاپا..... کیوں کیا آپ نے میرے ساتھ ایسا..... ایک بار بھی آپ کے دل میں میری محبت نہیں جاگی۔ کیا ایک دفعہ بھی آپ کا دل مجھے پیار کرنے کو نہیں چاہا۔ بتائیں پاپا کیوں کر لیا تھا آپ نے خود کو یوں پتھر کہ میری محبت بھی کسی کام نہ آئی۔" آج وہ بالکل نارمل ہو کر ایک ننھی سی بچی کی طرح ان کے سینے سے لگی گلے شکوے کر رہی تھی۔ بڑی حسرت تھی اسے پاپا کے سینے سے لگ کر ان سے اپنے دل کی ساری باتیں کرنے کی اور آج اس کی برسوں پرانی خواہش پوری ہو رہی تھی۔

"بس..... میری بیٹی بس..... اب نہیں رونا..... میں پلٹ آیا ہوں۔ مجھے احساس ہو گیا ہے اپنی غلطیوں کا..... بہت دفعہ ایسا ہوا کہ میرا دل تمہاری طرف مائل ہو۔ تم سے ڈھیروں باتیں کرنے کو چاہا تمہیں سینے سے لگانے کی خواہش نے جنم لیا لیکن ہر بار میری انا نے مجھے روک دیا۔"

پاپا بھی رو رہے تھے۔

"آئی ایم سوری پاپا..... میں نے آپ کو بہت دکھ دیا..... مگر میں کیا کرتی، آپ کے سوا میرا تھا ہی کون..... آپ کی یہ مسلسل لاتعلقی مجھے اندر ہی اندر مارے جا رہی تھی اور پھر اس دن آپ کے مرے سے نکلنے کے بعد میرا دل چاہا تھا کہ میں اپنے آپ کو ختم کر لوں اور پھر کچھ سمجھ نہ آئی۔ میرا دل بہت دکھی ہو رہا تھا اور میں نے وہ کچھ کر لیا جو اللہ کو بھی پسند نہیں آتا۔"

"چپ..... بس اب کچھ نہیں کہنا۔ مجھے احساس ہو گیا ہے۔ ان شاء اللہ اب کوئی کوتاہی نہیں ہو گی..... بس اب تو ازالے کا وقت ہے۔"

"پاپا نے اسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔"

رومان کے ریکویسٹ کرنے پر وہ کمرے سے باہر نکلی۔ خشی عید پر ذبح ہونے والے بکرے لے کر آیا جو خاص طور پر سارا سال پالے ہی اسی مقصد کے لیے گئے تھے۔ ساری خواتین بکرے دیکھ رہی تھیں۔ رومان بھی ادھر چلی گئی۔ جہاں بکرے بندھے تھے وہ ستون سے لگ کر دیکھنے لگی۔ علی، رومان، صبا، بابا جی، رضا سارے ہی افراد جمع تھے۔ خوش ہو رہے تھے۔ صبا اور رومان کے بچے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے شور کیے جا رہے تھے۔ بہت عرصے بعد ماورا کو یہ پرشور زندگی کی مسرتوں سے مزین ماحول خوبصورت لگا۔ ورنہ زندگی تو گویا اس کے اندر سے ختم ہو گئی تھی۔ پاپا کی محبت کیا ملی تھی ساری دنیا اچھی لگنے لگی تھی۔ رومان نے یوں کھڑے دیکھ کر مسکرائی اس کے قریب آ کھڑی ہوئی۔

"دیکھنا ماورا!..... یہاں حویلی میں بکرا عید پر میٹھی عید سے بھی زیادہ رونق ہوتی ہے۔ قربانی ہوتی ہے۔ گوشت بانٹا جاتا ہے۔ طرح طرح کے پکوان پکتے ہیں۔ ہم لوگ تو گوشت کی خوشبو سے پیٹ بھر لیتے ہیں۔ پہلے دن بکرے ذبح کیے جاتے ہیں پھر دوسرے دن بڑے جانور کی قربانی کی جاتی ہے۔ تین دن تو اس مصروفیت میں گزر جاتے ہیں۔ یقین مانو ہم عورتوں کی شامت آئی رہتی ہے۔" وہ اسے بتا رہی تھی اور وہ صرف مسکراتی رہی۔

"ویسے یہ عید پہلے سے زیادہ خوشیاں لے کر آ رہی ہے۔ تمہاری اور بھائی کی شادی جو طے ہے سمجھ نہیں آ رہی کہ عید کی تیاریاں کریں یا شادی کی..... "وہ مزید کہہ رہی تھی ماورا کے مسکراتے لب بھینچ گئے۔ اتنے دن ہو گئے تھے مگر اس موضوع پر تو اس نے سوچا بھی نہ تھا۔ انکار کی اب کوئی بھی وجہ نہیں رہی تھی مگر اس کا دل سکڑ کر پھیل گیا تھا۔

سلامہ شاہ! کے تمام رویے کیسے بھول جاتی۔ اس کا یوں تحریری طور پر بتانا کہ ان کے فیصلے بدلا نہیں کرتے نے ہی اسے اتنا بڑا قدم اٹھانے پر مجبور کیا تھا اور اب رومان کا یہ کہنا اس کے دل میں بہت ہی اذیت ناک لہریں اٹھیں۔

"ہمارے ہاں بڑی روایتی قسم کی عید ہوتی ہے۔ عید والے دن کوئی آ رہا ہے' کوئی جا رہا ہے۔ ملازموں کے آتے ہی اعلان کر دیا ہے کہ اب میں کچن میں نہیں گھسوں گی۔ میرے دونوں بیٹے تو ایسے آفت کے پرکالے ہیں۔ ایک منٹ بھی ان سے آنکھ ہٹا دوں تو طوفان برپا کر دیتے ہیں۔ انگلی پر نچاتے ہیں مجھے ایک پاؤں ادھر تو دوسرا اُدھر بالکل اپنے باپ پر گئے ہیں۔ وہ بھی ایسے ہی ہیں۔ ویسے اماں جی نے تمہاری بری تیار کرنے کی ذمے داری لگا دی ہے۔ صرف ابھی تین چار دنوں میں۔ کچھ نہ پوچھو ہماری شامت آئی ہوئی ہے۔" وہ ہنس ہنس کر بتا رہی تھی اور ماورا کا ضبط جواب دینے کو تھا۔

"میں اندر جا رہی ہوں..... میرا دل گھبرا رہا ہے۔" نجانے کیوں وہ اس ذکر سے بھاگ رہی تھی۔

"کیوں..... خیریت..... کیا ہوا؟....." اس نے فوراً پرتشویش انداز میں پوچھا۔

"کچھ نہیں.....ویسے ہی....." وہ سر ہلاتی اندر اپنے کمرے میں آ گئی۔ تھوڑی دیر بعد پاپا اندر آئے تو وہ بالکل گم صم سی بیٹھی تھی۔

"پاپا!..... میں سلامہ شاہ سے شادی نہیں کروں گی....." انہیں دیکھ کر اس نے کہا۔

"مگر ماورا....."

"پاپا پلیز..... میں کہہ رہی ہوں نا..... مجھے وہ بالکل پسند نہیں..... بہت برا لگتا ہے وہ مجھے..... اس کے لیے مجھے مجبور مت کریں..... میرا دل نہیں مانتا....." میرا انداز قطعی تھا۔

"تو پھر کیا کرو گی..... تمہاری نانو نے شہریار کے لیے کہا تھا..... تم راضی ہو تو پھر میں ان سے بات کرتا ہوں....." اس کے انکار سے انہیں بہت تکلیف ہوئی تھی لیکن کے باوجود انہوں نے بردباری سے کہا تو وہ رو دینے کو تھی۔

"نہیں پاپا..... مجھے نہیں پتا..... مجھے کسی سے بھی شادی نہیں کرنی..... کسی سے بھی نہیں' نہ سلامہ سے' نہ شہریار سے....." اس کی اس بچگانہ بات پر رہبان شاہ ہنس پڑے۔

"اچھا۔ یہ بتاؤ تم سلامہ شاہ کو کیوں ناپسند کر رہی ہو..... پہلے تو میں وجہ تھا اب....." انہوں نے ملائمت سے پوچھا تو وہ سر جھکا گئی۔

"پاپا آپ کو شاید برا لگے لیکن میں اس خاندان میں خود کو کبھی ایڈجسٹ نہیں کر پاؤں گی۔ جذباتی طور پر مجھ میں برداشت بہت کم ہے۔ میں یہاں کے طور طریقوں رسم رواجوں کو کبھی قبول نہیں کر پاؤں گی۔ اس خاندان نے چوبیس سال تک مجھے قبول نہیں کیا۔ اب اگر قبول بھی کیا ہے تو سب کی اپنی اپنی غرض ہے اور میں کسی کی غرض کی بھینٹ نہیں چڑھوں گی۔"

صاف اور دوٹوک انداز میں اس نے بات کی تھی۔ اس نے صرف ایک کو مورد الزام نہیں ٹھہرایا تھا سب کو ہی شامل کیا تھا۔

رہبان شاہ صاحب چپ چاپ دیکھتے رہ گئے۔ وہ کیا کر سکتے تھے یہ سب کچھ ان کا اپنا ہی کیا دھرا تھا۔

رہبان شاہ نے سب کو ماورا کا فیصلہ سنا دیا۔ اس کا انکار سب تک پہنچا دیا۔ سب ہی چپ چاپ دیکھتے رہ گئے۔

"چچا جان وہ جذباتی ہے۔ صرف ایک سطحی بات سوچ رہی ہے۔ ضروری نہیں کہ اس کی بات مانی بھی جائے۔" سلامہ شاہ نے کہا۔

"نہیں سلامہ شاہ! تم میرے داماد بنتے یہ میری خوش نصیبی تھی مگر اب میں اپنی جانب سے ماورا کو کوئی دکھ نہیں دینا چاہتا....." وہ کہہ کر خاموشی سے اٹھ گئے بعد میں ان لوگوں کے درمیان مزید گفتگو ہوتی رہی۔

اماں جی' بی بی جان صابرہ اور رومان سب ہی بہت دکھی تھیں اتنے عرصے بعد سلامہ شاہ کسی لڑکی کے لیے راضی ہوا تھا خود اپنی زبان سے کہا تھا لیکن ماورا......

ماورا اس رشتے سے انکار کر کے پہلے سے زیادہ ذہنی طور پر پریشانی کا شکار ہو گئی۔ پہلے تو سلامہ شاہ کا رویہ تنگ کرتا تھا مگر اب..... وہ جو رومان سے تھوڑی بہت گھلی ملی تھی ان دو دنوں میں پھر کمرہ نشین ہو گئی تھی۔ رات کو وہ اپنے کمرے سے نکل کر لان کی سیڑھیوں پر آ بیٹھی۔ سردیاں زوروں پر تھیں۔ موسم دن بدن ٹھنڈا ہوتا جا رہا تھا۔ رات کو بھی اوس پڑتی تھی ساتھ میں دھند بھی۔ اس وقت سیڑھیاں بھی گیلی تھیں ماورا اگرچہ مکمل طور پر گرم کپڑوں میں لپٹی تھی اس کے باوجود سرد لہر اندر تک اترتی جا رہی تھی۔ اس معاملے میں وہ کافی حساس تھی موسم اس پر بہت جلد اثر انداز ہوتا تھا۔

دھند کی لپیٹ میں چاند بہت مدھم دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ابھی یونہی بیٹھی تھی جب گیٹ کھلنے پر گاڑی اندر داخل ہوئی۔ سلامہ شاہ صبح کا شہر گیا ہوا تھا اور اب رات گئے لوٹا تھا۔ ماورا اسے گاڑی کھڑی کر کے سیڑھیوں کی طرف آتے دیکھتی رہی۔

"اتنی سردی میں اس وقت تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" اتنے دنوں بعد وہ براہ راست مخاطب ہوا تھا۔ اپنی طرف سے تو سلامہ شاہ نے آرام سے پوچھا تھا مگر غصے کی ہلکی سی رمق ضرور تھی۔ جب سے اس نے رشتے سے انکار کیا تھا سلامہ شاہ کا غصہ حد سے بڑھا ہوا تھا صرف چچا کا احساس تھا ورنہ لمحوں میں اس کا دماغ درست کر دیتا۔

"نظر تو آپ کو بھی آ گیا ہے کہ میں کیا کر رہی ہوں۔" سلامہ کے لہجے سے استفسار پر اس نے اسی کے لہجے میں جواب لوٹایا۔ "کم از کم اس وقت واک کرنے سے تو رہی۔"

"اٹھو یہاں سے اور اندر چلو..... مرنے کا ارادہ ہے کیا..... اوس پڑ رہی ہے اس قدر دھند ہے....." ماورا کو گھور کر اس نے ڈپٹا تھا۔

"آپ جائیں آپ کو میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔" سلامہ شاہ کے ڈپٹنے پر اس نے بھی روکھے پن سے کہا تو سلامہ شاہ کا دماغ بھنا گیا۔ غصہ تو پہلے بھی تھا۔

"فکر کی بچی..... اٹھو یہاں سے ورنہ دوں گا الٹے ہاتھ کا ایک جھانپڑ..... عجیب شوق ہیں تمہارے۔ سارا عالم سردی سے بچنے کی کوشش میں بستروں میں دبکا بیٹھا ہے اور تم ہو کہ....." آگے بڑھ کر ماورا کا بازو تھام کر کھڑا کرتے اس نے سخت خشمگین نظروں سے گھورا تو ماورا ایک لمحے کو سچ مچ خوفزدہ ہو گئی۔ اس سے کیا بعید تھا اتنا تو حاکم و خودسر ہے اگر واقعی جھانپڑ لگا دیا تو۔

"خوامخواہ..... ایسے ہی رعب مت جمائیں..... ہاتھ تو لگا کر دیکھیں مجھے..... بڑے آئے کہیں کے دھمکیاں دینے والے....." اپنا بازو چھڑوا کر پیچھے ہٹی تو سلامہ شاہ نے گھورا۔

"یہ دھمکیاں نہیں ہیں عمل بھی کرتا ہوں۔ تمہیں شاید یوں قسطوں میں مرنے کا کچھ زیادہ ہی شوق ہے۔ اسی لیے آئے دن نئے نئے معرکے سر کیے اسپتال پہنچی ہوتی ہو....." وہ طنز کر رہا تھا دراصل غصہ تو اس بات کا تھا کہ اس نے آخر انکار کیوں کیا۔ سب کچھ تو اب نارمل تھا پھر وہ کیوں اب تک وہی پتھر کی مورت بنی ہوئی ہے۔

"آپ اپنی حد میں رہیں سلامہ شاہ!..... مجھ پر طنز کرنے کا آپ کو کوئی حق نہیں۔" اس کی پچھلی بات پر تپ کر پا ہوتے ہوئے اس نے کہا تو سلامہ شاہ ہنس دیا۔

"حق کی بھی تم نے خوب کہی..... سارا سارا دن اور ساری ساری رات اسپتال میں خوار ہوتا رہا ہوں۔ آرام سے اندر چلو ورنہ اٹھا کر لے جاؤں گا....." دھمکی دیتے اس نے کہا تو وہ تلملا گئی۔ اس کے ساتھ مغز ماری کرنے کے بجائے پاؤں پٹختے اندر آ گئی..... اپنے کمرے میں بھی آ کر وہ خود سے الجھتی رہی۔

عید میں صرف دو دن باقی تھے۔ حویلی میں خوب رونق لگی ہوئی تھی۔ ام رومان اسے کمرے سے زبردستی باہر نکال لائی۔ ان سب میں سے کسی کے بھی رویے میں رشتے سے ناراضگی کا شائبہ نہ تھا۔ وہ جو پہلے ہی انکار کر کے خود سے الجھی ہوئی تھی ان کے رویے دیکھ کر مزید شرمندہ ہوتی چلی گئی۔ صبا' رومان' اماں جی' بی بی جان ڈھیروں کپڑے پھیلائے بیٹھی تھیں۔ وہ بھی بیٹھ گئی۔ دلچسپی سے دیکھتی رہی۔ بی بی جان نے شہر سے سب کے لیے عید کے لیے کپڑے منگوائے تھے اس کے لیے بھی کتنی ساری چیزیں تھیں۔ وہ تو ہمیشہ ایک سادہ سے حلیے میں رہی تھی۔ اگر بہت ضرورت پڑی تو ہونٹوں پر لپ اسٹک لگالی۔ اب اپنے لیے یہ ڈھیروں چیزیں دیکھ کر حیران ہوئی۔

"یہ سب میرے لیے ہے......"

"تو اور کیا...... یہ سب تم پہنو گی بہت سجے گا تم پہ......" بی بی جان نے اسے ساتھ لگاتے ہوئے محبت سے کہا تو صبا نے مسکرا کر سوٹ اٹھا کر اس کے ساتھ لگا دیا۔ رومان اس کا ہاتھ پکڑ کر چوڑیاں پہنانے لگی۔

"او مائی گاڈ...... اتنا سب کچھ میں نہیں پہنوں گی...... تو...... نو...... اتنا آکورڈ لگے گا۔ اتنا ہیوی ہے یہ سب کچھ۔ مجھ سے نہیں سنبھالا جائے گا یہ سب کچھ کوئی سادہ سا سوٹ ہو تو بھی......"

"تم تو آرام سے بیٹھی رہو...... عجیب شوق ہیں تمہارے مائیوں والے...... میں شادی نہیں کروں گی۔ یہ نہیں پہنوں گی...... تو پھر کیا کرو گی......" رومان نے اس کے لہجے کی نقل اتارتے ہوئے اس ایک دم چپ کرا دیا۔ وہ خجل سی ہو گئی۔

"دیکھیں تو سہی...... کیسی لگتی ہے یہ بندیا تم پر......" صبا باجی نے بندیا اٹھا کر اس کے ماتھے پر سجا دی۔ وہ "ناں" "ناں" کرتی رہ گئی تھی مگر کسی نے بھی دھیان نہ دیا۔

"دوپٹہ جس پر بہت ہیوی کوڑی اور موتیوں کا کام تھا۔ اماں جی نے بھی اس کے سر پر اوڑھایا تو وہ لجا سی گئی۔

"دیکھیں بی بی جان آپ کی یہ پوتی بن سنور کر کیسی شہزادی لگنے لگی ہے۔" رومان اسے چھیڑ رہی تھی۔ بی بی جان نے اسے مزید لپٹا لیا۔ مادرا کا شرم سے برا حال تھا۔ یوں ہی گرتی پڑتی پلکیں اٹھا کر اماں جی کی طرف دیکھنا چاہا تو ان کے عقب میں کھڑے سلامہ شاہ کو دیکھ کر وہ مزید سٹپٹا گئی۔ وہ نجانے کب اندر آیا تھا۔ بڑی گہری نظروں سے تک رہا تھا۔

"ماشاء اللہ! میری بچی ہے ہی پیاری...... شہزادی ہی تو ہے۔ اللہ میرے رب! ان کی خوشی سلامت رکھے......" بی بی جان نے ایک دم اس کی پیشانی چومی۔

"سلامہ بھائی! اب آپ بھی بتا دیں کیسی لگ رہی ہے مادرا؟......" ام رومان سلامہ کی آنکھوں میں چھلکتے جذبے دیکھ کر شرارت سے بولی تو سلامہ سمیت سب ہنس دیے۔ اس پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اماں جی نے رومان کو ڈانٹا۔

"چلو...... میری بچی کو زیادہ تنگ نہیں کرو......" انہوں نے دلار سے کہا تو وہ دوبارہ سر بھی نہ اٹھا سکی۔ سلامہ شاہ کمرے سے باہر نکلا تو وہ بھی سب کچھ وہیں چھوڑ کے اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔

جذبے نجانے کیوں بے لگام ہوئے جا رہے تھے۔ خوش رنگ خوشبو جیسے۔ سلامہ شاہ کی شخصیت کبھی بھی نظر انداز کیے جانے والی نہ تھی تو پھر وہ کیوں پتھر بنی رہی جب کہ وہ ابھی بھی اسی کے تصور میں غرق تھا۔

"کیا میں واقعی سلامہ شاہ سے کبھی نفرت کرتی تھی اتنی گہری کہ کوئی گنجائش نکلنا بھی مشکل تھی اور جب کہ اب تو حالات نارمل تھے۔ پاپا کا رویہ بھی بہتر تھا تو میں کیوں اڑی رہی اپنی ضد پر......" تین دنوں میں پہلی دفعہ یہ سوال وہ خود سے کر رہی تھی اور اندر سے جو جواب آیا تھا اسے سن کر وہ کئی لمحے ساکت بیٹھی رہی۔

ان دو دنوں میں یہی ہوا تھا کہ اس کے جذبے رخ بدل گئے تھے شاید اس رات جب سلامہ شاہ اس کمرے میں جانے کا

کہہ رہا تھا کس قدر احساس تھا اسے کہ وہ کہیں سردی میں بیمار نہ پڑ جائے جب کہ وہ غصے میں تھا اور غصے میں تو وہ خود بھی تھی شاید گزرے دنوں کی وجہ سے تھا۔ پاپا سے سب کچھ کہہ کر دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے بعد نفرت جیسے کسی جذبے کا اب تصور بھی نہیں تھا۔ بس سلامہ شاہ سے اس نے کبھی بے پناہ نفرت کی تھی اب اس کے نام کے جذبے اس کے اندر سر ابھارنے لگے تھے جب کہ وہ اپنے ہاتھوں سے ہی اپنی ساری راہیں بند کر چکی تھی۔

عید والے دن حویلی میں خوب رونق تھی۔ اس کی دونوں پھوپھیاں بھی اپنے بچوں سمیت آئی ہوئی تھیں۔ قربانی کے بعد گوشت بانٹنے اور پکوان بنانے میں بھی مصروف ہو گئے تھے۔ وہ بھی بجھے دل کے ساتھ اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ نجانے کیوں باہر جانے کو موڈ نہیں بن رہا تھا۔ اماں جان کی لائی ہوئی تمام چیزیں زیب تن کی ہوئی تھیں۔ پہلی دفعہ وہ یوں سجی سنوری تھی۔ بہت منفرد و خوبصورت بھی لگ رہی تھی۔ پاپا اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے تھے کہ کسی اور سے ابھی تک سامنا ہی نہیں ہوا تھا پھر وہ خود بھی بچنے کی کوشش میں تھی۔ بستر سے اٹھ کر الماری کی طرف آ گئی۔ ادھر سے ادھر تلاش کر کے اسے وہ چیز مل گئی تھی جس کی اسے تلاش تھی۔ بستر پر بیٹھ کر اس نے ڈبے میں سے تمام چوڑیاں نکال کر اپنے دائیں ہاتھ میں پہننا شروع کر دیں۔ یہ وہی چوڑیاں تھیں جو لندن میں سلامہ شاہ اس کے کمرے میں چھوڑ آیا تھا۔ یہاں آتے ہوئے وہ انہیں اپنے ساتھ لے آئی تھی یہ سوچ کر کہ سلامہ شاہ کو واپس کر دوں گی مگر یہاں آ کر ادھر کے مسئلوں میں الجھنے میں واپس ہی نہ کر پائی تھی اور اب جب کہ کچھ نہیں بچا تھا تو خود سے بہت لڑنے کے بعد اس نے آج پہلی بار یہ چوڑیاں پہن لی تھیں۔

"ارے تم کیا آج بھی کمرہ نشین ہوئی بیٹھی ہو۔ باہر چلو سب تمہارا پوچھ رہے ہیں۔" صبا باجی اندر آئیں اور اسے چوڑیاں پہنتے دیکھ کر چونکیں۔

"ارے یہ اتنی پیاری گولڈ کی چوڑیاں کہاں سے لیں تم نے......؟" انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ جھینپ گئی جواب بھی نہ بن پڑا۔

"اچھا اب باہر چلو وہاں تمہاری سسرال آئی بیٹھی ہے۔" اگلے ہی لمحے انہوں نے مزید کہا تو وہ حیران ہوئی۔ چونک کر انہیں دیکھا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ چچا جان نے تمہارے ننھیال والوں کو ہاں کہہ دی تھی۔ آج وہ نکاح کی تقریب کرنے آئے ہیں۔ تم تو اندر بند ہو۔ تمہیں کیا خبر؟"

"صبا باجی......" وہ منہ کھولے ہکا بکا تھی۔ ابھی تو اسے اپنے جذبوں کی خبر ہوئی تھی۔ ابھی تو اسے پاپا کے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف کرنا تھا لیکن یہ کیا......

"اماں جی اور بی بی تمہیں تیار کر کے لانے کو کہہ رہی ہیں۔ اب جلدی کرو وقت نہیں ہے میرے پاس۔" انہوں نے جیسے اس کے اڑے اڑے حواس دیکھے ہی نہ تھے۔ ہاتھ پکڑ کر کھڑا کیا۔

"مگر صبا باجی......" وہ رو پڑی۔

"اگر مگر کچھ نہیں۔ تم سلامہ بھائی کے لیے راضی نہ تھیں ہم نے زبردستی نہیں کی۔ جب تم ہی راضی نہیں تو پھر کیا فائدہ۔ یہ بندھن باندھنے کا۔ چچا جان تو اور بھی راضی نہ تھے مگر ہم سب کے سمجھانے پر راضی ہو گئے۔" صبا باجی نے سنجیدگی سے اسے بتایا۔ اس کے آنسو مسلسل بہنے لگے۔

"صبا باجی! پلیز کچھ کریں...... مجھے نہیں پسند یہ شہریار...... اتنا برا ہے وہ...... سلامہ شاہ تو اس سے کئی درجے بہتر

ہیں..... میں نادم ہوں میں واقعی غلطی پر تھی۔ مگر میری غلطی کی اتنی بڑی تو سزا نہ دیں۔" وہ ایک دم اپنے جذبے عیاں کر گئی۔ صبا خاموشی سے اسے دیکھے گئیں۔ پھر نفی میں سر ہلایا۔

"اب میں کچھ نہیں کر سکتی..... فیصلہ ہو گیا ہے۔ مہمان آئے ہوئے ہیں۔ اب واقعی کچھ نہیں ہو سکتا۔ تم ہماری بھائی بنتی یہ ہمارے لیے خوشی کا مقام تھا کیونکہ ہمارے بھائی کی خوشی تم سے ہے لیکن ہمارے بڑوں کی زبان بھی کوئی اہمیت رکھتی ہے۔ کاش تم سمجھ سکتیں۔" انہوں نے اسے چپ کرا دیا۔

نجانے انہوں نے اسے کب تیار کیا تھا۔ سجایا سنوارا تھا۔ دلہن بنا کر وہ اسے ہال کمرے میں لے گئی تھیں جہاں ساری حویلی والی اور مہمان عورتیں جمع تھیں۔ نانو ممانیاں اس سے بہت محبت سے ملیں۔ وہ ٹھنڈے یخ ہاتھوں کو جکڑے واقعی پتھر کی مورت بنی بیٹھی تھی۔ سب اس کی تعریف کر رہے تھے۔ سراہ رہے تھے مگر وہ یہاں کہاں تھی۔ اس غائبانہ ذہنی حالت میں اس کا نکاح بھی ہو گیا۔ پاپا اس کے پاس نکاح کا رجسٹر لے کر آئے ان کی طرف شکایتی نظروں سے دیکھتے اس نے دستخط کر دیے۔ پھر پتا نہیں وہ کب تک وہاں بیٹھی رہی تھی اور کیا کیا ہوتا رہا تھا۔

صبا باجی اس کی ذہنی حالت محسوس کر کے اسے وہاں سے نکال کر دوبارہ اس کے کمرے میں لے آئیں۔

"صبا باجی..... " ان کے کندھے سے لپٹ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ سب اس کے ساتھ زیادتیاں کرتے آئے مگر اس نے پہلی دفعہ کسی کے ساتھ زیادتی کی تھی اس کی بھی فوراً سزا مل گئی تھی۔ ساری عمر کے رونے کی صورت میں۔

"اب بس بھی کرو ماورا..... اور کتنا روؤ گی۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا..... " انہوں نے کافی دیر بعد خود سے جدا کرتے ہوئے کہا تو وہ پھر بلک اٹھی۔

"یہ میرے ساتھ ہی کیوں ہوا ہے..... دوسروں کے ساتھ کیوں نہیں ہوتا؟..... کیا ساری محرومیاں میرے ہی مقدر میں ہیں۔"

"ماورا..... صبر سے کام لو..... تم تو خود خاصی سمجھدار ہو..... اتنی جذباتیت کیوں..... " انہوں نے کہا تو وہ سر جھکائے روتی رہی۔ حتیٰ کہ وہ اٹھ کر خاموشی سے باہر نکل گئیں۔ غصے میں آ کر اس نے بھاری دوپٹہ نوچ کر پھینک دیا۔ بھاری کام سے مزین فراک اور پاجامے میں اس کا وجود دیکھنے کے لائق تھا۔ اس نے ایک ایک کر کے سارے زیورات اتار کر بستر پر پٹخ دیے۔ دائیں ہاتھ میں صرف اب وہی چوڑیاں تھیں جو سلامہ شاہ نے دی تھیں۔ روتے ہوئے وہ پلٹی تو نظر دروازہ بند کیے اس کے ساتھ پشت لگا کر کھڑے سلامہ شاہ سے جا الجھی۔ وہ بڑی دلچسپ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ گھنی مونچھوں تلے کشادہ لب نجانے کیوں مسکرا رہے تھے جب کہ ماورا کے خیال میں اسے رنجیدہ ضرور ہونا چاہیے تھا۔ آخر کو اتنے دعوے کیے تھے اس نے اور اب..... مگر یہ یہاں آیا کیوں اور یہ ہنس کیوں رہا ہے۔ اپنا بھیگا چہرہ صاف کر کے اسے دیکھا وہ ایک ایک قدم اٹھاتا اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"آپ..... آپ..... " سلامہ شاہ کے تیور اور اس کی یہ پیش قدمی وہ گھبرا گئی۔ کہیں غم سے میری طرح اس شخص کا دماغ تو نہیں چل گیا۔ ماورا نے مشکوک نظروں سے دیکھا۔

"آپ..... آپ..... کب آئے..... " ماورا کے اوسان خطا ہونے کو تھے۔ لڑکھڑاتا لہجہ تھا۔ سلامہ شاہ کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ وہ مزید بدحواس ہوئی۔

"اگر تم یہ پوچھتیں کہ کیوں آیا ہوں تو بہت اچھے انداز میں جواب دیتا۔" سینے پر ہاتھ باندھ کر بے باک نظروں سے دیکھتے اس نے گل افشانی کی تو وہ جز بز ہوگئی۔ پہلے بھی جو ہوا تھا نا قابل قبول تھا۔ اب یہ سلامہ شاہ اور اس کے تیور..... آخر یہ اتنا خوش کیوں ہے۔" اسے الجھن ہوئی۔

"جب تم رونے دھونے میں اور زیور اتار کر پھینکنے میں مصروف تھی تو اندر آیا تھا۔ صبا باجی نے بڑی ڈرامائی پوزیشن بتائی تھی۔ انہیں خدشہ تھا کہ کہیں تم غم کی شدت سے کوئی الٹی پلٹی حرکت نہ کر بیٹھو۔" آخر کو ہم تمہاری ایک ایسی حرکت بھگت چکے تھے..... لیکن یہاں آ کر دیکھا تو ایسی کوئی صورتحال نہ تھی' تم تو مرنے مارنے والے موڈ میں ہو..... " وہ شاید صرف اس کا جی جلانا چاہتا تھا۔ آخر کو بڑے دعوے تھے محبت کے۔ اب اتنی جلدی کیسے جان بخشی کر دیتا۔ اس نے اس کی اس ساری بکواس پر شکایتی نظروں سے دیکھا۔ لیکن اگلے ہی لمحے اسے نظریں جھکانا پڑیں۔ سلامہ شاہ کی نگاہوں میں کوئی شریفانہ تیور نہ تھے۔ اس نے گھبرا کر رخ بدلنا چاہا تو سلامہ شاہ نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اسے مزاحمت بھی نہ کرنے دی۔

"یہ..... یہ..... آپ..... " بے بسی کے احساس سے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ ماورا کی اس شخص کے ساتھ ایک بھی یاد نہ تھی۔ ہمیشہ دونوں محاذ آرائی کی ہی حالت میں رہے تھے اور اب اس کی یہ جسارت جب کہ درمیان میں کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ ہمیشہ کی طرح وہ اس پر چیخ بھی نہ سکی۔ اس کی حدود کا کہہ کر اسے باز بھی نہ رکھ سکی۔ دل عجیب طوفانوں کی زد میں تھا۔

"آپ جائیں یہاں سے..... مجھے تنگ نہ کریں۔" رندھی آواز میں کہتے اس نے اس کے ہاتھ جھٹکنا چاہے تو سلامہ شاہ ہنس دیا۔

"تم چاہتے مجھے جتنا مرضی تنگ کر لو اور اب بھی وہ کہتے ہیں نا کہ رسی جل گئی مگر بل نہ گیا۔ رو دھو کر ان خوبصورت آنکھوں کا ستیاناس مار لو گی منہ سے نہیں پھوٹو گی۔" ہنسی روک کر اس نے کہا تو وہ ششدر دیکھتی رہ گئی۔ "اس شخص کو صبا باجی نے سب بتا دیا ہے اب یقیناً یہ مجھے طنز کی مار مارے گا۔ کیسا ظالم ہے یہ بھی....."

"کیا مطلب ہے آپ کا؟..... " سلامہ کی بات نے اس کے اعصاب جھنجھوڑ دیے تھے فوراً چہرہ صاف کر کے پوچھا۔

"مطلب بھی میں سمجھاؤں یا تم سمجھاؤ گی..... " اس کے تحمیر سے بچہ پر ماورا واقعی کچھ مزید الجھ گئی۔ آنسوؤں کی روانی میں ایک دم اضافہ ہوا۔

"پلیز۔ چھوڑ دیں مجھے..... جائیں یہاں سے..... " اپنے کندھوں سے اس کا ہاتھ ہٹانے کی کوشش میں ناکام ہو کر اس نے چیخ کر کہا۔

"ماورا..... اب بس بھی کرو..... سچ سچ کتنا پانی ہے تمہاری آنکھوں میں ایک عرصے سے اپنے پیچھے خوار کیا ہے تم نے مجھے اور اب آنسو بہا بہا کر جان لینے کے درپے ہو۔"

اس کے مہکتے جذبوں سے اٹی آواز پر وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو دی۔

"پاپا نے بہت غلط کیا میرے ساتھ..... میں نے انہیں منع بھی کیا تھا مگر پھر بھی انہوں نے آج نکاح کر دیا..... مگر مجھے نہیں کرنی اس شہریار گھونچو سے شادی..... سن لیں۔ آپ بھی..... کوئی زبردستی تھوڑی ہے۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے اسے بتا رہی تھی۔

سلامہ شاہ شہریار کو گھونچو کہنے پر زوردار قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"آپ ہنس کیوں رہے ہیں۔" اس نے غصے سے پوچھا۔

"اب تم یوں احمقوں والی حرکتیں کرو گی تو میں ہنسوں بھی نہیں..... " ہنسی دبا کر اس نے ماورا کی آنکھوں میں جھانکا پھر اس کے تمام آنسوؤں کو پوروں سے چن لیا۔ وہ کوئی مزاحمت بھی نہ کر سکی۔ صرف اسے دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں ان گنت جذبوں کی روشنی تھی۔

"تمہارا کسی شہریار وغیرہ سے نکاح نہیں ہوا..... " اس نے ایک دم ماورا کے حواس پر بم پھوڑا۔

"کیا..... تو پھر؟" وہ پھیلی آنکھوں سے حواس باختہ تھی۔

"تو پھر مجھ سے ہوا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ میرا تم سے وعدہ ہے محبت تم سے کی ہے شادی بھی تم سے کروں گا دیکھو کتنا سچا ہوں میں اپنی محبت میں بقول شاعر

میں اپنے عشق میں سچا ہوں اور کہتا ہوں
میرے لہو میں بہت زہر ہے رقابت کا
ہزار اس نے چاہا میں بکھر جاؤں
پر میں نے صبر کیا، صبر بھی قیامت کا

تم سے محبت کی ہے۔ تمہارے احمقانہ انکار پر بہت غصہ آیا جی تو چاہا منٹوں میں دماغ سیدھا کردوں۔ اس طرح تمہارے سارے کل پرزے ٹھیک ہو جائیں گے مگر پھر سوچا، ہو تو تم پتھر کی مورت ہی۔ اتنے عرصے سے سر پھوڑ رہا ہوں کیا فائدہ ہے۔ تھرڈ آؤٹ پر اپر چینل استعمال کرو۔ اب افسوس ہو رہا ہے کہ یہ پراپر طریقہ کاش پہلے استعمال کیا ہوتا تو کب کی ہماری دسترس میں ہوتی۔"

وہ ہزار ہا جذبوں میں گھرا اسے بتا رہا تھا اور ماورا کی وہ حالت تھی گویا کاٹو تو بدن میں خون نہیں۔ مرتے مرتے دوبارہ زندگی ملی تھی۔ خدا کیسے پل میں مہربان ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو بہہ نکلے۔

"اب کیوں رو رہی ہو؟" روتے میں ہنس دی۔

"ہیں اب کیا ہوا ہے.....؟" اس نے گھورا۔

"یہ بھی کوئی انسانوں والا طریقہ تھا میری جان نکال کے رکھ دی اور صبا باجی بھی کیسی ڈکٹیٹر بن بیٹھی تھیں۔ ذرا بھی میرے رونے کا احساس نہ کیا۔ اتنا نہ ہوا کہ مجھے بتا ہی دیں۔" ہنسی روک کر کچھ خفگی سے اسے دیکھا تو وہ ہنس دیا۔

"تمہیں اگر وہ بتا دیتیں تو یہ سارا معاملہ کیسے سلجھتا۔ تم نے اچھا خاصا چوپٹ کر دیا تھا وہ تو بھلا ہو میرے بڑوں کا کہ ان کی عقل تمہاری طرح گھاس چرنے نہیں گئی تھی۔ بہتر فیصلہ کیا۔ میری بھی رائے تھی کہ تمہیں لاعلم رکھا جائے۔ تمہارا کیا تھا تم پھر کوئی کھڑاک کر دیتیں بمشکل ہی تو قابو میں آئی ہو۔ ویسے تمہیں شرم آنی چاہیے تھی یوں مجھ سے اپنے جذبات چھپاتے پر۔ جب میں نے تم سے کچھ نہیں چھپایا ایک ایک جذبہ تمہارے سامنے تھا تو تم نے یہ بے ایمانی کیوں کی؟" وہ ایک دم یوں باز پرس پر اتر آیا تھا جیسے درمیانی تعلقات ہمیشہ ہی سے اسی طرح قائم دائم تھے۔ ماورا نے گھورا۔

"میں نے کوئی بے ایمانی نہیں کی۔ مجھے خود علم نہیں تھا وہ تو ان ہی دو تین دنوں میں علم ہوا کہ....." وہ کہتے کہتے ایک دم رک گئی۔ سلامہ شاہ کو دیکھا وہ پوری طرح متوجہ تھا۔

"کہ محترمہ ہمارے عشق میں مبتلا ہو چکی ہیں۔" وہ ہنسا۔ وہ زچ ہوئی اس کی خوش فہمی پر۔

"میں کوئی مبتلا وبتلا نہیں ہوئی بس بات ساری یہ ہے کہ پوری ایمانداری سے سوچا تو آپ کی محبت اور آپ کی شخصیت اتنی بری بھی نہ تھی۔ اسی لیے....." وہ شرارتی انداز میں مزید کچھ کہتی جب سلامہ شاہ نے اس کے ہونٹوں پر اپنا بھاری ہاتھ رکھ دیا۔

